پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ : ۱ جلد : ۲۷

اپریل ۱۹۷۹ء

ادارۂ تحریر :

گوپال متل ☆ مخمور سعیدی

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے، فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

مضامین :

افسانے :

نظمیں :

غزلیں :

تبصرے :

بزمِ احباب :

ہم شکر گزار ہیں

— ہم نے گزشتہ ماہ "تحریک" کے قدر شناس دوستوں سے گزارش کی تھی کہ وہ اس کی توسیعِ اشاعت میں حصّہ لے کر اسے بہتر بنانے میں ہماری مدد کریں۔

— ہم ان دوستوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ہماری درخواست پر توجہ فرمائی، بالخصوص حضرات عبد الرحیم نشتر، جاوید شہبازی اور راز مناوری کے، ان تینوں حضرات نے عملی تعاون کا ثبوت دیا ہے۔

— ہم نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ قارئین اپنے مفید مشوروں سے بھی ہمیں نوازیں۔ ہمیں بہت سے خط ملے ہیں اور اکثر حضرات نے افسانوی حصّے میں اضافے پر پسندیدگی ظاہر کی ہے چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب "تحریک" میں ہر مہینے کم سے کم پانچ افسانے ضرور شائع کیا کریں گے۔

— ہم اپنے تمام کرم فرماؤں سے توسیعِ اشاعت میں حصّہ لینے کی درخواست پھر کر رہے ہیں اور یہ بھی کہ وہ اپنے مشوروں سے بھی ہمیں نوازتے رہیں۔

● — ہم آپ کی عنایات کے منتظر ہیں۔

بولتا کلنڈر

گوپال متل

جی ہاں! ایک کلنڈر واقعی ایسا ہے جو بولتا ہے۔ یہ آپ کو ایسی کئی باتیں بتاتا ہے جنھیں آپ روسیوں سے براہِ راست پوچھیں تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لیں۔ یہ ایک ٹیبل کلنڈر ہے جسے ماسکو کے پالیٹکس پبلشنگ ہاؤس نے ۱۹۷۹ء کے لیے چودہ لاکھ کی تعداد میں شائع کیا ہے تاریخوں اور یادداشتوں کے اندراج کے لیے تو اس میں باقی کلنڈروں کی طرح صفحات ہیں ہی لیکن ان کے علاوہ ۱۸۰ صفحات پر اس میں روسی زندگی کے بارے میں بہت سی معلومات بھی درج ہیں۔ دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ اس میں اسٹالن کی تصویر کے ساتھ ساتھ اس کا مفصل خاکہ بھی ہے۔ یہ اس لیے دیا گیا ہے کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۸ء کا دن اسٹالن کی سوویں سالگرہ کا دن تھا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ خروشچیف کا اس میں ذکر نہیں جو اگر زندہ ہوتا تو یہ اس کی پچاسیویں سالگرہ ہوتی۔ لینن کی ایک سو نوویں سالگرہ پر جو نوٹ ہے وہ پورے دو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اسٹالن نے انقلاب اور خانہ جنگی میں جو کارنامے انجام دیے، کلنڈر میں صرف انھی کا ذکر نہیں بلکہ روس کی اقتصادی ترقی کے لیے اُس نے جو کوششیں کیں ان کی بھی ستائش کی گئی ہے۔ لکھا گیا ہے کہ:

"پارٹی کے دوسرے لیڈروں کے ساتھ ساتھ اسٹالن نے بھی قومی ریاست کی تشکیل، ملک کی سوشلسٹ صنعت کاری، دفاع کے استحکام اور پارٹی اور ریاست کی خارجہ پالیسی کو ڈھنگ سے چلانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس نے ٹراٹسکائیوں، بمبینی موقع پرستوں اور بورژوا قوم پرستوں کے خلاف جہاد کی رہنمائی کی۔ ۱۹۴۱ء میں اسٹالن عوامی کمیساروں کی کونسل کا چیرمین بنا اور بعد میں وزراء کی کونسل کا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک تحفظِ وطن کی جو عظیم لڑائی لڑی گئی اس میں اسٹالن ریاستی دفاع کی کمیٹی کا صدر، دفاع کا عوامی کمیسار اور سوویٹ یونین کی مسلح افواج کا کمانڈر انچیف تھا۔"

اس طرح ۱۹۷۹ء میں اسٹالن کو اسرِ نو [illegible] مقام بنا دیا گیا۔ البتہ تھوڑی بہت احتیاط ضرور برتی گئی ہے۔ اسٹالن کے مثبت کارناموں کے ساتھ ساتھ اس کی غلطیوں اور کچھ کوتاہیوں کا بھی ذکر ہے۔ کہا گیا ہے کہ شروع شروع میں جب وہ لینن کے ساتھ کام کرتا تھا تو ساتھیوں کے مشوروں کو سنتا تھا اور مشترکہ قیادت کے لینینی اصولوں پر کاربند تھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ ان سے ہٹتا گیا۔ اس سے یہ گمان گزر سکتا ہے کہ روس کی موجودہ قیادت اسٹالن کے بارے میں جو نیا اندازِ نظر اپنا رہی ہے وہ متوازن ہے لیکن درا صل ایسا نہیں ہے۔ خود کلنڈر بھی ہمیں بتاتا ہے کہ متوازن اندازِ نظر کے پردے میں اسٹالن کے سنگین جرائم کو چھپایا جا رہا ہے، جس کی ایک مثال یہ ہے:

۱۸ نومبر کو سٹینسلاؤ۔ وی۔ کوزیر کی نوّے ویں سالگرہ کا اندراج ہے۔ کلنڈر کے صفحہ ۲۶۲ پر اس کا فوٹو ہے اور

پارٹی کے تئیں اس کی خدمات کا تفصیلی ذکر بھی۔ بتایا گیا ہے کہ اس نے کتنی محنت سے یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کو منظم کیا اور اس کا لیڈر رہا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نے دوسرے رہنماؤں پارٹی کے تنظیمی سکریٹری کی حیثیت سے پارٹی کے ناپسندیدہ ممبروں کا صفایا کس طرح کیا۔ ١٩٣٠ء میں کوزیر پولٹ بیورو کا مکمل ممبر بن گیا تھا اور ١٩٣٨ء میں سوویت کنٹرول کمیشن کا صدر اور عوامی کیساروں کی کونسل کا نائب صدر منتخب ہو گیا تھا۔

کوزیر کا تذکرہ یہیں ختم ہو جاتا ہے ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ ١٩٣٨ء میں کوزیر کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پوچھ تاچھ کے دوران اسے اذیت دی گئی تھی۔ غیر ملکی انقلاب دشمن تنظیموں کے ساتھ رابطے کا مجرم قرار دیا تھا اور ١٩٣٩ء میں اسے سزائے موت دے دی گئی تھی، اور اس کے ساتھ ہی اس کی بیوی، اس کے بھائی اور اس کی سالی بھی موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے تھے۔ ایک فقرہ اس تذکرے میں بڑا معنی خیز ہے اور وہ خود کوزیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے "میری زندگی کا راستہ عام راستہ ہے۔ ایک سیاسی طور پر بیدار سیاسی کارکن کے لیے یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو انقلاب سے مکمل طور پر وابستہ کر دے"۔ تو گویا سوویٹ اندازِ نظر کے مطابق ایک ایسے شخص کے لیے جس نے انقلاب کو کامیاب بنایا، جو لینن کا معتمد ساتھی تھا، یہ بالکل قدرتی تھا کہ اسٹالن کے دور میں کروڑوں دوسرے لوگوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ روس میں ان دنوں غیر مقلدوں کی تعذیب میں جو اضافہ ہو رہا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ استدلال بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس کا ثبوت ہے کہ اسٹالن کی واپسی محض افواہ نہیں۔ ▲▲

یوسف چچا کی یاد میں (بقیہ صـ٧ سے آگے)

نمازِ ظہر، اس کے بعد ہمایوں کے مقبرہ تک چہل قدمی اور پھر واپس آکر تھوڑی دیر آرام کرنا شتہ...... پھر لکھنا پڑھنا علمی اور ادبی کام ——— اور پھر ملنے والے، مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، مسلک مختلف، مذہب مختلف، نظریات مختلف، لیکن جس دھاگے نے ان سب کو یکجا کیا تھا وہ تھا انسانیت کا دھاگہ ——— یہ بڑا ہی مضبوط دھاگہ ہے۔

بات کچھ فلسفیانہ سی لگتی ہے اور آپ سوچتے ہوں گے کہ ایسے لوگوں کو اور کوئی کام نہیں، خوشنما مکان بنانے کی تمنا نہیں، خوشامد اور خوشامدیوں سے دلچسپی نہیں، کوئی بڑا عہدہ حاصل کرنے کی خواہش نہیں، اور تو اور آرام دہ زندگی گزارنے سے بھی علاقہ نہیں ——— یہ کون سی مخلوق ہے، یہ کیسے لوگ ہیں؟ تو اس سوال پر مجھے یوسف چچا کی وہ بات یاد آتی ہے جو انھوں نے مجھ سے نومبر ۸۰ء میں کہی تھی:

"جس شخص کے پاس باطنی دولت ہوتی ہے وہ بہت سی چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے" باطنی دولت والے ہی روشن ضمیر ہوتے ہیں، ہر اس تعصب سے بالاتر جس میں خود ساختہ فصیلیں، حدود، تفریقات اور دل آزاریاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے اس دور میں بھی میں نے یوسف چچا سے کوئی سبق سیکھا تو وہ یہ کہ انسانیت تعصب سے پاک ہوتی ہے اور بالآخر صداقت ہی سب کچھ ہے، یہی وہ خوبی ہے، قوت ہے جو مرنے کے بعد بھی انسان کو اس کے کارناموں کے ذریعہ زندہ رکھتی ہے۔

یہی اصلی باطنی دولت ہے لیکن یہ یوں ہی نہیں مل جاتی۔ وہ لوگ جو علم و ادب کے ٹھیکہ دار ہیں، جو سچائی اور محبت کو کمزوری کہتے ہیں، جو صاحب نظر تو درکنار سلیم الطبع بھی نہیں، اور جو معیارِ زندگی کو معیارِ کامیابی قرار دیتے ہیں، ان کی قسمت میں یہ دولت نہیں کیونکہ ان لوگوں کا سرمایہ تو وہ سکے ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنے ساتھ برائے سفارش لے بھی نہیں جا سکتے۔

یوسف چچا اپنے ساتھ کیا لے گئے اور ہمارے لیے کیا چھوڑ گئے؛ اپنے ساتھ لے گئے نیکیاں، محبتیں، شفقتیں، اور اپنا روشن ضمیر، جگمگاتی ہوئی باطنی دولت، اپنا اندازِ فکر، اپنا کشادہ دل ——— اور ہمارے لیے چھوڑ گئے یادیں اور خوشبو، اور یہ ابدی پیغام کہ:

روشنی جہاں ملے روشنی کا ساتھ دو۔ ▲▲

عمر خیام اور خاقانی کا رشتہ؟

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

حکیم افضل الدین خاقانی نے ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام "تحفتہ العراقین" ہے۔ اس کے آخر میں اس نے اپنے والدین، دادا اور چچا کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ یہ بچپن میں سایۂ پدری سے محروم ہو گیا تھا اور اس کے چچا نے اس کی تربیت کی تھی۔ اس لیے خاقانی نے اس کا ذکر بے حد احسانمندانہ کیا ہے۔

"تحفتہ العراقین" ۱۸۵۵ء میں منشی ابوالحسن مدرس اول فارسی، آگرہ کالج، کے تحشیہ و تصحیح کے ساتھ مطبع مدرسہ آگرہ میں باہتمام پنڈت کدارناتھ چھپی تھی۔ اس اڈیشن کے صفحہ ۱۹۷ پر ایک عنوان ہے "در مدح عم خود عمر خیام کہ در اہتمام و تربیتِ او بود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمر خیام جو نیشاپور کا باشندہ اور اپنے عہد کا بہت بڑا ریاضی اور ہیئت کا عالم تھا۔ خاقانی کا چچا تھا۔ لیکن عنوانِ مذکورۂ بالا کے تحت جو اشعار لکھے گئے ہیں۔ ان کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بگریختہ ام ز دیو خذلان
در سایۂ عمر ابن عثمان
ہم صدرم و ہم امام و ہم عم
صدرِ اجل و امامِ اکرم
برہانی و ہندسی مقالش
افلاطن و ارسطو عیالش
از علمش دادہ دہر محدث
یک ثلث بہ ہر سہ مثلث

آگے چل کر لکھا ہے:[1]

چوں دید کہ در سخن تمامم
حسانِ عجم نہاد نامم
چوں پاے دلم بگنج در سوخت
سالم در ربست و گنج در کوفت
چوں دید کز اہلِ نطق بیشم
از شادیِ آں بمرد پیشم

اسی کتاب کا ایک اور عنوان ہے "در بیانِ نسبت از جانبِ عم کہ طبیب بود"[2] اس کے تحت لکھتے ہیں:

وز سوئے عمم طبیب گوہر
بقراطِ سخن بہ ہفت کشور

اپنے والد کے بارے میں جو شعر لکھے ہیں ان کا عنوان ہے[3] "در مدحِ پدرِ خویش شیخ علی نجار" اس حصے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

---

[1] تحفتہ العراقین ۲۰۰ و ۲۰۱، [2] تحفتہ العراقین ۱۸۹ [3] تحفتہ العراقین ۵۲

از بز خلائقم سبک بار
بر مائدۂ علیِ نجّار

ایک اور موقع پر اپنے باپ کا ذکر اس طرح کیا ہے[1]

دل در سخنِ محمّدی بند
اے پورِ علی ز بوعلی چند

ملک الوزرا جمال الدین موصلی نے خاقانی سے پوچھا ہے کہ تمھارا وطن کون سا شہر ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:[2]

گفتم متعلمی سخن داں
میلادِ من از بلادِ شرواں

ایک قصیدے کا شعر ہے:[3]

عیبِ شرواں مکن کہ خاقانی
ہست از اں شہر کابتداش شر است

تحفۃ العراقین کے مذکورۂ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی علی کا بیٹا اور عمر بن عثمان کا بھتیجا تھا جس کا یہ مطلب نکلا کہ خاقانی کے دادا کا نام عثمان تھا نیز یہ کہ اس کا مولد و منشا شرواں تھا۔ چچا نے اسے حسان العجم خطاب دیا تھا۔ اپنے نام کے بارے میں لکھتا ہے:[4]

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را
بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

رشید وطواط نے خاقانی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جواب میں خاقانی نے جو قصیدہ لکھا اس کے شروع میں رشید کے دو شعر دیوان خاقانی میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں کا دوسرا یہ ہے[5]

افضل الدیں بو الفضائل بحرِ فضل
فیلسوفِ دین فزائے کفر کاہ

دیوانِ خاقانی کے مصحح محمد عباسی نے اپنے دیباچے (صلا) میں مجد الدین خلیل کا ایک قطعۂ مدحیہ نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے:

افضل الدین امام خاقانی
تاجدارِ ممالکِ سخن است

ان حوالوں کے پیشِ نظر خاقانی کا پورا نام ہم یوں لکھ سکتے ہیں "افضل الدین ابو الفضائل بدیل بن علی بن عثمان خاقانی شروانی"۔

دیوانِ خاقانی میں دو قصیدے ایسے موجود ہیں، جن میں سے ایک اس نے اپنے چچا کی اور دوسرا اپنے والد کی مدح میں لکھا ہے۔ پہلے کا عنوان ہے "در تحسّر و تألم از مرگِ کافی الدین عمر بن عثمان عموی خود سرودہ است"
اس کے یہ شعر قابلِ ملاحظہ ہیں[6]

زاں عقل بدو گفت کہ اے عمرِ عثمان
ہم عمرِ خیامی و ہم عمرِ خطاب
ادریس قضا بینش و عیسائے شفا بخش
دادہ لقبش در دو ہنر واضع القاب

ان شعروں میں خاقانی نے اپنے چچا کو "عمر عثمان" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ عمر کی اضافت ابنی ہے یعنی مراد خاقانی "عمر بن عثمان" ہے۔ اس کے بعد چچا کو چار عظیم المرتبت اشخاص سے استعارہ کیا ہے، جو یہ ہیں: عمر خیامؒ، عمر بن خطابؓ، ادریسؑ، اور عیسیٰؑ۔ علامہ قزوینی نے چہار مقالۂ نظامی

---

[1] تحفۃ العراقین ص۵۲۔ [2] ایضاً ص۳۱ [3] دیوان خاقانی ۶۲ چاپ پیروز تہران ۱۳۳۶ ش، [4] ایضاً ص۲۹۷
[5] ایضاً ص۲۶ [6] ایضاً ص۵۳

رضی کے حاشیہ میں شعر اول کا یہ مطلب لکھا ہے[1] "یعنی
م در علم والاحت اولیں رتبہ مانند عمر خیام در عدل
احب نخستین درجہ چون عمر خطاب" محمد عباسی اپنے
یباچے میں اس شعر کا مطلب لکھتے ہیں "فضیلت عمر خیام
ابا نوع عمر خطاب در وجود خویش جمع داشتے[2]"
ن دونوں فاضلوں کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عمر عثمان
ور عمر خیام کو ایک نہیں دو جدا گانہ شخصیتیں مانتے تھے۔

خاقانی نے تحفۃ العراقین میں اپنے باپ دادا کے مخصوص
نروں کا ذکر کرنے کے بعد چچا کے بارے میں کہا ہے[3]

در سوے عمم طبیب گوہر
بقراط سخن بہفت کشور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چچا طبیب تھا، اور
اس درجے کا طبیب تھا کہ اس علم کو اس کا ہنر خاص مانا جاتا
تھا۔ قارئین اس بات کو ذہن نشین رکھیں۔ ایک اور قصیدے
کے عنوان میں عمر عثمان کے بارے میں لکھا ہے کہ[4] "در مدح
عمو سے خود کافی الدین شروانی گوید"۔ یہ نسبت ظاہر
کرتی ہے کہ کافی الدین عمر بن عثمان کا وطن شروان تھا۔ یہ بات
بھی یاد رکھنے کی ہے۔

خاقانی نے اپنے چچیرے بھائی کی مدح میں ایک
قصیدہ لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے "در مدح امام
الشارع وحید الدین ابو المفاخر پسر کافی الدین عمر
پسر عم و داماد خاقانی" اس قصیدے کا یہ شعر توجہ چاہتا
ہے[5]

ظاہر است آسایش از کافی عمر در گیر و دو
می شمر تا قدر سلف عثمان و ابراہیم او

جہاں تک اس شعر پر میں نے غور کیا ہے۔ یہ بات میری
سمجھ میں آتی ہے کہ خاقانی کے چچیرے بھائی کا نام و نسب یہ ہے
"وحید الدین ابو المفاخر عثمان بن کافی الدین عمر
بن عثمان بن ابراہیم شروانی" اور اگر یہ درست ہے تو پھر
خاقانی کے چچا کا نام کافی الدین عمر بن عثمان بن ابراہیم شروانی
طبیب ہونا چاہیے۔

مذکورۂ بالا دو قصیدوں میں سے دوسرا خاقانی نے اپنے
والد کی مدح میں لکھا ہے۔ اس کے آخر میں ہے[6]

ہم بہ ثنائے پدر ختم کنم چون مقیم
نانِ من از خوانِ او دست جامگی از خان او
گر ز قضائے ازل عہد "عمر" در گذشت
تا بہ ابد بگذرد نوبت "عثمان" او

ظاہر ہے کہ دوسرے شعر میں عمر سے مراد خاقانی کا چچا عمر بن
عثمان اور عثمان سے مراد اس کا چچیرا بھائی عثمان بن عمر عثمان ہے۔

اب خیام کی طرف آیئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور
نے اپنی بے نظیر کتاب "خیام" میں اس فیلسوف کے متعلق سارا
مسالہ یک جا کر دیا ہے۔ اس میں جن کتابوں کے حوالے دیے
گئے ہیں، ان میں سب سے قدیم تذکرہ نگار ظہیر الدین ابو الحسن علی ابی
القاسم زید البیہقی ہے۔ یہ تذکرہ نگار بقول خود اپنے والد کے ہمراہ
خیام کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اور خیام نے جو اس کے باپ ابو القاسم
زید کا دوست تھا، اس کا امتحان لیا تھا۔ تذکرہ نگار نے اسے

---

[1] چہار مقالہ نظامی تصحیح علامہ قزوینی ۲۱۰ طبع بریل ۱۳۶۱ھ [2] دیباچہ دیوان خاقانی ۲۲۔ [3] تحفۃ العراقین ۱۸۹،
[4] دیوان ۷۶: [5] دیوان ۵۹۷: [6] دیوان ۳۳۲۔

۵۰۰ھ کا واقعہ بتایا ہے[1]

خیام کے داماد محمد بغدادی سے اس تذکرہ نگار کے تعلقات تھے۔ چنانچہ اس کے حوالے سے خیام کی وفات کا یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک دن بوعلی سینا کی مشہور کتاب "الشفاء" کا وہ حصہ خیام کے زیر مطالعہ تھا، جو الٰہیات سے متعلق ہے۔ دوران مطالعہ میں خیام سونے کا خلال دانتوں میں کرتا جاتا تھا۔ جب "باب واحد والکثیر" پر پہنچا تو خلال ورقوں کے بیچ میں رکھ کر کتاب بند کر دی اور کہا کہ چند سمجھ دار آدمیوں کو بلاؤ۔ میں وصیت کروں گا۔ یہ کہہ کر اٹھا۔ اور نماز شروع کر دی اور کچھ کھایا نہ پیا حتیٰ کہ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد سجدے میں گیا۔ اور یہ دعا مانگی "اے اللہ، تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے امکان تک تجھے پہچانا۔ اب مجھے بخش دے کہ میرا پہچاننا تیری بارگاہ میں میرا وسیلہ ہے"۔ یہی دعا کرتے کرتے روح پرواز کر گئی[2]

ایسا تذکرہ نگار جو خیام کے دوست کا بیٹا اور خیام کے داماد کا دوست یا شناسا تھا۔ اور خود اپنے باپ کے ساتھ خیام کی خدمت میں حاضر بھی ہو چکا تھا، اپنی کتاب "تتمہ صوان الحکمۃ" میں جو ۵۴۹ھ کی تالیف ہے۔ اس عنوان کے تحت خیام کا ذکر کرتا ہے: "الدستور الفیلسوف حجۃ الحق عمر بن ابراہیم الخیام"[3] علامہ سید سلیمان ندوی نے مذکورۂ بالا کتاب کے آخر میں خیام کے وہ تمام رسائل نقل کر دیئے ہیں۔ جو انھیں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ان دو خطوں پر مشتمل ہے، جو قاضی ابوالنصر محمد بن عبدالرحیم النسوی اور خیام نے ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ اس مراسلت کا آغاز (حمد و نعت کے بعد) اس طرح ہوتا ہے[4]۔

"کتب ابو نصر محمد بن عبد الرحیم ـــــ سنۃ ثلاث وسبعین دار المعات الی السید الاجل حجۃ الحق، فیلسوف العالم، نصرۃ الدین سید حکماء المشرق والمغرب ابی الفتح عمر بن ابراہیم الخیامی" الخ

بیہقی نے خیام کے ذکر کے عنوان میں اور اس مراسلت کے مؤلف نے اپنے دیباچے میں عمر خیام کے باپ کا نام "ابراہیم" لکھا ہے۔ نیز خیام کے مذکورۂ بالا رسائل کے مخطوطوں میں اگر خیام کی ولدیت لکھی گئی ہے تو وہ صرف اور فقط ابراہیم ہے۔ کسی ایک شخص نے بھی چاہے وہ خیام کا معاصر ہو یا اس کے بعد کا تذکرہ نگار اس کی ولدیت بجز ابراہیم اور نہیں لکھی۔

اس اتفاق کی پشت پر خود خیام کا اپنا بیان بھی ہے، سید صاحب نے اس کا فارسی رسالہ نقل کیا ہے، جس کا عنوان ہے: "رسالہ بالعجمیۃ لعمر بن الخیام فی کلیات الوجود"۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

چنیں گوید ابوالفتح عمر بن ابراہیم الخیامی الخ

اس کے بعد یہ کہنے کی گنجائش مطلق نہیں رہتی کہ خیام کے باپ کا نام ابراہیم نہیں تھا بلکہ عثمان تھا، اور وہ خاقانی کا چچا تھا، کیونکہ یہ خود خاقانی کی تصریح کے بھی خلاف ہے اور خیام کے بیان سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ اس پر اگر اس حقیقت کا اضافہ کر لیا جائے تو میرے بیان کی مزید تائید ہوگی کہ خیام کا مولد و منشا نیشاپور تھا۔ جو صوبہ خراسان میں واقع ہے، اور خاقانی اور اس کے باپ اور چچا شروان کے باشندے تھے۔ جو صوبہ آذربائجان کا ایک شہر ہے۔ اور ان دونوں میں بہت بُعد ہے

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

---

[1] تتمہ صوان الحکمہ ۱۱۶ طبع لاہور ۱۳۵۱ھ [2] ایضاً [3] ایضاً ۱۱۲، [4] خیام ۳۷۵

ایک شہزادی زار و تنہا

کرشن موہن

غزلوں میں جوبن کی رنگت
اور نظموں میں جیون جس ہے
قطعہ، رباعی، گیت اور دوہے
جن سے مزین سازِ نفس ہے
میرؔ سے لے کر میراؔ جی تک
اُردو میں چاہت کا رس ہے
دلجو ہے اُردو کی خوشبو
جس سے شاد اپنی نس نس ہے
مسجد کا روشن مینارہ
مندر کا پُر نور کلس ہے
ہستی کا ہر رنگ ہے اس میں
سوزِ وفا ہے، کیفِ ہوس ہے
اُردو کا شیدائی رہے گا
جس کو بھی جینے سے مس ہے

لیکن اُردو وقت کے ہاتھوں
آج رہینِ خار و خس ہے
فرقہ پرستی کے طوفاں میں
آج یہ بےچاری بےبس ہے
حسرت ہے اس کی مستی ہے
اس کی ہستی سوزِ قفس ہے
کرشنا موہن، اک شہزادی
زار و تنہا ہے، بےکس ہے

غزل اور نظم

محمد علوی

ابھی تو پل کے جواں ہوئے ہیں
چراغِ شب کیوں دھواں ہوئے ہیں

بجا، بہت دن تھے زندگی کے
مگر وہ سب رائگاں ہوئے ہیں

گلی گلی حسن سے بھری ہے
جگہ جگہ امتحاں ہوئے ہیں

سڑک پہ یہ کون جا رہا ہے
مکان سب کھڑکیاں ہوئے ہیں

جھگڑتے ہیں دوستوں سے علوی
سنا ہے سید سے خاں ہوئے ہیں

▲▲

چھتری دل کا ایک سپاہی

بھاری جسموں کو اُگلتا اک جہاز
گیند کے مانند پاس آتی زمیں
ایک کے بعد ایک کھلتی چھتریاں
اِک پہاڑی سے اُترتی بکریاں
تیز، زہریلی ہوا چلتی ہوئی
ایک بستی آگ میں جلتی ہوئی
سوچتا ہوں لوٹ ہی جاؤں مگر
گر رہا ہوں، لوٹ کے جاؤں کدھر!

▲

نظمیں

مغنی تبسم

مجھے یاد ہے

ہجے یاد ہے تری گفتگو جو فضا میں تھی
مجھے یاد ہے تری آرزو
ری آرزو کے قریب ہی
ری زندگی تھی کھڑی ہوئی
ے راستوں میں ہر ایک سمت رکاوٹیں تھی آئی ہوئی

مجھے یاد ہے
ہ انا بدست سوال بھی
د ہ خیال بھی
لوئی حادثہ جو شریک ہو تو سفر کٹے
لہ یہ دائرہ تو قفس ہے جس کا محیط مرگِ دوام ہے
مجھے زندگی کا شرارِ جستہ عزیز تھا
لہ میں دائرے سے نکل گیا
تری آرزو سے خجل ہوں میں
مجھے اپنے عہد کا پاس کچھ بھی نہیں رہا

▲▲

آمنہ ابوالحسن

خوف

میرے ذہن کی ہزاروں آنکھیں
کھلے دریچوں کی طرح
تازہ ہوا لے رہی ہیں
اور میرے وجود کا گھنا درخت
بھر بھر پیالے روشنی کے
اپنے اندر انڈیل رہا ہے
پھر بھی تاریکی سے خائف ہے

▲▲

سلیٹ

زندگی ایک سلیٹ ہے گویا
جس پر وقت کا کن کھجورا
اپنی بے حد و حساب ٹانگوں سے
گزرنے کی لکیریں کھینچ رہا ہے
اور اس چال پر
جانے کون ہے جو ہنس رہا ہے مگر
اس کی ہنسی کن کھجورے کو سنائی دیتی نہیں
جس کی ٹانگوں میں کان نہیں
صرف جنبش ہے

▲▲

غزلیں

مظفر حنفی

سُوراخ کشتی، مُنہ زور دریا
تسلیم، چاہے جس اور دریا

یہ تیسرا کون اپنے مِلن میں
سنگم کے نیچے اک چور دریا

اپنی طرف سے ہم بھی گریزاں
بوسیدہ ساحل، گھنگھور دریا

جنگل میں منگل، منگل میں کیتو
اک مور شعلہ، اک مور دریا

جبّار موجیں، قہّار موجیں
مُنہ زور دریا، پُرشور دریا

یوں بھی مظفر دیکھے گئے ہیں
کانٹے میں طعمہ، لم ڈور دریا

▲▲

حامدی کاشمیری

ریگ زار آنکھوں میں بے خوابی کے ہیں
دن یہی بستی کی غرقابی کے ہیں

پھول سطحِ آب پر کھلنے لگے
ہاں یہی ایّام بے تابی کے ہیں

جم رہی ہیں تن پہ کائی کی تہیں
خواب آنکھوں میں گہر یابی کے ہیں

وادیاں اب برف سے ڈھک جائیں گی
شب کو شب، دن بھی گراں خوابی کے ہیں

ہے زمیں کی تیرگی کا سامنا
مرحلے آگے فلک تابی کے ہیں

کیوں ہوائیں آگ برساتی نہیں
دُور تک آثار شادابی کے ہیں

▲▲

مدحت الاختر

ایک ہم صورت فرشتہ رات بھر کہتا رہا
داستاں سنتا نہ تھا میں، مگر کہتا رہا

آج آئے درد کی شاخوں پہ رسوائی کے پھول
میں درختوں کو ابھی تک بے ثمر کہتا رہا

یاد اس کی آسمانوں پر پہنچ کر آئی ہے
ایک پاگل جو، کہاں ہے میرا گھر کہتا رہا

اب تو وہ بھی دشمنوں کی دسترس میں جا چکا
کیا اسی دن کے لیے صحرا کو گھر کہتا رہا

جو بزرگوں نے سنائے اور تھک کر سو گئے
میں وہی قصے بالفاظِ دگر کہتا رہا!

▲▲

رحمت کا ہاتھ

بلراج ورما

ساوتری کو علم تھا کہ آج یم راج اُس کے پتی کی جان لینے آئیں گے۔ اُس نے ضد کر کے ستیہ وان کو راضی کر لیا کہ آج وہ جنگل لکڑیاں لینے اکیلا نہیں جائے گا وہ بھی اس کے ساتھ چلے گی۔ پتی نے بہت سمجھایا کہ راج محلوں میں پلی راجکماری کے لیے جنگلوں کی خاک بلا وجہ چھانکنا مناسب نہیں ہوگا۔ مگر جب ساوتری نے کہا کہ وہ اب راجکماری نہیں ہے ایک لکڑہارے کی بیوی ہے، تو وہ لاچار ہو گیا۔

بوڑھے ماں باپ سے اجازت لے کر پتنی پتنی جنگل کی طرف چل دئیے۔

لکڑیاں کاٹتے کاٹتے جب ستیہ وان تھک گیا تو پتنی کی پیار بھری گود میں ذرا دم لینے لیٹ گیا۔ چند ہی منٹوں میں اُسے گہری نیند آگئی۔ پتی کو گود میں لٹائے لٹائے وہ یم راج کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ تشریف لے آئے۔

یم راج نے کہا "بالکے تم اس مرتبہ دیہ سے ... الگ ہو جاؤ۔"

ساوتری نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا دھرم راج کہ ان کی بجائے آپ مجھے لے جائیں۔ ان کے ماتا پتا بوڑھے اپاہج اور اندھے ہیں انھیں بہت دُکھ ہوگا۔"

یم راج نے جواب دیا "تمھیں تو ابھی سو سال اور جینا ہے بالکے تمھیں کیسے لے جا سکتا ہوں۔"

"پتی کے بغیر میں اتنے سال کیسے کاٹوں گی۔"

"تم پوتر آتما ہو بالکے۔ جبھی تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ تم اپنے پتی کی زندگی کے سوا جو چاہو، جو ور دان مانگو میں دینے کو تیار ہوں۔"

"آپ بڑے دیالو ہیں دھرم راج۔ مجھے ان کے سوا کچھ نہیں چاہیے ——— ممکن ہو تو میرے ساس سسر کی آنکھوں کی روشنی انھیں لوٹا دیں۔"

"تتھا استو" دھرم راج کا بس اتنا کہنا تھا کہ دور کٹیا میں بیٹھے ستیہ وان کے ماتا پتا ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ساوتری نے کہا "وہ اندھے لاچار تھے تو اپنے بھاگیہ سے کسی طرح سمجھوتہ کیے بیٹھے تھے۔ اب وہ اندھے نہیں رہے، دُنیا جہان کو دیکھ سکتے ہیں۔ اب تو انھیں اپنی اکلوتی اولاد کو اس طرح اچانک کھو دینے سے اور بھی دُکھ ہوگا۔"

"تو پھر؟" بھولے دھرم راج اچنبے میں پڑ گئے

"کیا یہ نہیں ہو سکتا دھرم راج کہ آپ انھیں اُن کا چھنا ہوا راج پاٹھ لوٹا دیں۔"

یم راج نے پھر کہا "تتھا استو" ——— یعنی ایسا ہی ہوگا۔

اور دُور بیٹھے اُس راجہ کا من جس نے ستیہ وان کے بھولے پتا سے زبردستی اُن کی حکومت ہتھیا لی تھی اور پتی پتنی کو اندھا کر کے در در کا بھکاری بنا دیا تھا اپنے گناہ

کی جہالت سے بوجھل ہو اُٹھا اور اُسی وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُن کی امانت لوٹانے چل پڑا۔

ساوتری اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تاکہ دھرم راج اپنا کام کرسکیں ـــــ ستیہ وان کی آتما کو شریر سے آزاد کرا کے وہ لوٹنے لگے تو وہ اُن کے قدموں سے چپٹ گئی۔

"دیو آپ بڑے دیالو ہیں۔ آپ نے میرے بوڑھے ساس سسر پر اتنا بڑا اُپکار کیا۔ بیٹے کے یوں چھن جانے کا غم اب اُن کے لیے اتنا تیور نہ رہے گا ـــ مگر مجھ ابھاگن کا بھی تو کچھ کیجیے، میری شادی ہوئے سال بھر ہوگیا ہے مگر میری گود ابھی بھی خالی ہے۔ پتی کی کوئی بھی نشانی میرے پاس نہیں۔ جس کے سہارے میں پہاڑ سی یہ زندگی گزار سکوں۔ سو سال کی آیو تو میرے لیے ابھی شاپ بن جائے گی۔"

ساوتری کی یہ انوکھی مانگ بھولے دھرم راج کی سمجھ میں نہ آئی آدیش میں آکر بولے "بیٹی ہم وردان دیتے ہیں کہ تو دودھوں نہائے اور پوتوں پھلے۔"

دیو کا وردان پاکر ستی سادھوی ایک دم کر رد ھست ہو اُٹھی اور بپھر کر چلائی "آپ پتا ہو کر بیٹی کو یہ وردان دے رہے ہیں۔ پتی نہیں ہوگا تو بچے کہاں سے آئیں گے۔ یہ وردان کہاں ہوا۔ یہ تو ایک گالی ہوگئی ایک ابھاگے دودھوا کے لیے۔"

دھرم راج چونکے۔ اپنی غلطی کا آبھاس پاتے ہی مسکرا دیئے۔

"تو نے ہمیں آج ہرا دیا بیٹی لے آج ہم خالی ہاتھ ہی لوٹے جاتے ہیں۔"

دھرم راج یہ کہہ کر لپت ہوگئے۔

اِس طرح ساوتری اپنے پتی کو موت کے مُنہ سے چھڑا لائی۔ دیوتاؤں نے آکاش سے شردھا کے پھول برسائے۔

دیو مالا میں کتنی ہی کتھائیں ہیں ایسی پتی ورتا دیویوں کی جن سے بھگوان بھی خوف کھاتے تھے۔

پنڈت رادھے شیام کتھا واچک نے وارتالاپ جاری رکھتے ہوئے کہا: آج بھی ہم سچی پتی ورتا استری کو ساوتری ایسی سادھوی کہہ کر اُس کا آدر ستکار کرتے ہیں۔ ایسی استریاں ہر یُگ میں ہوتی ہیں کتنی ہی کہانیاں ہیں ایسی عورتوں کی جنھوں نے جب کسی مرد کو ایک بار من سے اپنا لیا تو اُسی کی ہوگئیں۔ سیتا، اہلیہ، گارگی، دامودری، دمینتی بہُرا نے دیو مالائی نام ہیں، سنجوگتا تو ہماری جانی پہچانی اِتہاسک گاتھا ہے۔ ایسی کتنی ہی عورتوں کے قصے ہمارے آج کے ساہتیہ میں بھی ہر سُو بکھرے پڑے ہیں جیسے شرت کی پیراج۔ آپ شانتی کو نہیں جانتے۔ شانتی تاریخ یا کسی دیو مالائی کتھا کا کردار نہیں ہے۔ ایک عام سیدھی سادھی عورت کو ساہتیہ میں کون جگہ دے گا ـــــ

مگر شانتی کوئی معمول عورت نہ تھی۔ وہ دیو مالا ہی کی ایک شہزادی تھی۔ جو پیدا البتہ ہمارے آپ کے یُگ میں ہی ہوئی اور اسی یُگ کے ایک ایسے معمولی آدمی کے لیے مرمٹی جسے اُس نے من دھرم اور روچن سے سوامی سویکار کرلیا تھا۔

آزاد یُگ کے اِس دور میں شانتی کی کہانی میں آپ کو وہ رَس نہ ملے گا جو سعادت کی غیر سعادت مند عورتوں کے تذکروں میں ملتا ہے۔ اُن عورتوں کا بھی اپنا ایک مقام ہے۔ میں اُن کی حقیقت کو نہیں جھٹلاتا۔ عفت و عصمت میرے نزدیک بڑے اچھے اور پاکیزہ وصف ہیں مگر میں کچلی ہوئی عصمتوں کو بھی شفقت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی ہوں۔

اچھی نیک دل خدمت گزار اور شوہر سے محبت کرنے والی عورت جو ہر قسم کی محرومی کے باوجود عزت و ناموس کی چادر اوڑھے پڑی رہتی ہے جھوٹی یا غیر فطری شے نہیں۔ ایک سچائی ہے۔

عورت بیوی بن جاتی ہے تو شوہر کی کمائی پر اُس کا اتنا ہی حق ہو جاتا ہے جتنا خود کمانے والے کا۔ ایسی عورت کو مردک دستِ نگر کہنا ٹھیک نہیں۔ یگوں سے چلی آرہی ایک عظیم قدر

ہے جسے محض نبھا نہ سکنے کی وجہ سے ہم غلط رنگ میں دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شادی کرنا اور نبھانا بڑی ہمت بڑے حوصلے اور استقلال کا کام ہے۔ یہ بزدلی یا پست ہمتی کا راستہ نہیں۔ بلندیوں کی طرف جاتی ہوئی ایک عظیم شاہراہ ہے جس کے چاروں طرف زندگی کی اپسرائیں اپنے تمام تر رنگوں کی چنریاں اوڑھے ناچتی گاتی گنگناتی دکھائی دیتی ہیں۔

مگر میں کہاں بھٹک گیا۔ میں تو بس سیدھے سادے الفاظ میں آپ کو شانتی اور امرناتھ کی جیون یاترا کی کچھ جھلکیاں دکھانا چاہتا ہوں جو میں نے دیکھی ہیں اور متاثر ہوا ہوں۔ اپنی اور آپ کی زہریلی زندگیوں میں تھوڑا شہد تھوڑا امرت گھول دوں اور آپ کو کسی طرح یقین نہ دلا سکوں تو کم از کم بتا ہی سکوں کہ ساوتری آج بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایک آدرش جو ہر یگ میں عزت و احترام سے دیکھا جائے گا۔

آئیے اس کہانی کو وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں وہ ختم ہوتی ہے شانتی منتر...... شانتی ...... شانتی... شانتی اوم۔

اے دکھوں کے ہرنے والے پربھو۔ ہوا پر تھوی اور جل کے بغیر جو انیک پدارتھ ہیں اور ہمارے اوپر جو آکاش ہے اور ہماری دھرتی کے جو گیانی جوتش اور براہمنڈ کے جو دیوتا ہیں وہ سب ہمارے سکھ کاری ہوں اور ہمارے چاروں طرف شانتی کا باس ہو۔ اوم ..... شانتی ..... شانتی ...... شانتی ..... اوم ——

مگر شانتی کہاں تھی۔ اُس کا سارا شریر جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ دایاں بازو البتہ جھلس تو بری طرح گیا تھا۔ مگر بھسم ابھی نہیں ہوا تھا۔ ڈھیروں گھی کی آہوتیوں کے باوجود اگنی ڈھنگ سے بھڑک نہ پائی تھی۔ تازہ جنگلی لکڑی جس کا ریشہ ریشہ پانی سے شرابور تھا جلتی بھی تو کیسے۔

ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ آگ کو پوری طرح سے بھڑکا لینے کے لیے مٹی کا تیل ڈالا جائے مگر امرناتھ نہ مانا اور کچھ سوکھا اس دیو استھان میں نہیں ہے تو مجھے ہی اس کے ساتھ جلا دو۔"

مشورہ دینے والے اور وہ مداترین بنیا جو گردو نواح میں مٹی کے تیل کا واحد بیوپاری تھا اور سبھی دوا جو بلاشبہ تیل کا پورا ٹین دینے کو تیار ہو گیا تھا، چپ ہو گئے۔

برف بدستور پڑ رہی تھی۔

بھگوان کیدارناتھ کے مندر میں ایک بڑا پریوار بچے کا نام سنسکار کرنے آیا ہوا تھا۔ ضروری تھا کہ شانتی کا داہ سنسکار پورا ہو جائے، نہیں تو ان بیچاروں کے شگن میں بادھا پڑنے کا ڈر تھا —— موت کے سامنے کس کا بس چلتا ہے۔ وہ لوگ بھی چپ تھے۔

"کیا جگہ چنی ہے بھاگیہ وتی نے مرنے کے لیے۔"

"بڑے بھاگیہ ہوتے ہیں بھیا، جبھی کوئی اس طرح جاتا ہے۔"

خوشی خوشی دیو استھانوں کی یاترا کرنے آئی تھی پتی اور پریوار کے ساتھ۔ ہری دوار سے ہوتے ہوئے وہ لوگ بدری ناتھ گئے تھے اور اب لوٹتی بار کیدارناتھ آئے تھے۔

مندر سے ایک آدھ میل اُدھر ہی گھوڑے کے اچانک پھسل جانے سے امرناتھ نیچے کھائی میں گر گیا تھا اور پھر جو لڑھکا تو لڑھکتا ہی چلا گیا نیچے ہی نیچے۔ ساتھ میں درجنوں لوگ تھے مگر اُن میں سے ابھی کوئی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ شانتی جو اپنی باری سے اب پیدل چل رہی تھی دیکھتے ہی دیکھتے پتی کی جانب بھاگی اور اُسی کی طرح نیچے کھڈ میں لڑھکتی چلی گئی۔ دونوں تقریباً ایک ساتھ ایک بڑے پیڑ کے تنے سے جا لگے۔

حیرت تھی کہ امرناتھ کو تو چوٹیں آئی تھیں مگر شانتی کے نرم و نازک جسم پر ایک معمولی خراش بھی نہ آئی تھی۔ منزل پر پہنچ کر رات بھر وہ پتی کے جسم کو سہلاتی اور اُس کی خراشوں پر مرہم کا لیپ کرتی رہی۔

پھر جو سوئی تو اُٹھی ہی نہیں ——

" یہ اُس کا بھلا نا انداز ہے۔ اُس کے جسم پر ایک معمولی خراش بھی نہ آئی تھی۔ ایسا ہوتا ہے [illegible]

کرتا......

یہ مرنے کا کیا ڈھنگ ہے۔ اُس نے زندگی بھر میری سیوا کی مگر آخری بار بھی مجھے اپنے لیے کچھ کرنے کا موقعہ نہ دیا۔ میرے سارے زخم اُس نے اپنے اوپر لے لیے۔ چُپ چاپ۔ اس طرح کہ کسی کو کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ مجھے تو یہ چند عارضی خراشیں ہی آئی ہیں وہ تو ظاہر ہے کہ اندر ہی اندر ٹوٹ گئی تھی —— اور ہم راج آئے تو میری جگہ خود اُن کے ساتھ چل دی .....!

"حیرت ہے کہ اس بھاگیہ وتی کا دایاں بازو جل ہی نہیں رہا"۔

"دیکھتے نہیں ہو پنڈت جی، دیدی کے بازو میں سہاگ چوڑی ہے"۔ شانتی کی چھوٹی بہن اندو چتا کے قریب کھڑی روئے جا رہی تھی۔

امرناتھ نے شانتی کی ارتھی پر سے ایک بھی زیور نہ اتارنے دیا تھا۔ "یہ سب اُسی کے ہیں اُسی کے ساتھ جائیں گے"۔

بیس تیس تولہ سونا اس مہنگائی کے زمانہ میں دس پندرہ ہزار کی چیز تھی۔ پر مگر جو اپنا نہیں اسے لینا کیا مناسب ہے —— جس کے لیے یہ سب تھا جب وہی نہیں رہی تو میں یہ سب لے کر کیا کروں گا۔

—— "یہی سب کچھ تو پیچھے نہیں چھوڑ گئی وہ"۔

لوگ جو وہاں جمع تھے اور امرناتھ کو جانتے تھے۔ جانتے تھے کہ امرناتھ کوئی جذباتی یا احمق قسم کا رئیس نہیں ہے۔ بڑے اصولوں کا آدمی ہے۔ مگر آج سب حیران تھے۔

اندو نے دیدی کے کپڑے اتار کر نہلانا چاہا تھا مگر امرناتھ نے کہا تھا "نہیں اندو بہت سردی ہے۔ بے چاری کے کپڑے نہ اتارو۔ گنگا میا کے جل میں ہر قسم کی میل دھو ڈالنے کی شکتی ہے وہ تو صاف ستھری آتما تھی"۔

"آج دادا کیسی باتیں کر رہے ہیں"۔ مگر اندو مان گئی تھی۔

آخر جب عناصر کا غضب کم ہوتا دکھائی نہ دیا تو امرناتھ نے وہ ادھ جلا بازو بیوی کی سلگتی چتا سے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ ایک بار اُسے ہونٹوں سے لگایا پھر ماتھے سے اور پھر جیسے آہوتی دیتے ہوئے گنگا میں بہا دیا

"لو میّا سنبھالو اپنی بیٹی"۔

سہاگن کا ہاتھ تھا جلا نہ تھا کتنے ہی قصے ہیں ہماری دیو مالا میں اُن دیو آتماؤں کے جو شریر ساتھ بھسم ہو جانے پر بھی دھام لوٹیں۔

"میں نے کہا تھا نا" پنڈت رادھے شیام کتھا واچک نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ شانتی کی کہانی بھی ایک دیو مالائی کہانی ہے۔

ابھی کل کی بات ہے، سپنے میں یم راج آئے تھے

"کیا ارادہ ہے لالہ امرناتھ۔ بھرپور جئے ہو اب چلو گے نہیں"۔

"نہیں دیوا ابھی نہیں"۔

"کیوں امرناتھ"

"میں اسے" ساتھ لیٹی ہوئی شانتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "بیاہ کر لایا تھا اور آپ کی قسم کھا کر اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے اپنے ہاتھوں وداع کروں گا"۔

"مگر اس کی عمر تو ابھی ہے"۔

"تو پھر میں مجبور ہوں دیو"۔

"تمہاری مرضی امرناتھ۔ ہم نے سوچا، تم نے سب کچھ تو کر لیا مزدوری۔ نوکری۔ دوکانداری چھوٹا بڑا ہر قسم کا بیوپار۔ روپے پر روپیہ پیدا ہوئے تھے۔ آج تمہارے ملازم بھی غالیچوں پر سوتے ہیں۔ ایک کھیتی رہ گئی تھی وہ ہوس بھی تم نے پوری کر لی اب اور کیا کرنے کا ارادہ ہے"۔

"بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ ایک بیٹا ہے نیک سیرت سیدھا سادہ بچہ۔ اسے بیوپار کے داؤ پیچ اور اصول سمجھا دوں"۔ امرناتھ نے شرارت سے آنکھ میچ کر دیو کو جھٹلایا۔

"تمہاری مرضی درست، مگر دیوی کے بعد"۔

دھرم راج نے اُسے درست کہا تھا اس کا حوصلہ

بڑھ گیا۔ نہیں اِن کے بعد بھی نہیں۔ بابوجی بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اپنے سامنے میرا مرنا برداشت نہ کر سکیں گے، پاگل ہو جائیں گے۔

"کوئی کسی کے لیے پاگل نہیں ہوتا امرناتھ کیوں ہوتا تو پربھو کے لیے دُنیا چلانا محال ہو جاتا۔ خیر آج ہم ایسے ہی لوٹ جاتے ہیں۔ آج ہم محض یہ جاننے کے لیے نکلے تھے کہ کوئی اپنی مرضی سے بھی پربھو دھام جانا چاہتا ہے کہ نہیں ــــ دیکھتے ہیں آج ایسا کوئی جیو بھی نہیں۔"

وہ الٰہی نُور جس سے کمرہ ایکا ایک جگمگا اُٹھا تھا نہ جانے ایکا ایک کہاں گپت ہو گیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے سرکنے سے شانتی کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔

"ارے یہ کیا تمہارا شریر تو پسینے سے جیسے نہا سا گیا ہے۔" شانتی نے بیڈ سوچ دبا کر کمرہ منور کر دیا تھا۔

"یہ تمہارے چہرہ پر ایسا بھیانک...... ڈر گئے تھے ــــ سو بار کہا ہے کہ ہاتھ چھاتی پر رکھ کر نہ سویا کرو۔"

"تو پھر کہاں رکھا کروں۔"

شانتی شرما گئی تھی۔

پچاس سال کی اِس عُمر میں بھی اس عورت کو شرمانا آتا تھا۔

"شرم دھیا کی دیوی ہے میری بہو"..... بابوجی کہا کرتے۔

"تو سدا سہاگن رہے" مرتی ماں نے وردان دیا تھا۔ اس دُنیا سے اپنے سچّے دھام کو لوٹتے ہوئے یاتریوں کے آشیرواد میں بڑی ستّا ہوتی ہے۔

"سوتے سوتے اچانک کاروبار کا خیال آگیا تھا۔" امرناتھ نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"کیا کہیں گھاٹے کا خطرہ ہے؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مگر اپنا شیام بیچارہ بڑا سیدھا بچہ ہے۔"

"اِس عمر میں سبھی ایسے ہوتے ہیں۔ تم ہی کون اتنے ہوشیار تھے۔"

"سو تو ہے، مگر میرے پاس کھونے، گنوانے کے لیے کچھ نہ تھا اُس کے پاس لاکھوں ہیں۔"

"وہ تمہارا بیٹا ہے اپنی اولاد سب کو لولی لگتی ہے۔ کون جانے وقت آنے پر وہ تم سے بھی دو قدم آگے نکلے۔"

"مگر!!"

"مگر وگر کچھ نہیں جی۔ ابھی مَیں زندہ ہوں۔ بھُولو نہیں کہ مَیں بھی اس کی ماں ہوں ــــ ایک یُگ بڑا ہے شامو کو بھی تیار کر لینا۔"

ــــ ایک یُگ ــــ

پورا ایک یُگ دان کر دیا تھا اُس نے اُس رات۔

کیدارناتھ مندر کے بڑے پُجاری جی بھگوان کی آرتی اُتار کر اب شانتی منتر کا جاپ کر رہے تھے۔ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ پرارتھناؤں میں، بھگوان کی ارادھنا میں بڑی شکتی ہوتی ہے۔ پرارتھنا کے پنکھ پا کر آتما سورگ کی اور اُڑنے لگتی ہے۔ اُس نے دیکھا شانتی کی آتما مُسکراتی اور آنکھوں سے اسیم پیار کی برکھا کرتی ہوئی پربھو دھام کی اور اُڑی جا رہی ہے اُوپر ہی اُوپر۔ اُسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ شانتی جس نے دھرتی پر بھی اپنا ایک سورگ بنا رکھا تھا۔ سورگ ہی کی کوئی اپسرا تھی ــــ

مگر کل اور آج میں بڑا فرق تھا۔

کل وہ میرے گھر تھی۔ آج اپنے گھر چلی گئی ہے۔

ــــ یہ آتمائیں روز روز گھر کیسا بدلتی رہتی ہیں۔

شانتی نے اپنی مختصر سی زندگی میں کتنے ہی گھر بدلے تھے۔ متھرا میں اپنے ماں باپ کا گھر جس کے کھلے آنگن میں کھیل کود کر وہ بڑی ہوئی، پھر آگرہ میں سسرال کا گھر۔ جہاں امرناتھ اُسے بیاہ کر لایا تھا۔ پھر کلکتہ مدراس پونا بمبئی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے۔ پیار کی الوٹ ڈور میں بندھی وہ سوامی کے ساتھ ہر اک بڑھتا بڑھ ڈگر پہ چلی تھی اور ہر سال کو ٹھری کو اُس

نے پیا کا گھر جان کر سجایا سنوارا تھا۔ زندگی کی اولین لڑائیوں میں [illegible] چھوٹے گھروندے امرناتھ کی پناہ گاہیں بنے۔ زندگی نے اُسے کتنی بار پچھاڑا کتنی ہی بار وہ گھایل ہوا مگر جب اور جیسے ہی وہ تھک ہار کر گھر لوٹا شانتی نے اپنے پیار کے مرہم سے اُس کے سارے زخم بھر دیے۔

زندگی پر چھائے ہر گہرے اندھیرے میں وہ ایک زندہ وتابندہ ستارے کی طرح چمکتی، جگمگاتی تھی۔ امرناتھ جب بھی اُسے دیکھتا اُسے لگتا کہ دنیا اتنی بُری نہیں جتنی دکھائی دیتی ہے۔

نہ جانے اُس کے بات کہنے کے ڈھنگ میں ایسا کون سا انوکھا وصف تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ محض بہلانے اور ڈھارس دینے کے لیے یہ بات کہہ رہی ہے اُس کی بات ہمیشہ سچی لگتی۔ اِن چھوٹی چھوٹی باتوں کے رس میں زندگی کی ساری اُلجھنیں، گرہیں اپنے آپ کھلنے لگتیں اور گہرے کالے بادلوں سے گھری صبحیں بھی جگمگاتی مسکراتی دکھائی دیتیں۔

چالیس برس پہلے جب اس کا بیاہ ہوا تھا تو آگرہ کے بنیوں کے محلے میں اُس کی بہو کی سُندرتا کی دھوم مچ گئی تھی۔

”واہ کیا پیاری بھولی بھالی صورت پائی ہے۔“

”ساکشات لکشمی کا رُوپ۔“

”لگتا ہے بھگوان نے فرصت کے اوقات میں خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے یہ حُسن کا پیکر۔“

”یہ لڑکی ہے کہ مورت۔ دیکھو تو کیسی گڑیا سی لگتی ہے۔“

”امرناتھ کا بھاگیہ کھل گیا۔“

”سُنا ہے ڈھیر سا پیسہ بھی لائی ہے۔“

”مگر ایسے پیسوں سے کب کسی کا گزر ہوا ہے پیارے۔ دُعا کرو کہ یہ نکھٹو خود سے بھی کچھ کھانے کمانے لگ جائے۔ نہیں تو ہاتھوں کی مہندی اُترتے اُترتے دُلہن کا یہ سارا

رنگ رُوپ مٹی ہو جائے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو بھیا ایک دھیلا بھی تو کم بخت نہیں کماتا بس اکھاڑے میں بیٹھا صحت بنایا کرتا ہے۔“

”پیسہ تو پیسے ہی سے کمایا جاتا ہے۔ پیسے ہوتے تو لالہ جی بیٹے کو دکان نہ کھلوا دیتے۔ بنیے کا بیٹا تو تم جانو دکان پر ہی سجتا ہے۔“

جب چند ہی دنوں بعد کلکتہ سے نوکری کا بلاوا آگیا تو امتی نے چہکتے ہوئے کہا ”دیکھا کتنی بھاگیہ والی ہے میری شانو بھابی۔ آتے ہی بھیا کی تقدیر کے دوار کھول دیے۔“

”تیس روپیہ مہینہ اور کلکتہ جیسا بے مروت شہر۔ بھئی میں تو مشورہ نہ دوں گا کہ لڑکے کو اتنی دُور بھیجا جائے“ تاؤ جی نے چھوٹے بھائی کو مشورہ دیا۔

”آپ ٹھیک کہتے ہیں بھائی صاحب۔ تیس میں اپنا پیٹ ہی پال پائے گا۔ بہو بیچاری کیا ادھر اکیلی رہے گی۔“

”لڑکا اکیلا جانے کو راضی ہو جائے گا۔“

راضی کیسے نہیں ہو گا۔ بہو کو وہاں لے جا کر کیا کرے گا۔ کہاں رہیں گے دو جنے۔ کیا کھائیں گے۔ کیا پہنیں گے اور پھر ہم نے بیٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔“

شانتی نے کہا ”تیس تو بہت ہوتے ہیں میں تمہارے ساتھ ان سے آدھے میں بھی رہ سکتی ہوں۔ دو چار سال تو ہمیں کپڑے لتّے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ تب تک تمہاری ترقی ہو ہی جائے گی۔ ساتھ رہوں گی تو دو جنوں کی تقدیر کام کرے گی۔ میں بڑی بھاگیہ والی ہوں۔“

”سچ!!“

”تو کیا جھوٹ۔ تمہارے ایسا سوامی پانا اس سے بڑا بھاگیہ کیا ہو گا کسی کا۔“

تیس روپے آگرہ میں رقم ہو سکتے ہیں کلکتہ میں نہیں۔ پھر بھی امرناتھ شانتی کو ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا۔

"سالا جنون ہے"
"نرن مُریدِ!"
"ارے نہیں بھئی خون میں حرارت ہے چھوکرے
ے۔ اکھاڑے کا پلا ہوا اُبھر جوان ہے، عمر بھی تو دیکھو"
"ایسی سُندر مجورو چھوڑ کر جانا بھی تو سہل نہیں بھیّا"
"رام سیتا کی جوڑی ہے میرے بھیّا بھابھی کی" اِتی کی
یشی کی واقعی کوئی سیانہ تھی۔
امرناتھ نے سب کی سُنی۔ سب سچ کہہ رہے تھے، مگر
ب سے بڑا سچ تھا اُس کی اپنی بھرپور جوانی اور شانتی
بے پناہ حُسن۔
"اکیلا رہوں گا تو دن رات تمہارے ہی بارے
ں سوچتا رہوں گا۔ ٹھیک سے کام بھی نہ کر سکوں گا۔
م پاس رہو گی تو میری ہمت بندھاؤ گی۔ کام میں من لگے
اور کام اچھا ہوگا۔ کام اچھا ہوگا تبھی تو مالک لوگ خوش
ں۔ مالک خوش نہ ہوں گے تو ترقی کیوں کر پاؤں گا"
"ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے"
ؤ جی اکثر کہا کرتے تھے۔
صداقت کیا ہے وہ نہیں جانتا، مگر تاؤ جی کی بات
ینًا سچی تھی اتنا تجربہ ہے اُن کا۔
ترقی۔ ترقی۔ ترقی وہ ضرور ترقی کرے گا۔ شانتی
س کے پاؤں کی بیڑی نہیں اُس کی پریرنا بنے گی۔ اُس کی
سزوری نہیں اُس کی طاقت بنے گی۔ ہر بڑے آدمی...
ی وہی مانتا ہے جو وہ ماننا چاہتا ہے۔
جانے سے پہلے شانتی نے اپنے سارے زیور اُتار کر
ں کی جھولی میں ڈال دیے۔
"یہ اِتی کے لیے ہیں اماں، میں نے منگل سوتر اور ہاتھ
، وہ دو چوڑیاں رکھ لی ہیں۔ جو کافی ہیں"

کلکتہ میں انھیں ایک ہی ہفتہ دھرم شالہ میں رہنا پڑا۔
ریل گیا۔
"یہ سالا بھی کوئی گھر ہے"

"گھر کیوں نہیں ہے جی۔ تم ہو۔ میں ہوں۔ گھر میں اور
کیا ہوتا ہے"
"تمہارے پتا کا گھر"
"بہت بڑا تھا مگر ہم بھی تو بہت جنے تھے۔ چھ بھائی
بہن۔ نہیں دادا جی تاؤ جی اور......... یہاں تم ہو۔ میں
ہوں اور ہمارے سر پر بھگوان کا سایہ ہے"
"کبھی کبھی تو تم سیتا ساوتری ایسی دقیانوسی باتیں
کرنے لگتی ہو"
"تم اسے دقیانوسی کہتے ہو کیا تم ان دیویوں کی حقیقت
سے منکر ہو"
منکر کیوں کر ہوتا وہ، ہر یُگ کا آدمی یہ مانتا ہے۔
"پتنی پتی کی سب سے سچی صلاح کار ہوتی ہے"
تاؤ جی نے چوری سے اسے سو روپے تھماتے ہوئے کہا تھا
"میں سب کے سامنے کچھ بھی کہوں۔ کوئی کچھ کہے، مگر شرمانا
نہیں جھجکنا بھی نہیں، بہو کو ساتھ ہی لے کر جانا میں نے
اس لڑکی کو ایک نظر دیکھ کر ہی پہچان لیا ہے۔ یہ تمہاری
سب سے بڑی طاقت ثابت ہوگی"۔ تاؤ جی کہتے جہان
ہیں امرناتھ کے دل میں اپنے والد کے بڑے بھائی کے
لیے اسیم شردھا تھی۔
نوکری کرتے اسے چھ مہینے ہو گئے تھے۔ تنخواہ باقاعدہ
ملتی تھی مگر آگے ترقی کا کوئی وسیلہ نظر نہ آتا تھا۔ کولہو کے
بیل کی طرح صبح و شام وہ پیدل ہی دفتر آتا جاتا ایک دن بہت
تھک کر لیٹ گیا۔
شانتی نے اس کے منہ پر ماتھے پر سر پر گیلا تولیا ملا۔ جوتے
اُتار کر اس کے پاؤں کو بھی ٹھنڈک پہنچائی اور جب اُسے یقین
ہو گیا کہ اب وہ کچھ سُن سکنے کے موڈ میں ہے تو بولی "ماں
نے کہا تھا کہ تمہارا مرد جو کمائے اُس میں سے کچھ بچا کر ضرور رکھنا۔
تمہارے تیس روپوں میں سے میں نے ہر مہینہ پانچ کے حساب
سے پورے تیس بچا رکھے ہیں۔ گھر سے شگن کے بھی کچھ پیسے
میرے پاس ہیں۔ کُل ملا کر پچاس روپے میرے پاس ہیں۔
چالیس بیالیس کا اچھا خاصا سائیکل آ جاتا ہے۔ تمہارا اس طرح

ڈھوپ میں روز چھ چھ میل آنا جانا مجھے اچھا نہیں لگتا جبکہ میں خود سارا دن آرام سے پلنگ پر لیٹی رہتی ہوں۔ سائیکل ہو گی تو ساتھ میں گھر کا پکا کھانا بھی ڈھنگ سے ڈبے میں بند کر کے دفتر لے جا سکو گے۔ وقت پر آؤ گے وقت پر جاؤ گے۔"

سائیکل آ گئی ——

پھر ایک دن اُس نے کہا "جب تک تم باہر رہتے ہو میرا بیکار من بلا وجہ بے چین سا رہتا ہے۔ سوچتی ہوں کیوں نہ تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ مشین تو اپنے پاس ہے ہی اگر تم اجازت دو تو کیوں نہ تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔ پاس پڑوس کے لوگوں کے دو چار کپڑے ہی سی دیا کروں کبھی کبھی۔"

"اپنے جیتے جی میں تمھیں غیروں کا کام نہ کرنے دوں گا۔"

"یہ دوسروں کا کام تھوڑے ہی ہو گا۔ اپنا کام ہو گا — بیوپار ہو گا۔ ہم بنیا لوگ ہیں بیوپار ہمارا دھرم ہے۔ یہیں ادھر آ کے آٹھ دس مہینے ہو گئے ہیں مگر اس بیچ ہم آگرہ دو بار ہی دس دس روپے بھیج پائے۔ وہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم سے اتنے عرصہ میں اتنا ہی بن پڑا۔"

"تم نے اپنے سارے زیور، سارا جہیز تو دے دیا۔ وہ کیا کافی نہ تھا۔"

"وہ ہماری کمائی تھوڑے ہی تھی۔ جہیز تو انھیں کا تھا۔"

وہ چُپ ہو گیا۔

یہ کیسی عورت ہے۔ ہر وقت دوسروں کا خیال۔

وہ کلکتہ پورے چھ سال رہے۔ آتے ایک کے بعد ایک ترقی ملی اور وہ تیس روپیہ کی بجائے تین سو روپے مہینہ کمانے لگا۔ صاحب لوگ بہت مہربان تھے اُس کے کام اور اس کی ایمانداری سے بے حد متاثر تھے۔ ادھر آگرہ والے بھی خوش تھے اور متھرا والے بھی۔ اُن کی بیٹی نے بڑی شوبھا کمائی تھی۔ کون ماں باپ ایسی بیٹی پر ناز نہ کرے گا۔

کلکتہ کی فرم نے اُسے اپنی کئی برانچوں کا یکے بعد دیگرے منیجر بنایا اور وہ لوگ مدراس پونا اور بمبئی سے ہوتے ہوئے بالآخر دلّی پہنچ گئے۔

بیس سال کی اِس مسافت نے اُن کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ دِلّی پہنچ کر شانتی نے کہا "یہ بھارت کی راجدھانی ہے۔ اب ہم یہیں رہیں گے اور نہیں گھومیں گے۔ بہت کر لی غیروں کی نوکری تم نے۔ اب ٹک کر اپنا کام کرو۔ خوب اچھا سا بڑا سا گھر بناؤ۔ اب ہم دو نہیں پورے چھ ہو گئے ہیں۔ اب اماں باپو جی اور تاؤ جی کو بھی اکیلے آگرہ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

ہر وقت، دوسروں کا خیال۔

شانتی کے چاہنے کی دیر تھی کہ اُن کا اپنا کام بھی شروع ہو گیا۔ جیسا وہ چاہتی تھی ویسا گھر بھی بن گیا۔

"آدمی کے کام کا اڈہ گھر سے الگ ہونا چاہیئے۔"

اُس نے چاہا ہی تھا کہ یہ بھی ہو گیا۔ یہ نئی بلڈنگ اُن کے اپنے رہائشی مکان سے دُگنی بڑی تھی۔ چھ فلیٹ اور پوری بارہ دُکانیں۔ اس کا اپنا دفتر جو پہلے ایک دُکان میں تھا پھیلتے پھیلتے چھ دُکانوں میں بٹ گیا۔

سٹاف آیا گاڑی آئی، پھر دوسری گاڑی آئی پھر ایک ساتھ چار گاڑیاں آ گئیں۔

سب طرف چین کی بنسی بج رہی تھی۔

"اب اور زیادہ نہ مانگنا اپنی لکشمی ماں سے شانو وہ تم پر بہت مہربان ہیں مگر اب اور زیادہ سنبھالنے کی شکتی مجھ میں نہیں ہے۔"

"میں جو تمہاری شکتی ہوں۔ شکتی تو تمہارے چرنوں کی داسی ہے۔"

پنڈت رادھے شیام کتھا واچک نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا "ایک دن میں نے کہا، تمہارے ہاتھ میں لوہے کو سونا بنانے کا جادو ہے یار امرناتھ۔"

"میرے ہاتھ میں نہیں رادھے بھیّا یہ کوئی دوسرا ہی ہاتھ ہے"

دھدوسرا ہاتھ آج امرناتھ نے گنگا میّا کے سپرد کر دیا

تھا۔

ساوتری ستیہ وان کی پریم گاتھا امرناتھ کو بہت پسند ہے۔ اُسے یقین ہے کہ شانتی نے بھی ساوتری ہی کی طرح کا کوئی سودا دھرم راج سے کیا تھا اور جو زندگی وہ جی رہا ہے اس کی اپنی نہیں شانتی کی دی ہوئی ہے۔ اور شانتی آج بھی زندہ ہے۔

وہ یورپ یاترا سے لوٹا تو میں اس سے ملنے گیا۔ بچوں نے بتایا کہ دادو اُدپر چھت پر ہیں ——

"ارے اس اندھیرے میں کیوں چھت پر کھڑے کیا دیکھ رہے ہو امرناتھ، پورے دس منٹ سے کھڑا دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ٹک اُوپر ستاروں ہی کو گھور رہے جا رہے ہو۔"

"چراغ نہیں چاندنی تو ہے۔ میں اس مٹیالے اُجالے میں اُسی کو کھوج رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں دوست کہ وہ کہاں ہے۔"

"کون؟"

"میری تقدیر کا ستارہ۔"

"شانتی بھابھی؟"

"ہاں دوست تمہاری شانتی بھابھی اور میرے بھاگیہ کا ننھا ایک ستارہ جس کے بغیر میں زندگی کی بھری محفل میں بھی آج اکیلا ہوں۔ آج میری حسرتیں اُس پھول کی طرح ہیں جو شاخ پر ہی مُرجھا کے بکھر جاتا ہے۔"

"مُرجھاؤ نہیں پیارے، مگر بکھرو ضرور بکھرو اور پھیلو تاکہ تمہارے اسیم پیار کی اس مہک سے میرے ایسے دوسرے بھی فیضیاب ہو سکیں۔"

"وہ خود تو چلی گئی مگر اپنی برکتیں یہیں چھوڑ گئی۔"

"وہ گئی کہاں ہے پیارے وہ تو تمہارے اپنے اندر سمائی ہوئی ہے۔ اُسے باہر کہاں ڈھونڈو گے۔"

"میں سمجھتا تھا کہ اُس کے جاتے ہی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہو جائے گا۔ مگر شکر ہے بھگوان کا سب اُسی طرح چل رہا ہے بلکہ پہلے سے بھی بہتر چل رہا ہے۔"

"وہ آج تم میں اور تمہارے بیٹے بیٹیوں میں ہی نہیں تمہارے سارے خاندان میں سما گئی ہے۔ وہ تمہاری میری طرح انسان تھوڑے ہی تھی۔ وہ تو ایک دیوشکتی تھی جو جو آشیرباد بن کر اس گھر کے در و دیوار میں اس کی ساری فضا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رچ بس گئی ہے۔ اب خود ہی دیکھو نہ بھائی کہ تم کیا تھے اور آج کیا ہو۔ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہو اور میرے ایسے تمہارے درجنوں ساتھی آج بھی زندگی کے چوراہوں پر کھڑے ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کون راستہ کدھر کو جاتا ہے۔"

امرناتھ نے بھرپور ٹھنڈی سانس لی اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے۔ جب کچھ دیر بعد اُس نے آنکھوں سے ہاتھ اُٹھائے تو اس کی پلکوں میں جھلملاتے ہوئے شبنمی ستاروں کی لو بتا رہی تھی کہ اُسے محبوب کا دیدار ہو گیا ہے۔ اب وہ آنکھیں ٹھہرے ہوئے ساکن پانی کی چند لمحے پہلے والی خاموش جھیلیں نہ تھیں۔ وہ عمیق اور اتھاہ سمندر تھیں جنھیں کوئی طوفان نہیں ڈرا سکتا۔

▲▲

مستقبل میں
ماں اور باپ بننے
والوں کے لیے
نیک مشورہ
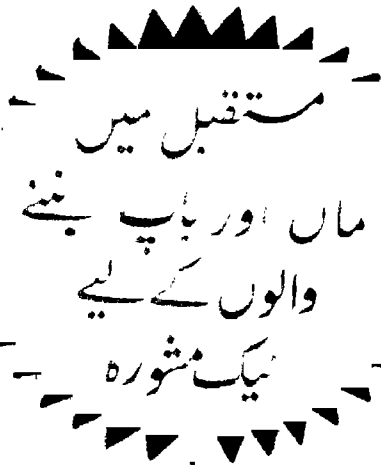
اپنے نزدیکی فیملی پلاننگ سینٹر، پرائمری ہیلتھ سینٹر
یا گرام سواستھ سہائک سے جو آپ کو ضروری
صلاح اور ساز و سامان فراہم کرسکتے ہیں
آج ہی رابطہ قائم کیجیے

78/495

غزلیں

سید فضل المتین

زندگی تجھ سے کسی روز بچھڑ جاؤں گا
ایک پتے کی طرح شاخ سے جھڑ جاؤں گا

وقت کے ساتھ بدلنا ہی پڑے گا مجھ کو
پیڑ کی طرح ہواؤں سے اکھڑ جاؤں گا

مجھ سے مت روٹھو، مرا ساتھ نبھاؤ کچھ روز
ایک دن آئے گا، میں آپ بچھڑ جاؤں گا

زیر کر لے گا تجھے بھی، تری خواہش کا طلسم
میں بھی حالات کے افسوں سے بچھڑ جاؤں گا

ذات اس کی ہی تو اک میرا سہارا ہے متین
کیا کروں گا میں اگر اس سے بچھڑ جاؤں گا

▲▲

عبد اللہ کمال

دیکھنا ہے پیاس کے صحرا کا پس منظر تو آ
اے سمندر، تو ہمارے جسم کے اندر تو آ

دیکھ پھر جامد مناظر کے لپکنے کا سماں
اے نشاطِ حرفِ تازہ، تو مرے لب پر تو آ

اک سکوتِ بیکراں رگ رگ میں ہے، اترا ہوا
تو اٹھا سکتا ہے اپنے خون سے محشر تو آ

قطرہ قطرہ دے چکا ہوں اپنے ہی خوں کا قصاص
اب بھی تشنہ ہے ترے انصاف کا خنجر، تو آ

میں خدا کی طرح تنہائی کے شعلوں میں جلوں
تو بھی ہے اس کربِ تنہائی کا پیغمبر تو آ

دیکھ، روشن ہو گئے ہیں نقشِ ارضِ آفتاب
شاہزادے، اب طلسمِ خواب سے باہر تو آ

▲▲

رشید افروز

اے ہوا..... اذنِ سفر دے ـــــ بادباں
منتظر ہیں راستوں کے درمیاں

اب نظر میں وحشت کی وسعت نہیں
آنکھ میں پھیلا ہوا ہے آسماں

اب کہاں پر تولنے کی آرزو
اب تو میں ہوں اور میرا آشیاں

جاگ اٹھا ہوں مگر آنکھوں میں ہے
نیند کا احساس..... خوابوں کا دھواں

میں جہاں کے سامنے پھیلاؤں ہاتھ
اور تو خاموش پتھر کی زباں

▲▲

نظمیں

ظہیر غازی پوری

دریدہ قبا

خدا کی طرف سے
ودیعت ہوئی ہے
مجھے سوچ کی اہلیت تو
میں یہ کیوں نہ سوچوں
کہاں ہے وہ ! ؟
جس کی عطا
روح بھی، جسم بھی، زندگی بھی ہے
لیکن

یہی سوچتے ہیں
اناالحق کی آواز کیوں دار پر چڑھ گئی
پیمبر کو مصلوب کیوں کر دیا
جام سم ذہن بالغ کی تقدیر کیسے بنا
کیوں یہ پہرہ لگا سوچ پر
آج پھر
میں برہنہ ہوں
مجھکو دریدہ قبا ہی سہی
کچھ تو دو !

▲▲

شاہد عزیز

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی تنہائیوں کے سرد جنگل میں
ہوائیں تیز چلتی ہیں ....

کوئی بھولا ہوا لمحہ
کوئی بچھڑی ہوئی ساعت
کوئی پرچھائیں میرے پاس سے ہوکر گزرتی ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ برسوں تک .....
کوئی موسم نہیں آتا

وہی اک سوکھا دریا
جسم کے اندر اترتا ہے

▲▲

اشفاق احمد اعظمی

طوفان

زبردست طوفان ہے
ہر سمت شور قیامت بپا ہے
تناور درختوں کے گرنے کا منظر
بڑا ہی بھیانک ہے
جنگل میں شورش ہے برپا
عجب نفسی نفسی کا عالم ——
ہر اک بدحواسی میں چاروں طرف
دوڑتا، بھاگتا پھر رہا ہے
سبھی تیز طوفان میں گھر گئے ہیں
نکلنے کی کوئی بھی صورت نہیں ہے
ہر اک اپنی بھرپور طاقت سے چلا رہا ہے
مگر کچھ سنائی نہیں پڑ رہا ہے
نہیں اپنی آواز بھی اب
قیامت کے اس شور میں ——
زبردست طوفاں ہے —— !!

▲▲

یوسف چچا کی یاد میں

ڈاکٹر انور حسین

روشن ضمیر آدمی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوتا ہے علم اور شعورِ علم ـــ یہ تو ان لوگوں کی قسمت ہو سکتا ہے جن میں پڑھنے لکھنے اور حصولِ علم و فن کا جذبہ ہوتا ہے لیکن وہ عالم، محقق اور نقاد جو وسعتِ دل اور وسعتِ نظر رکھتے ہیں، جن میں وضع داری ـــ حلم اور بردباری ہوتی ہے، جو اس کی تلقین کرتے ہیں اور خود عمل بھی کرتے ہیں، وہ روشن ضمیر ہوتے ہیں کہ حقیقتاً ایسے ہی لوگوں کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہوتا ہے۔

یوسف چچا (ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم) کی علمی، ادبی اور تحقیقی کارشوں کا تذکرہ میں کیا کر سکوں گا اب تک ان کی تصانیف کے کچھ حصے ہی سمجھ میں آسکے اور یہ توفیق کبھی نہ ہوئی کہ ان کے سامنے بیٹھ کر علمی گفتگو کرتا۔ اور ذاتی محرومی کی ایک مثال یہ بھی کہ جب انھیں خط لکھا ساہتیہ اکیڈیمی کا انعام حاصل کرنے پر تو یوسف چچا وہ خط پڑھ نہ سکے کہ آخری علالت شروع ہو چکی تھی لیکن اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود مجھے اس بات پر فخر ہے کہ یوسف چچا ایک عظیم انسان تھے۔

رشتۂ خون کے حوالے سے، ہم وطن ہونے کے سبب، ہم مذہب یا ہم مسلک ہونے کی بنا پر تعریف و توصیف بہت آسانی سے کی جا سکتی ہے۔ مگر ایک انسان کے ناطے، صرف انسانیت کے رشتے سے، انہیں کو سمجھنا اور ان کے متعلق رائے قائم کرنا مشکل کام ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ڈاکٹر یوسف حسین خان کو میں ایک چچا کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک انسان کی حیثیت سے جانتا تو یہی کہتا کہ وہ ایک وسیع القلب اور محبت کرنے والے انسان تھے، یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت ـــ علم و ادب، فن اور ہنر یہاں تک کہ رشد و ہدایت کی سطح سے بلند تر ہو جاتی ہے، یہ مقام فنا نہیں، مقام بقا ہے۔

اور یہ مقام ملتا ہے اس دولتِ باطنی سے، سادگی سے، محبت سے جن کا تعلق خمیر اور تربیت دونوں سے ہے۔

نومبر ۷۸ ۱۹ء میں طویل مدت کے بعد میں دہلی گیا۔ اسی وقت احساس ہوا کہ یوسف چچا کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی، وہ بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن میں اس بات کو کبھی بھول نہیں سکتا کہ بزرگی، علمی و ادبی مصروفیت اور خرابیٔ صحت کے باوجود میرے دورانِ قیام میں وہ کس خلوص اور شفقت سے پیش آئے کس طرح وہ مجھ سے جو ان سے ہر اعتبار سے کمتر ہے، "آپ" سے مخاطب ہوئے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کا ذکر کیسے کروں، در اصل میں مدتوں سے ایک ایسے ماحول میں رہتا ہوں جہاں اس قسم کے سلوک کا تصور ہی نہیں، یا شاید وقت کے ساتھ ساتھ ہماری تربیت کے بعض نقوش مدھم پڑ گئے ہیں۔ لیکن جب میں دہلی سے لوٹا تو ایک نقش لے کر، اس احساس کے ساتھ کہ جینے کا سلیقہ ہی تمام تر زندگی ہے۔

دہلی کی دنیا ہی الگ ہے، بات ہی کچھ اور ہے، چند روز نومبر میں جو میں وہاں رہا تو یوسف چچا کو اس رنگ میں دیکھا جس کا ذکر کبھی کبھی پرانی کتابوں میں وضع دار، شریف بزرگوں کے متعلق ملتا ہے، صبح سویرے، بلکہ آخر شب اٹھنا، نہانا دھونا،

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

رات کے راہی

رضی الدین صدیقی

رات کے ٹھیک گیارہ بجے دروازہ پر بہت ہی آہستہ سے دستک ہوئی۔ پربھا جواب تک سوئی نہ تھی، چپکے سے پلنگ سے اُٹھی۔ اس کے اس طرح اُٹھنے سے ذرا بھی آہٹ یا آواز نہ ہوئی۔ اس کے پاس والی دو چارپائیوں پر اس کی بیٹی ریکھا اور اس کا بیٹا دیپک گہری نیند سو رہے تھے۔ بہت ہی آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے پنجوں کے بل چلتے ہوئے وہ دروازہ کی طرف بڑھی۔ دروازہ کے بالکل قریب پہنچ کر اس نے ایک نظر پھر سے دونوں بچوں پر ڈالی ریکھا کا منہ دوسری طرف تھا۔ دیپک کا چہرہ دروازہ کی طرف تھا لیکن دونوں ہی بچے گہری نیند میں تھے۔ نائٹ لیمپ کی مدھم روشنی کمرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ پربھا کا ہاتھ آگے بڑھا۔ اس نے بہت ہی احتیاط سے دروازہ کی چٹخنی کو سیدھا کیا۔ لیکن اسے نیچے نہیں گرنے دیا مبادا آواز ہو۔ آہستہ سے چٹخنی نیچے آئی۔ دروازہ بغیر آواز کیے کھل گیا۔ وہ دروازہ کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آگیا۔ باہر محلّہ کی ٹیوب لائٹ کی روشنی سے جب وہ کمرہ کے اندر آیا تو پہلے تو اسے کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن چند ہی سیکنڈ میں منظر صاف ہو گیا۔ پربھا اس طرح کھڑی تھی کہ بچوں کی نظر اگر وہ جاگتے ہوں تو اس پر نہ پڑے لیکن دونوں بچوں میں سے کوئی بھی نہ ہلا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرہ کو پار کر گیا۔ پربھا نے آہستہ سے دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔ پربھا نے آہستہ سے باورچی خانہ کا دروازہ کھولا، وہ اس میں داخل ہو گیا۔ پربھا نے ایک طائرانہ نظر پھر سے بچوں پر ڈالی۔ اور آہستہ سے باورچی خانہ میں اس کے پیچھے پیچھے داخل ہو گئی۔ اندر داخل ہو کر پربھا نے باورچی خانہ کا دروازہ کھینچ لیا۔ وہ پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پربھا کی طرف پھیلا دئے۔ پربھا لپک کر اس کی بانہوں میں چلی گئی۔ چند لمحوں تک دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کھڑے رہے پھر نیچے بیٹھ گئے۔ پربھا نے پہلے سے ہی وہاں دری بچھا رکھی تھی۔ جسم سے جسم لپٹائے ہوئے وہ اندھیرے میں باتیں کرتے رہے۔

باہر کسی کی آواز ہوئی۔ دونوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ کمرہ میں ایک دفعہ پھر سے آواز ہوئی۔ ایسا لگا کہ بچوں میں سے کوئی جاگ گیا ہو۔ وہ دونوں یکبارگی تو گھبرا سے گئے۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کونے میں کھڑا ہو گیا۔ پربھا باورچی خانہ . . . . کے دروازہ کی جالی سے کمرہ کی طرف جھانکنے لگی۔ اس کی بیٹی ریکھا جاگ گئی تھی۔ اُٹھ کر اس نے سب سے پہلے اپنے پتا کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ ان کا پلنگ خالی تھا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ وہ تو آج نو سے بارہ بجے والا پکچر کا شو دیکھنے گئے ہیں۔ پھر اس نے اپنی ممی کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ اس کی ممی کا پلنگ بھی خالی تھا۔ اس کی نظریں فوراً غسل خانہ اور بیت الخلاء کی طرف گئیں۔ لیکن وہاں اندھیرا تھا۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک جگہ کی لائٹ جلی ہوئی ہوتی تو وہاں اس کی ممی کی موجودگی کا ثبوت مل جاتا۔ ریکھا سوچ میں پڑ گئی کہ آخر اس کی ممی گئی کہاں؟ اس کی نظریں کمرہ کے دروازہ کی طرف

ہیں۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ
ن کی ماں گھر سے باہر نہیں گئی۔ ایک خیال لپکا ایک اس
کے دماغ میں آیا کہ چھوٹے بھائی کو جگا دے۔ وہ آگے کو جھکی
ر اپنے چھوٹے بھائی دیپک کو جھنجھوڑا۔ دیپک کسمساتا ہوا۔
منمناتا ہوا۔ آنکھیں ملتا ہوا اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے
حتجاج کیا کہ ریکھا نے اس کی نیند کیوں خراب کی۔

"ممی کہاں ہیں؟" ریکھا نے دیپک سے پوچھا۔

"ممی" دیپک نے دہرایا اور اپنی ماں کے پلنگ کی طرف
یکھا۔ اسے خالی پاکر وہ پلٹا اور اس نے ریکھا سے سوال
ر ڈالا۔

"ممی کہاں ہیں؟"

ریکھا پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دیپک سے
و سال بڑی تھی۔ دیپک کے سوال کا جواب اسے دینا
ھا۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، دونوں طرف کے دروازے
ندر سے بند تھے۔ اس کی ماں کے باہر جانے کا سوال ہی
پیدا نہ ہوتا تھا۔ ریکھا کی نظریں دیوار پر لگی گھڑی کی طرف
ٹھ گئیں۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اس کی سمجھ
یں کچھ نہ آیا۔ اسے کھڑا دیکھ کر دیپک بھی اپنی چارپائی سے نیچے
تر آیا۔ اور اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اب بھی وہ پوچھ
رہا تھا:

"دیدی۔ ممی کہاں ہیں؟" ریکھا سوچ ہی رہی تھی کہ وہ
دیپک کو کیا جواب دے کر مطمئن کرے کہ اتنے میں باورچی خانہ
یں کوئی چھوٹا برتن گرا جس سے کافی زور کی آواز پیدا ہوئی۔ گزشتہ
چند دنوں سے چوہے بہت پریشان کرتے تھے۔ اکثر رات کے
وقت باورچی خانہ میں نقصان کر جایا کرتے تھے۔ پانچ چھ روز پہلے
انہوں نے تیل کا ڈبہ گرا دیا تھا اور تمام تیل فرش پر گر گیا تھا۔
و روز پہلے چائے کے کپ اور پلیٹیں گرا کر توڑ ڈالی تھیں۔ آج
پھر جب باورچی خانہ میں چوہے نے کوئی برتن گرایا تو ریکھا
باورچی خانہ کے دروازہ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کی جالی
سے اس نے اندر جھانکا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ دیپک بھی اس

کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ ریکھا کو باورچی خانہ میں کوئی نظر نہ
آیا۔ لیکن اسے ایک ہلکا سا احساس ہوا کہ باورچی خانہ میں
کوئی ہے۔ اس کا ہاتھ خود بخود باورچی خانہ کے دروازہ
کی چٹخنی کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن اسے معلوم ہوا کہ وہ تو پہلے ہی
سے کھلی ہوئی تھی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کو اپنی طرف کھینچا۔
لیکن اسے یہ جان کر تعجب ہوا کہ دروازہ اندر سے بند تھا۔
باورچی خانہ کا دروازہ اندر سے کیسے بند ہو سکتا ہے۔ وہ سوچنے
لگی۔ ضرور کوئی اندر ہے۔ اگر اس کی ممی باورچی خانہ میں گئی ہوتی تو
وہ لائٹ جلا کر جاتی۔ اور پھر دروازہ اندر سے بند کرنے کا
سوال ہی نہ تھا۔ ریکھا نے کچھ سوچ کر پکارا۔

"ممی"۔

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اب تو ریکھا گھبرا گئی۔ ان دنوں
محلّہ میں اکثر گھروں میں چوریاں ہوئیں تھیں۔ گزشتہ چند
دنوں میں پڑوس کے دو مکانوں سے رات کو چور بہت
سی چیزیں اور نقدی چرا لے گئے تھے۔ شہر کے دوسرے
محلّوں سے بھی چوریوں کی اطّلاع ملی تھی۔ یہ خیال آتے ہی
ریکھا کے دل میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کیا باورچی خانہ
میں چور ہے؟ یہ خیال ایک دم اسے آیا۔ دیپک اس کے
پاس کھڑا ہوا کبھی اُسے دیکھ رہا تھا کبھی باورچی خانہ کی جالی
میں سے اندھیرے میں جھانک رہا تھا۔ ایک بار پھر سے
ریکھا نے ہمت کر کے پکارا۔

"ممی"۔

لیکن اسے باورچی خانہ میں سے کوئی جواب نہ ملا۔
ایک دفعہ پھر اس کے دل میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ اسے
کپکپی سی چھوٹنے لگی۔ اسے پورا یقین ہو گیا کہ باورچی خانہ
میں چور گھسا ہے۔ ایسی حالت میں جبکہ نہ اس کے پتا
گھر میں ہیں اور نہ ممی نظر آتی ہیں۔ اس کے منہ سے
ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔

"چور"۔

دیپک ریکھا کے بالکل قریب آگیا اور اس کا ایک
ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بھی بہت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے

ریکھا دوسری چیخ مارے یا زور زور سے رونے لگے۔ باورچی خانہ میں سے اس کی ممی کی آواز آئی۔

"ڈرو نہیں بیٹا۔ میں ہوں اندر"۔

"ممی!" ریکھا اور دیپک دونوں زور سے بول اٹھے۔

"ہاں بیٹا"۔ اندر سے آواز آئی۔ یہ ان کی ممی کی ہی آواز تھی۔ دونوں بہن بھائی نے جالی میں سے اندھیرے میں جھانکا۔ تو انھیں ایک چیز کا احساس ہوا کہ باورچی خانہ میں ان کی ممی کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ دروازہ ابھی تک بند تھا۔ لائٹ ابھی تک نہیں جلائی گئی تھی۔

"ممی۔ اور کون ہے اندر؟" ریکھا نے زور سے پوچھا۔

ستیش اور پربھا کی شادی ہوئے سولہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ دونوں کی محبت مثالی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔ لوگوں کی محبت کا جوش ٹھنڈا پڑتا جاتا ہے۔ لیکن ستیش اور پربھا کی محبت کا معاملہ بالکل ہی الگ تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرا ان کی محبت زیادہ مضبوط اور والہانہ ہوتی گئی۔ دونوں کالج کے ساتھی تھے۔ ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے۔ دونوں کا تعلق اوسط درجے کی آمدنی والے خاندانوں سے تھا۔ کالج کے ایام میں محبت پروان چڑھی تھی۔ دونوں نے ڈگری حاصل کرنے کے بعد فوراً ہی شادی کرلی۔ سیدھی سادی شادی۔ ایسی ہی محبت تھی سیدھی سادی جس میں نہ کوئی اسکینڈل تھا نہ کوئی ایڈونچر۔ دونوں کے گھر والوں نے بخوشی شادی کی اجازت دے دی۔ شادی ہوئی اور اس کے بعد وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔ شادی کے دوسرے سال میں دونوں کو ریکھا جیسی پیاری اور گڑیا سی بیٹی ملی۔ ریکھا جب دو سال کی ہوئی تو دیپک کا جنم ہوا۔ دونوں بہت ہی خوش تھے۔ ستیش کو گریجویٹ ہوتے ہی ایک اچھی سی نوکری مل گئی تھی۔ اچھی تنخواہ تھی۔ اچھی طرح کھاتے پیتے اور پہنتے تھے۔ بچوں کی پرورش کے معاملہ میں دونوں ہم خیال تھے۔ دونوں تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں اب اور بچوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ان ہی دو بچوں پر اپنی محبت اور شفقت نچھاور کردی دونوں نے۔

لوگ پربھا اور ستیش کی محبت کو مثالی محبت قرار دیتے تھے۔ ان کے جوڑے کو مثالی جوڑا۔ ان کے گھر کو مثالی گھر۔ سال گزرتے گئے۔ ہر چیز کا آرام تھا۔ ہر طرح کی خوشی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ایک کمی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ یہ کمی تھی مکان کے چھوٹے ہونے کی۔ شہر میں مکانوں کی کمی تھی۔ بڑے مکانوں کے کرائے اور پگڑیاں آسمان کو چھوتے تھے۔ جس مکان میں ستیش اور پربھا رہتے تھے وہ شروع میں تو چھوٹا محسوس نہ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں میاں بیوی اکیلے ہی تھے۔ ایک کمرہ۔ باورچی خانہ۔ غسل خانہ اور بیت الخلاء پر مشتمل یہ مکان پہلے تو کافی آرام دہ تھا لیکن جب سے بچے بڑے ہوئے تھے اس مکان میں دونوں کو تکلیف ہونے لگی تھی۔ جب سے دونوں بچے سیانے ہوئے تھے انھیں گھر کا چھوٹا پن کھائے جا رہا تھا۔ اکثر رات کے وقت جب ستیش اور پربھا محبت کے عالم میں سرشار ہوتے بچے جاگ جایا کرتے تھے۔ دونوں کی محبت میں خلل پڑتا۔ میاں بیوی کو بہت ہی احتیاط برتنی پڑتی تھی۔ جیسے جیسے بچے پڑھتے پڑھتے بڑی کلاسوں میں آئے اور سمجھدار ہوئے۔ دونوں میاں بیوی کی احتیاط بڑھتی گئی اور یہ احتیاط اتنی بڑھ گئی کہ اب ہفتوں دونوں کو ساتھ بیٹھ کر محبت کا اظہار کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اور دونوں کی حالت ہجر میں تڑپتے ہوئے عاشق معشوق کی سی ہونے لگی اسی طرح احتیاط برتتے برتتے ایک دفعہ کافی دن ہو گئے۔ اور میاں بیوی کو رانِدیو کا موقع نہ مل سکا۔ تو ستیش نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے ایک اسکیم بنائی۔ اس اسکیم کو اس نے پربھا کے سامنے رکھا جسے پربھا نے ہنستے ہنستے قبول کرلیا۔

اس اسکیم کے تحت ستیش کو بہانہ بنانا تھا کہ وہ رات

نیما کا آخری شو یعنی نو سے بارہ بجے والا شو دیکھنے جائے گا۔
سے کہا کر وہ نکل جائے۔ بچے رات کو ڈیڑھ کر دس بجے
قریب سو جایا کرتے تھے۔ وہ واپس گھر گیارہ بجے کے
یب آئے۔ مجھکیے سے دروازہ کھٹکھٹائے۔ پربھا چپکے
۔ دروازہ کھول دے ستیش اندر آجائے دونوں میاں
ی باورچی خانہ میں چلے جائیں۔

احتیاطاً ایک اسکیم اور بنائی تھی۔ اگر دونوں کی
ت میں بچوں کی طرف سے خلل پڑے تو احتیاط کے
اقدام کیے جائیں۔ اگر دونوں یا دونوں میں سے ایک
بچے جاگ جائے تو ستیش کو باورچی خانہ سے گلی کی طرف
ی کھڑکی کھول کر باہر نکل جانا تھا۔ پربھا کو بچوں کے پاس
بس چلا جانا تھا۔ پکچر ختم ہونے کے وقت ستیش کو
س گھر لوٹنا تھا۔ اس طرح بچوں کو ستیش کی موجودگی
لم نہ ہو سکے گا۔ بنائی ہوئی اسکیم کے تحت ستیش
ک گیارہ بجے گھر آگیا تھا کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔
ون میاں بیوی بڑی آسانی سے باورچی خانہ میں داخل
ہو گئے تھے۔ اور اب جبکہ دونوں بچے جاگ اٹھے
تو ہنگامی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ حالات نے
ٹا کھایا تھا وہ بالکل اپنی قسم کا تھا۔ دونوں بچے باورچی خانہ
دروازہ کے پاس کھڑے تھے۔ مجبوری کی حالت میں
ھا کو ریکھا کی پکار کا جواب دینا پڑا تھا۔ اگر وہ ریکھا
پکار کا جواب نہ دیتی تو ممکن تھا ریکھا زور زور
"چور چور" کا شور مچا دیتی۔ اس لیے اس نے مجبوراً
رچی خانہ میں سے جواب دیا کہ اندر وہ خود ہے ماں
وجودگی سے ریکھا کو اطمینان ہو گیا تھا لیکن دوسرے
ال کے لیے پربھا بالکل تیار نہ تھی ——— ریکھا نے
ھا تھا "ممی۔ اور کون ہے اندر؟"

جب پربھا کو اپنی بیٹی کے اس سوال کا جواب نہ ملا
ستیش اپنی اسکیم کے تحت باورچی خانہ کی کھڑکی کی
ف بڑھا جو گلی میں کھلتی تھی۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی کھولی۔
رلو وجانے کے پیچے وہ کھڑکی پر چڑھ گیا۔ اس کی اس

حرکت کو بچے نہ دیکھ سکے۔ کیونکہ کھڑکی باورچی خانہ کے دروازہ
کے متصل کچھ دوری پر تھی۔ بہت ہی آہستہ سے کھڑکی سے
پھسل کر باہر نکل جانے کا ارادہ کیا اس نے ایک پیر کھڑکی
سے نیچے لٹکایا۔ جیسے ہی وہ باہر نکلنے کے لیے آگے بڑھا۔
پیچھے سے پربھا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ستیش نے
نیم اندھیرے میں پربھا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے
دیکھا ———

پربھا اس کے کان میں پھسپھسائی "بھگوان کے
لیے باہر مت کودنا۔ میں بچوں کو کیا جواب دوں گی
کہ اندر میرے سوا اور کون تھا"

اور ستیش کو ایسا لگا گویا اس کا جسم کھڑکی سے چپک
گیا ہو جسے وہ چھڑا نہ سکتا ہو۔

▲▲

پتھر

منوّر امروہوی

سنیما ہال کے باہر کھڑے کھڑے میں اُکتا سا گیا تھا۔ بار بار میری نگاہیں گیٹ پر لٹکے اُس سائن بورڈ سے ٹکرا رہی تھیں جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا:
"ہاؤس فُل" —— مہینوں بعد آج فلم دیکھنے کا موڈ بنا تھا اِس لیے یونہی واپس ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مَیں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک لمبا سا کش لیتے ہوئے پاس کھڑے ایک صاحب سے پوچھا "کیوں صاحب ٹکٹ ملنے کی کوئی اُمید ہے؟"

"کوئی اُمید نہیں!" اِتنا کہہ کر وہ صاحب تھوڑا سا آگے بڑھ گئے۔ مَیں ایک کونے میں کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔

"ٹکٹ چاہیے؟"

"ہاں! کتنے میں دو گے؟"

"خالد صاحب پہلی بار آپ میرے علاقے میں فلم دیکھنے آئے ہیں کسی کی کیا مجال جو کوئی آپ سے بلیک کر جائے!" وہ میری جیب میں ٹکٹ ڈالتے ہوئے مُسکرایا۔

"سعید" مَیں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہاں خالد!" اُس کی آنکھیں ڈبڈباسی گئیں۔

"تم یہ دھندا کب سے کرنے لگے؟"

"یہ نہ پوچھو میرے دوست! مَیں تم سے بہت شرمندہ ہوں، مدّتوں بعد یہ کردار لے کر مَیں اپنے ایک شفیق دوست سے مِلوں گا یہ مَیں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آج اچانک تمھیں یہاں دیکھ کر مَیں نے اپنے آپ کو تم سے چُھپانے کی کوشش کی۔ بہت دیر تک سوچتا رہا تم سے مِلوں یا نہ مِلوں۔ لیکن رہا نہ گیا کہو کیسے ہو اور کیا کر رہے ہو؟"

"اچھا ہوں بھائی! یہیں ایک کالج میں پڑھاتا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اچھا آؤ ایک کپ چائے پی لیں!" سعید نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور ہم دونوں ایک چائے خانے میں چلے گئے۔

سعید میرے بچپن کا دوست تھا آٹھویں جماعت کے بعد اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد اس کی زندگی کِن حالات میں گزری یہ اس نے مجھے چائے پیتے ہوئے بتایا۔

تھوڑی دیر بعد دو تگڑے سے نوجوان آئے اور انھوں نے سعید کے کان کے پاس سرگوشی کی۔ سعید نے ایک نظر میں پورے ہجوم کا جائزہ لیا اور پھر آہستہ سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے اُن سے کہا "ابھی نہیں فلم شروع ہونے میں دیر ہے بھائی اور رش بڑھے گا!"

سعید کا جواب سُن کر وہ دونوں چلے گئے۔ کچھ دیر تک تو سعید سامنے بھیڑ پر نگاہیں جمائے دیکھتا رہا

اور پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا ——
"ہاں خالد صاحب آپ اکیلے کیسے آئے بھابی کہاں ہیں ؟"
اچانک وہ مجھ سے ایسا سوال کر بیٹھا جس کے لیے میں بالکل تیار نہ تھا۔ اس کا یہ سوال سن کر ایک بار پھر شہناز میرے ذہن پر چھا گئی۔ اور میں سوچنے لگا، اس لڑکی کو میں بھلا چکا ہوں اب اس کے بارے میں کچھ سوچنا بھی گناہ سے کم نہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں —— شہناز ایک خوش مزاج و خوبصورت لڑکی تھی وہ میری کلاس فیلو تو کبھی نہ رہی ہاں کبھی کبھی یونہی رسمی سی ملاقات ہو جایا کرتی تھی —— کچھ ہی دن بعد وہ آسیب کی طرح میرے خیالات پر چھا گئی۔ مجھے اپنی سانسوں میں اس کی خوشبو آنے لگی۔ وہ جب بھی مجھے ملتی دور ہی سے سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتی اور جتنی دیر باتیں کرتی شرمائی سی رہتی۔ سادگی اس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ ایک اونچے کردار کی خالص مشرقی لڑکی تھی خاصی ذہین لیکن نہ جانے کیوں میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکی —— دن گزرتے رہے اور میں محسوس کرنے لگا کہ شہناز مجھ سے دور نہیں ہے لیکن کبھی یہ بات میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دی —— ایک دن اچانک مجھے معلوم ہوا کہ ایک رئیس زادے سے شہناز کے رشتہ کی بات چل رہی ہے۔ لیکن اس لڑکے کے پاس دولت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا خزانہ نہ تھا —— اور اسی لیے وہ رشتہ طے نہ ہو سکا —— کچھ ہی دن بعد انور جو میرا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "سعید! میں شہناز کے یہاں رشتہ بھجوا رہا ہوں تمہاری کیا رائے ہے ؟" ایک لمحہ کے لیے میرا جسم شل ہو گیا رگوں میں خون جمنے لگا لیکن میں نے اپنی اس حالت کو اس سے چھپا لیا۔ اور پلا جھجک میری زبان سے نکلا —
"کیا حرج ہے تم خاصے پڑھے لکھے خوبرو نوجوان ہو سمجھ نگ رشتہ نہیں "

لیکن اس بچارے کو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ اس کا خون اتنا گاڑھا نہیں ہے جتنا شہناز کے خاندان کا۔ اس کے بعد چھ سات رشتے اور آئے لیکن بات آگے نہیں بڑھی۔ ان رشتوں کی ناکامی سے میں کچھ سہم سا گیا۔ میری پریشانی اور بڑھ گئی دن رات میں یہ سوچنے لگا آخر شہناز کے والدین کو کیسے لڑکے کی تلاش ہے ؟ اور جب میں نے اپنے گھر کے حالات پر نظر ڈالی تو میں کسی طرح اس گھرانے کا داماد بننے کا اہل نہ تھا صرف گاڑھے خون اور تعلیم کے سوا میرے پلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ میری چھوٹی سی تنخواہ سے پورے گھر کے اخراجات پورے ہو رہے تھے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں کسی طرح شہناز کے ہاتھ پاؤں نہ سما سکتے تھے اس کے سوا اور کوئی جائداد نہ تھی —— اسی طرح دو سال گزر گئے۔
بمبئی کے ایک کالج میں میرا اپائنٹمنٹ ہو چکا تھا اور میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جانے سے پہلے نہ جانے کیوں میں بھی شکست کھانے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہی ہوا میں وہ شیش محل کہاں سے لاتا جس میں شہناز کو سجایا جا سکتا۔ میں ٹکا سا جواب سن کر زمین میں دھنس گیا اس کے بعد بھی رشتے آئے لیکن شہناز دلہن نہ بن سکی اور میں بمبئی چلا گیا ——
تقریباً تین سال بعد تک بھی شہناز کی شادی نہ ہو سکی تھی میں ذہنی طور پر مفلوج سا ہونے لگا۔ آخر شہناز کے والدین نے کیا سوچا ہے ؟ وہ کیوں اس بچاری کی زندگی تباہ کر رہے ہیں اب تو اس کی عمر بھی کافی ہو گئی اور کچھ دن بعد ادھیڑ ہو جائے گی۔ اگر انھیں کوئی خاندانی بڑی والا تعلیم یافتہ دولتمند لڑکا نہ ملا تو کیا شہناز یونہی بیٹھی رہے گی ؟ کیا وہ اپنے والدین سے بغاوت کر سکے گی ؟ یہ سوچتے ہی میرے سامنے اس کا بھولا بھالا چہرہ آ جاتا اور میرا دل کہتا وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی خاموش رہے گی۔ اس کے قدم کبھی نہ ڈگمگائیں گے ——

"خالد صاحب چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ آپ کس سوچ میں پڑ گئے میری زندگی کے متعلق نہ سوچو بھائی! کچھ گزر گئی اور کچھ ایسے ہی گزر جائے گی۔ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھر لو پھر ذرا گھر چلیں گے نزدیک ہی میرا مکان ہے۔ ابھی فلم شروع ہونے میں بھی تو دیر ہے۔"

"نہیں سعید پھر کبھی آؤں گا۔"

"چلے چلو خالد اِسی بہانے میں بھی گھر ہو آؤں گا۔"

"تو کیا تم روز گھر نہیں جاتے؟"

"ضرورت بھی کیا ہے، بیوی ہے، ایک بچہ ہے روز ان کے خرچے کے لیے پیسے بھجوا دیتا ہوں اور بس۔"

"آخر وجہ کیا ہے؟"

"چھوڑیئے خالد صاحب ان باتوں کو آؤ چلیں۔"

سعید مجھے اپنے گھر لے گیا گلی میں اس کا بچہ کھیل رہا تھا اس نے اسے آواز دی بچہ بھاگا بھاگا آیا ——

"دیکھو بیٹا یہ تمہارے چچا ہیں!"

میں نے بچے کا گال تھپتھپایا اور ہم دونوں مکان میں داخل ہو گئے سعید نے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا اور خود اندر والے کمرے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے اپنی زندگی کے کچھ اور نشیب و فراز بتائے میں چپ چاپ سنتا رہا۔

"ارے بھئی چائے لے آؤ" —— تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی چائے کی ٹرے لیے میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور سعید کے گھر نہ آنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس کی بیوی بدصورت تھی۔ چہرے پر موٹے موٹے چیچک کے داغ تھے اور رنگ بھی کالا تھا۔ سر کے بال سفید ہونے لگے تھے۔ دبلی پتلی سی وہ عورت چائے رکھ کر چلی گئی اتنے میں دروازے پر کسی نے آواز دی سعید باہر چلا گیا میں نے سگریٹ سلگایا اور سعید کی زندگی کے متعلق سوچنے لگا۔

"پان حاضر ہے خالد صاحب!"

میں نے چونک کر اوپر دیکھا سعید کی بیوی پان لیے کھڑی تھی۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ اس کی پلکوں پر کئی ستارے لرزنے لگے۔

بے ساختہ میری زبان سے نکلا —— شہناز!

●●

عمر خیام اور خاقانی کا رشتہ؟ بقیہ ص ۱

یہ امر بھی کم لائق توجہ نہیں کہ خاقانی نے اپنے چچا کے طبیب ہونے کا ذکر شد و مد سے کیا ہے۔ اور خیام کی شہرت طبیب کی حیثیت سے بالکل نہیں۔

لہٰذا ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ تحفۃ العراقین کے مطبوعہ نسخے میں سے جو عنوان آغاز مضمون میں نقل کیا گیا ہے۔ اس میں لفظ عمر خیام یا تو اس نسخے کے کاتب کی اختراع ہے، جو مطبوعہ کا اصل تھا یا اس مطبوعہ کے مصحح کو دھوکہ ہوا خاقانی کا چچا عمر بن عثمان تھا، اور خیام کا نام عمر بن ابراہیم الخیام تھا اور یہ دونوں جداگانہ شخصیتیں تھیں۔

●

غزلیں

...ش بڑودوی

...بھی اہلِ نظر گر کہیں پائے جاتے
...ہ میں پاتے جگہ دل میں بسائے جاتے

...ں کے لوگ مجھے بھول گئے ہیں ورنہ
...، آمد پہ مکانات سجائے جاتے

...تجھ سے بہت پیار ہے ہم کو لیکن
...ے ناز نہیں ہم سے اُٹھائے جاتے

...تے نئے الفاظ کی رنگ آمیزی
...، پھر تری تصویر بنائے جاتے

...تو حسن ہے ہم میں بھی کشش ہے کوئی
...یا کی نمائش میں نہ لائے جاتے

...ن وہ تمھیں محفل میں بلاتا اک دن
...آوازمیں آواز ملائے جاتے

▲▲

شاہ حسین نہری

قہرِ سورج کے روبرو میں ہوں
اپنے سائے کی جستجو میں ہوں

سُن رہا ہوں: پُکارتا ہے کوئی
نارسائی کی آبرو میں ہوں

راہ پہچان کی ہے پتھریلی
پتھروں پر لہولہو میں ہوں

کون محفل سے اُٹھ گیا ہے آج
آج موضوعِ گفتگو میں ہوں!

ہے سبب کون، شاہ! اِلّا ھُو
اس کے ہونے میں میرا تُو میں ہوں

▲▲

جاوید شہبازی

ابھی تو راہ میں باقی ہیں امتحان بہت
ابھی تو دور ہے وہ آخری نشان بہت

زمیں پہ گر کے پشیماں تھا آسمان بہت
کہ پستیوں کو بھی عظمت کا تھا گمان بہت

خود اپنے پیروں پہ وہ پیڑ جھک گیا اک دن
دکھا رہا تھا جو دُنیا کو آن بان بہت

اندھیری رات میں سب کو پناہ دی جس نے
چمکتی صبح میں تنہا تھا وہ مکان بہت

سروں پہ سینکڑوں سورج ہوں اگر سہہ سکتے
پناہ لینے کو بس ایک سائبان بہت

▲▲

غزلیں

اسعد بدایونی

کیوں مجھکو گھنی چھاؤں میں مرنے نہیں دیتا
کیوں دھوپ کی سرحد سے گزرنے نہیں دیتا

تھا میری اڑانوں سے پریشان جو پہلے
اب مجھکو زمینوں پہ اترنے نہیں دیتا

سچائی کا جلتا ہوا سورج، مرا دشمن
آنکھوں میں کوئی خواب ٹھہرنے نہیں دیتا

ملتا نہیں اب پہلے کی مانند وہ لیکن
زنجیرِ تعلق بھی بکھرنے نہیں دیتا

اندازہ نہیں اس کو زمانے کی ہوا کا
احوال بیاں بھی مجھے کرنے نہیں دیتا

▲▲

خالد محمود

اندھیری شب، ہوا ہے اور میں ہوں
مرا بجھتا دیا ہے اور میں ہوں

تمھیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

وہی میری جرائم میں اسیری
وہی میری سزا ہے اور میں ہوں

تلاشِ ذات نے بھٹکا دیا ہے
اب اک ذہنی خلا ہے اور میں ہوں

کسی اندھے کنویں میں ہوں میں خالد
بس اک میری صدا ہے اور میں ہوں

▲▲

رئیس الدین رئیس

ہوا شعور تو خود آگہی کے پر نکلے
فصیلِ ذات میں خوش فہمیوں کے در نکلے

میں اپنے قتل کا الزام کس کے سر رکھتا
جب اپنے ہاتھ ہی اپنے لہو میں تر نکلے

تری تلاش میں اکثر سفیر یادوں کے
ردائے خواب سرِ شام اوڑھ کر نکلے

ہوئیں دراز جو مہرِ سحر کی شمشیریں
تمام جسموں کے سائے خمیدہ سر نکلے

جنھیں تلاش تھی شاداب و سبز موسم کی
انھیں کی راہ میں سوکھے ہوئے شجر نکلے

▲

آئنسٹائن کی سوویں سالگرہ

کنور سین

۱۴ مارچ کو دنیا کے کونے کونے میں فزکس کے عالم البرٹ آئنسٹائن کا سوواں جنم دن منایا گیا۔ آئنسٹائن نے سائنس کے اس شعبے میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے اور ہمعصر سائنسدانوں کو چونکا دیا۔

زمین اور آسمان کے درمیان جاری و ساری عمل کی بابت وضع کیا جانے والا کوئی بھی اصول دائمی، حتمی اور آخری نہیں۔ آئنسٹائن کا یہ اعلان سائنس اور فلسفہ کے درمیان نیا رشتہ قائم کرتا ہے۔

آئنسٹائن کے تجسس کی انتہا نہ تھی بچپن سے ہی اُس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات اُٹھتے اور اُن کا جواب پانے کے لیے وہ بے چین ہو اُٹھتا۔ ایک شام وہ کھانے کی میز پر دیر سے پہنچا۔ اُس کے والد بہت خفا ہوئے اور اُسے گھڑی دکھانے لگے۔ گھڑی کے ساتھ قطب نما لٹک رہی تھی۔ آئنسٹائن باپ کی خفگی اور برہمی کو بھول کر قطب نما میں کھو گیا ——— اس کی سوئی ہر وقت شمال کی جانب اشارہ کیوں کرتی ہے؟

آئنسٹائن جرمنی کے شہر اُلم میں ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی وہ شرمیلا تھا اور کم گو بھی۔ رُک رُک کر بولنا اُس کی فطرت تھی۔ اُس کے ہم جماعت اُسے کند ذہن اور بیوقوف سمجھتے۔ آئنسٹائن سب سے الگ کھڑا کسی گیت کی دُھن گنگناتا رہتا۔ اُس کے اُستاد بھی اُس کی حوصلہ افزائی نہ کرتے۔ وہ اُس کی طرف سے پوچھے جانے والے سوالات سے گھبراتے اور اُن کا جواب دینے سے کتراتے۔

آئنسٹائن نے اپنا لڑکپن میونخ میں گزارا۔ پھر وہ اپنے والدین کے ساتھ اٹلی چلا گیا۔ اُسے تعلیم حاصل کرنے کے لیے سوئٹزرلینڈ بھیجا گیا۔ اُسے ریاضی اور فزکس میں بے پناہ دلچسپی تھی۔

ریاضی میں اُس کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جب وہ اپنے چھوٹے بچے کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا تو ساتھ ساتھ سوالات بھی حل کرتا رہتا۔

آئنسٹائن کا ذہنی رویہ الگ تھا۔ اسی کی بدولت اُس نے سائنس کے سمندر کے نئے جزیروں کی کھوج کی۔

۲۶ سال کی عمر میں اس نے اضافیت کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق صرف آدھ پاؤنڈ وزن کے مادّے کو اگر ہم انرجی میں بدل دیں تو وہ ستر لاکھ ٹن T.N.T کے دھماکے کی قوت کا حامل ہو جائے گا۔

اضافیت کا مطلب ہے کہ کسی چیز کا مشاہدہ اُس کے شاہد کے زاویۂ نظر پر منحصر ہے۔ ہمارے ساتھ ٹرین میں سفر کرتا ہوا کوئی بھی مسافر ہمیں غیر متحرک دکھائی دے گا جب کہ ریلوے لائن کے پاس کھڑے ہوئے آدمی کو وہی مسافر گاڑی کی رفتار سے دوڑتا نظر آئے گا۔

سائنسدانوں نے آئنسٹائن کی تھیوریوں کو درست مانا اور اس کے مفروضوں کو بھی۔ وہ پہلے زیورچ اور پھر پراگ میں پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں اُسے برلن انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں اُسے نوبل پرائز ملا۔

بعض سائنسداں آئنسٹائن کے اس قول کا تمسخر اُڑایا کرتے تھے ——— قوانینِ قدرت کو ریاضی کے فارمولوں میں بند کیا جا سکتا ہے ——— آئنسٹائن سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ فلاسفر بھی تھا۔ اضافیت کی تھیوری کے علاوہ

فوٹون اور مقداریت کی تھیوریاں بھی آئنسٹائن کی دین ہیں گیلیلیو کے بعد آئنسٹائن ہی ایسا سائنسدان ہے جس نے انسان کو ستاروں اور سیاروں کی دنیا کی طرف راغب کیا۔

"زندگی سادہ ہونی چاہیئے" آئنسٹائن ہمیشہ کہتا۔ پوشاک، خوراک اور عادات کے لحاظ سے یہ عظیم سائنسدان انتہائی سادہ تھا۔ برلن میں اس کا چھوٹا سا مکان ایک بیٹھک اور رسوئی پر مشتمل تھا۔ فرش پر پھٹی پرانی قالینیں بچھی تھیں۔ گھر میں سب سے قیمتی شے پرانا پیانو تھا جس پر آئنسٹائن نے شروع کے وہ نوٹس لیے جو بالآخر اضافیت کی تھیوری کی بنیاد بنے۔

شہرت اور عزت نے اس میں غرور پیدا نہیں کیا۔ وہ حیران تھا کہ شہرت اس کی ہم سفر کیسے ہو گئی۔ یہی سبب ہے کہ سائنسدان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انسانی فلاح کا بھی متمنی رہا اور اسے ایک رحم دل اور ہمدرد انسان کے طور پر جانا پہچانا گیا۔

آئنسٹائن کی سادگی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اسے اپنے گھریلو بجٹ کو متوازن کرنا بھی نہ آتا تھا۔ پرنسٹن یونیورسٹی میں کام کرنے کے لیے آئنسٹائن نے اخراجات کا جو تخمینہ پیش کیا اس نے وہاں کے سربراہ کو حیرت میں ڈال دیا۔ سربراہ نے اس تخمینہ سے تین گنا رقم منظور کی۔ آئنسٹائن نے نوبل پرائز کی رقم بھی خیرات کر دی تھی۔

سائنس میں اپنے مفروضوں اور نظریوں کو قلمبند کرنے کے علاوہ آئنسٹائن نے انسان کی روحانی آزادی پر بھی کتابیں اور پمفلٹ لکھے THE WORLD AS i SEE iT اور QUT OF DAST YRERS اس کے نظریۂ زندگی پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یہ کتابیں موجودہ معاشرے کی خرابیاں بھی آشکارا کرتی ہیں۔ آئنسٹائن کہتا ہے :

"آج ہم اس بھیانک سچائی کو پہچانیں کہ انسانی زندگی کے تہذیبی ستون ہل چکے ہیں۔ قومیں جو افتخار سے سربلند رہتی تھیں جابروں اور قاہروں کے آگے سرنگوں ہیں۔ ناانصافی کے خلاف ردِ عمل مفقود ہو گیا ہے۔ یہی ردِ عمل حیوانیت سے انسان کی آخری پناہ ہے۔ آؤ ہم مہلک سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیں۔ ہم اس ناگزیر لڑائی سے گریز نہ کریں جو انسانی حقوق اور عظمت کی حفاظت کے لیے لڑی جائے۔"

آئنسٹائن سائنس اور فلسفے میں بُعد کو نہیں مانتا۔ اس کے خیال میں تصوّف مادیت کو پھلانگ جاتا ہے۔ طبعی اور مابعد الطبعی کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں کھینچی جا سکتی۔ خوبصورتی رازہائے سربستہ میں ہے۔ یہی فن اور سائنس کی محرک ہے۔ جو حساس نہیں وہ مُردہ ہے۔ مذہب کی بنیاد بھی اس ان دیکھے اور انجانے پر ہے جو ہوتے ہوئے بھی ہماری پہنچ سے باہر ہے۔ آئنسٹائن اپنی عمر کے آخری برسوں میں کہنے لگا تھا ـــــ میں سائنس داں کم اور فلاسفر زیادہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم سے پرے بھی ایک سچائی ہے ..... خدا ایک بھید ہے لیکن خدا کینہ ور نہیں۔

آئنسٹائن کو زندگی سے بے پناہ محبت تھی۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم پھینکے گئے تو اس کی روح کراہ اٹھی۔ اسی وناش کا آلۂ کار بننے سے بچنے کی خاطر وہ جرمنی واپس نہیں گیا۔ اپنی موت سے دو ماہ پیشتر اس نے کہا :

"یہ ایک حقیقت ہے کہ آئندہ ہونے والی کسی بھی عالمگیر جنگ میں ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال ناگزیر ہوگا۔ ان ہتھیاروں کا استعمال انسانی وجود اور بقا کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ میں برملا کہتا ہوں کہ ہمارے مسائل کا حل ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال نہیں، امن کی کھوج ہے ....."

آئنسٹائن عملی آدمی نہ تھا پھر بھی تاریخ میں اس جیسے کم آدمی ملیں گے جنھوں نے انسان کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر چھوڑا۔ اس کی عظمت اس بات میں ہے کہ ستاروں پر کمند پھینکنے والا دھرتی پر آباد انسانوں کے تئیں اپنی ہمدردی اور محبت لٹانا نہیں بھولا۔

▲▲

نیوز ریلے

شمیم صادقہ

کہیں کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے۔ پھر بھی یہ کیسی تبدیلی ہے
ـدر اندر اپنے پنجوں سے میری رُوح کو نچوڑ رہی ہے۔ کیا
ـلِ پاس کر کے کالج میں داخل ہو جانا بہت اہم ہوتا ہے؟
ـ یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایک کلاس کے بعد دوسری میں جانا ـــ
ـی ادارے بھی اکثر بدلتے رہے ہیں ـــ دو سال پہلے
ـدوسرے شہر میں تھے ـــ وہاں میرا داخلہ جس اسکول
ـہوا تھا، وہیں تو روزی میری بنچ کے آگے بیٹھتی تھی۔

عجیب ہے روزی بھی ـــ آگے سے جتنی بدصورت
ـنوار لگتی، پیچھے سے اتنی ہی خوبصورت نظر آتی۔ اس کی
ـن ـــ گردن سے نیچے جمپر کے گلے کی گہری تراش
ـــ اور اس کے دونوں جانب لٹکتی چوٹیاں ـــ
ـی کی چوٹیاں، چھوٹی بہن نکّی کی چوٹیوں سے کتنی مختلف
ـں ـــ نکی کے گھنے بالوں کی موٹی موٹی کالی چوٹیوں کو
ـکر گھوڑے کی دُم یاد آجایا کرتی تھی ـــ میں تو اکثر یونہی
ـدیا کرتا تھا ـــ مگر روزی کے بالوں کو گندھا ہوا
ـکر لگتا جیسے اِن پیچوں کے بیچ کچھ عجیب راز سا ہے ـــ
ـں آہستہ آہستہ، چپکے سے اس کی چوٹی کھول دوں ـــ
ـیانک، جو کچھ ان میں لپٹا ہوا ہے، آن گرے گا ـــ
ـر روزی بھی جانتی تھی کہ وہ پیچھے سے کتنی اچھی ہے۔ اسی
ـمبر، اسکیل، پنسل، حتیٰ کہ کتاب تک وہ پیچھے مڑے بغیر،
ہاتھ بڑھا کر مانگ لیا کرتی ـــ اور میں چپ چاپ بڑھا
دیتا ـــ

پتہ نہیں روزی نے کہاں ـــ کس کالج میں داخلہ لیا
ہوگا؟ ـــ یہ کالج کی زندگی بھی کتنی عجیب سی ہے۔ آزادی بھی ـــ
اور اس کے تحفظ کا احساس بھی ـــ کلاس نہ جاؤ، تو بھی کوئی نہیں
کچھ کہتا ـــ مگر جانا تو ہے ہی ـــ اور پھر پڑھائی کا
معیار کتنا اونچا ہے ـــ خصوصاً رحمٰن صاحب کی شخصیت
تو طلسمی لگتی ہے ـــ پڑھاتے ہیں تو لگتا ہے ذہن ان دیکھے
جزیروں کی سیر کر رہا ہے ـــ اتنی علمیت ـــ اتنی بصیرت
اور ایسی گہرائی ـــ اچانک وہ اگر کوئی سوال کر دیتے ہیں
تو جواب جانتے ہوئے بھی میری آواز رک جاتی ہے ـــ
میں کچھ نہیں پاتا اور پھر جب بیچ بیچ میں وہ کسی بات
پر ہنس پڑتے ہیں تو لگتا ہے انھیں صرف ہنسنا ہی چاہیے ـــ
ہنستے رہیں اور دیکھا کروں ـــ اتنا قاتل انداز ـــ
ایسی ہنسی ـــ اُف ـــ

گھر کے لوگ بھی عجیب ہیں ـــ شاید و باید کبھی تقریب
ہوئی بھی تو گھر مہمانوں سے بھر گیا ـــ دُور دیہات سے
لوگ لدلد کر چلے آرہے ہیں ـــ صرف اس لیے کہ بھیا کی
شادی ہے ـــ اگر نئے ڈھنگ سے، صاف ستھری سی
کوئی تقریب منعقد کی جاتی تو میں رحمٰن صاحب کو ضرور مدعو

کرتا ــــ وہ یقیناً آتے ــــ ان کے اندر اتنا خلوص ہے
کہ انکار کر ہی نہیں سکتے ــــ مگر تقریب اب کہاں ممکن
ہے؟ ــــ ایک بجیا کی شادی تھی وہ تو ہو گئی ــــ

بجیا بھی شادی کے بعد کتنی بدل گئی ہیں مجھ پر پہلے
سے زیادہ توجہ دینے لگی ہیں ــــ میرے کپڑوں پر آئرن
کرنا بستر کی چادریں بدلنا ــــ وقت پہ ناشتہ
لگوانا ــــ اور بات بات پہ کہتی ہیں۔

"اب مجو کالج جانے لگا ہے میرا مجو کالج اسٹوڈنٹ
ہے بھئی" ــــ

مگر نہ جانے کیوں بجیا کی باتیں اب مجھے نقلی اور
پرائی لگنے لگی ہیں ــــ بلکہ وہ تو مجھے عین اس خوشبو کی طرح
لگتی ہیں ــــ وہی خوشبو جو حنائی مہک کی طرح میرے
پیچھے پڑ گئی تھی ــــ ہوا یہ تھا کہ ان کی شادی کے روز
میں نے کھلے ہوئے بیلے کے کئی موٹے موٹے ہار پہن لیے تھے۔
اتنے ڈھیر سارے رکھے ہوئے جو تھے اور شادی
کے دوسرے دن، بجیا کی رخصتی کے بعد، جب میں نہانے
گیا، وہی باسی مہک، کرتے اور بنیان کے بدلے، میری گردن
سے اٹھتی ہوئی محسوس ہونے لگی ــــ کئی بار صابن ملنے کے
بعد بھی وہ مہک باقی رہ گئی تھی اور کئی دن تک طبیعت عجیب
بدمزہ، اور سہمی ہوئی رہی جیسے چرائی ہوئی مہک، وہی مسلی
ہوئی خوشبو اب بھی، مسلسل میرے جسم سے اٹھ رہی ہو ــــ
بالکل ایسا ہی تو لگتا ہے، بجیا کی ساری باتوں کے پیچھے وہی
انجانا سا احساس ہوتا ہے، اسی خوشبو کی طرح، جیسے فیروز
بھائی کا وجود میرے اور بجیا کے درمیان آگیا ہو ــــ
بجیا کے بولنے کا انداز ــــ ان کا اٹھنا بیٹھنا ــــ حتیٰ کہ
ان کا لمس تک مجھے گھن اور خوف کا مشترکہ احساس دینے
لگتا ہے۔ جیسے سب کچھ قیمتی بھی ہو اور باسی بھی ــــ

مگر باسی کھانے اچانک اچھے لگنے لگے ہیں۔ کالج
جاتے ہوئے، نہ جانے کیوں جی چاہنے لگتا ہے، اگر رات
کی روٹی مل جائے تو نعمت ہے ــــ کالج سے واپسی کے
بعد خیال ہوتا ہے، اگر کھانا ٹھنڈا ہے اور گرم کر کے نہ دیا جائے
تو یقیناً بڑی عنایت ہوگی ــــ مگر میں کہہ بھی تو نہیں سکتا
کوئی وجہ بھی تو نہیں کہ ایسا کیوں لگتا ہے ــــ مگر ایسا لگتا
ہے۔ میں کس سے کہوں۔؟ ــــ میں خود بھی تو نہیں جانتا
ــــ اگر امی کو ہی چپکے سے کہہ دیا تو وہ صحت اور تعلیم
کی ہم آہنگی سے متعلق وہ لکچر دیں گی کہ بس توبہ ہی بھلی ــــ
ہاسٹل کے راشد اور واصف کتنے مختلف ہیں ــــ
انھیں کسی کے لکچر نہیں سننے پڑتے بس اپنی مرضی سے جیتے
ہیں ــــ کل تو وہ مجھے بھی زبردستی سنیما دکھانے لے گئے
ــــ رحمٰن صاحب چھٹی پر تھے۔ بقیہ لوگوں کے کلاس چھوڑنے
کا احساس کم تھا یا سنیما جانے کی خوشی زیادہ میں تو بہر حال
ان کے ساتھ چل دیا ــــ فلمیں تو فیروز بھائی نے بھی
دکھائی تھیں ــــ فرسٹ ڈیویژن میں میٹرک پاس کرنے
کے بعد امی نے دکھائی تھیں ــــ . . . . . .
. . . . ــــ مگر یہ دوستوں
کے ساتھ جانے کا پہلا اتفاق تھا۔

اچھی سی سنجیدہ فلم تھی ــــ مگر وہ دونوں شاید فلم
دیکھنے آئے ہی نہیں تھے ــــ سامنے کی قطار میں چند لڑکیاں
تھیں جن کے ساتھ، ایک بوڑھی عورت تھی ــــ شاید
وہی انھیں لے کر آئی تھی۔ جیسے ہی فلم شروع ہوئی ــــ
راشد اور واصف نے سامنے کی سیٹوں پہ پاؤں ٹکا دیے
ــــ لڑکیاں پہلو بدلنے لگیں۔ ان میں سے ایک نے
مڑ کے دیکھا تو واصف نے کنکھی مار دی ــــ میں پسینے
پسینے ہو گیا ــــ

" واصف ـــــ کیا کرتے ہو ـــــ میں جا رہا
ں "ـــــ

واصف نے میرے بازو تھام کر ایسے رازدارانہ
ں کہا جس میں مکاری اور عیاری چھپی تھی ـــــ

" ارے یار ـــــ زندگی کے معنی بتا رہا ہوں "

ـــــ لہجے کے ننگے پن سے میں یوں شرمسار ہوا کہ سامنے
ین پہ نظریں جما دیں ۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پھر عجیب
ی سی ہوئی ـــــ میں نے دیکھا، راشد اپنے سامنے
کی کے پیروں میں اپنے پاؤں الجھانے میں مصروف
ـــــ

اچانک مجھے روزی یاد آنے لگی ـــــ روزی کی
ن ۔ اس کے جمپر کے گلے کی تراش ـــ اس کی دو چوٹیاں
میرے سامنے تھیں ـــ ۔ اور میری نظر ہٹتی ہی نہ تھی
ـ بس جی چاہنے لگا سنہرے مخمل کے اس الٹے لپٹے
ے رول کو چھو کر دیکھوں ـــــ

وہ دونوں انٹرول سے پہلے باہر چلے گئے ـــــ میں
ا ـــ واصف نے باہر نکل کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ۔

" دام وصول " ـــــ

مجھے ان کا یہ ریمارک بہت نامانوس، گھٹیا اور چھچھلا
ـــــ پھر بھی محسوس ہوا جیسے اس ریمارک کی حیثیت سنیما
یلے پہیے کی طرح ضرور ہے، جسے دیکھتے ہوئے صبر
یں ٹوٹنے لگتی ہیں اور خواہش ہوتی ہے، جلدی سے
آ جھے ـــــ اور فلم نظر آئے ـــــ ان دیکھی ـــــ
، دلچسپ اور قیمتی فلم ـــ

انٹرول کے بعد اندھیرا ہوتے ہی راشد اور
ت نے پھر اپنی حرکتوں کا آغاز کر دیا ـــــ بلکہ واصف
ر مجھے عجیب سے اشارے کرنے لگا ـــــ مبہم اشارے!

ـــــ مگر میں کچھ نہ سمجھ سکا ـــــ اور صرف مخمل کے
رول کی نرمی محسوس کرتا ہوا فلم دیکھنے لگا ـــــ

جب پکچر ختم ہو گئی اور سارے لوگ اٹھنے لگے،
تو راشد مجھے بھیڑ میں بے تحاشا گھسیٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا ۔

میں نے اسے روک کر کہنا چاہا ـــــ

" اتنی جلدی کیوں ہے ـــــ کیا پاکٹ ماری
ہے کسی کی " ـــــ

مگر وہ مجھے یوں گھسیٹ لے گیا کہ میرے الفاظ گھٹ
گئے ـــــ اور رنگا میں کسی لڑکی سے اس بڑی طرح ٹکرا
گیا کہ وہ مجسم میرے اوپر آ گری ـــــ

وہ باسی مہک ـــــ وہ مخمل کے رول ـــــ وہ
پیروں کا الجھانا ۔ جیسے نیوز ریل اچانک ختم ہو گئی ـــــ
اور میں فلم ـــــ واقعی فلم دیکھنے کے لیے بے چین
ہو اٹھا تھا ـــــ

راشد اور واصف مکاری سے مسکرائے اور
مجھے نہ جانے کن تنگ اور تاریک گلیوں کی طرف
گھسیٹ لے گئے ـــــ

بدیع الزماں خاور صاحب کے ایک حالیہ خط سے
یہ افسوسناک خبر ملی کہ کوکن کے بزرگ شاعر
حضرت آزاد لوجی جن کا ایک مجموعۂ کلام "برگ سبز"
کے نام سے چند برس پہلے شائع ہوا تھا ۱۶ مارچ
کو تو ٹریل ضلع قلابہ (مہاراشٹر) میں انتقال کر گئے ۔ وہ
ڈھائی ماہ سے بیمار تھے اور ڈاکٹروں نے چند روز قبل
ہی انھیں سرطان بتایا تھا ۔ ہم مرحوم کی مغفرت کے
لیے دعا گو ہیں ۔

خلاؤں کے گمنام مسافر

فاروق راہب

انگنت زلزلوں کے انگنت جھٹکوں نے انھیں مسمار کر دیا تھا!

سُرخ، دہکتا سورج اپنی تمازت کھو کر شام کی سیاہ بانہوں میں پھنسا ہوا خود تماشائی بن کر اپنے بجھنے کا تماشا دیکھ رہا تھا اور کالی پرچھائیوں کی بھیڑ خوف کی بے آب تلوار لیے اس پر حملہ آور ہونے سے پہلے ہی آب دیدہ تھی کہ کسی کے مٹ جانے کا تماشا ان کی آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں!

"اپنے آدرشوں کے وہ سارے منار آخر تم نے گرا ہی دیے، جن کی بلندیوں پر تمہاری پرواز کے پنکھ ٹکے تھے۔"

"نہیں، خود کو مٹا کر میں نے حقیقت کو گھائل ہونے سے بچایا ہے!"

ہوا کے پالیوں پر کھڑے خیالی مکانوں میں قید بے آتما جسموں پر ناچتی ہوئی دہشتوں سے زندگی کی تمام علامتیں چھن چکی تھیں اور کنکالوں پر آباد شہرِ نگاراں کی اُکھڑی سانسوں کی سسکیاں سننے والا کوئی نہ تھا!

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں ——— میں سیّد جمیل احمد ——— نہیں پہچانا؟ میں سیّد اقبال احمد کا چھوٹا بھائی ——— نہیں!؟ تو آپ چھوٹے کو ضرور جانتے ہوں گے جن کی ذہنی حالت زمانے کی اُلجھنوں کا شکار ہو گئی ہے ——— نہیں؟ تو آپ سیّد پرویز کو جانتے ہوں گے جو تاج سائیکل اسٹور کے ——— انھیں بھی نہیں! اچھا تو ڈاکٹر سہیل؟ نہیں! سیّد شہاب الدین یزدانی کو جو ایگزیکٹیو کے ایس، ڈی، او ہیں؟ نہیں! اُف، اُف!! اچھا ڈاکٹر سیّد احمد؟"

"اب خاموش بھی رہو! پہچان کے تمام رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ اس لیے کہ جسموں سے نکلنے والی شعاعوں نے اپنا زاویہ بدل لیا ہے۔"

"لیکن میں ——— !"

"کچھ نہیں! جاؤ اور مایوسیوں کے دہالے میں خود کو چھپا لو کہ امیدوں کی روشنی کوچ کر چکی ہے۔"

گمنام خدا کی پرستش کی دوڑ میں اتنے طاقتور خداؤں نے جنم لیے کہ تباہ حال انسان کی بند مٹھیاں اپنے مسیحا کی تلاش میں اوپر اٹھیں اور بے آواز چیخ پکار سے جب فرضی عرش کے تمام سومی پائے پگھل گئے تو خون سے رنگا ہوا مسیحا آیا اور ان کے شریر میں پانی بھر جانے والا لہو بھی لیتا گیا!

"ہاں، تو بھائیو! ایک تین برس کا لڑکا گم ہو گیا ہے۔ رنگ سانولا، بلو ہاف پینٹ، سفید قمیض، سفید جوتے، سفید موزے ——— ہاتھ میں اسکول کتابیں لے جانے والا بکس ——— کل شام سے غائب ہے۔ جن جن کو بھی وہ لڑکا ملا ہو۔ وہ اسے آرزو ٹیلرس میں پہنچا دیں۔

پہنچانے والے کو سو روپیہ انعام دیا جائے گا۔"
رکشا میں بندھا ہوا لاؤڈ اسپیکر چیختا رہا، لیکن اسے
وہ لڑکا نہ مل سکا، جس کی اسے تلاش تھی! —— اور جھیل
کے خاموش سینے پر ایک بچے کی لاش کی بدبو پھیل رہی تھی!
موسلا دھار بارش اور طوفان کے درمیان کپکپاتی بوڑھی
رات کے اس جگنو کو جانے کس نے نگلا تھا!!
"قیامت جلد ہی آنے والی ہے۔"
"ڈریں وہ، جنھوں نے قیامتیں نہیں دیکھی ہیں"۔
ریگزاروں میں لہلہاتے سبزہ زاروں پر بکھرے
کانٹوں سے اب کون رگڑے گا؟! سنسان ہواؤں کے
درمیان نہ بھٹکا ہوا کوئی دیوانہ، کہیں دور ہی سے آتی
ہوئی نہ کوئی صدا —— بس گھنگور ظلمتوں کے
نیچے اپنی گھٹتی آرزوؤں کے جلنے کا دردناک منظر! اور
۔ بجھنے والی خاموش بے حس دیواروں پر کھنچی گئی بے مطلب
ناقابلِ فہم لکیریں۔ جو ناہموار راستوں کی خندقیں پھاند کر آنے
والوں کے لیے مزید الجھنوں کا سبب بن جاتی ہیں۔
'جے گرو دیو نام پرماتما کا'۔
'۳۱ مارچ ۱۹۸۱ء میں یگ پریورتن'۔
'ستیہ یگ آنے والا ہے'۔
'عورت اور مرد۔ بس یہی ایک صحیح رشتہ ہے۔
باقی رشتے بناوٹی ہیں'۔
'اپنے دکھوں سے نجات چاہتے ہو تو دوسروں کے
...رسے نوچ کر اپنے اوپر چپکا لو'۔
'ہم جب تک بیکار ہیں۔ اسی طرح دیواروں کی
بے زبانی کو زبان دیں گے'۔
'سارے دکھ اپنے آپ سے مٹا دینے کے لیے
اپنے آپ پر اطمینان کر لو اور اپنے سے نیچے دیکھو، قلب
کی بے سکونی کو کچھ سکون ملے گا!'
برفانی صبح کی یخ بستہ ہواؤں نے سورج کی حرارت
چھین لی تھی! وہ صبح، جس کے انتظار میں آنکھوں نے
اپنے اندر شکست کی ساری سوئیاں چبھو لی تھیں۔ آئی

تو اس شان سے کہ ابلتا کھولتا رگوں کا لہو منجمد ہو گیا اور
حلق میں ایسے کانٹے پھنسے کہ قوتِ گویائی ہمیشہ کے لیے
سلب ہو گئی۔
پُرشور چوک کے بیچوں بیچ ایستادہ سفید مورتی کی
سفید آنکھیں، اپنی ہڈیوں پر بکھری زنجیر کے حلقوں میں
پھنسی گردنوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں، جنھیں مضبوط
ہاتھوں نے جکڑ دیا تھا۔
خود کو مٹا کر، پورے وجود کو پتھر میں منتقل کر دینے
کے بعد بھی کچھ نہ ہوا!
عشرت کی چادر کو لپیٹ کر پھینک دینے والے
جوگیوں نے سکھ کے لمحات میں پڑے تمام دکھوں کو
اپنی جھولی میں بھر کر، پیچھے کھڑی بے بس قطاروں کو سکون
کی دِشا بتائی، گیان کی شکشا دی اور خود آسمان کے کناروں
میں جذب ہو گئے۔
مگر شانتی کی فاختہ انھی پنجوں میں پھڑپھڑا رہی تھی جن
کے ناخنوں سے زہر ٹپک رہے تھے۔
اور نراشا کی چٹانوں کے نیچے کروٹ بدلتے ہوئے
کچلے جسموں کی مفلوج ہتھیلیوں پر ان کے انجام تحریر
تھے ——

وہی سب کچھ جو پہلے تھا!
کچھ بھی تو نہیں بدلا! —— ہاں، احساس کی سلیں
اپنی جگہ سے ضرور کھسک گئی تھیں۔
بادلوں کے گھوڑوں پر سوار راہبوں کے دَل آئے،
گرجے اور خوب گرجے، مگر بنا برسے ہی گزر گئے اور
برسہا برس کی مرجھائی بے نور آنکھوں کی سیپ میں کوئی
موتی نہیں جھلملایا۔ تاریکیوں کی وہی صدیوں پرانی جنگ
اپنے آپ سے نبرد آزما، اپنی پرچھائیوں کے سینے میں خنجر
گھونپ گھونپ کر زندگی کی ہر بازی بغیر داؤ لگائے
ہی ہار جانے والے لوگ، اپنی بے کفن لاشوں پر
قہقہہ لگاتے ہوئے دوسروں کی تکلیف اور موت
پر اپنا خونِ جگر بہاتے ہوئے لوگ! —— مگر تباہ حالی

کی داستان سُننے والا کوئی نہیں !

روشنی، روشنی ۔
جگمگاتے شہر کی اندھی گلیوں میں ٹھوکر کھاتی ہوئی آوازیں ۔
ہاں، ہاں ۔ آئے گی، آئے گی ۔
بلوریں فرش پر تھرکتے ہوئے قدموں کی چاپ ۔
مگر فضا کی مکروہ باہوں میں جھولتی ہوئی کراہوں کو
پامالی کے سوا کچھ نہ ملا !
اپنے دُکھتے کاندھوں پر سُنہرے خوابوں کے محل
تعمیر کر دینے کے بعد انھیں انعام میں ناکام مسافرت ملی ۔
بے گھر، بے جسم انھیں چلتے جانا تھا ۔
اطراف میں پھیلی سیاہی سے لڑتے، منوں زہریلے
دُھویں کو سینے میں آتار سے بجھ بجاتی گلیوں میں دکھ سسر
رہے تھے ۔

وقت نکل جانے کے بعد وہاں کوئی بھی تو،
نہیں آتا — !
نہ روشنیوں کے ٹھیکے دار ۔
نہ مؤرخ ۔
نہ پہرے دار ۔
ہاں بس وہی کبھی کبھار کوئی ٹوٹا کہانی کار آتا ہے
اور اپنے درد سے بھرے کشکول کو چھپاتے، ان کے
پہ درد کشکول میں قلم کے سہارے آترتا ہے اور کاغذ وا
پر بکھر جاتا ہے ۔
مگر اس سے دونوں کو کیا ملا ؟
وہی بے سکونی کے سمندر میں سکون کی دو چار
بوندیں اور بس !

تبصرے

آڑی ترچھی لکیریں

مصنف: ستیش بترا۔ صفحات: ۲۴۰۔ قیمت: دس روپے۔ پنجابی پستک بھنڈار۔ دلی ۶۔ اور نامی پریس لکھنؤ ۳ سے طلب کی جاسکتی ہے۔

ستیش بترا صاحب اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے ادبی رسائل میں برسوں سے شائع ہورہے ہیں اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے افسانوں کے دو مجموعے بھی چھپے ہیں اور ایک ناول بھی کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

ستیش بترا صاحب اپنے افسانوں کا تانا بانا روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے بنتے ہیں، ان واقعات میں کوئی خصوصیت نہیں ہوتی لیکن بترا صاحب انھیں ایک خاص ترتیب دے کر ان کی اس معنویت کو نمایاں کردیتے ہیں، جو انھیں الگ الگ دیکھنے کی صورت میں خود کو منکشف نہیں کرتی۔ بترا صاحب کے قلم کی ایک خصوصیت کردار نگاری بھی ہے۔ کرداروں کی پیشکش میں وہ ان نفسیاتی عوامل کی طرف بھی اشارے کرتے جاتے ہیں جن کے زیر اثر یہ کردار اپنے دائرہ کار کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"ایک کامیاب کلاکار کی چاہے وہ ڈرامانگار ہو یا کہانی کار یا پھر ایک ناول نویس اپنی کوئی ذات نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جب تک اپنے آپ کو مکمل طور پر بھلا کر اپنے کرداروں کی ذات میں مدغم نہیں کردیتا وہ کامیاب کہلائے جانے کا حقدار نہیں ہے"

بترا صاحب صاف ستھری زبان لکھتے ہیں لیکن کہیں کہیں وہ ایسی غلطیاں کر گئے ہیں جن پر فوراً ہی نظر رکتی ہے۔ مثلاً پیش لفظ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "تاکہ زندگی انفرادی اور سماجی طور پر زیادہ پر معنی، زیادہ لطف اندوز اور رہنے کے قابل بن سکے"۔ خط کشیدہ الفاظ کا یہاں کوئی محل نہیں۔ آگے چل کر ایک جملہ یہ نظر پڑتا ہے "آپ کو جب کبھی کوئی لرزش نظر آئی ہے آپ نے اس کی طرف میری توجہ دلائی ہے"۔ یہاں "لرزش" کی جگہ "لغزش" کا لفظ ہونا چاہیے تھا۔

——— مخمور سعیدی

انتخاب غزلیات

ناشر: مسکین بکڈپو۔ موتی ڈونگری روڈ۔ جے پور۔ (راجستھان) صفحات: ۱۹۲۔ قیمت: دس روپے۔ مرتب کا نام درج نہیں۔

یہ کتاب اردو کے بی۔ اے اور ایم۔ اے۔ کلاسوں کے طلبہ کی ضروریات کو سامنے رکھ کر ترتیب کی گئی ہے اور اس میں ولی دکنی سے فراق گورکھپوری تک ایسے شعرا کی غزلیں شامل کی گئی ہیں جن کا کلام مختلف یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں داخل ہے۔ ابتدا میں غوث شریف عارف کا دیباچہ ہے جس میں غزل کی فنی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور انتخاب میں شریک شعرا کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اردو میں کتابت اور طباعت کا معیار بالعموم اطمینان بخش نہیں لیکن نصابی ضرورتوں سے جو کتابیں چھاپی جاتی ہیں وہ ناشرین کی اور بھی زیادہ بے توجہی کی شاکی نظر آتی ہیں حالانکہ ان میں صحت متن وغیرہ کا خاص طور پر خیال رکھا جانا چاہیے زیر نظر کتاب بھی کتابت کی غلطیوں سے بھری ہوئی ہے اور

چھپائی بھی خراب ہے۔

———— رزاق ارشد

آس نراس کی شام

مصنف: بھگوان داس اعجاز۔ ناشر: سطور پرکاشن، دلّی گیٹ، دلّی ۶۔ قیمت: سات روپے۔

پاکستانی نقاد سید مظفر علی نے ایک جگہ لکھا ہے ————

"دوہے کا رواج اپنی جگہ ہمارے لیے ایک تنبیہ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم عربیت اور فارسیت میں بہت آگے نکل گئے ہیں اور زبان کے دیسی پن کو بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ ہم پر واضح کرتا ہے کہ میر اور سودا سے پہلے نانک اور کبیر نے اس زبان کی داغ بیل ڈالی تھی، جسے ہم آج اردو کا نام دیتے ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے ہندوستانی کلاسکی شاعری کا ایک بڑا حصہ، جس پر پہلا حق اردو کا تھا، گنوا دیا ہے اور نانک، کبیر، رحیم اور میرا وغیرہ کی شاعری ہمارے ادب سے باہر رہی ہے۔

پیشِ نظر کتاب جناب بھگوان داس اعجاز کے دوہوں پر مشتمل ہے جو غالباً اردو میں دوہوں کی پہلی کتاب ہے۔ یہ دوہے ذہن اور زمین کے رشتے کی استواری کی تائید کرتے ہیں دوہے کی فضا حسن و عشق کے سوز و گداز سے معمور ہے۔ محبوب قریب ہو یا بعید ———— اعجاز کے دوہے ہر وقت ساتھ دیتے ہیں۔

چند دوہے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ————

دُنیا تھک گئی پوچھ کر ہے سدا ہم مَون
سمجھے گا تیرے سوا من کی بھاشا کون

کل سب کچھ وہ لے گئے اب ہے سوچ وچار
آج ملیں گر خواب میں تو کیا دوں اُپہار

وہ چنچل کل شام کو لیے ہاتھ میں ہاتھ
لوک لاج کو تیاگ کر نا چی میرے ساتھ

کتنا لمبا ہے سفر کیسے آؤں پاس
تیرا میرا فاصلہ دھرتی اور آکاس

اس کتاب کے دیباچے میں جناب مخمور سعیدی نے اعجاز کے دوہوں کو سراہا ہے۔ جناب گوپال متل صاحب کی رائے بھی قابلِ ذکر ہے کہ اعجاز نے اردو میں ایک نئی صنفِ شاعری کو استحکام دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک نئی بحر سے بھی روشناس کرایا ہے۔

———— چندر بھان خیال

بالک باغ

مصنف: محوی صدیقی لکھنوی، مرتب: منیر المحوی، قیمت: چھ روپے، صفحات: ۱۴۴، ناشر: معیار بکڈپو۔ بھوپال۔

بچوں کے لیے لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے۔ جیسا کہ عبدالقوی صاحب دسنوی نے دیباچہ میں لکھا ہے "شاعر کو تجربہ کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے بچوں کا مزاج داں اور زبان داں ہونا چاہیے۔ ان کی پسند ناپسند، نفرت کے جذبوں سے آگاہ ہونا چاہیے اسے اس کا تجربہ ہونا چاہیے کہ کیا باتیں بچے دلچسپی سے سنیں اور سمجھیں۔۔

پھر ہر عمر کے بچوں کے لیے موضوعات اور زبان کا لازم ہے ہماری زبان میں اوّل تو بچوں کا ادب بے حد مختصر اور جو ہے بھی تو ایسا کہ سات سے ساٹھ سال تک کے بچوں کے لیے کارآمد مانا جائے۔ دو نام اسمٰعیل میرٹھی اور شفیع الدین نیر کے ہیں جنھوں نے اپنا کل وقت بچوں کے لیے لکھنے پر صرف کیا۔ غالب کا قادر نامہ۔ نظیر اکبرآبادی کی کچھ نظمیں راجہ مہدی علی خاں اور حامد اللہ افسر کی نظمیں۔ حالی۔ آزاد، اکبر، حفیظ اور جوش کے کچھ اشعار اقبال کی دو تین نظمیں بس یہی ہے کل متاع۔ ایسے میں بچوں کے لیے ۷۲ نظموں کا مجموعہ آجانا بھی غنیمت ہے۔ ان نظموں میں بچوں سے خلوص اور پیار کا اظہار ہے اور ان کو نیک، خوش اطوار اور سچا انسان بنانے کی خواہش بھی۔

"بالک باغ" کی طباعت صاف ستھری ہے اور مرتب نے اس کو سجانے سنوارنے میں محنت کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ———— اس مجموعہ کو محوی صاحب نے ترتیب دیا تھا۔ مصنف کا لکھا دیباچہ جو اس کتاب میں ہے رزاقی صاحب

بزمِ احباب

● تحریک تقریباً ۱۹۶۲ء سے میرے مطالعہ میں ہے اور ہر شمارے نے میرے شوق کو مہمیز کیا ہے۔ محترم گوپال متل صاحب کے شذرات نے ہر بار میری پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لی ہے۔ خصوصیت سے "اسلام اور کمیونزم" پر۔ اُن کی ہر تحریر پر "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" کی دعا دل سے نکلتی ہے۔ تازہ شمارہ (مارچ ۷۹ء) میں بھی اِس موضوع پر انھوں نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ "مسلمان کمیونسٹوں کی چالیں خوب سمجھتے ہیں اور اس جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں جو نورالدین کبوتری جیسے لوگ ان کے لیے بچھاتے ہیں"۔ مسلمانوں میں اس طرح کا شعور پیدا کرنے میں جہاں حضرت مولانا مودودی اور دوسرے مفکرینِ اسلام کی تحریروں کا دخل ہے وہاں محترم گوپال متل صاحب کی تحریروں نے بھی بھرپور حصہ لیا ہے۔

★ ——— صابر فخرالدین بادگیری

● منشی جنگ بہادر میرٹھی پر مشتاق شارق کا مضمون عجب ہے مگر لاہور سے جو اخبار شایع ہوا کرتا تھا اس کا نام "عام" تھا۔ "عالم" نہیں تھا۔ مضمون میں سرور جہاں آبادی شاگردِ میاں یزدانی کے بارے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ انھوں نے مشہور آریہ سماجی پنڈت لیکھرام کے قتل پر ایک دردناک نظم لکھی تھی مگر اس نظم کا کوئی شعر بطور نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔ یاد ہے پنڈت لیکھرام کا قتل ۶ مارچ کو مرزا غلام احمد قادیانی بانیِ جماعت احمدیہ کی پیشگوئی کے تحت ہوا تھا اس کا اظہار مرزا غلام احمد نے اپنی ایک نظم میں یوں کیا تھا ؎

جس کی دُعا سے آخر لیکھرام تھا کٹ کر
ماتم پڑا تھا گھر گھر وہ میرزا یہی ہے

بہر حال مضمون کی دلچسپی کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ سرور جہاں آبادی کی نظم کا کوئی شعر درج کیا جاتا۔

★ ——— خان غازی کابلی۔ دہلی

● تازہ تحریک کے افسانوی حصّے میں شفق اور عطیہ پروین نے بے حد متاثر کیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس سے قبل بھی عطیہ پروین صاحبہ کا ایک افسانہ "کنٹھ مالا"۔ "تحریک" میں شائع ہوا تھا۔ "سفید سانپ" بھی اسی قبیل کا افسانہ ہے۔ عطیہ پروین کو اس نوع کے محسوساتی افسانے لکھنے پر قدرت حاصل ہے۔ میری طرف سے بہت بہت مُبارکباد۔ غزلوں میں مندرجہ ذیل اشعار خصوصاً پسند آئے ؎

چیخیں ہماری دوشِ ہوا سے اُتار لو
ہم مَر چکے ہیں اپنی صدا کے جہاد میں

(مصوّر سبزواری)

اگر آنکھیں وہاں برسیں تو عالم ہی نیا ہوگا
سرِ محفل جہاں چھلکا نہ ہو پیمانہ برسوں سے

(عروج زیدی)

مصوّری ہے گپھاؤں میں آج بھی جاری
یہ دور میرے تمہارے لیے مشینی ہے

(اختر نظمی)

★ ——— رونق گیاوی، بہار

● "سمالی دھرتی کی غزلیں" پر خلیق الزماں سحر کا تبصرہ تحریک کے مارچ ۷۹ء کے شمارہ میں پڑھا۔ اسی تبصرے میں شان بھارتی کے دو اشعار ان کی شاعری کی وضاحت کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے اس شعر پہ تبصری

نظر کی ہے

کیا بیاں تم سے کروں خود میں حقیقت اپنی
کسی شیشے پہ برستا ہوا پتھر دیکھو

برسات ایک پتھر کی نہیں ہوتی۔ ایک پتھر تو صرف گر سکتا ہے۔ اگر دوسرے مصرعے کو شان بھارتی نے اس طرح کہا ہوتا ہے

کسی شیشے پہ برستے ہوئے پتھر دیکھو

تو شعر کا فنی ضعف بھی ختم ہو جاتا اور مفہوم کی وسعت میں بھی اضافہ ہو جاتا۔ کیا شاعر یا تبصرہ نگار مجھے مطمئن کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

★ —— سبط اصغر رضوی نئی دہلی

● حمید الماس صاحب کی کتاب "شب گرد" کے تعلق سے جناب صابر فخر الدین کا جو خط چھپا ہے۔ وہ غلط ہے۔ کنڑا کے مشہور شاعر شری بسویشور کے وچنوں کا ترجمہ سب سے پہلے حمید الماس صاحب نے ہی کیا ہے بسواپی جنگلور نے ۱۹۶۵ء میں ایک پریس نوٹ شائع کرایا تھا کہ بسویشور جی کے وچنوں کے تراجم کی ضرورت ہے، دلچسپی رکھنے والا شاعر، پانچ وچنوں کا ترجمہ نمونہ کے طور پر بھجوائیے۔ جناب حمید الماس نے جو نمونے (منظوم تراجم) بھجوائے تھے وہ بے حد پسند کیے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۰۸ وچنوں کے تراجم کا مسودہ ۱۹۶۷ء میں بی ڈی جتی صاحب کو گلبرگہ میں پیش کیا، انھیں جو اُن دنوں بسوا سمیتی کے صدر تھے۔ یہی چیز الماس صاحب نے "فرمودات" کے نام سے کتابی شکل میں شایع فرمائی ہے جس پر آپ نے بھی تبصرہ فرمایا ہے۔

حمید الماس صاحب کے منظوم ترجمہ کے بعد حیدرآباد کے شری مدنور کر صاحب نے انہی وچنوں کا نثر میں ترجمہ کیا جس پر حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر راگھویندر راؤ جذب عالمپوری نے نظرِ ثانی فرمائی تھی۔

★ —— ماہر منصور ٹمکور

● مارچ کے "تحریک" میں ابن النصیر انور صاحب نے درست ارشاد فرمایا کہ احمد عثمانی کا مضمون شایع کر کے آپ نے "تحریک" کے تین صفحات ضایع کیے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے دس پندرہ برسوں میں بلراج مینرا اور سریندر پرکاش ہی وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اعتبار پیدا کیا ہے!

لیاقت ندیم صاحب کے بات ٹھوری بلراج مینرا، سریندر پرکاش کو برا بھلا کہنے سے کوئی حاصل نہیں۔ جن افسانہ نگاروں کا لیاقت ندیم صاحب نے ذکر کیا ہے انھیں اب تک اظہار پر بھی دسترس نہیں ہے افسانے لکھنا تو دور کی بات ہے! پتہ نہیں ان افسانہ نگاروں کو خود چھپوانے کی ایسی کیا جلدی پڑی ہے جبکہ اس کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔

قمر احسن، شوکت حیات، حسین الحق اور شفق کی تحریروں سے ذہانت کا پتہ تو ضرور چلتا ہے لیکن یہ سب اس وقت تک بہتر نہیں لکھ سکتے جب تک خود ساختہ "پوز" سے چھٹکارا حاصل نہ کر لیں! اور اپنے میڈیم کا صحیح عرفان نہ حاصل کر لیں! ان افسانہ نگاروں کو اپنے پیش روؤں (بیدی، منٹو، قرۃ العین حیدر، غیاث احمد گدی، اقبال مجید، انتظار حسین، انور سجاد، بلراج مین را، اور سریندر پرکاش) کا عمیق مطالعہ بھی کرنا چاہیے کہ جس کے بغیر وہ اردو افسانے کے سفر کو آگے بڑھا ہی نہیں سکتے۔ اور جس کے فقدان کی وجہ سے ان کی تحریریں طفلانہ معلوم دیتی ہیں۔

لیاقت ندیم نے اپنے خط میں مہدی جعفر صاحب کے مضمون کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے جس میں معاصر ادیبوں کو "ادوار" میں تقسیم کیا گیا ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کیا ادب میں بھی اب تین اور پانچ سال کے ادوار ہونے لگے ہیں کیا اس سے مضمون نگار کی بچکانہ ذہنیت آشکار نہیں ہوتی! دراصل المیہ یہی ہے کہ آج کل رسائل میں ناپختہ ذہنوں نے وہ اودھم مچا رکھا ہے کہ ادب کا سنجیدہ قاری بیزار سا ہو گیا ہے

میں نہ صرف آپ سے بلکہ اس تحریر کے توسط سے مدیران "آہنگ" "الفاظ" "شب خون" اور "جواز" سے گزارش کروں گا کہ ادھ کچی تحقیقات اور مضامین کی اشاعت سے احتراز کریں کہ اس سے قاری کو یقیناً بد ہضمی ہو سکتی ہے —!

★ —— حفیظ آتش، بمبئی

● تحریک مارچ ۱۹۷۹ء میں، بزمِ احباب میں جناب لیاقت ندیم کا خط شائع ہوا ہے۔ وہ خط بہت سی جگہوں پر میری موافقت میں ہے۔ اور کچھ حصّے ایسے ہیں جو اختلاف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں انھیں کی بابت ندیم صاحب اور قارئینِ تحریک سے گفتگو کروں گا۔

۱۔ ہماری تنقید پیچھے کی طرف اور ادب آگے کی طرف بھاگتے ہیں اُس کے خلاف میری یہ کمزور آواز تھی۔

۲۔ میں کوئی بھاری بھرکم مضمون نہیں لکھنا چاہتا تھا۔ (اور اب ایک بھرپور مضمون جعفر مہدی صاحب کا آچکا ہے)۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ پرانے لکھنے والوں یا قریبی لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ حقیقت کی عینک لگاکر دیکھا جائے۔ تعلقاتی، نظریاتی تنقید آدمی کو باقر مہدی بنادیتی ہے۔

۳۔ جن سات افسانہ نگاروں کی میں نے فہرست بنائی (فہرست بنانا غلط ہے) وہ بالکل ہی نیا خون ہے اور اُن کے بعض افسانے انور سجّاد، سریندر پرکاش، یا بلراج مینرا سے بھی آگے ہیں تو پھر اُن کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔

۴۔ آپ نے بھی جو فہرست بنائی ہے وہ جناب مہدی جعفر کا مضمون پڑھنے کے بعد باطل ہوجاتی ہے۔

۵۔ میں جناب لیاقت ندیم کے مطالعے کی داد دیے بنا نہیں رہ سکتا کہ جناب نے سلطان سبحانی کو جدید کی فہرست میں رکھا جبکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں سلطان نظریہ اوڑھتے ہیں، نظریہ بچھاتے ہیں اُنھیں ہر چیز میں سُرخ رنگ دیکھنا پسند ہے اگر وہ رشین امپورٹڈ ہو۔ تو کیا کہنے۔

۶۔ ایمانداری میں حد کو داخل کردیا جائے تو ایمانداری مشکوک ہوجاتی ہے میرے نقادوں سے تعلقات بھی نہیں اور میں خود بھی نہیں چاہتا کہ "کسی حد" میں مجھے افسانہ نگار آپ جیسے لوگ تسلیم کریں۔

۷۔ دراصل وہی کام باقر مہدی نے کیا، وہی کام میں نے کیا اور وہی کام لیاقت ندیم کر رہے ہیں۔

اِن سب میں میری آواز کمزور سہی لیکن سنجیدہ حضرات تو ضرور سوچیں گے۔ کہ ہم تو چیگوارہ اور سارتر

پاگر رکی کی چھتری لگاتے ہیں اور دھوپ کا مزہ لیتے ہیں اور ایک آدمی حقیقت میں دھوپ کا مزہ لیتا ہے اُس میں اور ہم میں تجربے کا فرق تو ہوگا صاحب!

★ ——— احمد عثمانی، مالیگاؤں

خبرنامہ

● غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی ہر سال اُردو ادیبوں اور شاعروں کو ادب کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر چار ایوارڈ پیش کرتی ہے۔

ان میں ایک شاعری کے لیے ہے ایک نثر نگاری کے لیے تیسرا ایوارڈ تنقید و تحقیق کے لیے مخصوص ہے۔ چوتھا کسی ممتاز ڈراما نگار کو دیا جاتا ہے۔ ہر ایوارڈ کی رقم پانچ ہزار روپے ہے۔ قارئین تحریک کو اس خبر سے مسرت ہوگی کہ اس بار نثر کا ایوارڈ "تحریک" کے مدیر اعلیٰ گوپال متل صاحب کو پیش کیا گیا ہے۔ شاعری کا ایوارڈ جناب بسمل سعیدی کو (بعد از وفات) دیا گیا ہے اور تنقید کا ظ۔ انصاری صاحب کو۔ چوتھے ایوارڈ کا ابھی اعلان نہیں ہوا ہے۔ بسمل سعیدی صاحب کے ایوارڈ کی رقم ان کے ورثا کو پیش کی جائے گی۔

● ساہتیہ کلا پریشد دلّی بھی ہر سال دلّی میں رہنے والے ممتاز فن کاروں کو مختلف انعامات پیش کرتی ہے جن میں کچھ انعامات ہندی اُردو اور پنجابی کے ادیبوں اور شاعروں کے لیے ہیں۔ اُردو کے لیے اس سال جو انعام ان کی شعری خدمات کے اعتراف میں جنابِ کرشن موہن کو پیش کیا گیا ہے۔ جناب کرشن موہن لگ بھگ دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں اور انھوں نے فنی اور لسانی سطح پر گوناگوں تجربے انجام دیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلمہ فنی آداب کا احترام بھی کرتے ہیں۔ انعام کی رقم اکیس سو روپے ہے۔

● مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین جو اب تک این سی ای آر ٹی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر (اُردو) کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ ایڈیٹر کے عہدے پر ترقی پا گئے ہیں۔ این سی ای آر ٹی نصابی کتابیں تیار کرنے والا سرکاری ادارہ ہے۔ اُردو والوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ اُردو کی نصابی کتابیں اس ادارے سے بسہولت دستیاب نہیں ہوتیں۔ کتابوں کی تیاری میں بھی تاخیر ہوتی ہے اور فراہمی کا انتظام بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین صاحب ان امور کے لیے کسی طرح ذمہ دار نہیں لیکن اُردو والے ان سے بجا طور پر توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے منصبی فرائض کی ادائگی کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی دھیان دیں گے۔

● کے۔ کے۔ کھلر صاحب کے نام سے اُردو والے ناواقف نہیں۔ وہ اُردو کے مسائل پر انگریزی اخباروں میں اکثر اظہار خیال کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اُردو کے مسائل سے ان لوگوں کو باخبر کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں جو اُردو رسم خط سے واقف نہیں۔ معاصر اُردو ادب کے بارے میں کئی اچھے تعارفی مضامین بھی انھوں نے انگریزی جریدوں میں شائع کرائے ہیں۔ موصوف مرکزی وزارتِ تعلیم میں انڈر سیکریٹری کے طور پر کام کر رہے تھے حال ہی میں انھیں ترقی دے کر ڈائرکٹر آف لینگویجز بنایا گیا ہے۔

تبصرے (بقیہ صفحہ ۴۶ سے آگے)

پر ۲۷ فروری ۱۹۷۴ء کی تاریخ رقم ہے جبکہ اس مجموعے میں ۱۹۸۱ء کی دو نظمیں بھی شامل ہیں۔ مرتب کو اپنے "پیش لفظ" میں اس کی تشریح کرنا چاہیے تھی کہ انھوں نے کتنی نظمیں اور اس مجموعے میں شامل کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ محوی صاحب نے "معذرت" کی گزارش میں لکھا ہے کہ "ابتدا میں ۱۹۱۰ء میں چند نظمیں حضرت استاذی شوق قدوائی لکھنوی مرحوم کے کہنے سے رُت برسات کی بہاریں لکھی تھیں" حالانکہ "بالک باغ" میں

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ : ۲ جلد : ۲۷

مئی ۱۹۷۹ء

ادارۂ تحریر :

☆ گوپال متل

☆ مخمور سعیدی

☆ پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے، فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج، نئی دلی ۲-۱۱۰۰۰

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ۔ نئی دلی ۲-۱۱۰۰۰

شذرات و مضامین :

امید کی روشنی

مخمور سعیدی

ابھی علی گڑھ کے فرقہ وارانہ فساد کی تکلیف دہ یادیں تازہ تھیں کہ جمشید پور میں فساد پھوٹ پڑا ۔ جمشید پور کے ہولناک واقعات کی جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہیں ۔ یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ آدمی اتنا وحشی ہو سکتا ہے لیکن بربریت اور درندگی کے اس گھور اندھیرے میں جس نے پورے شہر کو نگل لیا تھا جہاں تہاں انسانیت کے چراغ بھی روشن رہے ۔ ان میں ایک چراغ کا نام شرف الدین ہے ۔

۱۸؍ اپریل کے "انڈین اکسپریس" کے مطابق یہ نوجوان شہر کے ایک ایسے علاقے کا رہنے والا تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس کے مکان کے سامنے ایک مقامی بیوپاری امرناتھ چھبڑ کا گودام تھا جس میں دس کروڑ کی مالیت کا سرکاری سامان جو باہر سے درآمد کیا گیا تھا ، رکھا ہوا تھا ۔ فساد کے دوسرے دن ۱۲؍ اپریل کو فسادیوں کا ایک ہجوم گودام کو آگ لگانے کے ارادے سے وہاں پہنچا ۔ ہجوم کا شور وغل سن کر شرف الدین گھر سے باہر نکلا اور صورتِ حال کا اندازہ کر کے تن تنہا گودام کی حفاظت پر کمربستہ ہو گیا ۔ گودام کا مالک جو کسی دوسرے علاقے میں رہتا تھا وہاں پہنچنے سے قاصر تھا ۔ ہجوم نے شرف الدین کو مزاحمت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کسی نے آگے بڑھ کر اسے دھکا بھی دیا لیکن شرف الدین نے نہ صرف اس کو زیر کر لیا بلکہ اس نے فسادیوں سے پٹرول بھی چھین لیا اور اس شخص کے ہاتھ سے ماچس بھی جو گودام پر پٹرول چھڑک کر آگ دکھانا چاہتا تھا ۔ آخر شرف الدین کی استقامت دیکھ کر فسادیوں نے حوصلہ ہار دیا اور واپس چلے گئے ۔

ہر فرقہ وارانہ فساد کے موقعے پر ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ ایک فرقے کے لوگوں نے دوسرے فرقے کے مظلوموں کی مدد کی اور انھیں پناہ دی ۔ جمشید پور میں بھی ایسا ہوا ہے لیکن مذکورہ بالا واقعہ دو وجوہ سے بطور خاص قابلِ ذکر ہے ۔ خبریں بتاتی ہیں کہ اس فساد میں جانی نقصان بھی اور مالی نقصان بھی اقلیتی فرقے کا زیادہ ہوا ہے ۔ ان حالات میں اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان کا یہ کردار قابلِ تعریف تو ہے ہی ، دوسرے اس واقعے سے اس نکتے کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ فسادی کتنے ہی آمادۂ شر ہوں اگر امن پسند شہری ان سے خوفزدہ ہو کر گھروں میں نہ بیٹھیں اور مزاحمت کے لیے تیار ہو جائیں تو صورتِ حال کو زیادہ بگڑنے سے روکا جا سکتا ہے ۔ شرف الدین اکیلا بھی تھا اور نہتا بھی لیکن اس نے فسادیوں کی مزاحمت کی اور فسادی جو اخلاقی جرأت سے محروم ہوتے ہیں ، پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے ۔

شر پسند ہر فرقے میں ہوتے ہیں لیکن زیادہ تعداد میں نہیں ۔ اکثریت امن پسند لوگوں کی ہوتی ہے جو دنگے

فسادات سے گھبراتے ہیں اور معمول کی زندگی گزارنا چاہتے
ہیں۔ ان کا فسادیوں کی ٹولی کے سامنے بے بس ہو جانا
اور پورے شہر کو غنڈوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا اولاً
تو اس خیال کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اپنے شہریوں کے جان و
مال کی حفاظت اور نظم و نسق کی برقراری حکومت کا
کام ہے اور یہ خیال غلط بھی نہیں۔ ثانیاً کچھ اندیشے بھی
ہیں جو انھیں آمادۂ عمل نہیں ہونے دیتے۔ ضرورت اس
کی ہے کہ ان اندیشوں کی زیادہ پروا نہ کرتے ہوئے امن
پسند لوگ اخلاقی جرأت سے کام لیں اور اپنے اور اپنے
پڑوسیوں کے جان مال اور عزت آبرو کے تحفظ کے لیے جو کچھ
کر سکتے ہوں، اس سے دریغ نہ کریں۔ اس سے غنڈوں
کے حوصلے پست ہوں گے اور غنڈہ گردی کا ہدف بننے
والوں میں خود اعتمادی اور مدافعت کی قوت پیدا ہوگی۔

▲▲

آہ! ذکی انور

ان سطروں کی سیاہی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ ذکی انور کی شہادت کی خبر ملی۔
ذکی انور جو اردو کے مشہور افسانہ نگار تھے اپنی نگارشات میں ہمیشہ فرقہ وارانہ
ہم آہنگی اور قومی یکجہتی پر زور دیتے رہے تھے۔ وہ جمشید پور کے ایک کالج میں اردو کے استاد
تھے اور اپنی وسیع المشربی اور مرنجاں مرنج طبیعت کی وجہ سے ہر حلقے میں انھیں
ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق جب فسادیوں نے انھیں
شہید کیا وہ فرقہ وارانہ اتحاد اور بحالیِ امن کے لیے بھوک ہڑتال پر تھے۔ ان کی
لاش کئی دن بعد مسخ شدہ حالت میں دستیاب ہوئی۔

اس المناک حادثے پر جتنا بھی اظہارِ غم کیا جائے کم ہے لیکن ذکی انور
نے اخلاقی زوال کی انتہائی پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو اپنا خون دے
کر سرخرو بھی کیا ہے وہ اب ہم میں نہیں رہے لیکن ہمارا قومی ضمیر اگر بالکل ہی مردہ
نہیں ہو گیا ہے تو ان کی یاد ہمیشہ دلوں میں تازہ رہے گی اور ہمیں بدی کی
طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشتی رہے گی:

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

▲▲

ناوابستگی — اصلی اور نقلی

گوپال متّل

ہندوستان کے سابق وزیر خارجہ شری چوان کو موجودہ وزیر خارجہ شری واجپائی کی یہ بات ناپسند ہے کہ وہ ناوابستگی کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ساتھ لفظ اصلی لگا دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ناوابستگی کو اس طرح مشروط کرنا مغرب کی طرف جھکاؤ کی پردہ پوشی ہے۔

شری چوان چکّر میں اس وقت پڑے جب انھوں نے ناوابستگی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس کے معنی غیر جانبداری نہیں، یہ ایک مثبت تصوّر ہے جس کی بنیاد نوآبادیت دشمنی اور سامراج دشمنی پر ہے۔ شری چوان کی زبان سے سامراج دشمنی کا لفظ نکلا ہی تھا جب شری کامتھ پکار اٹھے "لیکن جب روس نے ہنگری پر حملہ کیا تھا تو آپ نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا" اس طرح ان کا وار اُچٹ کر انھی پر جا پڑا۔

ناوابستگی اصلی اور نقلی دونوں طرح کی ہوتی ہے اس کا ایک ثبوت کیوبا کا رویّہ ہے۔ انگولا اور ایتھوپیا میں اس نے روس کے ہراول دستے کے طور پر جو فوجی مداخلت کی اس پر ناوابستہ ممالک نے رابطہ بیورو کے اجلاس منعقدہ ہوانا میں بھی زبردست نکتہ چینی کی اور نومبر ۱۹۷۸ء میں بلغراد میں منعقد ہونے والے ناوابستہ ممالک کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں بھی۔ اس سے متاثر ہو کر کیوبا کے صدر کاسترو نے اپنے رویّے میں تھوڑی بہت ترمیم کی۔ عدیس ابابا میں ستمبر ۱۹۷۸ء میں سامراج اور رجعت پسندی کے خلاف افریقی اور عرب عوام کی یک جہتی کا اعلان کرنے والی جو بین الاقوامی کانفرنس ہوئی اس میں تقریر کرتے ہوئے کاسترو نے آزادی کی تحریکوں کی حمایت کا اعلان تو کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے کہا کہ وہ بات چیت کے ذریعے مسائل کے حل کو ترجیح دیتا ہے۔ کاسترو یہ تو چاہتا ہے کہ ناوابستگی کی تحریک کی تین سالہ صدارت حاصل کر کے تیسری دُنیا میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائے اور اس کے ساتھ ہی سوویٹ مفادات کو بھی تقویت پہنچائے لیکن افریقہ سے اپنی فوجیں ہٹانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں۔ کیوبا پر سب سے زیادہ تنقید اریٹیریا میں اس کی فوجی مداخلت پر کی جا رہی ہے جہاں اور کسی بھی جانب سے بیرونی مداخلت نہیں ہو رہی تھی۔ یساری نکتہ چینیوں کو شکوہ تھا کہ کیوبا ایک سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت میں معاون ہو رہا ہے جس کے کچھ حصّوں کو حقِ خود ارادیت حاصل تھا۔

انگولا میں بھی کیوبا کی فوجی مداخلت بدستور نکتہ چینی کا ہدف ہے۔ کیوبا کی فوجیں انگولا میں سوویٹ ٹرانسپورٹ کی مدد سے پہنچی تھیں۔ مئی ۱۹۷۸ء تک انگولا میں کیوبا کے بیس ہزار فوجی اور چار ہزار سویلین موجود تھے۔ بعد میں شہری ماہرین کی تعداد اور بھی بڑھی اور دونوں ملکوں میں تعاون کے جو معاہدے ہوئے ہیں، ان کے پیشِ نظر بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد دس ہزار ہو جائے گی۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں کاسترو کے دورے کے بعد ایتھوپیا میں کیوبا کی سرگرمیاں شدت اختیار کرنے لگیں اور نومبر کے بعد فوجی مداخلت کافی زور پکڑ گئی۔ مارچ ۱۹۷۸ء تک وہاں کیوبا کے سترہ ہزار فوجی پہنچ چکے تھے جن میں چودہ ہزار لڑاکا فوجی تھے۔

اس وقت افریقہ میں کیوبا کے پینتیس ہزار کے قریب فوجی موجود ہیں۔ یہ تعداد اپریل ۷۷ء کے مقابلے میں دوگنی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کی موجودگی میں کیوبا کے ناوابستگی کے دعوے کو نقلی ہی کہا جائے گا۔ ویسے غیر ممالک میں مداخلت اندرونِ ملک کیوبا کو مہنگی پڑ رہی ہے اور ایسے آثار موجود ہیں کہ افریقہ میں متعین کیوبن فوجوں میں بھی بددلی ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر پریس اور ریڈیو نے ایتھوپیا میں کیوبا کی فوجوں کے ساتھ کاسترو کی ملاقات کی جو خبریں دی تھیں ان میں یہ ذکر تھا کہ کاسترو نے فوجیوں کو یہ یقین دلایا کہ انھیں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ اطمینان وہاں فوجوں میں پائی جانے والی بےچینی کا نتیجہ ہوگی۔

انگولا اور ایتھوپیا میں بھی کیوبا کی فوجوں کی موجودگی پر بےچینی ظاہر ہونے لگی ہے۔ اس بات پر خاص طور پر بےچینی پائی جاتی ہے کہ خوراک اور روزمرہ کی دیگر ضروریات کے معاملے میں جو سہولتیں کیوبا کے فوجیوں کو حاصل ہیں وہ مقامی فوجوں کو حاصل نہیں۔

مختلف اندازوں کے مطابق افریقہ کے مختلف علاقوں میں ۱۹۷۸ء کے اختتام تک کیوبا کے پانچ ہزار فوجی مارے جا چکے تھے۔ کیوبا کی حکومت اپنے شہریوں کو اس قسم کی اطلاعات دینے سے ہچکچاتی ہے اور مرنے والوں کے خاندان والوں سے یہاں تک کہہ دیتی ہے کہ ان کی موت کا سبب کچھ اور تھا۔ اس سے مقامی بےچینی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔

تو نقلی ناوابستگی کوئی سود مند سودا بھی نہیں۔

▲▲

طبقاتی جنگ — ایک فرسودہ نظریہ

گوپال متّل

ہندوستانی مارکسی خواہ وہ سُرخ ہوں یا پیازی ہر وقت طبقاتی جنگ کا راگ الاپتے رہتے ہیں لیکن یہ نظریہ کمیونسٹ ملکوں خاص کر چین میں فرسودہ قرار دے کر ترک کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں ماؤزے تنگ تک کو تنقید کا ہدف بنایا جا رہا ہے۔ اب چین کے ماہرینِ نظریہ برملا کہہ رہے ہیں کہ ماؤ بورژوا طبقے کے خلاف مسلسل طبقاتی جنگ لڑنے پر جو زور دے رہا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ "ورکر" ڈیلی کے ۲۷ فروری ۱۹۷۹ء کے شمارے میں ژنگ بین ہی کا، جو چین کی سوشلسٹ سائنسوں کی اکیڈمی میں فلسفیانہ ریسرچ کی انسٹی ٹیوٹ کا ڈپٹی ڈائرکٹر ہے، ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس نے دو ٹوک لفظوں میں کہا ہے کہ ماؤ نے جو سیاسی مہمیں شروع کیں ان میں اقتصادی حقائق کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ اس کا کہنا ہے:

"بیس سال تک یکے بعد دیگرے سیاسی مہمیں جاری کی گئی ہیں۔ بسا اوقات ان طبقاتی اور سیاسی مہموں میں جو لوگ شریک ہوتے تھے ان کا پیداوار یا سوشلسٹ اقتصادی تعمیر سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا تھا۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ طریقِ کار ناقص تھا اور اس سے بُرے نتائج برآمد ہوئے۔ آئندہ اس طریقِ کار سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔"

ماؤ کے اس قول پر کہ زیادہ بدنظمی کا نتیجہ بہتر نظم ہوگا، اظہارِ خیال کرتے ہوئے ژنگ نے کہا ہے کہ اسے اصول کا درجہ دینا غلط تھا۔ یہ غلط تھا کہ ہر چند برس کے بعد سیاسی مہم شروع کی جائے۔ ژنگ کا کہنا ہے کہ اس قسم کا طریقِ کار طبقاتی جدوجہد کے بارے میں مارکسی نظریے کو پوری طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ یہ غلط ہے کہ طبقاتی جنگ کو پیداوار بڑھانے کی جدوجہد پر ترجیح دی جائے اس کے نزدیک ماؤ نے ۱۹۵۶ء میں وسائل پیداوار کی ملکیت کی سوشلسٹ تبدیلی کے بعد طبقاتی جنگ کی صورتِ حال کا جو اندازہ لگایا وہ غیر سائنسی تھا۔ ۱۹۵۷ء کے بعد کمیونوں کے صفائے کی کئی مہمیں غلط شروع کی گئیں جس کے نتیجے میں طبقاتی جنگ کو غیر ضروری فروغ ملا۔

۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۶ء کے درمیان ماؤ کی پالیسیوں پر لیو ڈنگی نے بھی نکتہ چینی کی ہے۔ لیو ڈنگی پروپیگنڈے کا افسرِ اعلیٰ تھا جو پہلے محروم وقار رہا اب ازسرِنو بحال ہوا ہے۔ "پیپلز" ڈیلی کے ۸ مارچ کے شمارے میں اس نے "بڑی چھلانگ" کے زمانے میں فولاد کی پیداوار کو صرف پانچ برس میں چھ ملین ٹن سے بڑھا کر اکیس ملین ٹن تک لے جانے کو عظیم غلطی قرار دیا ہے کیونکہ یہ فیصلہ زراعت اور چھوٹی صنعتوں پر بڑی صنعتوں کو غیر معمولی ترجیح دیتا تھا۔

سرمایہ داروں کے بارے میں بھی چین کا رویّہ تبدیل ہو رہا ہے جو ماؤ کے اندازِ نظر کے برعکس ہے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۷۹ء کے "پیپلز" ڈیلی میں مرکزی کمیٹی کا فیصلہ شائع ہوا ہے جس میں چین کے قومی بورژوا طبقے یعنی سابق

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

اب کہ جب...

کرشنے موہن

اب کہ جب آگئی ہے شام شباب
ابروؤں کی تراش سے حاصل؟

... ...

دل میں جب پہلا سا وہ پیار نہیں
اب گلابوں پہ وہ نکھار نہیں —
کھو چکے اپنا تیکھا پن بادام
سنبھلی سنبھلی ہیں آج کل مادام
چپ ہُوا خواہشوں کا آوازہ
بوئے تازہ سے ہے تہی غازہ
اور کاجل میں وہ خمار نہیں
بانکپن اب مزہ نہیں دیتا
حُسن بھی ہو چلا اُداس اُداس
اب نہیں ہے لباس میں بھی پیاس
پیری ہونے لگی ہے اب وارد
ہوگئیں آپ دفعتاً بارد
کتنے ہی دن مِلن نہیں ہوتا
پیار کا یہ چلن نہیں ہوتا

▲▲

غزلیں

فضا ابن فیضی

یہ سب تبول، جلاؤ ہمیں، بجھاؤ ہمیں
کہیں تو لے چلو، سنکی ہوئی ہواؤ ہمیں

زمیں کے قد سے کبھی چھوٹا یہ آسماں نکلا
اب آسماں سے زمیں پر اُتار لاؤ ہمیں

الگ ہے اپنی ادا، پھول بھی ہیں خنجر بھی
وہ آستیں ہو کہ دامن، کہیں چھپاؤ ہمیں

اس آئینے میں چلو جائزہ ہی لیں اپنا
ہمارے دور کا چہرہ ذرا دکھاؤ ہمیں

قدم قدم وہی بے نام منزلوں کا سفر
خبر نہیں، کہ ہے کرنا کہاں پڑاؤ ہمیں

ابھی تو ساز کے تاروں کو کس رہا ہے شعور
ابھی نہ قریۂ آواز میں بلاؤ ہمیں

نہیں گلاب کہ رونق بنیں گے آنگن کی
چمکتی دھوپ ہیں، دیوار پر بچھاؤ ہمیں

چلو کہ شرطِ رفاقت کبھی ساتھ چھوڑ گئی
کبھی جو یاد بھی آئیں تو بھول جاؤ ہمیں

ابھی تو جسے تنک آب سے ہیں ہم بھی فضاؔ
کہاں ملا ترے آہنگ کا بہاؤ ہمیں

▲▲

عروج زیدی

اُن کے حضور نذرِ متیسّر ہی لے چلیں
آنسو نہیں تو خشک سمندر ہی لے چلیں

اخلاص چاہتا ہے اُنھیں اپنا ہم سفر
وہ خواہ آستین میں خنجر ہی لے چلیں

ہم اذنِ عرضِ حال پہ اب کشمکش میں ہیں
دل کو یہ ضد ہے شوق کا دفتر ہی لے چلیں

کُنجِ قفس میں ہوگی نہ یہ بزمِ رنگ و بو
منظر جو سامنے ہے وہ منظر ہی لے چلیں

دامن میں گُل نہیں تو برائے ثبوتِ سیر
صحنِ چمن سے خار کے نشتر ہی لے چلیں

سرمایۂ عروج ہیں تازہ غزل کے پھول
بزمِ سخن میں شاخِ گلِ تر ہی لے چلیں

▲▲

عتیق احمد عتیق

بھٹک رہا ہوں من میں تیری آس لیے
کتنے سُندر سپنوں کا بن باس لیے

تجھ بن منوا جل درشن کو ترسے ہے
سات سمندر خشک لبوں کے پاس لیے

چاٹ رہا ہوں برسوں سے اپنا ہی لہو
پل دو پل کی راحت کا وشواس لیے

سونا سا ڈھلکا کے اُفق میں ڈوب گیا
گھائل پنچھی خون میں لتھڑی آس لیے

اوروں کو سیراب کرے ہے میرا وجود
اپنے اندر جنم جنم کی پیاس لیے

دِل پر اُبھرا ایک انوکھا گھاؤ عتیقؔ
کتنے پرانے زخموں کی بو باس لیے

▲

فن اور تنقید

خورشید سمیع

ادب کا شعبہ دوسرے فنی شعبوں سے اس اعتبار سے مختلف رہا ہے کہ اس میں زندگی اپنی تمام تر انفرادی اور اجتماعی صورتوں کو سمیٹے ہوئے حسین تر انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ گویا دوسرے تمام شعبوں کے توانا رجحان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ایک دوسرے کا جزو بن کر جب ادب میں آتے ہیں، اکائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ شعبہ تصوف کی اصطلاح میں وحدت فی الکثرت کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تخلیقات عارضی محرکات کی ودیعت ہونے کے باوجود ابدی ہوتی ہیں۔ اور ہر دور میں ہر قسم کے قاری کو محظوظ کرنے کا سامان اپنے اندر رکھتی ہیں۔

زندگی صرف وہی فنکار حاصل کر سکتا ہے۔ جو اپنے فن میں انفرادیت پیدا کر سکے۔ یہ سوال اس پس منظر میں بیحد اہم ہو جاتا ہے کہ ادب میں، انفرادیت سے کیا مراد ہے اور فنکار اس انفرادیت کو کس طرح نمایاں کر سکتا ہے۔ مشہور فرانسیسی ناقد سینٹ بیو ... کے حوالے سے لکھتا ہے "مولیئر اتنا عظیم فنکار ہے کہ اسے جب پڑھو نئی حیرت کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کے مشہور ڈرامے کارتونی" کا طرز بیان اختیار کرنے کی کوشش لیسنگ نے اپنے ایک ڈرامے میں کی تھی، لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ اصل میں کارتونی جیسا انداز بیان دنیا میں صرف ایک ہی بار جنم لیتا ہے"۔ یہی بات ہر اس فنکار کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جس نے اپنے فن میں، انفرادیت پیدا کر لی ہو۔ وہ گویا روشنی کا ایک ایسا مینار کھڑا کر جاتا ہے۔ جو سب سے الگ پہچانا جاتا ہے۔ جس فنکار نے اپنے فن میں انفرادیت پیدا نہ کی، اس کی طرف کوئی متوجہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا فن بہت جلد وقت کی تہوں میں دفن ہو جاتا ہے۔ اور اکثر کو تو خود ان کا اپنا زمانہ ہی فراموش کر دیتا ہے۔ یہ وہی فنکار ہوتے ہیں جو اپنی انفرادی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے اور دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو دہراتے ہیں۔

اپنے دور کے مقتضیات، کی بات شاید اتنی غلط نہ تھی، جتنا کہ ہمارے ترقی پسند ناقدوں نے اسے غلط قسم کے معانی پہنا دیئے۔ جب یہ بات کہی گئی کہ تمام پرانا ادب جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ اس کو لغو محض قرار دیا جائے اور صرف مزدور اور کسان وغیرہ کی ہی بات کی جائے۔ حسن و عشق کے افسانے کافی ہو چکے ہیں اس لیے اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے صرف طبقاتی تصورات کو ہی پیش کیا جائے تو دراصل یہ ہماری تنقید میں بازگشت تھی ان نظریات کی جو اشتراکی روس کے پیش کردہ تھے۔ اپنے دور کے مقتضیات سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے عہد کی زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھے اور سماجی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان سے بے خبر نہ رہے۔

فرانسیسی ناقد ٹین (TAINE) نے ایک فارمولا بنایا تھا کہ کوئی بھی پارۂ فن اپنے وقت کی معاشرتی فضا کی پیداوار ہوتا ہے۔ ٹین نے کسی بھی پارۂ فن کی قدر متعین کرنے کے لیے جو فارمولا بنایا تھا وہ یوں ہے (۱) نسل (۲) ماحول (۳) لمحہ۔ اس کی نظر میں فنکار کے افکار و خیالات اپنے وقت کے تمدنی اثرات لیے ہوتے ہیں۔ اور اس کی تخلیقات جب منصۂ شہود پر آتی ہیں تو اس لمحاتی کیفیت کا عکس بھی ہوتی ہیں جو تخلیق کے وقت نسلی ارتقاء کا ایک مرحلہ تھی ٹین کی یہ بات اپنے اندر کافی

وزن رکھتی ہے کہ پارۂ فن اپنے خالق کے نسلی اثرات کے ساتھ ساتھ اُس کے جغرافیائی حالات اور سوسائٹی کا عام رنگ رکھتا ہے۔ لیکن اس سے یہ بات قطعاً واضح نہیں ہوتی کہ ایک ہی دور ایک ہی نسل کے ہمعصر فنکار اپنی اپنی آرا زکیوں رکھتے ہیں۔ ڈادجڑواں بھائی بھی پورے طور پر ایک طرح کا میلان کب رکھتے ہیں۔

سینٹ بیو کے نزدیک کسی بھی پارۂ فن کو سمجھنے کے لیے فن کار کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اور فنکار کو سمجھنے کے لیے صرف اس کے نسب نامے یا اس کے دور سے آگاہی کافی نہیں۔ شعور اور لاشعور کی کتنی ہی پیچ پیچ دادیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک فنکار کو اپنے ہمعصر فنکاروں سے ممتاز کرتی ہیں کسی بھی پارۂ فن کی صحیح قدر و قیمت جاننے کے لیے فنکار کی شخصیت کا جاننا بھی لازم ہے، اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے سینٹ بیو کہتا ہے کہ فنکار کس نسل اور کس خاندان میں پیدا ہوا۔ اُس نے کیا خصوصیات ورثے میں پائیں اور کن باتوں سے شعوری طور پر پیچھا چھڑایا۔ عام زندگی میں اُسے کن حادثات سے دوچار ہونا پڑا اور یہ حادثات اُس کی داخلی زندگی میں کس حد تک داخل ہو سکے۔ اُس کے غیر ادبی دوستوں کا حلقہ کس قسم کا تھا، یہ سب کچھ جان لینے کے بعد ہم کسی فنکار کے فن کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکیں گے۔ اور یہ سمجھ سکیں گے کہ اُس کی آواز دوسرے فنکاروں سے اس لیے مختلف ہے کہ اُس کی شخصیت کو بنانے یا بگاڑنے میں مختلف عوامل نے حصّہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنے ایک مضمون میں کہتا ہے کہ شاعر کے پاس اظہار کے لیے کوئی شخصیت نہیں ہوتی بلکہ اُس کے پاس شخصیت کے بجائے صرف ایک ذریعہ یا واسطہ ہوتا ہے جو کسی عنوان شخصیت نہیں کہا جا سکتا۔ میں اس خیال سے متفق نہیں۔ فنکار کے پاس جب تک شخصیت نہیں ہوگی اُس کے فن میں دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی مضمون میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ آگے چل کر لکھتا ہے کہ ——— فنکار کے تاثرات اور تجربات جو بطور انسان اس کے لیے اہم ہیں اُس کی شاعری میں کوئی جگہ نہیں پائیں گے اور جو تاثرات اور تجربات اُس کی شاعری میں اہم بن جاتے ہیں، وہ اُس کی ذات، اُس کی شخصیت پر بالکل برائے نام اثر انداز ہوں گے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے"۔

ایلیٹ کی اس بات کے ڈانڈے فرانس کی اس تحریک سے جا ملتے ہیں۔ جو علامت نگاری کی تحریک کہلاتی ہے۔ یہ وہی تحریک ہے جس کی امامت میلارمے اور بودلیئر جیسے فنکاروں نے کی ہے۔ اس اسکول کے بعض فنکاروں کے فن میں ابہام پسندی، ابہام پرستی کی حد تک چلی جاتی ہے۔ کروچے کہتا ہے کہ ہر تجربے کی حیثیت ضمنی یا اضافی ہے۔ فنکار جو تجربہ کسی خاص لمحے میں حاصل کرتا ہے، کسی دوسرے لمحے میں اس کی تحصیل سے قاصر بھی رہ سکتا ہے۔ وہ اپنے اُس خاص تجربے کو اپنے فن پارہ میں منتقل کر کے، وقت کے بہاؤ میں آگے نکل جاتا ہے۔ اب دوسرے خاص لمحے میں، اس پر کسی دوسرے قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ظاہر ہے اُس تبدیل شدہ صورتِ حال میں وہ پہلے فن پارے کو کیسے پورے طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے ہم فنکار پر کسی قسم کی گرفت تو کر نہیں سکتے البتہ اُس سے یہ تقاضا کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے اس خاص تجربے کو جو مخصوص ہیئت دے۔ وہ خوبصورت ہو۔ کروچے اس بات کو یوں مکمل کرتا ہے کہ اسی لیے فنکار کے اوپر کسی قسم کی سماجی یا انسانی ذمے داری نہیں۔ اُسے اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ورنہ اُس کے فن میں انفرادیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔

ہو سکتا ہے جس خاص لمحے میں کروچے نے یہ بات کہی ہو، اُس وقت اس کے سوا، اور کچھ نہ کہا جا سکتا ہو۔ لیکن اس امر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ محض ہیئت پسندی یا اظہاریت پسندی ادب کا مقصد نہیں۔ جب تک فنکار نے اپنے تجربے کو پورے حسن سے قاری یا سامع تک نہ پہنچایا ہو، اُس کی کوئی وقعت نہیں

اس سلسلے میں ٹالسٹائی کے راستے کو اعتدال کا راستہ کہا جا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ فن کا مقصد بہر حال ترسیل یا ابلاغ ہے۔ یعنی فنکار نے جو تجربہ خود کیا ہے۔ جب تک وہ اسے قاری تک نہیں پہنچائے گا، اُس کا کام ادھورا سمجھا جائے گا،

اگر فن کار اشاریت پسندوں کی طرح اپنے تجربے میں خود ہی گھل مل کر رہ گیا۔ اگر اُس نے تجربے سے فنّی علیحدگی اختیار نہ کی اور اُس تجربے میں سے اُن اجزا کو چن کر ترکیب و ترتیب سے پیش نہ کیا، جس سے وہ پہلے بھی اپنے فن کی تشکیل کرتا آیا ہے، تو اُس کے فن میں مطابقت نہیں رہے گی۔ اور جب تک اُس کے فن میں مطابقت کا پہلو نہ ہوگا" انفرادیت" حاصل کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

کوئی بھی عظیم فنکار ہمیں قنوطی نہیں بناتا، زندگی سے فرار نہیں سکھاتا۔ بلکہ ہم میں جو ہمارا ہمزاد چھپا بیٹھا ہے، یہ اُس کو ابھارتا ہے، ارتفاع بخشتا ہے اور ہم داخلی طور پر قیدِ زمان و مکاں سے آزاد ہو کر انا کے کامل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک جہانِ حاصل کر لیتے ہیں جو وہ برلنے بھی بناتا ہے، اور نئی بستیاں بھی۔ جب تک فنکار اپنی شخصیت کی تعمیر میں داخلی یا خارجی مراحل سے گزر کر اپنا ایک کردار نہیں قائم کرے گا، جب تک اپنا رشتہ ماضی کے تمام ادب سے مضبوط نہیں کرے گا۔ اُس کی تخلیقات میں عظمت نہیں آئے گی، یا بصورتِ دیگر کوئی بھی شکل ایسی ہوگی جسے معاف کرنا بہت مشکل ہوگا۔ اگر فنکار خود بھی کسی دوسرے وقت اس بات کو سمجھ لے، تو وہ خود کو معاف نہیں کر سکے گا۔

فن اور شخصیت ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔ شخصیت جتنی گہری اور ہمہ جہت ہوگی، فن اُتنا ہی منفرد اور رمیز ہوگا۔

ایلیٹ نے جس غیر شخصیت کے رجحان کو عام کیا اور "ویسٹ لینڈ" جیسی نظمیں جو کائنات کا منظرنامہ کہی جا سکتی ہیں، تخلیق کیں، اور داخلی شاعری کے بدلے خارجی شاعری کو اہمیت دی تو دراصل اُس نے ایک عملی تجربہ کیا اور ہر عمل کا ایک ردِّ عمل ضرور ہوتا ہے۔ اس طرح کی غیر شخصی شاعری میں ذاتی تجربات، احساسات، خیالات اور تصورات کی گنجائش نہ تھی، اس کے ردِّ عمل میں امریکی شاعری میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا۔ جس سے بہت حد تک غیر شخصی شاعری کی یکسانیت اور بے رنگی دور ہوئی اور فضا میں ایک تازگی کا احساس جاگا۔ اس رجحان کو اکثر و بیشتر CON-FESSIONAL شاعری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نام سے ہی ظاہر ہے۔ شاعر کی ذات ہی اُس کی شاعری کا منبع اور مرکز ہے۔

CONFESSIONAL شاعری میں شاعر اپنی زندگی کے پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے نفسیاتی اور جذباتی مسائل کی عکاسی کرتا ہے۔ کل باتیں شاعر کی زندگی سے براہِ راست منسلک ہوں ایسا نہیں ہے لیکن نفسیاتی طور پر منسلک ہوں۔ یہ عین ممکن ہے۔ زندگی کے واقعات کو من و عن ادب یا شاعری میں جگہ دی جائے گی تو پھر فن کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے اس لیے شاعر تفصیلات کا انتخاب جمالیاتی تقاضوں کے پیش نظر کرتا ہے۔ ادب اور فن کا یہ توازن برقرار رکھنا مشکل ہے۔ جہاں یہ توازن ہے، وہاں شاعری فنّی نقطۂ نظر سے زیادہ ممتاز ہے۔ جہاں نہیں وہاں فنّی لغزشیں بھی ہوتی ہیں۔

بہت پہلے ایلیٹ نے ورجل کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ رومن تاریخ اور لاطینی زبان کے مزاج کے حالات کچھ اس طرح کے ہو گئے تھے کہ کسی بھی لمحے ایک بے مثال اور یکتا کلاسیکی شاعر کا ظہور ممکن ہو گیا تھا۔ ایلیٹ کی بات کا گویا یہ مطلب ہوا کہ ہماری تاریخ اور اردو زبان کا مزاج اُس وقت تک انتظار کرے جب کسی بھی لمحہ بے مثل اور یکتا کلاسیکی شاعر کا ظہور ممکن ہو۔ یعنی جب ہماری تہذیب اپنی معراج پر پہنچ چکی ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کوئی فنکار کسی بھی دور میں انفرادیت حاصل کر سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب عام بحرانی دور سے گزر رہا ہو یا مادّی اور روحانی پستی کسی سماج کی خصوصیت بن چکی ہو تو اُس وقت فنکار کو نسبتاً زیادہ جاں کاہی، زیادہ وسعتِ نظر، زیادہ جگر کاوی، زیادہ تندہی سے کاوش کرنی پڑے گی۔ ورنہ لکھنوی ادب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

▲▲

دِلّی انتظامیہ کی نمایاں کامیابیاں

تعلیم

(۱) مفید اور ہمہ گیر تعلیم کا انتظام۔
(۲) پچھلے سال ۵۴ مڈل سکول اور ۲۳ ہائر سیکنڈری اسکول کھولے گئے۔
(۳) ۳۴ اسکولوں اور ۳ بالغوں کے اسکولوں میں ۱۲ ویں جماعت تک پڑھائی کا بندوبست۔
(۴) دن میں پڑھ سکنے والے بچوں کے لیے ۴۸ نئے قلیل مدت والے اسکول کھولے گئے۔
(۵) بالغوں کو حروف شناس بنانے اور کام دھندوں میں بہتر مدد دینے کے لیے گاندھی جینتی سے خصوصی مہم شروع۔
(۶) ۳۱ نئی اسکولی عمارتوں کی تعمیر مکمل، اور ۱۸ زیر تعمیر۔
(۷) بچوں کو سنسکرت، پنجابی اور اردو پڑھانے کا اسکولوں میں خاص انتظام۔

چھوٹی صنعتیں

(۱) زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار دینے کے لیے گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی اسکیم پر عمل شروع۔
(۲) نریلا، رانی جھانسی روڈ، پٹ پڑ گنج، وزیر پور کی صنعتی بستیوں اور رینکر کالونی بھارت نگر کی تعمیر کا کام شروع۔

ہمہ جہت دیہی ترقی

(۱) گاؤں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ۶۶۵ کروڑ روپے۔
(۲) آئندہ چار برسوں میں تمام گاؤں کے لیے پینے کا پانی اور آبپاشی کی سہولیات بہم پہنچانے کا مکمل بندوبست
(۳) خصوصی ترقیاتی اسکیم کے تحت علی پور، کنجھاولہ اور نجف گڑھ ترقیاتی بلاکوں کی ترقی کے لیے ۵۱ لاکھ روپے کی رقم مخصوص۔

سماجی بہبود و ہریجن بہبود

(۱) بچوں کے عالمی سال میں سبھی بے سہارا بچوں کو سماجی تحفظ مہیا کرنے کا تہیہ۔
(۲) سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے مقابلے میں ہریجن بہبود کے لیے بجٹ میں ڈھائی گنا اضافہ۔
(۳) بوڑھوں اور بیوہ عورتوں کو پنشن دینے کی اسکیم نافذ۔
(۴) گاؤں میں ہریجنوں اور بے زمینوں کو تقریباً ..۳۳ رہائشی پلاٹوں کی تقسیم۔

تعمیرِ رہائشات

(۱) دِلّی میں پہلی مرتبہ مکانوں کی تعمیر کے لیے ہاؤسنگ فائنانس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا ہے۔
(۲) اس سال دِلّی میں ۱۱ ہزار مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ۔
(۳) ۶۷ فیصد مکانات کم آمدنی اور کمزور طبقوں کے لیے۔

نشہ بندی

(۱) ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مرحلہ وار مکمل نشہ بندی نافذ کرنے کا پروگرام۔
(۲) خشک دنوں کی تعداد میں دوگنا اضافہ اور شراب کی دکانوں میں بھاری کمی۔

جاری کردہ، محکمۂ اطلاعات واشاعت، دِلّی انتظامیہ دِلّی

آس پاس

عبد الرحیم نشتر

"علم کے لیے چین کا سفر بھی کرنا پڑے تو دریغ نہ کرو۔"
مولوی صاحب نے یہ بات چھٹی جماعت میں ذہن نشین کرادی تھی اور میں نے ان کی بات پر تکیہ کرلیا تھا۔ مولوی صاحب جیسے برگزیدہ انسان، پنج وقتہ نمازی، جھوٹ، فریب، دغا اور ہر طرح کی برائی سے احتراز کرنے والے سیدھے سادے اور نیک انسان، وہ کوئی غلط بات تھوڑے ہی کہہ سکتے تھے۔

—— پھر میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ علم سے اپنے سینے کو منوّر کرلیا۔ میرا ذہن تابناک ہوگیا۔ میرے دل میں اور میرے دماغ میں ایک مقدس روشنی تھی اور میں سمجھ رہا تھا میں جس طرف سے گزروں گا وہ راہیں روشن ہو جائیں گی۔

عِلم آدمی کو اونچا اٹھاتا ہے۔ بندے کو ولی بناتا ہے۔ رفانِ ذات عطا کرتا ہے اور خدا کی پہچان بتاتا ہے۔ علم کی ین بے حساب ہے۔ علم کی عطا لازوال ہے۔ ان سب توں نے میرے ارادوں کو مستحکم کیا۔ میرے والد نے میری لیم کی طرف دھیان دیا۔ وہ ایک مزدور پیشہ آدمی تھے پھر بھی بنا پیٹ کاٹ کر انھوں نے میرے لیے ہر سہولت مہیا کی۔ ھا کھانا، اچھے کپڑے اور شوق پانی کے لیے اچھا خاصا جیب رچ —— میرے والد نے سوچا میں پڑھ لکھ کر ایک بڑا بسر بنوں گا۔ دس پچاس آدمی میرے ماتحت ہوں گے اور ، یہ سوچ کر فخر سے اپنی چھاتی پھلالیں گے کہ وہ ایک آفیسر کے پ ہیں۔

میں نے میٹرک کیا۔ میرٹ لسٹ میں میرا نام آیا۔ میں ،بی۔ اے کیا پھر بی ایڈ کیا پھر ایم اے کیا اور اب میں نے ملازمت کے لیے درخواستیں دینی شروع کیں۔ میرے ماں باپ کا خیال تھا کہ نوکریاں میرے انتظار میں خالی پڑی ہوں گی۔ جیسے ہی میں عرضی داغوں گا سرکار دوڑی دوڑی میرے پاس آئے گی اور کہے گی حضور تشریف لائیے۔ ہم کب سے آپ کے منتظر ہیں۔ یہ اعلیٰ ترین پوسٹ مدت سے آپ کا انتظار کررہی ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی لیاقت کا معقول مشاہرہ نہیں ادا کرسکتے صرف تین ہزار روپے ماہانہ دے سکتے ہیں امید ہے آپ جیسا عالی ظرف اسی مشاہرے پر قناعت کرے گا۔"

میں نے اتنا اونچا خواب تو نہیں دیکھا تھا لیکن اتنا ضرور چاہا تھا کہ کسی کالج میں لکچرر ہوسکوں گا اور پانچ چھ سو روپے ماہوار کما سکوں گا لیکن ...... پچھلے ایک ماہ سے میرے والد مجھ سے سخت ناراض ہیں کیونکہ اتنا پڑھ لکھ کر بھی میں ایک معمولی آدمی ہوں جو ایک جنرل اسٹور میں بیٹھا مختلف قسم کی چیزیں بیچتا رہتا ہے جسے گاہکوں سے اُلجھنا پڑتا ہے۔ ان کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ ان کے کڑے تیور سہنے پڑتے ہیں اور ان کی سخت سست باتیں سننی پڑتی ہیں۔ کہاں دس پچاس آدمیوں پر حکم چلانے کا خواب اور کہاں ایسے ویسے لوگوں سے کڑوی کسیلی سننے کی حقیقت! میرے والد مجھے کس قدر ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ ان کا یہ غصہ، یہ کھنچاؤ اس پیار کا ثبوت ہے۔

آٹھ روز کے بعد آج مختار کی صورت دکھائی دی۔ ہمیشہ کی طرح زندگی بخش مسکراہٹ کے ساتھ وہ مجھ سے ملا۔ عزیز ترین یاروں سے آٹھ روز کی جدائی بھی کڑا امتحان ہوجاتی

ہے۔ ایسی رفاقت پھر کسی کو نہیں ملتی۔ میں نے شکایتوں کا دفتر کھول دیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح مجھے ادھر ادھر کی باتوں میں اڑا گیا میں جانتا ہوں کہ وہ کتنا دکھی ہے۔ اس کا گھر اس کی شادی کے بعد جن بلاؤں کا شکار ہو گیا ہے اس سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے کسی بڑے گھر میں شادی نہیں کی۔

میری بیوی غریب ماں باپ کی بچی ہے نہ محنت مشقت سے گھبراتی ہے نہ الٹی سیدھی فرمائش کرتی ہے۔ وہ میرا مزاج پہچانتی ہے۔ اس نے بھی کچھ سنہرے خواب ضرور دیکھ رکھے ہیں مگر ان خوابوں کی تکمیل پر اسے اصرار نہیں۔ وہ جس حال میں ہے خوش ہے میری ماں اور میری بہنوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں میرا چھوٹا سا گھر، چھوٹے گھر کی اس لڑکی سے بہت بڑا ہو گیا ہے۔ بہت ہی بڑا۔ یہی خوشی اور احساس ہے جو مجھے مایوس نہیں ہونے دیتا ورنہ ہم چھوٹے لوگ کہاں سکون پاتے۔ ہمارے مٹی کے مکان۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل۔ ٹین کی چادر سے بنے ہوئے سائبان اور قمچی کی ٹٹیوں سے گھرے ہوئے آنگن۔ دو کمروں کا گھر جس میں کھانا پکانا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ سونا جاگنا سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ گھر نہیں کابک کہلاتا ہے اور ہم چھوٹے لوگ کابکوں میں رہتے ہیں۔

مختار نے خبر سنائی پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں میرا پرفارمنس اچھا تھا لیکن انتخاب شفیع الدین صاحب کے بھانجے کا ہوا ہے کیونکہ وہ یونیورسٹی کے ریڈر ہیں۔ دنادار ہیں ان کے اثر و رسوخ کے پنجے دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چلئے قصہ تمام ہوا۔ ہم کمل کینٹین سے چائے کی پیالیوں میں سارا غم و غصہ پی کر ہم اپنی مصروفیتوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

لوٹتے وقت میں املی باغ کا راستہ اختیار کرتا ہوں راہ میں منہاج بھائی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ چالیس پینتالیس کا سن۔ درمیانہ قد۔ آدھے آدھے بال۔ گورا رنگ چمکتی ہوئی آنکھیں اور ہنس مکھ چہرہ۔ دلکش گفتگو کرنے والا یہ بوڑھا آج بھی جوان لگتا ہے اسے سدا بہار جوانی کا راز معلوم ہے وہ ہمیشہ نوجوانوں کے حلقے میں گھرا رہتا ہے۔ نوجوانوں جیسا رہن سہن۔ نوجوانوں جیسی بات چیت۔ ہنسی مذاق اور داؤ پیچ۔ منہاج بھائی کو دیکھ کر خوش ہو گیا ہوں۔ اور یہی خوشی ان کے چہرے پر بھی عود کر آئی ہے۔ "کہاں تھے یار۔؟"

"آپ کہاں تھے؟"

"کیا بات کرتے ہو۔ میں اور احتشام تمہیں ایک ہفتے سے تلاش کر رہے ہیں۔"

"اچھا کیا حال ہے احتشام کا؟"

"بڑا پریشان ہے۔"

"کیوں؟ کیا اس کی شادی ابھی تک طے نہیں ہوئی۔"

"ارے کہاں؟"

مدت سے میرا کلاس فیلو احتشام بڑا پریشان ہے کالج لائف میں اسے بہت اچھی لائف پارٹنر مل گئی۔ زرینہ۔ متوسط گھرانے کی ایک خوب صورت۔ خوش مزاج۔ کومل سی لڑکی! دونوں ایک دوسرے سے اوب جائیں۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔

منہاج بھائی نے خوش خبری سنائی کہ ان کی بیٹی کا بیاہ شہر کے ایک معزز نوجوان سے ہونے جا رہا ہے وہ بہت خوش تھے۔ خوشی کی بات بھی تھی۔ وہ ایک چھوٹے موٹے بنکر مزدور۔ سیٹھ کے یہاں دن بھر کارخانہ چلاتے دو تین ساڑیاں بنتے۔ ہفتہ بھر میں تیس چالیس روپے اجرت بنتی دو تین۔ بچے، بیوی تھوڑا بہت کام کر لیتی۔ بس اسی میں گزارا ہو جاتا۔ ان کی بچی بڑی سوشیل اور خوب صورت تھی مگر تھی تو غریب ماں باپ کی بچی ——— کسی غریب گھر کا ہی نصیب ہو سکتی ہے مگر بخت نے یاوری کی اور اچھے گھر کا رشتہ آ گیا۔ اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی۔

منہاج بھائی کے ساتھ پھر گجری بازار لوٹتا ہوں۔ آج منہاج بھائی مجھے چائے کا بل نہیں ادا کرنے دیتے اور ان کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے میں ہاتھ روک لیتا ہوں۔ خوشی میں چھوٹا آدمی بھی بڑا فیاض ہو جاتا ہے۔

انھیں اپنی جوانی یاد آ گئی ہے اور وہ مجھے بیتے ہوئے لمحات کی داستان سنا رہے ہیں۔ انیس سو چالیس اور

ار ماندان کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ ایک زبردست
۔ سحر انگیز ترنم۔ آواز میں سوز اور بلا کی کشش۔ جس
ا میں ان کا نغمہ بلند ہوتا تو جوان لڑکیوں کی چھاتیاں
تیں۔ وہ خود بھی خوب صورت تھے۔ خون جلد سے
لتا تھا۔ سرخ سرخ تانبے جیسا رنگ پرکشش خدوخال
بہترین زیبا نقش۔ وہ گویا شہر نگار کے شہزادے
ملے کا کوئی بھی بڑا جلسہ ان کی شمولیت کے بغیر
نہ پہنچتا۔ موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں
کچھ ایسے ولولے سے پڑھتے کہ ہزاروں کا اجتماع
یاتا اور جب ان کی آواز ٹوٹتی تو سارا پنڈال نعرہ
ونج اٹھتا۔

طرف مقبولیت۔ ہر طرف چرچا! وہ جان محفل تھے
کی انجمن ان کے بغیر سونی معلوم ہوتی تھی۔ نیا بازار
یک ایسی ہر دلعزیز شخصیت تھی کہ جسے دوسرے
ے رشک وحسد سے دیکھا کرتے۔

رم کے دن تھے۔ کامٹی کے محرم اپنی رنگارنگ تقریبات
ے اطراف میں بہت مشہور تھے۔ جگہ جگہ سواریاں
اتیں۔ تعزیے سجائے جاتے۔ علم اٹھائے جاتے۔ دلدل
ں مرثیے پڑھے جاتے۔ ٹمکی پارٹیوں کے مقابلے ہوتے
ا اہتمام کیا جاتا۔ شاعروں کا دنگل منعقد ہوتا۔ کچھ
نیتے۔ ان کا ناچ قابل دید ہوتا۔ شمس الدین بجا
ن۔ بیل بابو اور موٹا لڑا ایتور۔ شیر ناچ میں بڑے ماہر
کے ارد گرد سینکڑوں بچوں۔ بوڑھوں اور جوانوں
رہتا۔ باجوں کی دھماکا خیز آواز ناچنے والوں کے
ینترے اور دیکھنے والوں کا زبردست ہجوم غرض
دنوں کامٹی میں غضب کی دھوم رہتی۔ زندگی ہمہ
نگ نظر آتی۔ ہندو مسلمان سبھی ہم آہنگ ہو جاتے
را آتے تھے تو مذہبی تفریق ختم ہو جاتی تھی۔ یہ لوگ
کی طرح گھل مل جاتے تھے ___ پتہ نہیں اب ایسا
ں ہوتا ہے؟

رم کی نو تاریخ تھی۔ آج سواریاں اٹھنے والی تھیں
پیلی حویلی بھاجی منڈی اور چھوٹا نادلی میں بڑے بڑے
الاؤ سلگائے گئے تھے۔ ان الاؤں میں سواریاں اٹھانے والے
کود پڑتے اور دیر تک گھٹنے گھٹنے انگاروں میں ننگے پاؤں
کھیلتے۔ یہ ایسا عجیب و غریب اور ایمان پرور منظر ہوتا کہ بے
عقیدہ لوگ بھی دم بخود رہ جاتے۔ تماشائیوں میں خواتین
کی بھی بڑی بھاری تعداد ہوا کرتی۔ بوڑھیاں، بچیاں اور وہ
جن کے لئے نوجوان کیا کچھ جتن نہیں کرتے۔

حسب معمول منہاج بھائی بھی سیر سپاٹے کو نکلے سبز
رنگ کا کوٹ۔ سفید رنگ کی قمیص اور سفید ہی رنگ
کا پتلون۔ گلے میں لپٹا ہوا بڑا سا سرخ مخمل کا رومال۔ آنکھوں
میں سرمہ کی دلکش لکیر۔ بانکا سجیلا نوجوان! عادت کے مطابق
وہ اس گوشے کی طرف نکل گئے جس طرف موہنی صورتوں کا
جماؤ تھا۔

کھلنڈرے نوجوانوں کا ایک شوخ حلقہ سواری اٹھانے
والے شخص کے ارد گرد "بولو دولہا بولو دولہا" کا بلند آہنگ
شور باندھ کر شرارتوں میں مگن تھا جس منڈپ میں سواری
بٹھائی جاتی تھی اس کے دائیں ہاتھ پر جو ایک گلی جیسی خالی
جگہ رہ گئی تھی وہ اس وقت محلے کی بے شمار عورتوں اور لڑکیوں
سے پر تھی شوخ نوجوانوں کی دھینگا مستی کا لطف لینے کے لئے
چنچل لڑکیاں اتاولی ہوگئی تھیں اور وہ بھی کسی حد تک سامنے
نکل آئی تھیں حسن کو اپنا جلوہ دکھانے کی بیتابی اور عشق کو
اپنے جوہر دکھانے کی۔ کچھ ان نگاہوں کی کافرانہ ترغیب اور
کچھ انہیں خراب ہونے کی تمنا! چھوٹا سا محلہ شہر رومان کا منظر
پیش کر رہا تھا۔

منہاج بھائی بھی لطف نظارہ سے محفوظ ہو رہے تھے کہ
اچانک انہیں اپنی پشت پر کسی مانوس لمس کا احساس محسوس
ہوا وہ فوراً پلٹے اور ان کی حیران نگاہیں عورتوں کی بھیڑ میں
گم ہوتی ہوئی زرد رنگ ملبوس میں آراستہ مکھی سے بنی
ہوئی ایک پلے دیکھی۔ پرکشش وجاذب نظر حسینہ پر ٹھہر گئیں
جو انہیں شرارت اور محبت سے دیکھ رہی تھی۔
منہاج بھائی چونک پڑے۔ حیرت و مسرت [illegible] ساتھ

رم کے مہینے میں عید کا چاند! کیسی حیرت اور مسرت کا سماں
عادہ تو اپنی سلمیٰ کی تلاش میں تین سال سے پریشان تھے
نہیں کیا خبر تھی کہ وہ آج اس طرح اچانک مل جائے گی۔ آسمان
سے اترے ہوئے رنگ و نور اور نغمہ و خوشبو کا تحفہ بن کر
منہاج بھائی کو جیسے نشہ ہو گیا وہ پاؤں کہیں رکھتے اور قدم
کہیں پڑتے۔ سلمیٰ ان کی بے خودی دیکھ کر زور سے ہنس پڑی
سے بلا وجہ یوں بے ساختہ ہنستا دیکھکر اس کی سہیلیاں چونک
گئیں اور اس سے پہلے کہ ان کی نظریں منہاج بھائی کا تعاقب
کریں وہ جھٹ سے منہ پھیر کر بھیڑ میں کھو گئے اور لبولہ
وہاہاوردیہا چلانے لگے ہونٹوں سے پھوٹ نکلنے والی ہنسی کو
روکے رکھنا ان کے لئے بڑا دشوار ہو رہا تھا۔

اس زمانے میں کاماٹی الکٹرک اور نل کی سہولیات
سے محروم تھی۔ شام ہوتے ہی پورا شہر گھنے اندھیرے
میں ڈوب جاتا۔ چاروں دشاؤں میں درختوں سے گھرے
ہوئے میدان تھے۔ بڑے بڑے گھنے درخت ــــ آم املی
نیم۔ سکیسر۔ پیپل۔ کرنجی۔ پرٹھوری۔ کو یٹ اور بیری کے
درخت۔ شام ہوتے ہی درختوں کے سائے اور بھی گھنے ہو
جاتے اور شام تاریک تر ہو جاتی۔ دن بھر ہینڈ لوم چلانے
والے مزدوروں کی بستی برتنوں کے شور و غل میں ڈوب جاتی
یا پھر بستروں کے ڈھیر میں کھو جاتی۔

منہاج بھائی کے ماں، باپ، بھائی بہن، بھتیجے بھانجے ایک
بڑا خاندان تھا جو ایک چھوٹے سے گھر میں مشترکہ زندگی
گزار رہا تھا۔ منہاج بھائی گرمیوں کے موسم میں ہمیشہ گھر
کے سامنے والی سڑک پر اپنی کھٹیا ڈال کر سویا کرتے تھے
چونکہ انہیں منہ اندھیرے اٹھ کر ٹھپل باغ کے کنوئیں
سے میٹھا پانی لانا ہوتا تھا۔ وہ حسب معمول ملگجے اندھیرے
میں ٹھپل باغ کے کنوئیں پر پہنچے۔ اتنے اندھیرے میں ابھی
وہاں کوئی نہ تھا۔ انھوں نے جلدی اپنے برتن بھر لئے
اور واپسی کے لئے مڑ ہی رہے تھے کہ انہیں کسی پایل کی
جھنکتی صدا نے روک لیا۔

دھندلی دھندلی روشنی میں انہیں وہ پیکر ایک نوکا

تیلا تیکھا۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں۔ بھرے بھرے صبیح
رخسار ستواں ناک۔ کشادہ پیشانی۔ گھنے بالوں سے ڈھکی
ہوئی۔ سفید فراک۔ سفید شلوار اور شانے پر صبح کی
سرد ہواؤں سے کھیلتا ہوا دوپٹہ۔ یہ سلمیٰ تھی۔ منہاج
بھائی اسے پہچان گئے اور شاید سلمیٰ نے بھی انہیں پہچان
لیا تھا۔ لڑکا اپنے ہی محلے کا ہو۔ اپنی ہی برادری کا ہو
ایک قابل رشک ہنر کا مالک ہو اور سارے شہر میں اسکے
گیتوں اور اس کی باتوں۔ اس کی خوب صورتی اور اسکی
چہل بل کا چرچا ہو تو کوئی لڑکی ــ کوئی ایسی لڑکی جس
کے دل میں اس کے نام اور اس کے ذکر سے گدگدی پیدا
ہوتی ہے۔ اسے کیسے نہ پہچانتی ہوگی۔

سلمیٰ کی بے وجہ شرم۔ گھبراہٹ اور جاں نثاری و خود
سپاری کی اداؤں سے منہاج بھائی کی حالت عجیب
ہو گئی۔ انہیں لگا سارا ٹھپل باغ یکایک بقعۂ نور بن گیا
درختوں میں پتیوں کی جگہ تمقمے جھلملا رہے ہیں۔ پھولوں
کے پودوں پر بہار آئی ہوئی ہے۔ ہر پودا پھولوں سے
بھرا ہوا نکھرا ہوا۔ سرسبز و شاداب۔ رنگ نغمے اور خوشبو
کی بوچھار ہے اور سارا ٹھپل باغ ایک طلسمی شہر کا منظر پیش
کر رہا ہے۔ سلمیٰ کو واپس جاتے ہوئے ڈر لگا۔

"اتنا گھنا اندھیرا۔ کہیں کچھ ہو گیا تو؟"

منہاج بھائی دل ہی دل میں ہنسے۔ پگلی اکیلے آنے ہوئے
ڈر نہیں لگا اور اب اکیلے جاتے ہوئے .... لیکن
انہوں نے سلمیٰ کی درخواست منظور کر لی اور منظور کیسے نہ
کرتے وہ تو خود ہی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے ایسی گداز بدن
اور رسیلی دوشیزہ کا قرب کون نہیں چاہے گا ــــ اور پھر
کنوئیں سے فرلانگ دو فرلانگ کا فاصلہ بہت سی باتوں
میں اس طرح کٹ گیا کہ انہیں خبر بھی نہ ہوئی مگر ابھی تو
ایک پھیری اور باقی تھی منہاج بھائی نے پھرتی سے اپنی
ڈول رسی اٹھائی اور سلمیٰ بھی جھٹ سے اپنی گاگر لے کر
نکل پڑی۔

پھر وہی دودھیا اندھیرا ـــــ پھر وہی طلسمی

منظروں والا پھل باغ ـــ پھر وہی بھربان رہگزر راہوں
باتیں ـــ کچھ اپنی، کچھ مخاطب کی۔ بے تکی باتیں۔ غیر ضروری
باتیں یہاں وہاں کی۔ ادھر ادھر کی۔ جھلکیاں۔ بازگشت
دھیمی دھیمی جلتے بجھتے چراغوں جیسی ہنسی۔ آنکھ مچولی کھیلتے ستاروں
جیسی مسکراہٹ۔ خوشبو اڑاتے پھولوں جیسی گفتگو۔ نقطے اور
روشنیاں

پتہ نہیں دونوں ذرا سی دیر میں کتنے قریب آ گئے
کتنی پہچان نکال لی کتنی باتیں کرلیں۔ یہ کیا طلسم ہے ـــ؟ یہ
کون سا جذبہ ہے ـــ؟ یہ کیسا احساس ہے جو دو انجانی
آتماؤں کو ایک قالب میں پرو دیتا ہے۔ بیگانگی کو پل
میں مٹا دیتا ہے۔ شرم اور جھجک کو ایک جھٹکے میں پست کر دیتا
ہے یہ کیا جادوگری ہے کہ غیر ہوتے ہوئے بھی دونوں ایک
دوسرے میں ڈوب گئے۔ ایک دوسرے میں لین ہو گئے
ذرا سے تانا بانا سلجھاتے بن پڑے تو اسے کڑی جوڑتے۔ دھاگے
الجھ جاتے ہیں ـــ دھاگے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ اللہ ـــ کیسا
اضطراب ہے کیسی پریشانی ہے۔ کیسی دھڑکن ہے۔ دل سینے
میں ٹھہرتا نہیں۔ سانس دھونکنی جیسی دھڑ دھڑ چلتی ہے
اس سے پیٹ بھر کھایا نہیں جاتا اور اس سے کچن میں برتن
نہیں سنبھلتے۔ کبھی چائے کی پیالی کبھی شیشے کا گلاس۔ چکنا
چور ٹکڑے دیکھ کر سلمیٰ جھلا جاتی ... اور کبھی کبھی ہنس پڑتی
لٹھ دو دن میں کیا حال ہو گیا ـــ؟
اب دن ڈوبے گا ـــ اب شام آئے گی ـــ اب رات بھیگے
گی ـــ ایک پہر ...... دو پہر ...... سہ پہر ... اور
اب جا کر وہ ساعت آئے گی جب وہ اپنی خالی گاگر لیکر ایک
افسوس ڈگر پر نکلے گی جانے کتنے دن بعد وہ ساعت آئے
انتظار ...... انتظار ...... اضطرار ...... اضطرار
دن بیتنے لگے۔ راتیں گزرنے لگیں اندھیرے
دو دھیا سویرے ایک کے پیچھے ایک ـــ مگر؟ سوا ـــ
چنچل۔ گستاخ۔ نرم ہی اور چنچل خود سا ـــ! وہ کب
کسی کی رفیق ہوتی ہے کب کسی کی یا جذبہ کب کسی کی دوست
اور غمگسار۔ ایک تو مسلم سا خمرہ۔ دوسرے متوسط خاندان

تیسرے شادیوں کے مسئلے! اچھے لڑکے۔ اچھے گھر۔ بیٹیاں
جہیز۔ سماج۔ برادری۔ ضابطے ...... قانون
اصول اور پابندیاں۔

سلمیٰ کو گھر بٹھا دیا گیا۔ کڑی نگاہیں ـــ کڑے پہرے
منہاج بھائی سخت پریشان ہو گئے۔ اس گلی کے پھیرے
اس گلی کی دھول۔ تانبے جیسا رنگ مٹی ہو گیا۔ محفلوں
کی جان۔ دوستوں کا محبوب۔ محلے کی شان ... سب
کچھ ایک غبار دود میں لپٹا ہوا تھا۔ مگر زندگی ہر دائرہ
توڑ دیتی ہے۔ ہر گھیرے سے نکل جاتی ہے۔ ماں باپ
بھائی بہن۔ بھانجے بھتیجے۔ فرائض۔ مجبوریاں: آخر
زندگی سے سمجھوتہ کئے بغیر کیسے جیا جا سکتا ہے۔؟

منہاج بھائی بھی زندگی کے پابند ہو گئے۔ انہوں
نے اپنے زخم پہ ایک پھاہا رکھ دیا۔ اپنے درد کو سہن
کر لیا مگر وہ زخم آج پھر ہرا ہو گیا۔ اس درد نے آج
پھر کروٹ بدل لی۔ سلمیٰ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں
ہے اور وہ جھٹ سے منہ پھیر کر بھیڑ میں کھو گئی ہیں اور
"دولہا دولہن" "دولہا دولہن" چلانے لگے ہیں۔ لبوں سے
پھوٹ نکلنے والی ہنسی کو روکے رکھنا ان کے لئے بڑا
دشوار ہو رہا ہے۔

رات تیزی سے بھاگ رہی ہے۔ شور و غل کا طوفان
بپا ہے۔ کھلنڈرے لڑکے۔ لڑکیاں اپنی اپنی پھلجھڑیاں
چھوڑ رہے ہیں اور دھیرے دھیرے ابھر رہا ہے وہی
رات کا سینہ چاک کرنے والا جفاکش با تو۔ سماں تک جیسے
انگارے پھینکنے والا شعلہ زدہ اندھیرے کی بساط الٹنے والا
زبردست چہرہ ...... دن جاگتا ہے تو وہ بیڑا دوده
لنگ ولیمہ کی محفل بکھر چکی ہے۔ منہاج بھائی تھکے قدموں
سے اپنے گھر لوٹ رہے ہیں۔

کھلی جو آنکھ تو تنہا تھے در و دیوار
گزشتہ رات یہاں جشن جیسا منظر تھا

منہاج بھائی اپنی جیون کتھا کے موڑ پر پہنچنے والے
تھے کہ احتشام آ گیا۔ میرا کلاس فیلو۔ میری طرح دبلا

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

"ڈبویا مجھ کو ہونے نے..."

ساجدہ زیدی

مری نظر
لامکاں میں محوِ سفر تھی
دِل،
اِک وجودِ مطلق کے حسن کا نکتہ داں تھا
احساس
ماورائے طلسم ہر دو جہاں تھا
رگ رگ میں
سوزِ عبدیت تمنا رواں دواں تھا
مرا تصور،
ورائے قیدِ زماں تھا
راہِ عدم مری واردات کی رزمگاہ تھی
ہر نفس
ازل و ابد کا سرِّ نہاں تھا
پہنائے آرزو کے افق کا
میرا ہی ذوقِ بے حد و راز داں تھا

نہ کوئی آواز نالہ زن تھی،
نہ کوئی ادراک نیش زن تھا،
نہ کوئی حسرت کہ خونچکاں تھی،
نہ کوئی لمحہ کہ رائیگاں تھا،
نہ کوئی خواہش وبالِ جاں تھی،
نہ کوئی رنجِ فراقِ مجبور و سرگراں تھا،
ہر اک نفس
اک سکونِ مطلق کا ہم عناں تھا

مگر مری ہی نگاہِ حائل نے
بہتے دریا کے درمیاں
اک لکیر سی کاٹ دی
اک انجانی جستجو میں

مری نگاہیں
حدود اور فاصلے کی زد میں سمٹ گئی ہیں
مری تمنائیں
ہست و امکان
بود و نابود
اور — فنا و بقا کے خانوں میں بٹ گئی ہیں
مرا مذاقِ سفر
گرفتارِ ابتدا، انتہا ہوا ہے
مرا دلِ بیقرار
دوشِ ہوا کے قابل نہیں رہا ہے

میں رمز و آہنگ کی
اکائی کو کاٹ کر جی رہی ہوں
شاید....
میں اپنی ہستی کی خود نفی ہوں

نظمیں

پروانہ رُدولوی

سوال

گاؤں کے باہر
بوڑھے پیپل کے بوجھل بوجھل سایہ میں
ایک پرانی قبر کا پتھر
پوچھ رہا تھا آج کسی سے
سورج کب آترے گا زمیں پر۔ اور
قیامت کب آئے گی ؟

▲▲

دُعائے سحر

رات
تاریکی کے آنچل نے
مری عزت بچا لی
صُبح
کس کونے میں اپنا مُنہ چھپاؤں
رات
جن آنکھوں کی زد سے بچ گیا تھا
اب تو اُن آنکھوں سے بچنا ہے محال
اے خُدا
تو چھین لے صُبحیں مری !

▲▲

شاہین بدار

آخری منزل

عمر کا سیلاب بڑھتا جا رہا ہے دوستو
وقت کا دھارا پلٹ سکتا نہیں
کہہ رہی ہے آخری منزل نہیں خوش آمد
اور ہم نظریں جُھکائے
چہرۂ تاریک اور دستِ تہی اپنا لیے
رفتہ رفتہ بڑھ رہے ہیں آخری منزل کی سمت

▲

غزلیں

بدیع الزماں خاور

مجھے مٹاتا رہا ہے یہ آسمان بہت
مگر زمین پہ ہیں اب بھی، مِرے نشان بہت

ہے لطف کچھ تو ہے میرے جدید لہجے میں
قدیم ورنہ ہے میری بھی داستان بہت

تلاش ہو بھی تو کیا سایۂ شجر کی مجھے؟
مِرے لیے ہے یہ سورج کا سائبان بہت

اب آ گئے ان کے دلوں میں کیا، خدا جانے
نظر تو آتے ہیں یہ لوگ مہربان بہت

عجب نہیں کہ میں دریا نہ پار کر پاؤں
شکستہ ہے مِری کشتی کا بادبان بہت

بہائے پیار نے چشمے ہزار ہا، لیکن
ہے سخت اب بھی تِرے در کی چٹان بہت

پتا نہیں، یہ مجھے آج کل ہوا کیا ہے؟
میں اپنی ذات سے ہوں بدگمان بہت

▲▲

حنیف کیفی

نادر اشیا کی جگہ چھانٹ کے لائے پتھر
ہم نے کس شوق سے کمرے میں سجائے پتھر

حرفِ حق حرفِ غلط کرنے کو آئے پتھر
میں نے سچ بول کے ہر دور میں کھائے پتھر

ہم نے بے فیض چٹانوں میں کھلائے گلزار
تم نے زرخیز زمینوں سے اُگائے پتھر

روز اُبھرتے رہے دیوارِ مقابل بن کر
اپنی راہوں سے بہت ہم نے ہٹائے پتھر

کیا خبر کون سے عالم میں اُٹھی تھیں نظریں
میں نے دیکھا تو ستارے نظر آئے پتھر

پھول برسائے تھے ہر ایک پہ ہم نے کیفی
لوٹ کر ہم پہ ہر اک سمت سے آئے پتھر

▲▲

اطہر عزیز

اشک ہوں، آہ ہوں، آتش ہوں کہ اخگر دیکھو
کیا ہوں میں دوستو آؤ مجھے چھو کر دیکھو

سوچ کے غار سے اک شور اُٹھا ہے تو سہم
اب کہاں جا کے ٹھہرتا ہے یہ لشکر دیکھو

میں نے مانا کہ گگن پھول کی کشتی ہے مگر
اپنی دھرتی پہ بھی کچھ دور تو چل کر دیکھو

میں نے جو سنگ اُچھالا وہی سورج نکلا
ڈوبتی رُت کے دہکتے ہوئے تیور دیکھو

دل کہ دیپک تھا کبھی آج ہے داغوں کا گھر
کتنے رنگ اور دکھاتا ہے مقدر دیکھو

گُل سے خوشبو ہی اگر روٹھ گئی ہو اطہر
پھر تو بس ایک مہکتا ہوا پتھر دیکھو

▲▲

بڑے آدمی

کنور سین

تمھاری سبز آنکھوں میں
سیاہی بھی تو پنہاں تھی
وگرنہ تم نہیں کہتے ——
ہوا مشرق سے آئی ہے
وگرنہ تم نہیں کہتے ——
مہک مشرق سے کیوں آئی؟

آسکر وائلڈ نے —— ادبی دوستی کو زہر بھرے برتن کی
ن کے مماثل قرار دیا ہے —— شاید بڑے لوگوں کا ذہنی رویّہ
یہ عمل میں یہی رہا ہے۔ اپنے کو اپنے جیسوں سے الگ اور
، سمجھنا اور اگر غلطی سے اُن کی تعریف و توصیف میں منہ سے
ل جائے تو اُس پر پچھتانا چھوٹے لوگوں کا نہیں بڑے لوگوں
ہ ہے۔ چھوٹے تو ہوتے ہی بت پرست ہیں حالانکہ وہ
ہیں:

بظاہر قابلِ تعظیم و سجدہ
مگر اندر سے ہر بُت کھوکھلا ہے

ایذرا پاؤنڈ اور ٹیگور کی دوستی میں پنہاں مخاصمت
نہ بھی ہے حقیقت بھی۔ دونوں میں کچھ مشترک نہ تھا پھر بھی
پاؤنڈ نہ تو ٹیگور کو نظر انداز کر سکا نہ اُس کی مذمت کیے بغیر
ا۔

ایذرا پاؤنڈ عظیم امریکن شاعر والٹ وہٹ مین کے بعد سب سے زیادہ ذہین اور زرخیز شاعر تھا۔ اُسے جینیس کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن اُس کی ذہنی بے راہ روی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کا ذہنی انتشار اِس حد تک بڑھ گیا کہ اُس نے ہٹلر جیسے جابر کو ایک سنت کہا، ڈیموکریسی کو ڈکیتی۔ اِسی ذہنی اور اخلاقی دیوالیہ پن کی وجہ سے اُس کے آخری ایام پاگل خانے میں گزرے۔

ٹیگور ایک سُلجھا ہوا انسان اور منجھا ہوا شاعر تھا۔ اُس کی شخصیت اور شاعری میں تضاد ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ روح کی مانند لطیف اور جذبے کی طرح گداز بنگالی گیت، دھرتی سے آکاش تک پھیلا ہوا۔ اُس میں اور ایذرا پاؤنڈ میں کچھ بھی مشترک نہ تھا۔ پھر بھی دونوں جونہی ایک دوسرے سے ملے دوست بن گئے۔ یہ ملاقات ۳۰ جون ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔

اُن دنوں پاؤنڈ مشہور آئرش شاعر ایٹس کے سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ٹیگور نے لندن میں ایک خاص ادبی اجتماع میں اپنی نظمیں پڑھیں۔ وہیں پاؤنڈ بھی ایٹس کی طرح ٹیگور کا مداح ہو گیا۔ ایٹس نے ٹیگور کی گیتانجلی کا دیباچہ لکھا۔ لیکن یہ کہنا درست نہیں کہ اُس نے گیتانجلی کے گیتوں کا ترجمہ بھی کیا۔ پاؤنڈ نے بھی ٹیگور کی شاعری سے متاثر ہو کر اُسے امریکن ادبی حلقوں میں متعارف کرانے کا بیڑا اُٹھایا۔ شکاگو سے نکلنے والے میگزین 'POETRY' میں ٹیگور کی جو نظمیں شائع ہوئیں اُن کا تعارف پاؤنڈ نے لکھا۔

"رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کا انگریزی میں شائع ہونا انگریزی ادب ہی نہیں عالمی ادب میں ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ ٹیگور کی شاعری قرونِ وسطیٰ کے سنگیت کی مانند دل و دماغ پر چھا جانے والی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اور رکن اپنا سحر رکھتا ہے..... یہ بنگلہ شاعر اپنی نظم کے روپ میں ہمارے لیے وہ چین اور سکھ لایا جس کی اس فولاد اور مشین کے یگ میں ہمیں انتہائی ضرورت ہے... اِن نظموں کا استعارہ ہماری سوچ کے رنگوں سے کہیں زیادہ گہرا اور رچا ہوا ہے۔"

ایذرا ایک کے بعد دوسرے میگزین میں لکھتا چلا گیا:

"ایک مہینے سے زیادہ ہوا جب میں ایٹس کے کمرے میں داخل ہوا اور دیکھا وہ یہ کہنے کے لیے بے چین ہے ــــ ٹیگور ایک ایسا شاعر ہے جس کا ہم پلہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں۔ اُس کی نظموں کے مجموعے گیتانجلی کا مقابلہ صرف دانتے کی PARADIS سے کیا جاسکتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ یہ سب تعریف و توصیف اور خراجِ تحسین پاؤنڈ کے اندر کے اپنے تضاد کا نتیجہ ہے کسی کی ذہانت کو ناپنے کا یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ وگرنہ ٹیگور کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینے والا امریکن ادیب صرف ایک ماہ بعد ہی حسد اور رقابت کا شکار نہ ہو جاتا:

"ایک دھارمک آپدیشک کے روپ میں ٹیگور بارِ محض اور فضول ہے۔ اس سے بڑا تو لاؤنس ہے۔ مغربی تہذیب کے بحران کے فنکار رگوں کے لیے اُس کے پاس کچھ نہیں۔ وہ اُن کے زخموں پر مرہم نہیں لگا سکتا نہ اُن کی روح کی خستگی کا مداوا ہی کر سکتا ہے۔ اُسے جدید حسیت کے تقاضوں کا علم نہیں۔ اُس کی نظموں کا مواد متنازعہ ہے گو اُن کی ہیئت کے انوکھے پن سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ویدوں کو اپنی شاعری میں ڈھالنا کوئی ایسا کام نہیں جس کو کارنامہ کہا جا سکے۔ بنگلہ نظموں کا بنگلہ زبان میں بحر اور قافیہ ردیف کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، اُن کا نثری ترجمہ سپاٹ تصوف سے زیادہ کچھ نہیں۔"

شاید ایک دو ماہ کے قلیل عرصہ میں ہی ایذرا پاؤنڈ کے اندر کا سانپ جاگ اٹھا اور اپنا زہریلا پھن لہرانے لگا ورنہ ادبی اخلاقیات کے کسی بھی اصول اور پیمانے کی رو سے وہ خود اپنے کو اس طرح نہ جھٹلاتا۔ جب ٹیگور کو نوبل پرائز ملا تو ایٹس نے اُسے رسمی طور پر بھی مبارکباد نہ بھیجی نہ پاؤنڈ نے ہی اس تاریخی واقعے کا نوٹس لیا۔

بات معمولی تھی ــ

۱۹۱۷ء کے اختتام کے قریب ٹیگور امریکہ گیا۔ وہاں پاؤنڈ ایک دوسرے شاعر کے ساتھ مل کر کبیر کے دوہوں کا ترجمہ کر رہا تھا۔ ترجمہ دیکھ کر ٹیگور غصے میں آگیا۔ اُس کے خیال میں ترجمہ ناقص اور معیار سے گرا ہوا تھا۔ اُس نے دوہوں کا ترجمہ خود کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کام میں جی جان سے جٹ گیا۔ ایذرا پاؤنڈ نے اسے اپنی اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کی توہین سمجھا۔ اس کی انا بھنا اُٹھی اور وہ ٹیگور کے خلاف زہر افشانی کرنے پر تل گیا۔

▲▲

اپنے لوگ — بقیہ ص ۱۹

تھا لیکن مجھ سے زیادہ جلد باز اور با اخلاق نوجوان بھیا بھائی نے اس کے لئے جگہ چھوڑ دی ہے اور اس نے اصرار کر کے انہیں پھر بٹھا دیا ہے۔ وکیل کیپٹین سے چائے خانے کے ٹھیلے پان اور سگریٹیں لیکر ہم لوگ اپنے اپنے گھر اپنے اپنے کاموں کی طرف لوٹ گئے ہیں ــ ــ کام جو ہماری زندگی ہے۔

▲▲

سُرخ روشنیوں کا ٹوٹتا ہوا جال

احمد عثمانی

مَیں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ہر طرف سُرخ نیم
ے تھے۔ اور ان نیم دائروں میں سنہرے دلکش حروف
ہوئے تھے لنظریں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ پل بھر کے لیے دھندلا
ن تھیں۔ میرے قدم رُک گئے۔ دراصل میں سُرخ، سنہرے
ریب رنگوں میں کھو گیا تھا۔

تھوڑی دیر تک میں لطف اندوز ہوتا رہا۔ اب مجھے
یش سی ہونے لگی تھی کہ اس چوکور دروازے پر سُرخ نیم
رے اور سنہرے دلکش حروف کس لیے لٹکائے گئے
ں۔ میں وہاں تماشائی بنے رہنا چاہتا تھا لیکن ان رنگوں
مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں اُن کے بارے میں نہایت سنجیدگی
سوچنے لگا۔

دُور اور نزدیک سے یہ بہت ہی خوبصورت گیٹ
ائی دیتا تھا۔ اور میں نے اندر دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی
ندر کوئی نہیں تھا اور نہ میرے سوا کوئی اور باہر تھا۔
نے سوچا۔ ہو سکتا ہے جن لوگوں کو اندر جانا تھا وہ
ب اندر جا چکے ہوں۔ اور اندر جاکر سُرخ روشنی میں
رگہرے خوابوں میں ڈوب گئے ہوں۔ میرا سوچنا اس
یح تھا کہ گیٹ پر سحر انگیز سُرخ روشنی تھی۔ ایسی روشنی
ں کو خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔

میرا تجسّس بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ان
خ نیم دائروں اور سنہرے حروف کا کیا مطلب ہے؟ لیکن
ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے سوچا۔
یں یہ ایک خوبصورت فریب تو نہیں؟ کیونکہ بہتوں کے
شکاری خوبصورت کیڑے لٹکا کر پھندا بنا دیتے ہیں پرندہ
کیڑے کے لالچ میں آکر ریشمی پھندے میں پھنس جاتا ہے۔
یہ ویسا ہی پھندا تو نہیں ہے؟

میرا ذہن مسلسل سوچے جا رہا تھا۔ نئے نئے خیال
اُبھر رہے تھے۔ گیٹ کے اندر کوئی تھا نہ باہر۔ ہو سکتا
ہے سب پھنس گئے ہوں۔ یا کوئی آیا ہی نہ ہو پھنسنے کے
لیے۔ یا آنے والوں نے اپنا دامن چھڑا لیا ہو۔ یا پھر ان سُرخ
نیم دائروں اور سنہرے حروف کا مطلب سمجھ گیا ہو۔ اور وہ خوابوں
کا مزہ چکھ کر واپس چلے گئے ہوں؟

سوچتے سوچتے میرا ذہن تھکنے لگا تھا۔ میں گیٹ کے ایک
جگمگاتے ستون سے ٹیک لگا کر سستانے جا ہی رہا تھا کہ مجھے ریشمی
پھندا یاد آگیا۔ میں جلدی سے دُور ہٹ گیا۔ پتہ نہیں کیا ہو جائے۔
میرے چھوتے ہی یہ گر پڑے یا اس کے اندر سے کوئی سُرخ
سُرخ زبان باہر نکل کر مجھے اندر کھینچ لے۔ ایسی ہی باتیں میرے
ذہن میں کلبلانے لگیں۔ کیونکہ یہاں کا ماحول بڑا ہی پُر اسرار تھا۔
پُر اسرار ماحول میں ذہن بہت جلد طلسماتی بن جاتا ہے۔ اور
اُسے عجیب عجیب پرچھائیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اور
یہاں تو ہو کا عالم تھا۔ لیکن طلسماتی فضا پر میرا تجسّس غالب
آگیا۔ اور تمام خطرات اور بلاؤں کو نظر انداز کر کے میں اندر
داخل ہو گیا۔

میں دُور تک چلا گیا۔ ایکبار پلٹ کر دیکھا کوئی نہ تھا۔ گیٹ
کی باہر والی روشنیاں اندر دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ گیٹ اندر
سے پھیکا نظر آرہا تھا۔ سُرخ نیم دائروں اور سنہرے حروف کے

اپنی شکل تبدیل کر دی تھی۔ اب وہاں بدصورتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں ایک لمحے کو رکا اور اپنے آپ کو اس ماحول میں ایڈجسٹ کرنے لگا۔ اب سامنے ایک کالی سڑک تھی جو پتا نہیں کہاں ختم ہوتی تھی —— میں نے دھیرے دھیرے قدم بڑھانے شروع کیے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے آگے کچھ معلوم ہو جائے۔ میں چلتا گیا۔ ایک جگہ مجھے بہت ساری کتابیں نظر آئیں۔ کتابوں پر سرخ سیاہی سے نیم دائرے بنے ہوئے تھے اور ان نیم دائروں میں لکھا تھا "انسانی خواب کی تعبیر" میں نے ایک کتاب اٹھانے کی کوشش کی۔ کتاب کو چھوتے ہی بھر بھر مٹی جھڑنے لگی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا لیا۔ کتابیں اتنی بوسیدہ ہو چکی تھیں کہ ان کو دیمک چاٹ گئی تھی اور الفاظ اُڑ چکے تھے۔ میں کتابوں کے بوسیدہ ڈھیر کے پاس سے ہٹ آیا۔ آگے ایک جگہ جھنڈوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ ان پر بھی نیم دائرے اور پتہ نہیں کیا کیا شکلیں تھیں۔ لیکن ان کا بھی رنگ اُڑ چکا تھا۔ یہ بھی تار تار تھے۔

میں حیرت زدہ آنکھوں سے ہر چیز کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں بہت آگے بڑھ آیا تھا اتنا آگے کہ سرخ نیم دائرے اور سنہرے حروف یہاں سے سیاہ دھبّے کی مانند نظر آرہے تھے۔ اندر کی بھیانک بدصورتی اب پوری طرح اُبھر آئی تھی۔ میں اکتا کر پلٹنے ہی والا تھا کہ مجھے ہلکی ہلکی چاپ سنائی دی۔ جیسے کوئی بہت ہی لاغر اور بوجھل جسم چل رہا ہو۔ میں تیزی سے اُس طرف دوڑ گیا تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے ایک پنجر دکھائی دیا۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں یوں پھیلی تھیں جیسے اُنھیں کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ اِدھر اُدھر نظریں گاڑ کر وہ ہڈیوں کا پنجر یوں چلتا تھا۔ جیسے اُس کے گرد سحر کا دائرہ کھینچ دیا گیا ہو۔ اُس کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ ایک خواب سے دوسرے خواب میں ڈوبتا چلا جانا چاہتا تھا۔ اُس کے بال بڑھ کر جٹاؤں کی شکل میں لٹک چکے تھے جسم لباس کی قید سے آزاد تھا۔ سارے بدن پر کمزوری سے رعشہ طاری تھا۔ وہ قدم بڑھاتا۔ اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا اور پھر مایوس سا ہو کر اس کالی سڑک پر چلنے لگتا۔

اُس کے قریب پہنچ کر میں نے پکارا "ہلو! ہلو!! ہلو!!!"

وہ رُک گیا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ میں نے ذرا تیز آواز میں کہا "تم کون ہو؟"

اُس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا "میں۔ میں ایک یونٹ ہوں"۔

"یونٹ! یونٹ کیا ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں صرف یونٹ کہلاتا ہوں۔ مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے۔ باقی باتیں گیٹ بنوانے والے ہی جانتے ہیں اور تم نے جو لفظ سب سے پہلے استعمال کیا ہے وہ لفظ میں دہرانا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ وہ لفظ بورژوا لوگوں کی زبان کا ہے۔ اس گیٹ کے اندر اُس کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ وہ یوں ہانپنے لگا جیسے زندگی کا سارا فلسفہ بیان کر دیا ہو —— تھوڑی دیر تک وہ بے دم سا آنکھیں موندے کھڑا رہا۔ پھر کہنے لگا "تم مجھے اس طرح اس لیے دیکھ رہے ہو کہ میں تمھیں عجیب دکھائی دے رہا ہوں۔ یقین کرو جس وقت میں نے اس دشت میں قدم رکھا تھا تم سے زیادہ گبرو جوان تھا۔ میری رگوں میں خون اُبلتا تھا۔ لیکن اُس کی ساری گرمی اور سرخی اُس نیم دائرے نے چھین لی ہے جسم کا سارا سنہرا پن اُن حروف نے چاٹ لیا ہے۔ انھیں رنگدار نیم دائروں اور حروف کو دیکھ کر میں اس دروازے میں داخل ہوا تھا۔ اور اب مسلسل خوابوں میں جی رہا ہوں۔ مجھے اب واپسی کا راستہ بھی نہیں سوجھتا۔ کیونکہ مجھے سرخ کرن کا انتظار ہے جو کبھی نہ کبھی مشرق سے نکلے گی اور اس دھرتی کے موسم بدل دے گی... "

میں یہاں اپنا قہقہہ روک نہ سکا —— مجھے ہنستے ہوئے دیکھ کر اُس آدمی کی آنکھوں سے شدید نفرت اور غصے کے سرخ شعلے سے اُبلنے لگے —— میں نے اُس کے غصے اور نفرت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو نہیں محسوس ہوتا کہ وہ کرن اب آئے گی۔ کیونکہ ساری کتابیں بوسیدہ ہو گئیں ہیں اور اُن کے الفاظ اُڑ گئے ہیں —— اور تم ابھی تک اُسی کے خواب دیکھ رہے ہو —— مجھے تو لگتا ہے جن لوگوں نے تمھیں خوابوں کی دنیا میں قید کیا ہے انھی نے اُس کرن کو

ستے ہیں ہی اچک لیا ہے اور اپنے ایوانوں کو روشن کر لیا
ے۔ تبھی تو وہ کرن تم تک نہیں پہنچی ——"
بوڑھے کی نظروں میں تشویش ابھر آئی ——" تو کیا وہ
ب دھوکا تھا۔ چھل تھا کپٹ تھا" بوڑھا بڑبڑایا۔
میں نے کہا " یہ سب دوسروں کے لیے ہے۔ اُن
ے لیے نہیں .... جنھوں نے تمھیں یہاں بھیجا
ے۔ وہ تو ایر کنڈیشن روم میں بیٹھ کر سُرخ کرن کی باتیں
رتے ہیں اور تم ہو کہ اس صحرا میں بھٹک رہے ہو" ——
بوڑھے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔
. باہر چلو گے ؟"
تھوڑی دیر تک اُس کی آنکھوں میں وہی تشویش تھی
ر چہرے پر کرب۔ لیکن دھیرے دھیرے اُس کی آنکھیں
ر چہرہ معمول پر آگئے۔ اور اُس کی آنکھیں بیدار

سی ہو کر چمکنے لگیں۔ اُس نے پُرمسرت لہجے میں کہا۔
"سچ۔ تم مجھے باہر لے چلو گے ؟"
میں نے کہا "ہاں۔ کیونکہ یہاں کی سُرخ فضا نے مجھ پر اثر نہیں ڈالا ہے۔ جو کچھ اثر ڈالا تھا وہ تمھیں دیکھ کر زائل ہو گیا ہے۔"
بوڑھے نے کہا "تو پھر جلدی لے چلو کہیں مجھے بھی دیمک نہ چاٹ جائے۔"
میں نے بوڑھے کا ہاتھ تھام لیا اور ہم بوسیدہ جھنڈیوں، دیمک لگی کتابوں کو پھلانگتے ہوئے باہر آگئے۔ بوڑھے نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا نیلا نیلا آسمان چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہم دونوں شہر جانے والی سڑک پر دھیرے دھیرے بڑھنے لگے۔ سُرخ نیم دائرے اور سُنہری حروف ہم سے دُور ہوتے چلے گئے ——

▲▲

طبقاتی جنگ (بقیہ ص...)

رمایہ داروں، تاجروں اور صنعت کاروں سے ازسرِنو
جوع کا ذکر ہے جن کی جائدادیں اور بینک اندوختے
چرل انقلاب کے دوران ناجائز طور پر ضبط کر لیے گئے
ے۔ نئی تجاویز میں یہ شامل ہے کہ نجی مکان ان کے مالکوں
و واپس کر دیے جائیں اور ان کا نجی مال و سامان اور بینک
ے اندوختے بھی۔ ان کے کارخانوں کی ضبطی کا انھیں معاوضہ
لے گا اور معاوضہ اس وقت سے شروع ہو گا جب
ارخانے ضبط کیے گئے تھے۔ ملازمت، تعلیم اور
رٹی کی ممبر شپ کے سلسلے میں سرمایہ داروں کے
وں کے خلاف کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ نیو
ائنا ایجنسی کی ۲۸ جنوری کی اطلاع کے مطابق
ب "جاگیردار اور امیر کسان کے لیبل لگانے
ا سلسلہ ترک کر دیا جائے گا اور انھیں عام ان کے
چوں کو پورے قانونی اختیار حاصل ہوں گے" یہ
وگ گزشتہ سیاسی مہموں خصوصاً کلچرل انقلاب

کے دوران ملامت کا ہدف بنے رہے ہیں سنٹرل کمیٹی کے فیصلے میں واضح طور پر درج ہے کہ ان اقدامات کا مطلب یہ ہے کہ اعتدال کی نئی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آبادی کے سبھی عناصر کی تائید حاصل کی جائے اور سابق سرمایہ داروں کے پاس جو مخصوص فنی اور انتظامی صلاحیتیں ہیں ان سے فائدہ اُٹھایا جائے۔
چین جو کسی زمانے میں اتنا بیباری تھا کہ روس تک کو اپنے مقابلے میں کمینی سمجھتا تھا، اس کا نیا انداز فکر اور پالیسیاں اس قابل ہیں کہ ہندوستانی مارکسی ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ یہ حقیقت باقی دُنیا کی سمجھ میں تو آچکی ہے، اب ان کی سمجھ میں بھی آجانی چاہیے کہ سماج کو نظریاتی سانچوں میں ڈھالنے کا دور گزر چکا ہے اور پرانے نعرے تو یقیناً فرسودہ ہو چکے ہیں۔

▲▲

انعام

مظہر الزماں خاں

سُرخ لمحوں کے جسم پر کانٹے اُگے ہوئے تھے اور وہ سب اُس کی زنجیر میں صدیوں سے اسیر تھے ـــ اُن کی زبانوں پر مُہر لگا دی گئی تھی ـــ وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے لیکن کہنے کے لیے مسلسل جد و جہد کر رہے تھے ـــ اگر اتفاق سے کسی کے ذہن پر لگی ہوئی مُہر کھُل جاتی تو پوری قوت سے چیختا کر میرے ذہن پر تالا نہ ڈالو کہ میں ابھی زندہ ہوں اور میرے اندر آواز کا دریا تیزی سے بہہ رہا ہے اور میں اُس آواز کے دریا میں ڈوب جانا چاہتا ہوں جو میرا پیدائشی حق ہے لیکن اُسے پکڑ کر پھر اُس کے ذہن پر تالا ڈال دیا جاتا تھا کہ کہیں اُس کی آواز سُن کر اُس کے ساتھی بیدار نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اگر وہ بیدار ہو جاتے تو انھیں سبز انقلاب کا ڈر تھا۔ اور اگر وہ سبز انقلاب لانے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر اُن لوگوں کا کیا کرایا مٹی میں مل جاتا جو صدیوں سے اُن کے منہ پر تالے ڈال کر اور آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ کر اُن سے بیگار لے رہے تھے۔ وہ سب کے سب اَن دیکھے راستوں پر چل رہے تھے۔ گو کہ پاؤں راستوں کی ٹھوکروں سے زخمی تھے اور تلوؤں میں آبلے پڑ چکے تھے ـــ ہاتھ بیگار کرتے کرتے برف بن چکے تھے۔ اور ذہن سوچنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ وہ مجبور تھے اور ان کی مجبوری ہی ان پر اپنا تسلط جمانے والوں کی اصل طاقت تھی۔

"ہم کب تک ان پر مسلط رہیں گے ـــ؟" لمحوں پر قابض ایک وجود نے اپنے ساتھیوں سے کہا ـــ "آئے دن کسی نہ کسی ذہن پر لگا ہوا تالا کھُل جاتا ہے اور وہ پوری قوت سے اپنے ساتھیوں کو بیدار کرنے کے لیے چیختا ہے۔ اُس کی آواز پر سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور بندھی ہوئی سیاہ پٹیاں نوچنے لگتے ہیں" ـــ ایک کے لیے رُک کر وہ پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ پٹیاں کھولنے میں وہ کامیاب ہو گئے تو پھر ہمارا کیا ہو گا

"اس چھپکلی کو اپنی کھوپڑی سے جھٹک دو جو بیہودہ پریشان کرتی رہتی ہے" لمحوں پر مسلط ایک بھوری آنکھ والے نے کہا۔

ـــ ـــ وہ سب ایک سُرخ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے ـــ اور اُن کے سامنے سُرخ ٹیبل۔ سُرخ پھول کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اُن سب کا لباس بھی سُرخ تھا۔ کی آنکھیں بھوری تھیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں ہوئی تھیں۔

"تم اپنے ساتھی کی آواز کی گہرائی کو سمجھنے کی کوشش کرو" تیسرے نے کہا "وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے۔ کہہ رہا ہے یا بقول تمہارے، اُس کی کھوپڑی میں بیٹھی چھپکلی اُسے پریشان کر رہی ہے ـــ اور اگر ایسا ہے تو اُس کی آواز کی گہرائی کو ناپنے کی ضرورت نہیں"

"میری آواز کو ناپنے کی بجائے اپنے دلوں میں دیکھو کہ تم سے وہ کیا کہہ رہے ہیں"

"ہمارے اس ساتھی نے جو کچھ کہا ہے ـــ خیال میں وہ ایک حقیقت ہے" چوتھے نے کہا یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اب وہ اپنے جسموں پر کسی ہو زبانوں پر پڑے ہوئے تالوں اور آنکھوں پر بند

... سے آزاد ہونا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ مسلسل جد کر رہے ہیں۔"

"اُن کی تمام کوششیں لاحاصل ہیں" ــــ پہلے نے جو اپنے ساتھی سے کچھ دیر پہلے کھوپڑی کی چھپکلی جھٹکنے لیے کہہ چکا تھا۔

"یہ تمہاری خام خیال ہے" دوسرے نے جواب دیا "تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی قبیلے کو اندھا کرنے کی کوشش کی گئی یا اُن کی زبانوں پہ تالے ڈال کر جادھند اُن سے کام لیا گیا۔ وہاں بہت جلد ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے اور اُن مٹھی بھر ذہنوں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے جو لمحوں کی گردن پر سوار ہو کر پوری نسل کو اپاہج بنانا چاہتے ہیں۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب تمہارا ضمیر بیدار ہو چکا ہے" تیسرے نے اپنے ساتھی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تمہاری طرح میں بھی اپنے ضمیر کو بیدار ہوتے ہی کچل چکا ہوں" ــــ وہ بولا "ورنہ اب تک دھماکہ ہو چکا ہوتا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" چوتھے نے کہا ـــ "کھل کر سامنے آؤ۔"

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انھیں اسیر ہی رکھا جائے۔ مگر ان کے سروں پر رکھے ہوئے پہاڑوں کا بوجھ کم کر دیا جائے۔ اور گاہ بہ گاہ انھیں یہ احساس دلایا جائے کہ تم پوری طرح آزاد ہو۔"

"ایسا کرنے سے کیا ہو گا ـــــ" تیسرا بولا۔

"وہ آگ جو اُن کے دلوں میں آہستہ آہستہ سُلگ رہی ہے ـــ سرد ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے" تینوں نے کہا۔ اور اُن کی بھوری آنکھیں انگارے بن گئیں۔

"ہم سب سُرخ سورج کو سلام کرتے ہیں۔ اور تمھارے دماغ کو لہو لہان انعام عطا کرتے ہیں۔" اُن سب نے بیک وقت کہا اور سُرخ زمین کے سینے پر بکھر گئے۔ تب اچانک ایک چیخ بلند ہوئی۔ جاگو!!

▲▲

نظمیں

ڈاکٹر نریش

واہمہ

میں نے جب
من کے کینوس پر
اپنے ماضی کی تصویر بنانا چاہی
تو
سیاہی کے دھبے سے ہی اُبھر پڑے
اور
ہاتھوں میں کوچی جیسے منجمد ہو گئی۔
احساسات کا گہرا پانی
گدلا گدلا، میلا میلا
جیسے کینوس پہ اُبھرا ہر نقش مٹانے کو، منہ کھولے
کسی دیو کی طرح
لپکنے کا موقع ہی ڈھونڈ رہا ہو۔
سوچ رہا ہوں
سبھی نقش مٹ گئے
تو میری صدیوں کی محنت پہ پانی پھر جائے گا۔
پھر میں کیسے امر رہوں گا۔
کیسے رہے گا نام مرا دُنیا میں باقی!

ساحل احمد

حروفِ تہجّی

الف، لام، میم،
تین حرف ہیں
لیکن سچ پوچھیے تو،
لفظ ہیں
کیوں کہ
نُو حرف ہیں
نُو تین سے کٹ جاتا ہے
اس لیے حرف ہیں
حرف نہیں کٹتا
حرف اللہ ہے
اللہ تنہا ہے
اکیلا ہے
اس کا کوئی شریک نہیں
الف سے ی تک
جتنے حروف نقطے والے ہیں
ان میں سب سے خطرناک
ب کا نقطہ ہے

کیوں کہ
ب سے بارود بنتا ہے
بم بنتا ہے
د کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے
جیسے وہ لڑکی
وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی
طویل فاصلہ
ایک جست میں طے کر گئی ہو
میں نے تمام حروف توڑ پھوڑ کر
نالی میں پھینک دیئے
لیکن!
یہ یاد آنے پر
کہ اس میں
اک ایسا حرف بھی تھا
جو میرا دوست تھا

غلطی ہو چکی تھی
چڑیا دانہ چگ گئی تھی

نظمیں

شاہد کلیم

جزیرہ

وہاں ہوں میں
جہاں چاروں طرف میرے
سمندر آنسوؤں کے بہہ رہے ہیں
اگر میں بھاگنا چاہوں
تو ان میں ڈوب جاؤں گا
(مفر کا راستہ کوئی نہیں ہے)
تو میں اک جیل میں رکھے گئے
اک ایسے قیدی کی طرح ہوں
کہ جس کو کاٹنی ہوگی سزائے قیدِ عمر
مگر کس جرم کی پاداش میں
ایسی سزا کاٹوں ــــ؟
ہر اک قیدی سزائے عمرِ دوراں کاٹ کر
آزادیوں میں روانہ ہو چکا ہے
مگر میں آج بھی انجانے جرموں کا سزایاب
صلیبِ غم اٹھائے پھر رہا ہوں
میں اپنی ذات کے تنہا جزیرے میں رہوں کب تک ــــ؟

▲▲

نسیم مظفر پوری

بدلتے موسموں کی مہک

تم اپنے سفر کی حدوں سے بہت دور آ گئے نکل تو چکے ہو
مگر راستے کے مناظر، بدلتے ہوئے موسموں کی مہک،
لمحہ لمحہ پگھلتی ہوئی ساعتوں پر
کبھی تم نے تھوڑی توجہ بھی کی ہے؟
یہاں چند سچائیاں کچھ بھیانک پہاڑوں کے سائے میں
سرگوشیاں کر رہی ہیں
وہاں دھیرے دھیرے ابھرتے ہوئے سرخ سورج کی کرنوں
کی آغوش میں جل رہی ہیں
خدا کے لیے دھان کے کھیت میں آدمی کی مسرت نہ ڈھونڈھو
وہاں کچھ نہیں ہے
فقط گندے پانی کی ہر آن بڑھتی ہوئی
نالیاں ہیں
تعفن، غلاظت سے دم گھٹ رہا ہے
مگر کارخانوں میں ہر روز اک آدمی کی کمی ہو رہی ہے
تو کیا آدمی سے بھی زائد وفادار مضبوط نعم البدل درحقیقت کوئی ہے
یہ گتھی اگر یوں ہی الجھی رہے گی
تو پھر شور و شر میں اضافے کی توجیہ کیا کر سکو گے ــــ!

▲▲

غزلیں

...م عثمانی

...حسین کھردرے پتھر میں قید ہے
...ِ نشاط کرب کے منظر میں قید ہے

...ے نہ سن سکے گا یہ معلوم ہے مجھے
...ر میری گنبدِ بے در میں قید ہے

...سکو تری تلاش ہے کب سے زبیرِ ثبت
...بِ حیات تیرے ہی خنجر میں قید ہے

...مکو سجھائی دیتا نہیں اپنا ہاتھ بھی
...ری نظر دھوئیں کے سمندر میں قید ہے

...ہی جو آسمان میں اُڑتا تھا رات دن
...غے میں فائلوں کے وہ دفتر میں قید ہے

...ب صرف اپنا جسم لیے گھومتا ہوں میں
...ے نجم میری روح مرے گھر میں قید ہے

▲▲

سحر سعیدی

چنگاریوں کا رقص تھا بجھتے الاؤ میں
کل رات ایک قتل ہوا تھا پڑاؤ میں

کیا اُس کے جی میں آئی تھی وہ شخص کون تھا
اک چیخ کھو گئی تھی ندی کے بہاؤ میں

دُنیا نے اُس کی بات نہ مانی یہ اور بات
سنجیدگی ضرور تھی اُس کے سجھاؤ میں

ہیں زیرِ آب گوہرِ نایاب بے شمار
کیا کیا سمیٹ لائیں گے چھوٹی سی ناؤ میں

یہ کون اپنے رُخ کا سویرا لیے ہوئے
چپکے سے آگیا مرے سُونے پڑاؤ میں

اُس جیسا کوئی دوسرا ملتا نہیں سحرؔ
مشہور تھا وہ شخص بہت رکھ رکھاؤ میں

▲▲

انور ملک

جب کبھی تیرا خیال آجائے گا
روشنی ہر سمت پھیلا جائے گا

ایک مدت ہوگئی تجھ کو گئے
کب ترے آنے کا دھوکا جائے گا

داستانِ دل مکمل بھی تو ہو
پھر کوئی عنوان سوچا جائے گا

رنجشوں کی دھول چہرے پر نہ ڈال
آئینے کا عکس دھندلا جائے گا

کرب کا طوفاں اُمڈ آیا، اگر
سوچ کا سورج بھی گہنا جائے گا

ہر زباں پر داستاں ہوگی مری
ہر گلی میں تیرا شہرہ جائے گا

▲▲

دادا

اوم پرکاش لاغر

میرے آبائی گاؤں سے بھائی کا خط آیا۔ جس میں تحریر تھا کہ دادا سرگباش ہو گئے۔ یہ پڑھ کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ پچھلے ۴۰ سال کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ جیسے سینما کے پردے پر فلم کے سین۔

دادا اوکاڑہ کے رئیس خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ دادا کے والد رائے بہادر نانک چند بہت بڑے زمیندار تھے۔ غلہ کی آڑھت کی دکان اور ایک سودی لین دین کا کاروبار تھا۔ گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک چلائی تو دادا مشن کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ گاندھی جی کی اپیل پر دادا نے پڑھائی چھوڑ کر ستیہ گرہ کیا۔ اس بات کا رائے بہادر نانک چند کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ کئی دن اپنے کمرے میں سے باہر نہیں نکلے۔ دادا جب سزا کاٹ کر گھر واپس گیا تو دادا کے والد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ دیکھو ٹھاکر داس انگریز کا راج بہت اچھا راج ہے۔ اس کے راج میں عورت سونا اچھالتی ہوئی جنگل سے گذر جائے کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ انگریزوں نے ریل گاڑی، ڈاکخانہ اور تار گھر بنائے ہیں۔ نہریں نکال کر پنجاب کا نقشہ بدل دیا ہے اور پھر ہمیں جاگیریں دے رکھی ہیں۔ مجھے رائے بہادر کا خطاب عطا کر رکھا ہے تو اپنی غلطی کا اعتراف کر لے۔ ڈپٹی صاحب بہادر سے بات کر لی ہے۔ وہ تجھے معاف کر دیں گے۔ آئندہ کے لئے توبہ کر لے۔ دادا بہت غور سے اپنے والد کی بات سن رہا تھا۔ بولا پتا جی آپ ایک بات بھول گئے۔ کہ جب کوئی گوری چمڑی والا کبھی آپ کے سامنے آئے تو آپ کو اسے کورنش سلام کرنے پڑتے ہیں۔ جاگیریں بابا جی نے پہلی جنگ عظیم میں اپنی جان پر کھیل کر حاصل کی تھی جہاں تک معافی مانگنے کا سوال ہے انگریز کو مجھ سے مانگنی ہوگی کیونکہ اس نے ہماری دھرتی پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ رائے بہادر نے بگڑتے ہوئے کہا۔ اگر یہ بات ہے تو میرے گھر سے نکل جاؤ۔ تجھے اپنی جائیداد سے پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔ دادا نے مسکرا کر کہا جائیداد کس کو چاہئے۔ دادا جب مکان چھوڑ کر جا رہا تھا تو صدر دروازے پر روتی ہوئی ماں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ دادا نے کہا ماتا جی ایک کے آنسوؤں کو میں ہزاروں ماتاؤں کی مسکراہٹوں کے راستے میں حائل نہیں ہونے دوں گا۔ اور دادا لاہور آگیا۔

ملک کی تقسیم سے پہلے لاہور سیاسی، تعلیمی، سماجی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ہندو مہا سبھا اور مسلم لیگ کو چھوڑ کر باقی سبھی پارٹیاں کانگریس کو اپنی ماں تسلیم کرتی تھیں۔ دادا مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کا ممبر نہیں تھا لیکن کس پارٹی کا ممبر تھا، یہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ ہاں لاٹھی کھانے اور جیل جانے کا وہ بے حد مشتاق تھا۔ لاہور کی سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے پولیس کی جو بھی لاٹھی ہوا میں لہرا(تی) وہ دادا کی پیٹھ پر ضرور گرتی۔ کمر کی دو ہڈیاں ٹوٹ جانے پر بھی دادا کا لاٹھی کھانے کا شوق کم نہیں ہوا تھا۔

دادا کے چھوٹے بھائی اور دادا کی ماں نے اسے دو ہزار روپیہ بھیج دیئے۔ دادا نے پیسہ اخبار سٹریٹ میں پریس لگا لیا تھا۔ چند مہینوں کے بعد حکومت نے اس پریس کو ضبط

دیا کیونکہ پولیس نے لال ڈھنڈورا کا ضبط شدہ اخبار ہاتھ
بیچتا ہوا پکڑ لیا تھا۔

۱۹۳۹ میں پنجاب کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے
لگان کسان مورچہ نام کی تحریک شروع کی کانگریس نے فیصلہ
کیا کہ اسکا کوئی ممبر اس میں حصہ نہیں لے گا اس کی خبر کا چھپنا تھا
کہ دادا بسترِ تند سے اٹھا اور ہمارے دفتر میں آگیا۔ دادا
پنجاب کانگریس کے لیڈروں کو من من بھر کی گالیاں دے
رہا تھا دوسرے ہی دن دادا نے ستیہ گرہ کیا اور گرفتار
ہو گیا۔ جب دادا مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا تو
دادا عدالت میں اس طرح اکڑ کر کھڑا تھا جیسے جنگل
میں شیر کھڑا ہوتا ہے۔ مجسٹریٹ دادا کو جانتا تھا۔ اس نے
دادا سے پوچھا تمہاری زمین کتنی ہے۔ ؟ دادا نے جواب
دیا جتنی میرے دونوں پاؤں کے نیچے مجسٹریٹ نے کہا۔ پھر
ستیہ گرہ کا فائدہ ؟ مجسٹریٹ کی طرف نفرت اور حقارت
سے دیکھتے ہوئے دادا نے کہا انگریز کے بوٹ کا تسمہ کھولنے
اور باندھنے والے کے بس کا روگ نہیں۔ کہ میرے کام
کی تہہ تک پہنچے۔ مجسٹریٹ نے ۶ ماہ قید سخت کا حکم سنایا
حکم سن کر دادا نے غصہ اور جوش سے انقلاب زندہ باد
کا نعرہ اس انداز سے لگایا جیسے دشمن کی فوج پر توپ کا
گولہ داغ دیا ہو۔ سزا کاٹ کر دادا اپنا بستر کندھے پر اٹھائے
دفتر آیا۔ اب وہ ہماری پارٹی کی بہت عزت کرنے لگا تھا
۱۹۳۹ کے آخر میں پنجاب بیوپار منڈل نے سیلز ٹیکس کی
عدم ادائیگی کی تحریک چلائی سبھی سیاسی پارٹیوں نے اس
تحریک کو صرف اخلاقی امداد دینے کا اعلان کیا۔ اور اپنے
کارکنوں کو اس میں حصہ نہ لینے کی ہدایت کی دادا کے کان
میں جب یہ بھنک پڑی کہ تاجروں کی تحریک میں ہم حصہ
نہیں لے رہے۔ تو وہ آگ بگولہ ہو کر دفتر میں آیا۔ اتفاق
سے اس وقت دفتر میں میں اکیلا ہی تھا۔ دادا سانپ کی
طرح پھنکارتا ہوا۔ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے
وہ مجھے بھسم کر دے گا۔ میں اس کی طرف دیکھ نہ سکا
کاغذ پنسل لیکر لکھنے لگا۔ دادا نے گرجتے ہوئے کہا۔ کیا
کر رہا ہے ؟ میں نے بھی نہ تو آواز میں جواب دیا کہ
خاموش رہا۔ دادا نے کہا سنا ہے تم لوگ بیوپاریوں کی تحریک
میں حصہ نہیں لے رہے میں نے کہا ہاں میں نے بھی ایسا ہی
سنا ہے منشی کہاں ہے دادا نے چلا کر کہا۔ امرتسر
گئے ہیں شام تک واپس آجائیں گے۔ میں نے نہایت
عاجزانہ لہجے میں جواب دیا تم لوگوں کی عقل پر پتھر
پڑ گئے ہیں۔ دادا گرجا، میں صرف اس کی طرف دیکھتا رہا
تم لوگ بیوپار منڈل کی تحریک میں حصہ نہیں لو گے
یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے میں نے کہا۔ دادا کوئی بھی
سیاسی پارٹی اس میں حصہ نہیں لے رہی۔ دادا نے
نفرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا
تم گدھے ہو۔ عقل تم لوگوں کے پاس تک نہیں پھٹکی
تم لوگ انقلاب لانے کے اہل ہی نہیں ہو۔ یہ کہتے ہوئے
کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں
دادا کے کمرے کی طرف گیا۔ تو وہ کمرہ خالی تھا دادا اپنا
بستر لے جا چکا تھا

انفرادی ستیہ گرہ دادا نے دو مرتبہ کیا۔ بعد ازاں
ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں دادا نے لگ بھگ
تین سال جیل کاٹی جب دادا جیل سے باہر آیا تو حکومت
نے دادا پر پابندی عائد کر دی کہ وہ لاہور سے باہر نہیں
جائے گا۔ ہر اتوار کو پانچ بجے سے پہلے پہلے صدر تھانہ میں
جا کر حاضری دے گا۔ دادا تیسرے ہفتے وہ پابندی توڑ کر
جیل چلا گیا۔ وہ جیل میں ہی تھا کہ اس کی ماتا کا انتقال ہو گیا

آزادی کے بعد دادا میرے آبائی قصبہ میں آگیا وہ
دن رات مہاجرین کی خدمت کرنے لگا اسے نہ سورج طلوع
ہونے کی خبر ہوتی تھی نہ غروب ہونے کی۔ دادا تھا اور مہاجرین
کی خدمت تھی۔ انہیں دنوں دادا کے بڑے بھائی کا خط آیا
جس میں لکھا تھا کہ ایک انگریز مسٹر میری اپنی کپڑے کی مل
بہت سستے داموں ان کو دے گیا ہے۔ والد صاحب کی
وفات ہو گئی ہے امید ہے کہ اب تجھے اپنی غلطی کا احساس
ہو گیا ہو گا اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ دادا فوراً بمبئی چلا آئے

دا نے خط پڑھ کر پھاڑ دیا۔ گاندھی جی کے قتل کا دادا پر
ت بڑا اثر پڑا۔ ہم سب ڈر گئے۔ کہ کہیں دادا پاگل نہ
جائے۔ ہر ملنے والے کانگریسی اور سوشلسٹ کارکن
گریبان سے پکڑ کر دادا کہتا گاندھی کے قاتل تم ہو۔ تم نے
۔ وارانہ ماحول کو درست کرنے کی کوشش نہیں کی تم نے
۔ پرستی کا مقابلہ نہیں کیا اور اس کا خمیازہ گاندھی جی کو
تنا پڑا۔ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا

فروری ۱۹۴۸ میں ہماری پارٹی نے کانگریس سے الگ
نے کا فیصلہ کیا۔ دادا اخبار بغل میں دبائے میرے پاس
اور بولا ان راہنماؤں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کانگریس
سب کی ماں ہے۔ بھلا کوئی سمجھدار آدمی اپنی ماں سے بھی تعلق
کرتا ہے۔ میں نے کہا دادا اب کانگریس میں ایسے آدمی
ئے ہیں۔ جن کے ساتھ ہم چل نہیں سکتے۔ دادا نے کہا جب
کانگریس چھوڑ جاؤ گے۔ تو وہ لوگ کانگریس کے مالک
جائیں گے۔ اب وہ لوگ تمہارے نام سے ڈرتے ہیں میں
دادا سے کہا۔ دادا یہ تو نیشنل کمیٹی کا فیصلہ ہے میں تو
ٹ کمیٹی کا بھی ممبر نہیں میں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ کو اگر
ہنا ہی ہے۔ تو مرکز کے دو لیڈر پنجاب کے دورے پر ہیں
سے بات کر لو۔ دادا نے کہا میری بات سن لو۔ یہ لیڈر
اری پارٹی کا تو ستیاناس کریں گے ہی۔ ساتھ ملک کو
لے ڈوبے گی۔ ایک دن دادا نے بستر اٹھایا۔ اور منڈل کانگریس
دفتر میں چلا گیا۔

مجھے گردشِ دوراں نے قصبے سے امرتسر اور امرتسر سے
لا پھینکا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ دادا کو پاکستان
جانے والے مسلمان ممبر کی جگہ میونسپل کمیٹی کا ممبر نامزد
دیا گیا ہے۔ مگر حلقہ دگرد جانے کے بعد وہ دوبارہ الکشن
نہ لڑ سکا۔ ایک بار میں اپنے آبائی قصبہ میں گیا جب میں
دا سے ملنے منڈل کانگریس کے دفتر میں گیا۔ تو مجھے معلوم
ہوا کہ دادا اب وہاں نہیں رہتا۔ دادا مجھے ایک دکان پر
بیڑی خریدتا ہوا مل گیا۔ دادا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا
اور بولا آجکل اٹھنی کما تا ہوں۔ ہمارے پاس کمرے

ایک آدمی نے ازراہِ مذاق کہا۔ دادا تم کامریڈوں سے پیچھے
کیوں لگے ہو۔ یہ تو کانگریس چھوڑ گئے۔ دادا نے کہا ان سے
ہمارا بہت پرانا حساب ہے۔ پہلے وقتوں میں کئی شامیں
ایسی بھی آجاتی تھیں جب کامریڈوں کے لیڈروں کے
پاس کھانا کھانے کو پیسے نہیں ہوتے تھے ایسے وقت میں
اپنا پیچھا کرنے والے سی آئی ڈی کے سپاہی کے پاس جاتا
اور اس سے کہتا۔ ایک چونی نکال ورنہ رات بھر بھاگتا
رہوں گا۔ اس پر ہی بس نہیں۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ
میں بھی بھاگوں گا۔ اور ظاہر ہے کہ تمہیں بھی میرے پیچھے پیچھے
بھاگنا ہوگا۔ سپاہی سے چونی لے کر داتا گنج بخش کے تنور
سے ایک آنے کے پانچ نان لے آتا۔ بازار سے دو پیسے کا مرچوں
کا اچار دو پیسے کی بیڑیاں خرید لاتا۔ لیڈروں کو ایک ایک نان
کھلا کر سلا دیتا۔ دوئی کی صبح کو چائے ہو جاتی۔ اپنی بات
ختم کر کے دادا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ہائے وہ بھی
کیا زمانہ تھا۔ میں نے دادا سے پوچھا دادا کانگریس کا دفتر
کیوں چھوڑ دیا۔ دادا نے ہنستے ہوئے کہا بھگت سنگھ
کے خلاف گواہی دینے والا اب اس منڈل کانگریس کا صدر
بن گیا ہے میں نے چٹکی لیتے ہوئے کہا دادا، تم نے کانگریس
چھوڑنے کا فیصلہ ٹھیک کیا تھا نہ۔ دادا چونکا اور بگڑتا ہوا
بولا۔ یہ سب تمہارے لیڈروں کی غلطی کا نتیجہ ہے اگر وہ
کانگریس نہ چھوڑتے۔ تو ایسے لوگ ہرگز ہرگز آگے نہ آپاتے
اب تم لوگ چوہوں کی طرح اپنے اپنے بل میں دبک کر زندگی
کے باقی ماندہ دن گنا کرو۔ میں نے بات پلٹنے کی غرض سے
کہا اچھا دادا کل کہاں ملو گے۔ دادا نے کہا کنگ دل پتری پاٹھ
شالہ کے سامنے دوسرے دن جب میں دادا سے ملنے گیا تو
کیا دیکھتا ہوں کہ دادا بھنی ہوئی مونگ پھلی اور کھانڈ کی
گولیاں لیے سکولوں کے سامنے سڑک کے کنارے بیٹھا ہے
دادا کو اس حال میں دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں دادا نے
مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا یہ سب
بھگوان کی مرضی ہے۔ میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے
ہوئے دادا سے سوال کیا دادا تم خدا کی ہستی کو کب سے

انے لگے ہو۔ دادا نے مسکراتے ہوئے کہا جب جاگے تبھی سویرا میں نے کہا دادا ایک بات بتاؤ۔ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔ دادا نے فلاسفر کی طرح ہوا میں انگلی لہراتے ہوئے کہا انسان کی عمر کا ایک خاص حصہ ہوتا ہے۔ جب اسے کسی لڑکی کی مانگ میں سیندور بھرنے کی سوجھتی ہے۔ ان دونوں میری قطر بھارت ماں کے پاؤں میں پڑی زنجیر دیکھ کر جا پڑی جب اس سے فرصت ملی تو عمر کا وہ حصہ گذر چکا تھا۔ میں نے کہا دادا تم نے پنشن لینے سے کیوں انکار کر دیا۔ دادا نے کہا میں تم سے پوچھتا ہوں۔ مجھے لاکھوں روپے کی جائیداد لینے سے کون روک سکتا تھا۔ یا روک سکتا ہے ہماری منزل تو اپنے دل سے اپنے دل تک ہے۔ بات جاری رکھتے ہوئے دادا نے کہا تم اپنا حال سناؤ تمہاری پارٹی کا کیا حال ہے میں نے کہا دادا میں نے پارٹی چھوڑ کر فرید آباد میں دکان کر لی ہے دادا نے کہا ٹھیک کیا جب ملک کے سامنے کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ تو قربانی اور ایثار کے جذبے سے سرشار سچے آدمی آگے آتے ہیں جب حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کا وقت آتا ہے۔ تو عیار و مکار آدمی میدان میں آ جاتے ہیں اب تم کنارے پر بیٹھ کر ان چوروں کے کرتب دیکھو۔

ایمرجنسی کے دنوں میں مجھے اپنے قصبہ کے ایک آدمی سے معلوم ہوا کہ دادا انبالہ جیل میں ہے میں نے حیران ہو کر پوچھا اس بوڑھے ضعیف آدمی سے حکومت کو کیا خطرہ محسوس ہوا تھا اس آدمی نے مجھے بتایا کہ دادا نے دو مرتبہ ستیہ گرہ کیا۔ ایک بار اس نے شہید بھگت سنگھ یا تلک کے مجسمے کو پانی سے دھویا اس کو پھول مالائیں پہنائیں پرنام کیا۔ اور پھر زور زور سے انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے لگا۔ لیکن پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا پھر دادا نے تانگہ اتروا کر سہارنپور کا رخ زندہ باد کے نعرے بلند کئے اس پر بھی کسی نے دادا کو کچھ نہیں کہا۔ دادا تھک کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر سستانے کے بعد پھر کھڑا ہو کر حکومت وقت مردہ باد پولیس مردہ باد۔ تانا شاہی نہیں چلے گی۔ چلانے لگا۔ دو چار شناسا آدمی جمع ہو گئے۔ آخر پولیس نے دادا کو گرفتار کر لیا جیل میں دادا بیمار ہو گیا۔ حکومت نے اسے رہا کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد دادا نے پھر ستیہ گرہ کیا

۳ مارچ ۱۹۷۸ء کو میں اپنے بھائی کے لڑکے کی شادی پر اپنے آبائی قصبہ گیا وہاں مجھے پتہ چلا کہ دادا بیمار رہے اور لالہ تیلو رام سود کے احاطہ میں رہ رہا ہے جب میں دادا کے کمرے میں داخل ہوا، تو میں نے دادا کو ایسا ہی شانت اور نرمل پایا جیسے بادل کے برس جانے کے بعد آسمان نرمل اور شانت ہوتا ہے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب میں اٹھنے لگا تو دادا نے کہا شاید یہ اپنی آخری ملاقات ہو میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ادب اور عقیدت سے میں نے دادا کے پاؤں چھوئے دادا نے کہا دیکھو یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب ایشور کی رضا ہے۔ تمہیں اپنا فرض نبھاتے ہوئے۔ اس کی رضا پر خوش رہنے کی عادت ڈالنی ہے۔

▲▲

مرگ ترشنا

اختر واصف

میں رنگوں کے اس حصار سے اب باہر نکل جانا چاہتا ہوں کہ یہ حصار جس میں مدتوں سے میں قید ہوں کسی عفریت کی مانند مجھے اپنے پنجوں میں دابے بیٹھا ہے۔

میں ..... کہ شاید اس وقت بیحد معصوم و سادہ لوح تھا جب میری نگاہوں نے پہلی پہلی دفعہ رنگوں کے چمکیلے جسم کو چھوا تھا۔ اس وقت یہ آنکھیں رنگ برنگی لہروں میں مسلسل ڈوبتی ابھرتی رہتی تھیں۔ ڈوبتے ابھرتے نہ تھکتی تھیں۔

اُس وقت —— میرے یہ ہاتھ، یہ پیر، اور جسم کے دوسرے اعضا رنگوں کے بھنور میں بس ڈوب جانا چاہتے تھے جانے کیسی پیاس تھی کہ مٹتی ہی نہ تھی —— اور یوں تھا کہ ایک رنگین سی لہر مجھے اپنے دوش پہ لیے جا رہی تھی۔ اس وقت جانے کتنے شفیق ہاتھوں نے مجھے روکا۔ جانے کتنی آوازیں مجھے واپس بلانے آئیں۔ لیکن میرے کان کچھ بھی نہ سن سکے۔ میں نے ان شفیق ہاتھوں کو محسوس ہی نہ کیا۔ میں بڑھتا گیا —— ڈوبتا گیا۔

پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ وہ تمام رنگ جو میرے حواس پر چھا گئے تھے بے نقاب ہونے لگے۔ ان کا عکس میری آنکھوں میں لمحہ بہ لمحہ مدھم پڑنے لگا۔ رنگوں کی جن لہروں کو دیکھ کر میرے ذہن میں شعلے سے لپک جاتے تھے انھیں دیکھ کر چنگاریاں بھی سرنگوں پڑی ہیں —— اور ..... ہر طرف راکھ سی جمنے لگی۔

آہستہ آہستہ میری آنکھوں نے ان رنگوں کے تمام رنگ دیکھ ڈالے۔ وہ تمام رنگ جو مجھے دیوانہ کیے دے رہے تھے۔ انھی رنگوں کو جب میری نگاہوں نے دوبارہ چھوا تو ایک سود بے کیف سے احساس کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔

—— پھر یوں ہوا کہ کسی نے میرے کان میں بڑی بیزاری سے کہا —— چلو، واپس لوٹ چلیں۔ ان رنگوں میں زندگی کی کوئی رمق نہیں۔ یہ بے رنگ سے رنگ تمھیں کچھ نہ دے پائیں گے۔

میں نے بھی سوچا —— ہاں! چلو، واپس ہی لوٹ چلتے ہیں شاید وہ آوازیں جو شروعِ سفر کے وقت مجھے بلانے آئی تھیں ابھی میرا انتظار کر رہی ہوں۔ شاید وہ شفیق ہاتھ اب بھی میرے انتظار میں پھیلے ہوں۔ اور یہی سوچ کر میں نے پیچھے کی جانب گھومنا چاہا۔ لیکن —— میں پیچھے کی جانب مڑ بھی نہ سکا۔ یوں لگا جیسے کسی عفریت نے مجھے دبوچ لیا ہو اور میں پیچھے گھوم نہیں سکتا۔ میں نے گھبرا کر پیچھے کی جانب دیکھنا چاہا تو لگا کہ اپنی گردن بھی پیچھے نہیں گھما سکتا اور تب —— جیسے میری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ میں تیزی سے گردش کرتے ہوئے رنگوں کے کسی خوفناک بھنور میں پھنس گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر اپنے ارد گرد دیکھا تو دور دور تک رنگوں کا ایک طلسمی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

میں نے اپنا ہاتھ اُٹھانا چاہا تو لگا ہاتھ بھی جیسے سُن ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے پیروں کو ہلایا —— لیکن ان میں کوئی قوت باقی نہ رہی تھی۔ اور میرا نیم مردہ جسم بھیانک غار نما بھنور میں تیزی سے گر رہا تھا —— میں کہ ایک بے بس پرندے کی مانند اپنے آپ ہی میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ رنگوں کا بھیانک عفریت مجھے اپنے پنجوں میں دابے بیٹھا تھا

کاش میں اس بھیانک گرفت سے یکبارگی چھوٹ جاتا

کہ آج بھی وہ آوازیں جو شروع سفر کے وقت مجھے بلانے آئیں تھیں لبِ ساحل میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ وہ شفیق بانہیں آج بھی میرے انتظار میں پھیلی ہوں گی۔

لیکن سوچتا ہوں اب میں کون سا منہ لے کر ان تک واپس جاؤں گا کہ میرا یہ چہرہ رنگوں کے تھپیڑے کھا کھا کر مکروہ و بدہیئت ہو چکا ہے۔ یہ جسم کسی پرانی ویران حویلی کی دیواروں کی مانند اندر ہی اندر بکھر چکا ہے یہ آنکھیں اب کچھ بھی نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ کان اب کچھ نہیں سن سکتے میں ایک اپاہج کی صورت ان کے سامنے کیسے کھڑا رہ پاؤں گا۔ وہ آوازیں جو ایک مدت سے میرے انتظار میں بیقرار ہوں گی —— مجھے اس حال میں دیکھ کر کیا سوچیں گی —— کیا انھیں دکھ نہ ہو گا؟

اور مجھے اس حال میں دیکھ کر لمحے کے لیے ہی سہی اگر انھوں نے اپنی نگاہیں نفرت سے پھیر لیں تو —— ؟ پھر وہ شفیق ہاتھ مجھے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے تو —— !

نہیں —— اب میں واپس نہیں لوٹ سکتا۔ رنگوں کے اس طلسمی سمندر کے کسی بھنور میں گردش کرتے کرتے غرق ہو جانا ہی شاید میرا مقدر ٹھہرا ——

کاش رنگوں کے اس طلسمی سمندر میں مجھے ایک ہمدرد لہر مل جائے جو میرا پیغام یہاں سے بہت دور لبِ ساحل کھڑی ان معصوم آوازوں تک پہنچا دے اگر وہ اب تک کھڑی ہوں تو واپس لوٹ جائیں —— وہ شفیق ہاتھ اگر اب تک پھیلے ہوں —— تو واپس کھینچ جائیں کہ اب کوئی لوٹ کر نہیں آئے گا ——

▲

کڑوی مسافت

جلیل تنویر

موسم کی یہ سرد ترین رات ہے۔
میں گرم کپڑوں میں ملبوس اپنے فلیٹ کے برآمدے
رسی بچھاکر بیٹھ گیا ہوں۔ میری نگاہیں نیچے سڑک پر ہیں۔
د قفہ سے کوئی موٹر، آٹو رکشہ، گزرتی رہتی ہے۔ لوگ
دی سے ٹھٹھرتے ہاتھ باندھے اپنے اپنے گھروں کی طرف تیز
اٹھاتے جارہے ہیں۔ سڑک عبور کرکے میری نگاہیں آگے
گئی ہیں۔ دور ناریل کے اونچے اونچے درخت اور ان کی
یں نزاکت سے جھولتی ہوئی پونم کے چاند سے سرگوشیاں
ہی ہیں۔ کھپریل کی چھتیں کہر آلود فضا میں نہا گئی ہیں۔ شہر
امع مسجد کے بلند مینار چاندنی میں روح پرور سماں پیش
ہے ہیں۔ میری نگاہیں دور دراز کا سفر طے کرکے اپنے
ٹ کے بالکل سامنے، کچے پکے مکانات اور جھونپڑیوں میں
ھونڈنے لگی ہیں۔ کیا ملے گا بھلا؟ یہاں برقی بلب تو روشن
ہیں۔ البتہ مٹی کے دیوں کی پھیکی پھیکی روشنی درزوں سے
چھن کر باہر آرہی ہے۔ ان جھونپڑیوں میں رہنے والے بیشتر وہ
ر ہیں جو عمارتوں پر کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں
لیے پختہ عمارتیں تعمیر کرکے خود بے زمینی اور بے چھتی کا شکار
اتے ہیں۔ سردی، بارش اور گرمی، ہر موسم میں غیر محفوظ۔
گاہوں کو سوچوں کے سمندر سے اٹھا لایا ہوں۔ جھونپڑیوں
صل ہی نئے طرز کی ایک بلند عمارت ہے جہاں کئی فلیٹ
اوپری منزلوں میں عموماً سرکاری نیم سرکاری ملازمین (مگر
رے) اور کچھ طلبا رہتے ہیں۔ گراؤنڈ فلور پر زیادہ تر
ی شدہ لوگ ہیں۔ بیشتر کمرے تاریکی میں ڈوب رہے ہیں۔

مگر کہیں کہیں بتی تا حال روشن ہے۔ مجھے اپنے ایک دوست کی
یاد آرہی ہے۔ جو کہا کرتا تھا کہ نادار کی جوانی اور جاڑوں کی چاندنی
کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ واقعی دیکھئے نا دودھیا چاندنی کا جادو ہر
سمت پھیل رہا ہے اور لوگ ہیں کہ دروازے بند کیے لحافوں
میں سرِ شام ہی دبک گئے ہیں۔ میری نگاہوں نے پھر دیکھا کہ
سامنے بلڈنگ کے کوری ڈور سے ایک نوجوان لڑکی گزری
ہے اور ایک کمرے کے سامنے رک گئی ہے۔ اچانک اندر سے
ایک نوجوان باہر آتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا لڑکی کمرے میں چلی
گئی ہے۔ لڑکی کے اندر داخل ہوتے ہی کمرہ کی بتی بجھ گئی ہے۔
البتہ سرخ روشنی اب بھی درزوں سے جھانک رہی ہے۔ میں
اس کمرے کے مکین سے واقف ہوں۔ انجینئرنگ کا طالب علم
ہے جو برسوں سے فیل ہوتا آرہا ہے۔ ضرورت بھی کیا ہے اسے
پڑھائی میں محنت کرنے کی۔ گھر سے پیسے منگواتا ہے اور عیش کرتا
ہے۔ مجھے اپنے دوست کی بات اب جھوٹی لگ رہی ہے جو کہا
کرتا تھا کہ نادار کی جوانی، اور جاڑوں کی چاندنی کی کوئی قدر نہیں
کرتا جاڑوں کی چاندنی کی قدر تو میں کر رہا ہوں اور نادار کی جوانی
کی قدر میرے سامنے والے فلیٹ میں ہو رہی ہے۔ چلیے ناقدری
کا گِلہ ختم ہوا۔ کل کی چاندنی بھی خوب نکھری ہوئی تھی۔ لیکن صاحب!
کیا بتائیں کل کا واقعہ بڑا ہی عجیب تھا۔ ہمارے محلے میں اکثر عجیب
غریب واقعات جنم لیتے رہتے ہیں۔ کل رات ایک مزدور اپنی کسی
ساتھی مزدور کے ساتھ ایک بوڑھے درخت کے نیچے دادِ عیش دے
رہا تھا کسی نے موقع واردات پر پہنچ کر ایک اعلان عام کردیا پھر
کیا تھا۔ لوگوں کا جم غفیر دیکھتے دیکھتے ان دونوں کے اطراف جمع

ہوگیا۔ عورتیں مارے عجلت کے اپنے کپڑوں کو سنبھالے بنا ہی درخت کے قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔ کئی نے اپنے بلاوز کے ہک بھی نہیں لگائے تھے۔ واقعہ کی کشش بھلا خود کو کہاں سمٹنے دیتی ہے " مارو کمینوں کو " لوگ ایک ایک کر کے فیصلے صادر کر رہے تھے۔ ایک بانکے نوجوان نے ٹھٹھری چاندنی میں مجرموں کے سروں پر پانی کا گھڑا خالی کر دیا۔ جذبات کی گرمی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے نوجوان کا یہ نسخہ قابلِ تقلید ٹھہرا پھر کیا تھا کئی حضرات اپنے اپنے گھروں سے پانی بھر لائے اور گھڑوں سے اس چاندنی کے جوڑے کو غسل دیا۔ مرد اور عورت اپنے بھیگے جسموں کو کہیں سے حرارت پہنچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

میں جو کسی قدر دُور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ جیسے سرگوشیوں میں کسی نے مجھ سے سوال کیا: سُنا ہے کہ ایسے لوگوں کو وہی پہلا پتھر مارے جس نے خود یہ گناہ نہ کیا ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟ ہاں میں نے بھی بزرگوں سے یہی سُنا ہے۔ لیکن.....

نصف شب سے کوئی صبح چار بجے تک محلے میں یہی ہنگامہ چلتا رہا۔ دن کی روشنی میں تحقیقات سے پتہ چلا کہ وہ دونوں شادی شدہ اور کئی بچوں کے ماں باپ ہیں۔ عورت کا شوہر چار بچوں کے ساتھ اسے چھوڑ کر بمبئی فرار ہوگیا ہے۔ اور اس مرد کی بیوی کسی کے ساتھ بنگلور منتقل ہو چکی ہے۔

رات بھیگتی جا رہی ہے۔ دُور دُور تک دودھیا چاندنی، ناریل کے اونچے اونچے درخت۔ انسانوں کی خاموش ٹھٹھرتی ہوئی پناہ گاہیں۔ لگتا ہے جب اپنی مصروفیت سے تھک گئیں تو میرے ذہن کا سفر شروع ہوا ہے۔ سوچوں کا لامتناہی سلسلہ پھیل گیا ہے۔ کیا سوچوں ــــ فرقہ وارانہ فسادات، ملک کی سیاسی پیچیدگیاں، بین الاقوامی مسائل ــــ!! کیا سوچوں ــــ اور کیوں سوچوں ــــ کیا حل دے سکوں گا؟ اچانک میرا ذہنی تسلسل ٹوٹ گیا ہے اس لیے کہ پڑوس کے بچے نے پھر رونا شروع کر دیا ہے۔ یہ میرے خیالات میں آج سے ہی نہیں کئی دنوں سے مخل ہوتا رہا ہے۔ عورت جھڑک رہی ہے۔ مرتا بھی نہیں کم بخت ــــ پتہ نہیں کیوں پیدا ہوا ہے؟ میری سوچ مسکراتی ہے " پیدا ہے یا ــــ!!"

سامنے فلیٹ کا دروازہ کھٹ سے کھلا۔ وہی لڑکی جو کچھ گھنٹوں پہلے اندر گئی تھی باہر نکلی۔ وہ نیچے اُتری بجلی کے کھمبے سے پھوٹتی روشنی میں مَیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے بکھرے بالوں کو درست کر رہی ہے۔ آگے پیچھے نظریں دوڑاتی تیز تیز قدم آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند رہے۔ بند مٹھی۔ بند ہو کر بھی میرے لیے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میں اسے بہت دُور تک جاتی دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ سخت جاڑا اناوارکی جوانی اور پھر آسمان پر پورا چاند اور اوپر ہوگیا ہے۔ اور ناریل کے درخت اُسے چھونے کی سعی کر رہے ہیں ــــ

▲▲

نظمیں

شہلا نگار شمسی

ریت کا گھر

آم کا باغ
ریت کا ڈھیر
سفید فراک
سُرخ ربن
ننھے ننھے ہاتھ
ریت کا گھر
آندھی کی لہر
آنکھ کے تارے
ذرہ کا زہر
آنسو کا تریاق
پھر نیا گھر

دُنیا کا باغ
ارماں کے ڈھیر
لمبی زلفیں
رنگیں آنچل
چاہت کے ہاتھ
بے ریت کا گھر
وقت کی آندھی
آنکھ کے ہیرے
ان دیکھی گرد
آنسو کا دُھواں
پھر نیا گھر
بن نہ سکا

ملکہ خورشید

خوف

ہم ....
اپنے وجود کی گہرائیوں میں سموئے ہوئے
تشنگی کا کرب
ازل سے زندہ ہیں
بے نام سی تشنگی روح و جاں کی
ہمیں قطرہ قطرہ پئے جا رہی ہے
....

....
مرے وجود سے لپٹا ہوا
مبہم سا خوف
لمحہ لمحہ مجھے ڈس رہا ہے
اور
ایک بے کیف احساس کی نیلاہٹ
مری رگ و پے میں
سرایت کرتی جا رہی ہے۔

نظمیں

چاند گل

(۱)

جب میں
اِن گلیوں اِن سڑکوں پہ
چلتی ہوں
تو ایسا لگتا ہے
جیسے میں بھی اِس دُنیا کا
اِک حصّہ ہوں
اور دُنیا کی ہر شئے سے
میرا ایک ناتہ ہے
یہ سب میرے ساتھی ہیں
میرا اِن کے دُکھ سُکھ میں حصّہ ہے
لیکن جب
اپنی چمچماتی مرسڈیز کار میں بیٹھ کر
اُنھیں سڑکوں سے گزرتی ہوں
تو ایسا لگتا ہے
جیسے میں لوہے کی چادر میں
بند ایک قیدی ہوں
اور دُنیا سے
کٹ کر رہ گئی ہوں
میرا ہر شئے سے ناتہ جیسے
ٹوٹ گیا ہو
اور کسی کے دُکھ سُکھ میں
میرا کچھ بھی نہیں
اور میں صحرا میں لگے اُس
خودرو پیڑ کی طرح ہوں
جو ہر موسم میں
خود کو بے بس پاتا ہے

(۲)

میں تنگدستی کے کنکریلے راستے سے گزر کر
آج آسائش کی راہوں پہ بڑھ رہی ہوں
لیکن مجھے حیرت ہے
اُنھیں راستوں پہ جن سے بارہا میں
تنہا گزری ہوں
اور وہ ہاتھ
جو میری سمت انگشت نمائی
کے لیے اُٹھتے رہے
اور وہ زبانیں جو
رسوائیوں کے زہر اُگلتی رہیں
آج
وہی ہاتھ میری راہوں پر
پھول بکھیر رہے ہیں — ؟
اور وہی زبانیں
میرے قدم سراہیں — ؟
آج آسائش کی شاہراہوں پر سے
کسی کو گزرتے ہوئے دیکھ کر
یہ انسان ——
شریف !
مہذب !
اور ایماندار کیسے ہو جاتے ہیں .... ؟

شاہ ظہیر

طے شدہ دائرے سے باہر آ،
تیرا اپنا پن تیرے ساتھ ہے
مایوس نہ ہو !
شہر کے طے شدہ دائرے میں
کب لہو کی موت ہو جائے ؟

کوئی نہیں جانتا
لوگ قہقہوں کے بیچ
ایک + جمع ایک کے بوجھ سے دبے ہیں

میرا کیا ہے
میں تو تنہا ——
رات اور دن کے درمیان چند لمحوں کے لیے
الیکانٹ کی نیند سو جاتا ہوں

شاید ——
یہ بھی
میری زندگی کا کوئی طے شدہ دائرہ ہی ہو

غزلیں

رئیس انصاری

کتنی سوئی ہوئی ٹیسوں کو جگاتی ہے ہوا
جب کبھی پورب کی طرف سے کبھی آتی ہے ہوا

پہلے آتی تھی تو کچھ پھول کھلا جاتی تھی
اب سنا ہے کہ بہت خاک اڑاتی ہے ہوا

حبسِ جسم میں ہم قید ہیں اک مدت سے
اور باہر سے ہمیں روز بلاتی ہے ہوا

اور تم لوگ بھی خیموں میں چھپو گے کب تک
بن کے آندھی ابھی صحراؤں سے آتی ہے ہوا

میری نس نس میں کوئی یاد سلگ اٹھتی ہے
سرد موسم میں بہت آگ لگاتی ہے ہوا

کون محفوظ کتابوں میں کرے گا اس کو
جو کہانی ہمیں دن رات سناتی ہے ہوا

▲▲

پرکاش تیواری

غم کے شعلے لپکنے لگے ہیں
زرد چہرے دمکنے لگے ہیں

ہو گئی عقل گمراہ کتنی !
راہبر خود بھٹکنے لگے ہیں

آتے ہی گل رخوں کا تصور
بند کمرے مہکنے لگے ہیں

کب رکے گی غموں کی یہ بارش
آس کے گھر ٹپکنے لگے ہیں

آئینہ تو ذرا دیکھو پرکاش
داغ دل کے جھلکنے لگے ہیں

▲▲

نظام الدین نظام

کہنے کو ہم نے یوں تو کئی شعر کہہ دیے
لیکن یہ دل کہے کہ ابھی کچھ نہ کہہ سکے

چہرے پہ اپنے پھر سے ذرا غور کیجیے
اب وہ بھی سچ کہاں ہے جو کچھ آئینہ کہے

کیسے کہوں کہ میرے پڑوسی ہیں شادماں
دیوار درمیاں تھی فقط قہقہے سنے

مجھ کو یقین ہے کہ مری یاد آئے گی
منزل سے روٹھ جائیں گے جب قافلے

سچائی پھول بن کے تو مہکی نہیں مگر
کچھ خار ہم نے اپنی زباں میں چبھو لیے

یہ حسنِ اتفاق ہے پھر مل گئے نظامؔ
اب کوئی بات موجبِ رنجش نہ بن سکے

▲▲

تبصرے

اُردو ادب کی تاریخ ــ حصۂ اوّل (نظم)

تالیف و ترتیب: سید ابوالعاصم رضوی، ناشر: مجلس ترقیِ اُردو، ۲۵۲۷ بارہ دری شیر افگن، دہلی ضخامت: ۴۸۴ صفحات، قیمت: پندرہ روپے،

سید ابوالعاصم رضوی دِلّی کے اینگلو عربک ہایر سیکنڈری سکول میں اُردو کے اُستاد ہیں۔ زیرِ نظر کتاب انھوں نے اُردو ادب کے طالب علموں کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی ہے اور اس میں قدیم ادوار سے لے کر موجودہ دور تک کے شاعروں کا تذکرہ، ان کے .... و فکر و فن پر تبصرہ اور انتخابِ کلام شامل ہے۔ رضوی صاحب نے اختصار ملحوظ رکھا ہے لیکن کوشش کی ہے کہ تمام قابلِ ذکر شاعروں کا احاطہ ہو جائے اور ان کے بارے میں وہ ساری باتیں بھی آ جائیں جن سے واقفیت طلبہ کے لیے ضروری ہے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان شعرا کو بھی جو آزادی کے بعد سامنے آئے ہیں، شامل کیا گیا ہے جبکہ دوسری تاریخیں جو اس دور سے پہلے لکھی گئی ہیں، قدرتی طور پر ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

شعرا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے رضوی صاحب نے محتاط انداز اختیار کیا ہے۔ قدیم شعرا کی حد تک ان کا طریقِ کار یہ رہا ہے کہ ان کے بارے میں جو عمومی رائے بن چکی ہے اس کا اعادہ کر دیا جائے۔ بعد کے شاعروں کے بارے میں انھوں نے اپنے مطالعے کی روشنی میں رائیں قائم کی ہیں اور ان میں کہیں کہیں بڑا ایک رخا پن آ گیا ہے مثلاً میراجی اور ن۔م۔ راشد کے بارے میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ کسی طرح قابلِ قبول نہیں۔

کتاب کے آخر میں اہم ادبی تحریکوں کا اجمالی تعارف بھی کرا دیا گیا ہے۔

ـــــــــ مخمور سعیدی

تصوّر

مصنف: راج ہندی، ناشر: کوالٹی کا پینگ سنٹر، راجوری گارڈن، نئی دہلی، ضخامت: ۵۲۶ صفحات، قیمت: سولہ روپے۔

یہ ایک ناول ہے جس میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان ہوئی ہے جو ایک خوشحال خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے، بچپن ناز و نعم میں گزرتا ہے لیکن جوانی کی سرحد میں قدم رکھتے ہی اسے پریشانیاں گھیر لیتی ہیں دولت کے ساتھ ساتھ صحت بھی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور حالات اس حد تک بگڑتے ہیں کہ وہ خود کو زندہ درگور سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن اسی مرحلے پر اس کا ذہن پلٹا کھاتا ہے۔ وہ پریشاں خیالی سے پیچھا چھڑا کر ذہنی یکسوئی کے ساتھ ان مسائل کا جائزہ لیتا ہے جن میں

وہ گھرا ہوا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ان مسائل کا حل وہ تلاش کرسکتا ہے۔ اس کا تصور اڑان بھرنے لگتا ہے وہ بہتر زندگی کے خواب دیکھنے لگتا ہے اور بالآخران خوابوں میں عمل کا رنگ بھر کر ایک بھرپور زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

راج ہنسی صاحب کی زبان سادہ ہے۔ ناول کے فنی تقاضوں سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں لیکن ایک دلچسپ اور سبق آموز کہانی پیش کرنے میں وہ کامیاب ہیں۔

——— پریم گوپال متل

بے چہرہ لمحے

شاعر: علقمہ شبلی، ناشر: شہریار برادرس پبلی کیشن، ۸۹/۵ رپن اسٹریٹ، کلکتہ ۱۶، ضخامت: ۱۲۸ صفحات، قیمت: دس روپے،

علقمہ شبلی اُردو کے کہنہ مشق شاعروں میں ہیں، گزشتہ تیس پینتیس سال سے ان کی شعر گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔ نظم و غزل سے انھیں ایک سی دلچسپی ہے۔ زیر نظر مجموعے میں انھوں نے دونوں اصناف کو برابر کی جگہ دی ہے لیکن ترتیب میں غزلوں کو پہلے رکھا ہے۔ اگر یہ اس کا اشارہ ہے کہ وہ خود کو غزل میں زیادہ کامیاب سمجھتے ہیں تو میں ان سے اختلاف کروں گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ نظم میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کی نظموں میں خیال کا تدریجی ارتقا بھی ملتا ہے اور وہ اپنی نظموں کو ایک مکمل شعری پیکر کا روپ دینے میں بھی کامیاب ہیں لیکن ان کا وضاحتی اسلوب غزل کے مزاج سے ذرا کم مناسبت رکھتا ہے وہ ایمائیت اور تہ داری جو غزل کا حسن بھی ہے اور اس کی قوت بھی، ان کے زیادہ تر اشعار اس سے خالی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غزل میں بالکل ناکام ہیں۔ احساس کی صداقت اور بیان کی سلاست ان کی اکثر غزلوں کا نمایاں وصف ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے۔

——— مخمور سعیدی

لفظوں کی لکیریں

شاعر: غلام حسین ایاز، ناشر: محمد شفیع، عشرت کدہ، ۲۹، اے پام ایونیو کلکتہ ۱۹، ضخامت: ۱۶۰ صفحات، قیمت: دس روپے،

جواں سال شاعر غلام حسین ایاز کا مجموعۂ کلام، جو غزل، نظم اور رباعی پر مشتمل ہے۔ پہلے فلیپ پر شمس الرحمٰن فاروقی اور دوسرے فلیپ پر شجاعت علی سندیلوی کی رائیں ہیں۔ اندرونی صفحات میں سید حرمت الاکرام، ابراہیم ہوش، پروفیسر اسد مظفر پوری، پروفیسر فخر الدین صدیقی آثر اور پروفیسر عبد الرؤف نے ایاز صاحب کی شاعری اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خود شاعر نے بھی اعتراف کے عنوان سے اپنے شخصی میلانات اور شعری نظریے کی وضاحت کی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے ان کے شعری سفر کا آغاز قدیم رنگ کی غزل سے ہوا تھا لیکن آگے چل کر انھوں نے ترقی پسندی اور پھر جدیدیت کا اثر قبول کیا اور غزل کے ساتھ ساتھ نظم اور رباعی کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ایاز صاحب کے کلام میں یہ تینوں رنگ الگ الگ بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن جہاں جہاں ان کے امتزاج سے ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا ہے وہ شاعر کا اپنا رنگ ہے امید

کی جانی چاہیئے کہ رفتہ رفتہ یہ رنگ ان کے ہاں اور گہرا ہوتا جائے گا اور ہمعصروں میں وہ اپنی جدا گانہ پہچان قائم کرلیں گے۔

——— مخمور سعیدی

حرفِ آگہی

شاعر: ناظم سلطان پوری، ملنے کا پتہ: سہیل پبلیکیشن ۱/۱۸ مولانا محمد علی روڈ خضر پور، کلکتہ، ضخامت: ۱۲۸ صفحات، قیمت: پندرہ روپے

ناظم سلطانپوری صاحب کلکتے کے معروف شاعر ہیں انھیں جانشین وحشت جناب شاکر کلکتوی سے تلمذ کی نسبت حاصل رہی ہے۔ وہ غزل گو شاعر ہیں اور ان کی غزلوں میں احساس و اظہار کا وہ رچاؤ ملتا ہے جو ہمیشہ اچھی شاعری کی پہچان رہا ہے۔ وہ فکر سے زیادہ جذبے کے شاعر ہیں اور جذبہ ان کے ہاں شدت سے زیادہ شائستگی کا حامل ہے جس سے ان کے کامیاب اشعار میں لہجے کا ایک ایسا دھیما پن پیدا ہو گیا ہے جو آہستہ خرام موجوں کی نرم موسیقی کی طرح دل کو متاثر کرتا ہے۔ یہ چند شعر دیکھیے:

ہم اہلِ جنوں شوق کی وہ راہ چلے ہیں
گر دھوپ سے بچ نکلے تو سائے میں جلے ہیں
کچھ آپ کے جلووں سے اُجالا ہے سرِ راہ
کچھ نقشِ قدم سے بھی مرے دیپ جلے ہیں

جگہ نہیں ہے مرے واسطے کہیں ناظم
نگاہ بن کے ہر اک دل میں جھانکتا ہوں میں

کتاب سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔

——— مخمور سعیدی

بزمِ احباب (بقیہ ص ۵۰)

آخری حرف ساکن ہے تو الف اس ما قبل سے مل سکتا ہے۔ یعنی ساقط ہو سکتا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ الف واحد مصوتہ ہے جس کی آواز خالص ہے۔ اسے اپنے ما قبل ساکن میں ضم ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی" ص ۶۱

اس کے بعد ذیل کے اشعار میں الف کا الف سے وصل اور الف کا ی سے وصل دیکھیے۔

(۱) راستی موجب رضائے خداست
خدا است کو خداست

(۲) میں دم توڑتا ہوں وہ دیکھیں گے کیونکر
خدا وندا آئیں نہ اب آنے والے
خدا وندا کا الف سنبھالا گیا ہے الف سے

(۳) صد جہاں پیدا دریں نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیا و انبیاست
فضا است سے فضاست
انبیا است سے انبیاست

(۴) دل ہے یکسو عاشقوں کا حال یکساں دیکھ کر
یعنی اطمینان ہے سب کو پریشاں دیکھ کر
یعنی کی ی کو الف سے اٹھایا گیا۔

اس بیان کی روشنی میں شمس الرحمٰن فاروقی خود اپنے بیان کی تردید کرتے ہیں۔

عربی و فارسی الفاظ میں حروف علت نہ گرانے کے حق میں علام عشق آبادی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، نسیم حیرتی۔ حسام الدین۔ وغیرہ ہیں۔ اور عربی فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان امتیاز کے خلاف جو حضرات ہیں ان میں رشید حسن خاں، شمس الرحمٰن فاروقی۔ کرامت علی کرامت ڈاکٹر گیان چند اور عصمت جاوید وغیرہ ہیں۔ مگر یہ حضرات اصول سے زیادہ محض "ذوق" کو رہنما بناتے ہیں۔ یہ معروفی طریقۂ کار نہیں مصرعہ کا صحیح وزن یہ ہے مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔ دیگر اوزان قیاسی ہیں۔ دوسرا مصرعہ معلا ہونے کی وجہ سے اختراع کیے گئے ہیں۔

——— تنویر چشتی رڑکی

بزمِ احباب

★ عزیز مکرم بسیار شیوہ ہاست بتاں راکہ نام نیست
وہ قاتل ادا جس نے میرے دل پر سب سے زیادہ اثر کیا ہے، وہ بیّن کا سرجوش نہیں، آپ کی خود پوشی ہے۔ غالب انعام کا ذکر تحریک میں سب سے زیادہ خفی حروف میں ہے۔ اتفاق سے میری نظر اس پر پڑ گئی۔ جو خوشی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایوانِ غالب نے آپ کو انعام دے کر اپنی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے اور تمام اُردو والوں کی عزت بڑھائی ہے میں آپ کے اسلوب کا جو غالب کا تیرِ نیم کش ہے دلدادہ ہوں۔ پھر آپ نے اردو کی جو بے مثل خدمت انجام دی ہے وہ بھی غالب کے برہمن کی طرح ہے جس میں وفاداری بھی ہے اور استواری بھی۔ حق گوئی بھی اور بے باکی بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے آپ کو صحت مند رکھے اور آپ کے قلم کی گوہر افشانیاں اسی طرح جاری رہیں میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

——— خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی

★ 'تحریک' بابت ماہ اپریل ۷۹ء نظر نواز ہوا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کی جانب سے جناب گوپال مِتّل کو ایوارڈ ملنے کی خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ مِتّل صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف بہت پہلے ہونا چاہیے تھا لیکن، مقامِ شکر ہے کہ تاخیر سے سہی حقدار کو اس کا حق دیا گیا۔ اس قسم کے ایوارڈ مِتّل صاحب کے لیے نہیں بلکہ خود ایسے ایوارڈوں کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ اب دیگر ادبی اداروں کو بھی غالب انسٹی ٹیوٹ کی پیروی کرتے ہوئے مِتّل صاحب کے ادبی مقام کا اعتراف کرنے میں غیر ضروری تاخیر کی جلد از جلد تلافی کرنی چاہیے۔ مزید تاخیر نامناسب ہی نہیں بلکہ ناانصافی ہوگی۔ لہٰذا اب ہر جانب سے ان کی ادبی خدمات کا بھرپور اور شایانِ شان اعتراف ہونا چاہیے۔

اِس شمارہ میں کرشن موہن صاحب نے بھی اپنی بہت اچھی تخلیق پیش فرمائی ہے۔ یا شاید یہ ہمارے نزدیک اس لیے اچھی ہے کہ کچھ کچھ ہماری بھی سمجھ میں آگئی۔ ورنہ موصوف نے اپنے فنّی اور ہیئتی وغیرہ تجربات سے خاص الخاص قارئین کو مستفید کرنے کے لیے عرصہ سے 'تحریک' کے پہلے صفحہ پر اپنا تصرف جما رکھا ہے۔ اور اکثر و بیشتر اپنی فلک پیمائیوں سے ہم جیسے عام قارئین کو مرعوب یا ششدر فرماتے رہتے ہیں۔ پھر بھی ؎

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

——— سورج تنویر۔ چندی گڑھ

★ 'تحریک' اپریل ۷۹ء ملا۔ بیک وقت پانچ خوبصورت کہانیاں دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ بلراج ورما نے آج کے یُگ کی شانتی کو دیومالائی کتھا کی ساوتری کے روپ میں دلپذیر انداز میں پیش کیا ہے آج بھی ایسے کرداروں کی کمی نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ نمائش پسند نگاہیں ان پر نہیں ٹھہرتیں۔ فاروق راہب کی علامتی کہانی بے پناہ تاثر لیے ہوئے ہے۔ اُردو کی بے کسی اور بے بسی پر کرشن موہن نے بڑی متاثر کن اور عبرت انگیز نظم پیش کی ہے۔ مظفر حنفی۔ حامدی کاشمیری مدحت الاختر اور عبد اللہ کمال کی عصری حسیت کی ترجمانی غزلوں کے درجِ ذیل اشعار خوب سے خوب تر کی علامت ہیں۔

اپنی طرف سے ہم بھی گریزاں
بوسیدہ ساحل، گھن گھور دریا

مظفر حنفی

جم رہی ہیں تن پہ کائی کی تہیں
خواب آنکھوں میں گہر یابی کے ہیں
حامدی کاشمیری

اک سکوت بیکراں رگ رگ میں ہے اترا ہوا
تو اٹھا سکتا ہے اپنے خون سے محشر تو آ
عبداللہ کمال

آج آئے درد کی شاخوں پہ رسوائی کے پھول
میں درختوں کو ابھی تک بے ثمر کہتا رہا
مدحت الاختر

——— محبوب راہی کھرگر

★ اپریل کے تحریک میں حفیظ آتش صاحب کا خط پڑھ کر ہنسی رکے نہ رکی، اس سے پہلے ابن النصیر انور اور لیاقت ندیم کے خطوط بھی نظر نواز ہوئے تھے، میرا خیال تھا کہ یہ کچھ "چھیڑ خوباں سے" والی حرکت ہے مگر یہاں تو معاملہ کچھ زیادہ گمبھیر نظر آتا ہے۔

ایک صاحب اپنے مضمون میں انور خان سلام بن رزاق، انور قمر، سلطان سبحانی اور انور رشید وغیرہ کو ۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں اہم سمجھتے ہیں اور دوسرے صاحب شفق، حسین الحق، شوکت حیات اور قمر احسن کو اہم ثابت کرتے دکھائی دیتے ہیں یہاں تک تو بات کچھ ایسی مزیدار نہیں ہے۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ ہم عصر افسانہ نگاروں میں سے بعض ایک کو اہم سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے کو۔ مگر مزہ تو آیا بمبیا ناقد حفیظ آتش کا مکتوب پڑھ کر جو احمد عثمانی اور لیاقت ندیم دونوں پر صرف اس لیے برہم ہیں کہ ان دونوں نے ایک دوسرے بمبیا ناقد باقر مہدی کے مضمون سے اختلاف کیا۔

ٹھیک ہے بھائی، بمبئی میں رہ کر باقر مہدی سے بیر؟ ترقی پسندوں کے ناراض گروپ کی قیادت کی کوشش کرنے والے باقر مہدی نے پہلے مین را کو اپنے گروپ میں شامل کیا اور اب تو اللہ کے فضل سے سریندر پرکاش بھائی بھی بجوکا لکھ کر تقویت ایمان کا ثبوت دے چکے ہیں۔ تو ایسی صورت میں یہ باقر مہدی کی ذمہ داری بھی ہے اور ضرورت بھی کہ اپنے گروپ کے ان دو عظیم افسانہ نگاروں کی نیا ڈوبنے سے بچائیں جن کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ بقول سریندر پرکاش "ہم نے تیس برس تک محنت کی تب چار دانگ عالم نے یہ جانا کہ اس عالم آب و گل میں بلراج مین را اور سریندر پرکاش نام کے دو افسانہ نگار بھی بستے ہیں" اور دوسری طرف حسین الحق، شفق، قمر احسن اور شوکت حیات نے دس برسوں میں ہی حفیظ آتش جیسے مہربان ناقد سے اپنی ذہانت کا اعتراف کرالیا تو یہ واقعی ان کے بوکھلانے کی بات ہے۔

اور یہی نہیں عصمت چغتائی کو دیکھیے جو شفق کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی ہیں تو قلم رکھنے کا نام نہیں لیتیں۔ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر سید محمد عقیل، نظام صدیقی، وہاب اشرفی، ابوالکلام قاسمی اور مہدی جعفر وغیرہ کو بھی ملاحظہ کیجیے جو انھیں ناپختہ ذہنوں کی کہانیوں کی تعریف کرتے ہیں۔ میں حفیظ صاحب سے بالکل متفق ہوں۔ واقعی قمر احسن، شفق، حسین الحق اور شوکت حیات نے بہت خود ساختہ پوز مارا ہے اور ناپختہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن مکتوب نگار مثالیں دینا بھول گئے ہیں مثلاً قمر احسن نے اپنی ایک کہانی "پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ" سردار جعفری کو بھیجی اور جب سردار جعفری نے واپس کردی تو تحریک میں گالی گلوچ کے ساتھ چھپوائی اور اپنی حمایت میں خطوط لکھوائے۔

شفق کو ایک مرتبہ خواب تلقارمس کے نام سے پکارا گیا اور تب انھوں نے کہانی تلقارمس لکھی۔ حسین الحق اپنی کہانی بلند مقام پر بہ آواز بلند پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

اور شوکت حیات نے پٹنہ کے سوداگروں اور سفیرانِ جہاں سے پیسے اکٹھا کرکے "شوکت جنرل" نکالا یہ سب تو بڑی دھاندلی ہے اور انھیں ادھم بازیاں

اور کرتب بازیوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سنجیدہ قاری نے کہانیاں پڑھنی چھوڑ دیں۔

ہاں "اظہار پر دسترس" کی بابت صرف اتنا عرض کرتا ہے کہ شوکت حیات، قمر احسن، حسین الحق اور شفق کو تو مانا کہ اظہار پر دسترس نہیں ہے مگر بلراج مین را کو "ماچس" اور "کمپوزیشن" کی کہانیوں میں اور سریندر پرکاش کو "تلقارمس" اور "جپی ٹراں" میں اظہار پر کون سی دسترس حاصل ہے؟ مین را صاحب ماچس میں ماچس کو زندگی اور روشنی کی علامت کے طور پر استعمال کرتے کرتے اچانک فرماتے ہیں کہ ماچس تو سیٹھ کے پاس ملے گی تو یہ تشریحی جملہ کیا ان کے فنکارانہ عجز کا آئینہ دار نہیں ہے۔ اور "کمپوزیشن" کی بچکانہ اور ناپختہ تجریدیت اور "تلقارمس" کا اوٹ پٹانگ اسلوب۔ اور "جپی ٹراں" کے بوڑھے کے کردار کی غیر متناسب پیش کش کیا ان کے جید، عظیم، بے مثال، لافانی، فنکارانہ قد پر چیچک کے داغ کی مثال نہیں ہے؟ کیا فاضل مکتوب نگار کے خیال میں یہ وہ افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اعتبار پیدا کیا ہے۔ اور قمر احسن "طلسمات"، "گرد باد اور پیلیا"، "نروان"، "ہوزا میم قہہ"، "یا مصطفے"، "ابابیل"، "آخری تنہا درخت" اور شوکت حیات "پاؤں"، "صرف"، "بانگ"، "لیٹر بکس کی تلاش"، "ڈھلان پر رکے ہوئے قدم"، "بکسوں سے دبا آدمی" اور حسین الحق "بارِ پشت"، "لخت لخت"، "امرلتا"، "بارش میں گھرا مکان"، "پس پردۂ شب"، "اندھی دشاؤں کے سائے"، "تم کتھا" اور شفق "کانچ کا بازیگر"، "ڈوبتا ابھرتا ساحل"، "سیاہ کتا"، "جشن الموت"، "بجھا ہوا گلاب"، "بہروپیا" اور "ناگزیر" جیسی اہم اور کامیاب کہانیوں کی تخلیق کے باوجود فاضل مکتوب نگار کے خیال میں خود ساختہ پوز سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے ہیں تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ حفیظ، آتش صاحب ہی نہیں باقر مہدی، سریندر پرکاش اور بلراج مین را بھی ریت میں سر چھپا کر آنے والے طوفان سے بچنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ۶۰ اور ۶۶ کے بیچ لائے ہوئے اسی طوفان کا تسلسل ہے جو باقر مہدی اور بلراج مین را لائے تھے اور جس طوفان میں انھوں نے قرۃ العین حیدر، منٹو، اور کرشن چندر کی ٹوپی اپنے سر رکھ کر اپنے کو اردو عظیم افسانہ نگار بنا کر پیش کیا۔ لہٰذا ادب کے کسی بھی سمجھدار قاری سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اظہار پر کمزور دسترس خود ساختہ پوز اور ناپختہ ذہن شفق، حسین الحق، قمر احسن اور شوکت حیات کی خصوصیت نہیں بلراج مین را اور سریندر پرکاش کی خصوصیت ہے جسے باقر مہدی، حفیظ آتش کے شانے پر بندوق رکھ کر اپنی درستادہ تنقید سے اڑا دینا چاہتے ہیں تاکہ دوست رسوا نہ ہو اور گروپ شکستہ نہ ہو۔ لہٰذا میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ادھ کچے مضامین اور خطوط کی اشاعت سے احتراز کریں کہ اس سے قاری کو یقیناً بدہضمی ہو سکتی ہے۔

تحریک میں کہانیوں کا حصہ بڑھا دینے سے خوشگوار احساس ہوا ہے۔ تحریک روز بروز نکھرتا جا رہا ہے!

——— ضرغام عبد ساجن پور

★ بزم احباب (تحریک اپریل) میں سبط اصغر رضوی صاحب کا مکتوب نظر سے گزرا۔ موصوف کی تسلی کے لیے عرض ہے کہ "کالی دھرتی کی غزلیں" میں یہ شعر دو جگہ چھپا ہے اور دونوں جگہ شعر اسی طرح درج ہے۔ یعنی؎

کیا بیاں تم سے کروں خود میں حقیقت اپنی
کسی شیشے پہ برستا ہوا پتھر دیکھو

میں تو بری الذمہ ہوا باقی جواب شان بھارتی کے ذمے۔

——— خلیق الزماں نصرت سیوانی

★ "تحریک" کے سلسلہ وار نمبر میں ہندی غزل پر شاہد میر کا مقالہ پڑھ چکی ہوں کافی اچھا جائزہ لیا ہے۔ لیکن دو قابلِ ذکر شاعروں کا ذکر نہ کر کے شاہد صاحب نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ایک تو ہیں شاہد میو کم اور دوسرا نام طارق سلطان کا ہے ان دونوں کا

نے ہندی غزل کو سنوارنے، سجانے میں حصہ لیا ہے۔
اب ادھر فروری ۷۹ء کے شمارہ میں شاہد صاحب نے 'تحریک' ہی کے توسط سے کچھ ہندی غزلوں کا انتخاب قارئین تک پہنچایا ہے لیکن اس بار بھی ان کی نظر انتخاب میوکھ اور طارق منظور پر نہیں پڑی۔ پہلے تو میرا یہ قیاس تھا کہ شاید مقالے کی طوالت سے پرہیز کرنے کے لیے ان لوگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے لیکن اس انتخاب کو دیکھنے کے بعد بہت افسوس ہوا اور میں سمجھ نہ سکی کہ جو شخص ہندی غزل پر اتنی اچھی معلومات رکھتا ہو وہ میوکھ اور طارق منظور کی غزلوں سے کیونکر ناواقف ہو سکتا ہے؟ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟ کیا اس لیے کہ یہ دونوں مسلمان ہیں؟ اگر یہ بات درست ہے تو یہ ایک ایسی ادبی بددیانتی ہے جس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ کیونکہ زبان و ادب کسی خاص فرقے یا مذہب کی میراث نہیں ہوتے ورنہ آج ہندی میں خسرو، کبیر، جائسی اور اردو میں نسیم، چکبست، فراق وغیرہ کا وجود تک نہ ہوتا۔

——— میمونہ ہاشمی ایم۔ اے بنارس

★ معاصر "گل کدہ" میں جناب طرفہ قریشی کے شعر:

وسعت کے جویا اُٹھ کسی دریا سے جا کے مل
اپنی جگہ تو قطرہ سمندر بنا نہیں

پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ مصرعۂ اولیٰ میں "جویا" کا الف گرتا ہے جس کے سبب یہ مصرعہ خارج از وزن ہو گیا ہے۔ اس اعتراض کا جواب ایڈیٹر کی طرف سے یہ دیا گیا تھا کہ یہاں اُٹھ کا الف الفِ وصل ہو کر جویا کے الف کو سہارا دے کر ساقط ہو جائے گا۔ اس جواب سے معترض کی تشفی نہیں ہو سکی تو میں نے اس مصرعہ پر چار سوالات قائم کر کے علّام عشق آبادی (مرحوم)۔ ڈاکٹر گیان چند۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، رشید حسن خاں صاحب، شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اور کرامت علی کرامت صاحب کو برائے استفسار بھیجے تھے ان حضرات کے جوابات (من وعن) 'تحریک' بابتہ ماہ نومبر ۱۹۷۸ء میں شائع کرا دیے گئے تھے۔ جوابات کے تضاد کو دیکھتے ہوئے میں نے عروضی حضرات سے اس مسئلے پر مزید غور کی درخواست کی تھی۔ میری درخواست پر توجہ کرنے والوں میں ڈاکٹر عصمت جاوید۔ جناب شمیم قریشی۔ جناب نسیم حیرتی۔ جناب حسام الدین۔ جناب ضیا فتح آبادی۔ جناب جیرام داس فلک۔ جناب راز لائل پوری وغیرہ ہیں۔ میں ان حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس علمی بحث میں شرکت فرمائی۔

اب میں سوال نامہ کی طرف آتا ہوں۔

(۱) اس مصرعہ میں جویا کے الف کو اُٹھ کا الف وصل ہو کر اٹھا رہا ہے۔ اس کی تائید میں یاس یگانہ کی رائے کے ساتھ علّام عشق آبادی۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، شمیم قریشی۔ حسام الدین۔ راز لائل پوری۔ جے رام داس فلک اور خود جناب طرفہ قریشی کی آرا شامل ہیں۔

الف میں الف کے وصل سے انکار کرنے والوں میں ڈاکٹر گیان چند۔ جناب رشید حسن خاں جناب شمس الرحمٰن فاروقی جناب نسیم حیرتی اور ڈاکٹر عصمت جاوید ہیں۔

جو لوگ الف میں الف کے موصول ہونے سے منکر ہیں۔ وہ شمس الرحمٰن صاحب فاروقی کی کتاب "عروض آہنگ اور بیان" کا یہ اقتباس دیکھیں۔

"سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الف موصول ہر جگہ مستحسن ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ الف کا وصل ہمیشہ ایک مشینی عمل کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں نہ ذوقِ سلیم کو دخل ہے نہ کسی کی رائے یا مشورہ کو۔ اگر لفظ کا پہلا حرف الف ہے۔ اور اس کے ماقبل لفظ کا (باقی ص ۳۶ پر)

لہ یہ بحث 'تحریک' کے صفحات پر ختم کی جا چکی ہے مگر تنویر چشتی جو اس بحث کے محرک تھے، ان کا خط ہمیں تاخیر سے ملا اس لیے اب شائع کیا جا رہا ہے۔
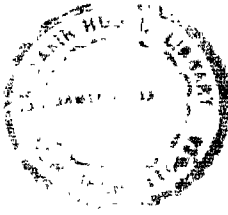
لکھنؤ میں ۲۰ر اپریل سے ۲۶ر اپریل ۱۹۷۶ء تک نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) نئی دتی اور اُتر پردیش اُردو اکاڈمی لکھنؤ کے زیرِ اہتمام اُردو کتابوں کا قومی میلہ لگایا گیا۔ اس موقع پر اُردو ناشرین کی ایک کانفرنس بھی ہوئی جس میں مختلف اشاعتی اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ تصویر میں نظر آرہے ہیں، دائیں سے بائیں: نیشنل اکاڈمی نئی دتی کے رزاق ارشد، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ کے اسد یار خاں، مکتبۂ جامعہ نئی دتی کے عبدالوحید، الیو والیہ بک ڈپو نئی دتی کے جانکی ناتھ، اُردو پبلشرز لکھنؤ کے منشی امیر علی، اسٹار پبلیکیشنز نئی دتی کے من موہن تلخ، علوی بک ڈپو بمبئی کے جوذر بھائی دارو والا اور نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کے ایس۔ اے۔ رحمٰن۔ دوسری صف میں بیٹھے ہیں: اتر پردیش اُردو اکاڈمی کے عبدالاحد خاں خلیل اور نسیم بک ڈپو لکھنؤ کے فہیم احمد۔

۲۰ر مئی ۱۹۷۶ء کو انڈیا انٹرنیشنل نئی دتی کے خوشنما آڈیٹوریم میں امیر قزلباش کے تیسرے شعری مجموعے "شکایتیں میری" کی تقریبِ اجرا منائی گئی۔ جلسے کی صدارت اور کتاب کا اجرا مرکزی وزیرِ تعمیرات و مکانات جناب سکندر بخت صاحب نے فرمایا۔ اسٹیج پر تشریف فرما ہیں، دائیں سے بائیں: جنابِ کمار پاشی، جنابِ مجتبیٰ حسین، جنابِ امیر قزلباش، جنابِ سکندر بخت، جنابِ گوپال متل اور پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

ندرجات :

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

تحریک

نئی دہلی

شمارہ : ۳، ۴ — جلد : ۲۷

جون - جولائی ۱۹۷۹ء

ادارۂ تحریر :

☆ گوپال متل

☆ مخمور سعیدی

☆ پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے، فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ تین پونڈ — فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سیکولرازم — ایک پل یا ایک خلیج؟

گوپال متل

سیکولرازم کے بارے میں کچھ لکھنا آسان نہیں کیونکہ راقم الحروف کو آج تک دو ایسے آدمی نہیں ملے جن کے ذہن میں اس کا مفہوم یکساں ہو۔ یہ بات قابلِ فہم بھی ہے۔ اس لفظ کے حقیقی معنی لادینیت ہیں لیکن ہندوستان میں جب اسے آئین کا جز بنایا گیا تو یہ معنی مدِنظر نہیں تھے۔ سیکولر نظام سے مراد ایک ایسا نظامِ حکومت تھا جس میں کسی فرقے کے ساتھ نہ تو بر بنائے مذہب کوئی تعصب برتا جائے اور نہ مذہب کی بنا پر اس کی برتری کو تسلیم کیا جائے۔ اس نکتے کی کئی بار وضاحت بھی کی گئی ہے لیکن کچھ لوگ اب بھی اسے لادینیت کا مترادف ہی سمجھتے ہیں اور ہر وہ شخص جو اپنے دینی شعائر سے منحرف نہ ہو، ان کی نکتہ چینی کا ہدف بن جاتا ہے۔

سیکولر کا لفظ آئین میں کیوں شامل کیا گیا یہ بات بھی بہ آسانی سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جو نظامِ حکومت بھی جمہوری ہوگا وہ لازماً سیکولر ہوگا اور ہندوستان میں تو نظامِ حکومت کا سیکولر ہونا ناگزیر ہے۔ آزادی سے پہلے جو حکومتی نظام تھے وہ جمہوری نہیں تھے لیکن سیکولر وہ بھی تھے۔ کچھ مخصوص معاملات کو چھوڑ کر جن کا تعلق خالصتہً مذہب سے ہے، حکومت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک فرقے کے لیے الگ قانون بنائے اور دوسر فرقے کے لیے الگ۔ برطانوی دورِ حکومت میں نظام حکو جمہوری نہیں تھا لیکن بنیادی طور پر سیکولر ضرور تھا مغا کا نظامِ حکومت جمہوری نہیں تھا، انھوں نے سیکولز کا دعویٰ بھی نہیں کیا لیکن بنیادی طور پر یہ حقیقت انھ نے تسلیم کرلی تھی کہ انھیں ایک ایسے سماج پر حکومت ہے جو مختلف مذاہب اور فرقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اسلام بن کر وہ یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتے تھ واضح طور پر اس کا اعلان کیے بغیر انھوں نے عملاً سرگرمیوں سے گریز کیا۔ قدیم ہندو دور میں بھی مذ معاملات میں دخل دینے کا رواج نہیں تھا۔ ا کی واضح مثال یہ ہے کہ چارواک جو ہندو مذہب بہت کٹیلے حملے کرتا تھا اسے صرف یہی نہیں کہ کوئ نہیں دی گئی بلکہ رشی کا خطاب بھی دے دیا گیا حکومت بلند بانگ دعاوی کیے بغیر بے تعص اصول اپنا سکتی ہے اس کا ثبوت برطانوی دور کی ریاستوں میں بھی ملتا تھا مسلم ریاستوں میں اہم اہم عہ پر ہندو متعین ہوتے تھے اور ہندو ریاستوں میں مسلم ویسے بھی ریاستوں کے حکمران مذہبی جھگڑوں سے الگ رہتے تھے۔

شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ حقیقت ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی رہی ہے کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں یک رنگ معاشرے کا قیام ممکن نہیں۔ جن لوگوں نے یک رنگ معاشرے کے قیام کی کوشش کی ان کی کوششوں کا انجام بخیر نہیں ہوا اگر کچھ کامیابی ملی تو صوفیوں اور سنتوں کو جو رنگا رنگی میں یک رنگی کے قائل تھے۔

حکومتی سطح پر یک رنگ معاشرہ قائم کرنے کی پہلی کوشش اکبر نے کی جو مہابلی کا لقب اختیار کر کے دین الٰہی نافذ کرنا چاہتا تھا ہر کوئی جانتا ہے کہ اس کی یہ کوشش صرف یہی نہیں کہ ناکام رہی بلکہ اس کا منفی نتیجہ بھی نکلا۔ اکبر نے مسلم علما میں ایک انتہا پسند طبقہ پیدا کر دیا۔ اس طبقے کی شدید مخالفت بالآخر دارا شکوہ کے قتل اور اورنگ زیب کی کامیابی پر منتج ہوئی۔ اورنگ زیب نے بھی اس طبقے کو اپنی مقصد برآری کے لیے ہی استعمال کیا تھا ورنہ جہاں تک اس کے خالص اسلامی حکومت کے حامی ہونے کا سوال ہے یہ قول بھی اسی کا ہے کہ حکمراں کو عہدہ دیتے وقت امیدوار کی صلاحیت دیکھنی چاہیے اس کا مذہب نہیں۔

سطور بالا سے سیکولرازم کے دو مفہوم ہمارے سامنے آتے ہیں ایک یہ کہ مختلف مذہب والے ایک دوسرے سے رواداری برتیں اور حکومت مذہبی تعصب سے بالا ہو۔ دوسرا یہ کہ ملک میں ایک یکرنگ معاشرہ قائم کیا جائے اور سبھی باشندوں کو کسی مخصوص عقیدے پر ایمان لانے پر آمادہ کیا جائے۔ خوش قسمتی سے دوسرا انداز نظر اب تک حکومت نے نہیں اپنایا لیکن ایک طبقہ ایسا ضرور موجود ہے جو اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سیکولر اور قوم پرست سمجھتا ہے۔ یہ طبقہ ایک نئی قسم کی فرقہ پرستی کو جنم دیتا ہے اور اس کے ساتھ منافقت کو بھی۔ جو مسلمان اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں وہ اپنے اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں پھر انھی مسلمانوں میں اعتماد قائم کرنے کے لیے انھیں ایسی حرکتیں بھی کرنا پڑتی ہیں جو عام طور پر وہ فرقہ پرست مسلمانوں سے منسوب کرتے ہیں۔

یہی حال غالی سیکولر ہندوؤں کا ہے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے وہ زور و شور سے سیکولرازم کے نعرے لگاتے ہیں لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ صرف مسلمانوں کے ووٹوں کے سہارے وہ مسند اقتدار پر نہیں پہنچ سکیں گے لہٰذا سیکولرازم کا پروپیگنڈہ وہ صرف مسلم حلقوں ہی میں کرتے ہیں جو ان کی منافقت کی کھلی دلیل ہے۔ اس منافقت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ آزمائش کی کسی گھڑی میں بھی انھوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا۔

تو کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم شیوۂ منافقت کو ترک کر کے واضح طور پر یہ تسلیم کر لیں کہ ہندوستان میں مختلف مذہبی عقائد رکھنے والے فرقے موجود ہیں۔ انھیں ہم آہنگی اور ہم وجودیت پر تو آمادہ کیا جا سکتا ہے لیکن یک عقیدگی پر نہیں پہلی صورت میں سیکولرازم ایک پُل کا کام دے گا اور دوسری صورت میں ایک خلیج کا۔ ہم یک عقیدگی کے منافقانہ نعرے بلند کرتے رہیں گے لیکن ہمارے دلوں میں مغائرت نہ صرف یہ کہ کم نہیں ہوگی، بلکہ بڑھتی بھی رہے گی۔

غزل

کرشن موہن

صبحِ شباب کا وہ تقاضا "مچل مچل"

شامِ شباب کا یہ اشارہ سنبھل سنبھل

آمیزہ نیک و بد کا ہے انسان کا خمیر

آئینہ ہر کسی کی ہے فطرت عمل عمل

تیرا جمال شعر و ادب کا کمال ہے

پایا ہے ہم نے تیرا سراپا غزل غزل

دل میرا شاہزادہ ہے جھیلوں کے دیش کا

جلوہ نما ہے اس کی لطافت کنول کنول

آخر قدیم رنگ میں کیسا خاص بات ہے

جب کہہ رہا ہے سارا زمانہ بدل بدل

تقدیر میں لکھا ہے جو ہو کر رہے گا وہ

کب تک یہ فکر و غم دلِ ناداں بہل بہل

تیرے ملن کی آس میں چاہت کی پیاس میں

لب میرے خشک خشک ہیں آنکھیں سجل سجل

کمبوڈیا کا مسئلہ — جو چین نے منظر عام پر لایا

ستیہ پرکاش

چین نے ویت نام کو 'سزا' دینے کے لیے جو فوجی کارروائی کی تھی اس سے چین کو ایک مقصد میں ضرور کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے کمبوڈیا کا مسئلہ ایک گرما گرم، جیتا جاگتا مسئلہ بن گیا ہے۔ دوسری صورت میں یہ مسئلہ تغافل کی دھند میں ہی لپٹا رہتا، جو کچھ تو سوویت یونین کی کارگر پروپیگنڈہ مشنری کی بدولت اور کچھ جمہوری ملکوں کی بے ضمیری کے باعث پہلے کسمپرسی کے عالم میں تھا۔

کمبوڈیا (جمہوری کمپوچیا) پر ویت نام نے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ایک زوردار حملہ کر ڈالا تھا۔ یہ جارحیت اس سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر تھی جس کی توقع کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس دھارے میں ویت نامی فوجیں نہایت تیزی سے کھمیر روج کی دفاعی لائنوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھتی گئیں۔ ۷ جنوری ۱۹۷۹ء تک کمپوچیا کی راجدھانی نوم پنھ پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد دونوں ملکوں میں 'امن، دوستی اور تعاون' کا معاہدہ ہوا، ظاہر ہے یہ معاہدہ بے معنی تھا، کیونکہ کمبوڈیا نے اس پر دباؤ کے تحت دستخط کیے تھے۔

ویت نام (آبادی: ۵ کروڑ ۱۰ لاکھ) اور کمبوڈیا (آبادی: ۸۰ لاکھ) کی کھٹ پٹ اور دشمنی صدیوں پرانی ہے۔ کھمیروں کے قومی ناز کا سرچشمہ گیارھویں صدی کے آس پاس کا وہ دور تھا جب آج کے بیشتر ویت نام، لاؤس اور تھائی لینڈ پر ان کی حکم

سلطنت کا تسلط تھا۔ تیرھویں صدی کے آغاز سے کھمیروں کی طاقت متواتر ماند پڑتی گئی۔ کمبوڈیائی پہلے تو شمال مغرب میں بڑھتی ہوئی تھائی طاقت کے سامنے جھکے اور پھر اُن کے قلمرو کے مشرقی سرے پر انامی سلطنت کی توسیع پسندی کا دباؤ پڑا جو جنوب کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی اور جس کی اطاعت قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں اور انیسویں صدی کے شروع میں کمبوڈیا اتنا کمزور ہو چکا تھا اور اتنے زیادہ حصوں میں بٹ چکا تھا کہ اس نے اپنے قومی وجود کو کسی نہ کسی درجے میں بڑی مشکل سے قائم رکھا، اور یہ مرحلہ بھی وہ اس لیے سر کر سکا تھا کہ اس کے باشندوں میں دب کر ابھرنے کی قوت تھی اور وہ اپنے سے زیادہ طاقتور تھائی اور ویت نامی دشمنوں کی آپس کی رقابت سے فائدہ اٹھانے کا ہنر جانتے تھے۔ اس کے باوجود غالب امکان اسی بات کا تھا کہ انجام کار سیام اور ویت نام کمبوڈیا کے حصے بخرے کر ڈالتے۔ یہ سانحہ اگر نہیں ہوا تو اس کی وجہ انیسویں صدی کے آخر میں ہند چینی میں فرانسیسیوں کی آمد تھی۔

فرانسیسی نوآبادیت اور بعد میں اس خطے میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کی موجودگی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ کمبوڈیا کے ساتھ ویت نام کی کھینچا تانی اور حریفانہ دعوے بالکل دب کر رہ گئے،

لیکن ۱۹۷۰ء کی دہائی کے شروع میں، جب یونائیٹڈ اسٹیٹس کا
کا اثر اس خطے میں ختم بھی نہیں ہوا تھا، ویٹ نام کی دشمنی کھل کر
سامنے آنے لگی۔ کمبوڈیائی لوگ دو معاملوں میں خاص طور
سے بہت حساس رہے ہیں، اور دونوں کا سلسلہ ویٹ نام
سے ملتا ہے۔ ایک تو انھیں یہ خطرہ ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے
کہ ویٹ نام پھر ان کے علاقے میں دراندازی کرے گا۔ دوسرے
انھیں یہ تشویش بھی رہی ہے کہ ویٹ نامی ایک متحد ہند چینی کے
سربراہ بننے کے ارادے اور منصوبے باندھے بیٹھے ہیں۔ کمبوڈیا
کے کمیونسٹ لیڈر اپریل ۱۹۷۵ء میں برسر اقتدار آنے سے
پہلے اس وقت بھی بہت برہم ہوئے تھے جب انھیں محسوس ہوا
تھا کہ کچھ عناصر ویٹ نام کی شہ پر کھمیر روج کے اندر انھیں جڑ سے اکھاڑنے
اور خود اُن کی جگہ سنبھالنے کے جتن کر رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع میں فرانسیسیوں نے انتظامی سہولت
کے پیش نظر اس خطے میں جابجا خط تقسیم کھینچ کر سرحدوں کا تعین کر دیا
تھا۔ پھر ۱۹۶۰ء کی دہائی کے وسط میں زمینی سرحد کی حد بندی کے
لیے باضابطہ سمجھوتہ ہوا۔ ویٹ نام اور کمبوڈیا، دونوں ہی کا دعویٰ
ہے کہ یہ سمجھوتہ واقعی ہوا تھا، لیکن اس کے ساتھ دونوں ایک دوسرے
پر اس سمجھوتے کا احترام نہ کرنے کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ معلوم ہوتا
ہے جھڑپیں زیادہ تر ان ہی علاقوں میں ہوتی ہیں جہاں سرحدیں غیر
واضح تھیں۔

کمبوڈیا کے خلاف فوجی جارحیت آزمانے میں پیش قدمی
ویٹ نام نے ہی کی تھی، چنانچہ جنگ کا بوجھ بھی اس کو ہی زیادہ
اٹھانا پڑا۔ خبروں کے مطابق ویٹ نام نے ـــ ر ...۱ سے بھی
زیادہ فوجی (ٹینکوں اور طیاروں کے ساتھ) اس مہم پر بھیجے تھے۔
ان میں سے اکثر ابھی تک کمبوڈیا پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ سی۔
این۔ یو۔ ایف۔ این۔ ایس کے کارپردازوں کا منصب
محض نمائشی ہے۔ ان کا کام بس اتنا ہے۔ کہ نئی سرکار کے لیے جتنے
بڑے پیمانے پر بھی ممکن ہو، تائید و حمایت حاصل کر دکھائیں۔

ویٹ نام کا اصرار ہے (اور اپنے دعوے کے حق میں اسے
سوویٹ یونین کی حمایت بھی حاصل ہے) کہ کمبوڈیا میں پول پوٹ
سرکار کے خلاف دسمبر میں جو شورشیں ہوئی تھیں ان میں
ویٹ نامیوں نے مطلق حصہ نہیں لیا تھا، یہ پورا معرکہ سی۔ این۔ یو۔
ایف۔ این۔ ایس نے سر کیا تھا۔ کمبوڈیا نے جب ویٹ نام پر
حملہ کیا تو سی۔ این۔ یو۔ ایف۔ این۔ ایس نے اس موقع کو غنیمت
سمجھا اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے بروقت بازی لگا دی۔ ویٹ نامی
وزارتِ خارجہ کے ایک بیان میں، جو ۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو جاری
کیا گیا تھا، اسی نکتے کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے
کہ سی۔ این۔ یو۔ ایف۔ این۔ ایس کے وجود میں آنے کا مقصد
ہی یہ تھا کہ پول پوٹ سرکار کے جبر و ستم سے نجات دلائی جائے۔ اس
کے ساتھ بیان میں یہ بات بھی دہرائی گئی ہے کہ ویٹ نامی حکومت
"اس برحق جدوجہد کی مکمل حمایت کرتی ہے۔" پھر یہ بھی کہا گیا ہے
کہ کمبوڈیا کی حکومت کی چھیڑی ہوئی "جارحانہ جنگ" کے پیش نظر
ویٹ نامی عوام "اپنے بچاؤ کا بہر لحاظ جائز حق استعمال کرنے
پر مجبور ہو گئے تھے۔" اس کے دو دن بعد ویٹ نامی کمیونسٹ
پارٹی کے اخبار "نہان دان" نے یہ نوید سنائی کہ انقلاب آجانے
سے کمبوڈیا نے ایک نئے دور میں قدم رکھ دیا ہے۔ اس نئے
دور میں ہند چینی کے جزیرہ نما کی تینوں قومیں ایک دوسرے
کی آزادی، اقتدارِ اعلیٰ اور برابری کے مکمل احترام کے جذبے
کے ساتھ "ایک نئی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک اور متحد ہو جائیں
گی۔" لیکن ان بلند بانگ دعووں کے باوجود حقیقت چھپ
نہیں سکی ہے۔ نئی سرکار کے خلاف مزاحمت آج بھی جاری ہے،
اور بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ اس مزاحمت کا ایک سبب
تو یہ ہے کہ فرنٹ کے لیڈروں کو ابھی تک شک کی نظر سے
دیکھا جاتا ہے، کیونکہ کچھ ہی عرصے پہلے تک یہ لوگ کھمیر روج کی

پالیسیوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے، اور دوسرا سبب ویٹ نامیوں کا خوف ہے، جو کمبوڈیائیوں کے دیرینہ دشمن ہیں۔

مارچ ۱۹۷۹ء کے آخر تک بہت ہی کم ملکوں نے سی پی آر کی کو تسلیم کیا تھا۔ یہ سب کے سب وہ ملک تھے جو ویٹ نام اور سوویٹ یونین کے یا تو حلیف تھے یا قریبی دوست۔ ویٹ نام اور سوویٹ یونین کے علاوہ کمپوچیاری پبلک کو جن ملکوں نے تسلیم کیا ہے وہ لاؤس، افغانستان، بلغاریہ، مشرقی جرمنی، ہنگری، منگولیا، ایتھوپیا، چیکوسلواکیہ، پولینڈ، کیوبا، انگولا، موزمبیق، کانگو، یمن کی عوامی جمہوری ری پبلک (پی۔ ڈی۔ آر۔ وائی) اور اسکاٹ لینڈ یا ہیں۔ سوویٹ یونین کی طرف سے کمپوچیاری پبلک کو تسلیم کرنے کی اطلاع ایک خاص پیغام کے ذریعہ دی گئی تھی۔ یہ پیغام ۹ جنوری کو صدر بریزنیف اور وزیر اعظم کوسی جن نے ہینگ سمرین کے نام بھیجا تھا۔ پیغام میں "محب وطن طاقتوں" کی فتح پر کمبوڈیا کے عوام کو مبارکباد دی گئی تھی اور سی پی آر سی کو کمپوچیا کی واحد قانونی حکومت قرار دیا گیا تھا۔ جواب میں ہینگ سمرین نے کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ماضی میں "سامراج اور نو آبادیت" کے خلاف جنگ میں اور پچھلے دنوں "قومی نجات" کی جدوجہد میں سوویٹ حکومت اور سوویٹ عوام نے ہمیشہ کمبوڈیائی قوم کا ساتھ دیا ہے۔

اس کے برعکس چین کی طرف سے ۱۳ جنوری کو جو سرکاری بیان جاری کیا گیا تھا، اس میں کمبوڈیا کے خلاف ویٹ نام کی "مجنونانہ اور وحشیانہ جارحیت" کی کڑی مذمت کی گئی اور کمبوڈیائی عوام کے لیے چین کی حمایت اور مدد کا یقین دلایا گیا۔ پھر ۱۷ فروری کو چینی فوجیں سرحد پار کر کے ویٹ نام میں داخل ہو گئیں۔ اس اقدام کے لیے سرکاری طور پر یہ وضاحت پیش کی گئی کہ یہ جوابی حملہ تھا اور بنیادی طور پر ویٹ نام کی اس ختم نہ ہونے والی "مسلح اشتعال انگیزی" کا رد عمل تھا جس کا مظاہرہ ویٹ نام سرحدی علاقوں میں کرتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ چین "ایک انچ کے برابر بھی" ویٹ نامی علاقہ نہیں حاصل کرنا چاہتا۔ کمبوڈیا پر ویٹ نامی حملے کا اس وضاحت میں براہ راست حوالہ ذرا بھی نہیں دیا گیا۔ ۵ مارچ کو چین نے یہ اعلان کیا کہ وہ سرحد پر تعینات اپنی تمام فوجوں کو چینی علاقے میں واپس بلا رہا ہے۔ سرحد پر امن کے قیام کے لیے اس نے ویٹ نام کو جلد بات چیت شروع کرنے کی پیش کش بھی کی۔ اس کے ساتھ اس نے "ویٹ نامی ارباب اقتدار" پر کمبوڈیا سے اپنی فوجیں واپس بلانے کے لیے بین الاقوامی دباؤ ڈالنے کی اپیل بھی کی۔

کمبوڈیا کی صورت حال پر شمالی کوریا کا تبصرہ وہاں کی کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "نوڈونگ سن من" (۱۲ جنوری) کے ایک اداریے کے روپ میں سامنے آیا ہے۔ اداریہ میں کہا گیا ہے کہ ویٹ نام کی بڑے پیمانے کی فوجی کارروائی کے نتیجے میں کمبوڈیا آج بھی ویٹ نام کے مسلح کنٹرول کے تابع ہے۔ اداریہ میں ویٹ نام کی "غلبہ پسندانہ" کارروائی کو "وحشیانہ" اور "بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی" قرار دیا گیا ہے۔

مغربی ملکوں کے لیڈروں نے بھی یہی استدلال پیش کیا ہے کہ کسی ملک کی اندرونی پالیسی کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو، انھیں باہر سے مداخلت کرنے کا حیلہ نہیں بنایا جا سکتا اور نہ ان سے حکومت وقت کا تختہ الٹنے کا جواز پیدا ہوتا ہے۔ رومانیہ اور یوگوسلاویہ نے بھی یہی انداز نظر اپنایا ہے۔ کمبوڈیا پر ویٹ نام کے حملے کے نتیجے میں متعدد مغربی ممالک ویٹ نام کے لیے اپنے امدادی پروگرام پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، اور کچھ صورتوں میں تو امداد منسوخ یا کم بھی کی جا چکی ہے۔

ایک تبصرہ نگار سے

سکندر علی وجد

نادان، مجھے درکار نہیں داد کا صدقہ
کیا شعر مرا کاسۂ دریوزہ گری ہے؟

ہے شہرتِ ارزاں کی طلب بُلہوسوں کو
محتاجیِ عالم کا سبب بے ہُنری ہے

ہے حُسنِ عمل شعر، خردمند جُنوں کا
تخلیقِ سُخن جوہرِ الماس گری ہے

رنگین بہانہ ہے یہ نظم اور غزل کا
مقصودِ حقیقت کی فقط پردہ دری ہے

ہے آتشِ دل شعلۂ صہبائے سخن میں
خشکی مرے لب کی، مری آنکھوں کی تری ہے

واقف ہوں میں، ایک ایک ریاکارِ ادب سے
فتنوں سے خبردار مری بے خبری ہے

کیا تجھ کو دکھاؤں گُلِ صد رنگِ معانی
نایاب چمن میں صفتِ دیدہ دری ہے

میں کچھ نہیں سب کچھ ہے مرا حُسنِ تخیّل
اِس حُسن کا زیور مری آشفتہ سری ہے

تالیفِ حکایاتِ جُنوں میری عبادت
تنقیص ترا مشغلۂ خوش بشری ہے

کیا فرق ہے سرنے میں نیا ہو کہ پُرانا
اِس فرق پہ اصرار تری کم نظری ہے

تحقیق ہو، تنقید ہو، تقریر ہو، کچھ ہو
ہر حال میں مشکوک تری معتبری ہے

ملحوظ رہے، فکرِ فلک رس کا تقدّس
یہ رہگذرِ منزلِ پیغام بری ہے

افکار کی پُر نور فضاؤں کے سفر میں
خفّاش کو ناحق ہوسِ ہم سفری ہے

تاریک ضمیروں پہ اثر کر نہیں سکتا
اشعار میں جو سوزِ دُعائے سحری ہے

▲

نظم

بمل کرشن اشک

کوئی کسی سے جُدا نہیں ہے
وہ کون وہ ہیں کہ درمیاں جن کے سازِ موج ہوا نہیں ہے
وہ سازِ موجِ ہوا کہ جس کی صدا ستاروں کو ایسے رشتے میں گوندھتی ہے
جو رشتہ رنگوں، زمانوں، نسلوں کو ایک رشتے میں باندھتا ہے

جو میرا پہلے بدن سے رشتہ تھا پھول بن کے
وہ ٹہنی ٹہنی کھلا ہوا ہے
جو جسم قوسِ قزح کی صورت کمان بنتا تھا بازوؤں میں
جو ہر نظر میرے بدن کی بستی پہ نقشِ پا بن کے پھیلتے تھے
وہ کانپتا، ہانپتا، اُترتا نشیب صورت فراز بن کر،
وہ مجھ کو ہر جسم کے مکافاتِ اوّلیں سے
جُڑا ہوا دیکھتا ہے، میں منفرد نہیں ہوں۔

خیال پیدا نہیں ہے مجھ سے۔
نہ جانے کس سمت تھا سفر میں سو اک گھڑی کو
سرائے اندر ٹھہر گیا ہے،
شفق کھلے گی تو آنکھ ملنے لگا، اور مجھے بازوؤں میں بھر کے
مرے بدن کو جگا کے، میری ہوس کو چھو کے
سفر کرے گا تو مجھ کو اوروں سے باندھ دے گا۔

میں کتنا پھیلا ہوا ہوں مجھ کو خبر نہیں ہے
میں کب سے پھیلا ہوں مجھ کو خبر نہیں ہے
بس اتنا معلوم ہے مجھے کوئی شخص مجھ سے جُدا نہیں ہے
وہ کون ہے جس کے اور مرے بیچ سازِ موجِ ہوا نہیں ہے

دوہے

کرشن مراری

چُنری میری اُڑ گئی ، شوخ پون کے سنگ　　لمحہ لمحہ راگنی ، وقت وقت کا جوڑ
سکھیو لاؤ ڈھونڈ کر ، دھانی اُس کا رنگ　　ڈھلی شام کا واسطہ ، بستی کے کچھ موڑ

پلکوں پر جب آ گئے ، موتی کچھ انمول　　کومل کومل مدھری ، چتون پر مسکان
پلکوں پر ہی ساجنا ، پلکوں سے لے تول　　چنچل چنچل دلبری ، ساجن کی پہچان

پلکوں کی چلمن اُٹھا ، دیکھ ادھر اک بار　　دِل جن پر ہوتا رہا ، سو دِل سے قربان
نین مدرا سے سجن ، کردے اَب سرشار　　وقت پڑا تو بن گئے ، سارے ہی انجان

انگ انگ شہنائیاں ، باجیں ساری رات　　ناچوں تیرے آنگنا ، ساجن تیرے سنگ
انگ انگ سے ساجنا ، کرتا جائے بات　　بولے بھاشا مُوک سی ، میرا اِک اِک انگ

نین بکھیریں مستیاں ، اَدھروں پر مُسکان　　نالاں ناہیں تیرگی ، خنداں ناہیں نُور
چنچلتا کے روپ ہیں ، مادکتا وردان　　چہروں پہ بے چہرگی ، محفل کا دستُور

میٹھے میٹھے لگ رہے ، تیرے چنچل بول　　میرے دِلبر ساجنا ، تیرا رُوپ انُوپ
بیٹھ تو آکر دو گھڑی ، ساجن میرے "کول"　　لذت تیرے قُرب کی ، شیت کال کی دُھوپ

شبنم روئی آنکھ بھر ، اشکوں بھر اُدیان
موتی موتی تب سجی ، کلیوں پر مسکان

جب زوال مقدّر بنا

م۔ق۔خان

اس کی گگن سے بات کرتی چوٹی کی جانب لوگ دیکھتے
رٹھٹھک کر رہ جاتے۔ اس کی بناوٹ اہرام جیسی تھی۔
سی طرف سے کوئی راستہ اوپر کی جانب نہیں جاتا تھا
سے بڑے کوہ پیما اس کی ساخت دیکھ کر دنگ تھے۔
موڑے تھوڑے دنوں کے بعد لوگ اس کا ہر پہلو سے
عائنہ کرتے کہ شاید کوئی تبدیلی ایسی رونما ہوئی ہو کہ اوپر
انے کی صورت نکل سکے۔ کئی بار اس کی چٹان کے کیمیائی
جزیے کی کوشش کی گئی لیکن وہ پورا ایک بلاک تھا اور
ن کا کوئی جزو کل سے الگ کرنا ممکن نہ ہو سکا حقیقت
بھی کہ وہ کوئی معمولی پہاڑ نہ تھا۔

یہ مغرور پہاڑ شان سے سر اونچا کیے اپنے گرد و نواح
ہر شئے کی جانب حقارت آمیز نظریں ڈالتا اور اپنی یکتائی
پھولا نہ سماتا۔ زمانے کے تغیر و تبدّل اور آئینِ فطرت
سے یہ ناآشنا تھا۔ اس خود فریب کی دنیا اپنے تک ہی
محدود تھی۔

اس کی بناوٹ کو دیکھتے ہوئے لوگوں کا خیال
تھا کہ بارش کا پانی بھی وہاں ایک دم نہیں ٹھہر سکتا۔
بادلن کی گھنگھور گھٹائیں آئیں، اس کی چوٹی سے لے کر
دامن تک پھیل گئیں۔ پھر بارش ہوئی۔ پہاڑ شنکر
کی طرح بھبھوت ملے پہاڑ کو جس کا بھورا پتھر زندگی
سے محروم دکھائی دیتا تھا اپنی ننگی، تپتی پیٹھ پر پانی کی پھوار
اچھی لگی۔ پانی، نبض فطرت کا غمّاز! اس نے راہ و رسم بڑھائی
اور دھیرے دھیرے قدم جمانے لگا۔ برسات کے بعد
جاڑے کا موسم آیا اور پانی جم کر برف ہو گیا۔ گرمی آئی تو
برف پگھل کر پانی ہو گیا غرض پگھلنے اور جمنے کے عمل نے
کیمیاوی تغیر و تبدّل کی راہ ہموار کر دی۔

پہاڑ کو کچھ وقت کے بعد یہ احساس ہوا۔ یہ دخل
اندازی اسے سخت گراں گزری۔ اس نے اس اجنبی کو
اپنے سینے سے جھٹک دینا چاہا لیکن اپنی جسامت، بلندی
اور مضبوطی کے باوجود وہ پانی کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

پہاڑ کی اس بے عملی اور بے بسی نے پانی کو اور بھی
تقویت پہنچائی۔ کبھی سمٹ کر کبھی من مانے طور پر پھیل کر
نشیب میں اس نے اپنی جگہ بنالی۔ اب کبھی کبھی پہاڑ بھی
اس کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھتا۔ پانی آگے
بڑھتا تو پہاڑ محسوس کرتا کوئی اپنی باہیں پیار سے
اُس کی گردن میں حمائل کر رہا ہے۔ ہوا کے نرم جھونکوں
سے سطحِ آب پر لہریں اُٹھتیں تو وہ گدگدی سی محسوس
کرتا۔ ترنگیں کناروں سے بوس و کنار کرتیں اور پہاڑ عجیب
سی مسرت سے جھوم اُٹھتا۔ وہ اپنا عکس شفاف پانی میں
دیکھا کرتا اور اس کا سر فخر سے اور اونچا ہو جاتا۔ پانی اب

بقیہ صفحہ [illegible] پر

لاوہ

مہدی ٹونکی

سات سال کی عمر کتنی چھوٹی عمر ہوتی ہے! ۔ اور اس عمر میں جو اندوہناک حادثہ اُس نے دیکھا تھا وہ ذہن پر جم کر رہ گیا۔

اُس دن وہ دوپہر میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہا تھا۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ کھلیانوں میں تھے۔ اتنے میں اس کا باپ آگیا۔ وہ کھیل چھوڑ کر باپ کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوا۔ ماں رسوئی گھر کے فرش کو لیپ رہی تھی۔

"ڈال ـــــ لا گہنے دے"۔ باپ نے چھپر کے ایک ڈانڈے کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

باپ کی لڑکھڑاتی زبان سے وہ سمجھ گیا کہ باپ شراب پی کر آیا ہے۔

"کیا کہا؟" ماں نے تیور بدل کر کہا۔ گارے میں سنے ہاتھ رک گئے۔

"تیرے گہنے ـــــ"

"میرے گہنے اور اُس چھنال کے لیے؟" ماں تنک کر کھڑی ہو گئی۔

"جبان سنبھال ـــــ چھنال کے بول"۔

"نہیں تو تو کیا کرے گا؟"

"مجھے گہنے چاہئیں گہنے ـــــ" باپ جھوم کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"تجھے نہیں ملیں گے گہنے"۔

"کیسے نہیں ملیں گے گہنے؟" اُس نے ہاتھ نچایا "میں ـــ میں تالا توڑ کر لے جاؤں گا"۔ وہ تبارے کی طرف بڑھا۔

"اگر تو نے بکس کے ہاتھ لگایا تو اچھا نہیں ہوگا"۔ وہ پیچھے پیچھے چلی۔

رمیش پریشان ہو گیا۔ ماں باپ کو تبارے میں جاتے دیکھتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ باپ جب کبھی شراب پی کر آتا ہے اُس سے پیسے مانگتا ہے نہ ملنے پر اُسے پیٹتا ہے۔ دادا دادی چلا بک کر الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن ان پانچ چھ دنوں سے تو وہ ماں پر بہت ظلم کر رہا تھا۔ شراب پی کر آتا اور ماں سے گہنے مانگتا۔ ماں دینے سے انکار کرتی تو اُسے پیٹتا۔ گاؤں کی کئی عورتوں کی باتوں سے رمیش کو پتہ چلا تھا کہ باپ دوسرے گاؤں کی کسی عورت سے پریم کرتا ہے۔ اُسے بہت ساری چیزیں لا کر دیتا ہے۔ روپئے پیسے دیتا ہے۔ وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔ باپ روزانہ ہی ماں سے گہنے مانگتا۔ تکرار ہوتی۔ ماں پٹتی مگر گہنے نہ دیتی۔ لیکن آج تو وہ دوپہر کے وقت ہی آگیا۔ شاید اُسے یہ پتہ نہیں تھا کہ آج ماں اپنے ساس سسر کے ساتھ کھلیانوں میں نہیں گئی ہے۔

رمیش تھوڑی دیر تک آنگن میں کھڑا ماں باپ کی تکرار، گالی گلوچ سنتا رہا مگر جب باپ کے پیٹنے کی آواز اور ماں کی چیخ پکار سنائی دی تو وہ تبارے میں پہنچ گیا۔ دو تین ساتھی بھی اُس کے ساتھ داخل ہوئے۔ رمیش نے دیکھا ـــــ ماں صندوق سے لپٹی ہوئی ہے اور باپ اُسے مار رہا ہے۔ ماں کے صندوق نہ چھوڑنے پر باپ نے ماں کے بال دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر زور سے جھٹکے دیئے۔ ماں زور سے چیخی اور ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ باپ نے بال پکڑے پکڑے ہی اُسے گھسیٹ کر صندوق سے

رکیا اور پاس پڑی لاٹھی اُٹھاکر زور سے صندوق کے تالے پر
ی ـــ

"نہیں ـــ میں گہنے نہیں دوں گی" ماں تڑپ کر
ندوق کی طرف جھپٹی اور لاٹھی کو زور سے پکڑ لیا۔

"حرام جادی ـــ ہٹ جا ـــ ہٹ جا ـــ" باپ
ے لاٹھی کو چار پانچ جھٹکے دیے مگر ماں نے لاٹھی نہیں چھوڑی۔
پوری طاقت سے لاٹھی کو پکڑے صندوق پر جھونپ ہو گئی۔
ر باپ نے لاٹھی چھوڑ کر ماں پر لاتیں گھونسے برسانا شروع
دیا۔ اچانک ایک زوردار لات ماں کے تھوڑے سے پھولے
ٹ پر پڑی۔ رمیش نے ماں کی دردناک چیخ سنی اور وہ سہم
ر دیوار سے لگ گیا۔ ماں نے لاٹھی چھوڑ کر پیٹ پکڑ لیا اور
دہری ہو کر چیختی ہوئی فرش پر لیٹ گئی۔ باپ نے لاٹھی اُٹھاتے
ٹھاتے بھی دو تین لاتیں اُس کی پیٹھ پر جڑ دیں ساتھ ہی کئی گالیاں
ی دیں۔ ماں پیٹ پکڑے زور سے چیخنے لگی۔ باپ نے لاٹھی
ے تالا توڑا، زیورات نکالے اور صندوق کو کھلا ہی چھوڑ کر
دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بچے جو یہ جھگڑا دیکھ رہے
ھے اُسے آتا دیکھ کر ایک طرف کھسک گئے۔ لیکن رمیش سہما
وا دیوار سے لگا درد سے چھٹپٹاتی ماں کو دیکھتا رہا۔ وہ ماں
و ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

پھر اس نے پہلی بار جیتا جیتا خون دیکھا۔ اس کی
نکھیں پھٹ گئیں وہ اور سہم گیا۔ خوف سے آنکھیں پھاڑے
ہ ماں کی خون سے بھری ٹانگوں کو دیکھنے لگا۔ دل پگھل کر
یچے ہی نیچے جانے لگا۔ ٹانگوں کی پھریاں پھول کر ٹیڑھی ہونے
ہیں۔ ماں درد سے چھٹ پٹا رہی تھی گاڑھا گاڑھا سُرخ خون لہنگے
و تر کرتا ہوا دھیرے دھیرے فرش پر پھیل رہا تھا۔ ماں نے چھٹ
ٹاتے ہوئے کئی بار رمیش کو آواز دی مگر وہ ایک ٹک خون
و دیکھے جا رہا تھا۔ اُس کے دماغ کا اگلا حصہ بالکل ٹھنڈا تھا۔
ھر ماں کو اُس نے ساکت ہوتے ہوئے دیکھا۔ آنکھیں کھلی
وئی رہ گئیں۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ وہ سمجھ
نہیں پا رہا تھا کہ ایک دم کیا ہو گیا؟

"ہائے رام ـــ" کسی عورت کی چیخ سنائی دی۔ پھر
کئی عورتیں اس عورت کی چیخ کی طرف لپکیں لیکن پھر بھی وہ ایک
ٹک خون سے لتھڑی ماں کی ساکت ٹانگوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر
کسی نے اُسے پکڑ کر کھینچا۔

"رمیش! ـــ او رمیش! ـــ بیٹا رمیش!" کوئی
اُس کی گردن کو پکڑ کر ہلا ہلا کر دُلار رہا تھا اُس نے آنکھیں اوپر کیں۔ پڑوس
کی موسی، سوہن کی ماں کا چہرہ اُس پر جھکا ہوا تھا۔

"بیٹا رمیش ـــ بولو ـــ کیا بات ہے؟" غم سے
اٹکتی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ موسی کی آنکھوں میں اُسے
غم کا سمندر دکھائی دیا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ اُسے تو صرف ماں کی
خون سے لتھڑی ٹانگیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ موسی نے اُسے لپٹا کر بھینچ لیا۔

پھر اُس کے کانوں میں بہت سی عورتوں کے رونے کی آوازیں
آئیں۔ رمیش کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ ماں مر گئی۔
کیونکہ اُس نے کئی بار دیکھا تھا کہ جس گھر میں کوئی مرتا ہے تو
وہاں کی عورتیں اور پاس پڑوس کی عورتیں بہت زور زور سے
روتی ہیں۔ ایسی ہی آوازیں جیسی کہ اس وقت سنائی دے رہی
ہیں۔ وہ ماں کی صورت دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھا لیکن دوسرے
ہی لمحے ماں کی آدھی ننگی، خون سے لتھڑی ٹانگیں، چھٹ پٹاتا بدن
آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ اُس کا دل ریت کی طرح سے بکھرنے
لگا۔ ٹانگیں پھر پھولنے لگیں۔

سوہن کی ماں کے گھر وہ خاموش، ایک ہی جگہ بیٹھا رہا۔
سوہن کی ماں اُس کے پاس بار بار آئی اسے پچکارا، دلارا اُسے
بلوانے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ دادا، دادی
آئے اُسے لپٹا کر بہت روئے مگر وہ نہیں رویا۔ وہ ایک لفظ
بھی منہ سے نہیں نکال سکا۔ رات کو اُسے دادی ساتھ لے گئی۔

دن گزرتے گئے لیکن ہنستے کھیلتے رمیش کو اب چپ لگ گئی
تھی۔ کوئی بات کرتا تو مختصر الفاظ میں جواب دیتا۔ کوئی کام کہتا
تو کر دیتا لیکن چہرے پر خاموش سنجیدگی برقرار رہتی۔ تنہائی میں تو
وہ بالکل ہی خاموش، اداس رہتا۔ سامنے کی کسی بھی چیز پر آنکھیں
گڑائے وہ گھنٹوں بیٹھا یا لیٹا رہتا۔ اُس کے دماغ میں دم توڑتی
ماں کی لرزتی اور بہتے خون کا خوفناک منظر جم کر رہ گیا تھا۔ گھر کے
اور آس پاس کے لوگوں نے ہر طرح سے اُس کی خاموشی توڑنے

کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

وہ باپ کو دیکھ کر سہم جاتا۔ جہاں باپ ہوتا وہ اُس جگہ سے ہٹ جاتا مگر دُور، جاکر چھپ کر باپ کو دیکھتا اور اُس وقت اسے اپنی آنکھوں کے سامنے شراب میں دُھت باپ، ماں پر لاٹھی لاتیں برساتا نظر آتا۔ اس حادثہ سے پہلے وہ اپنے باپ سے بہت پیار کرتا تھا مگر اب وہ محبت نفرت میں بدل گئی تھی لیکن وہ باپ سے ڈرتا تھا۔ اب وہ باپ کو دیکھ کر محبت سے لپٹنے کے بجائے سہمی سہمی نظروں سے دیکھتا ہوا خاموشی سے دُور کھسک جاتا۔ باپ کو معلوم تھا کہ بیوی کے دم توڑتے وقت بیٹا موجود تھا اس لیے باپ رمیش کا بے انتہا خیال کرنے لگا لیکن اُس کی خاموشی نہیں گئی۔ باپ نے ہر طرح سے بیٹے کی محبت پانے کی کوشش کی مگر اُسے ناکامی ہوئی۔ باپ جتنا اُسے اپنے قریب رکھنے کی کوشش کرتا، بیٹا اُس سے اتنا ہی دور بھاگتا۔ باپ جتنی محبت سے بیٹے کا مُنہ تکتا بیٹا اُتنی ہی دل کی نفرت اور خوف سے باپ کو دیکھتا۔

یہی نہیں بلکہ وہ جوان خوبصورت بنی سنوری لڑکیوں اور عورتوں سے بھی نفرت کرنے لگا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اس کی ماں کی موت ایک جوان خوبصورت عورت کی وجہ سے ہوئی ہے جسے باپ چاہتا تھا۔ بسنتی ـــــ جو قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ رمیش نے اُسے ایک بار بڑے گاؤں کے میلے میں دیکھا تھا، ماں کے مرنے سے کچھ مہینے پہلے ہی۔

”یہ ہے بسنتی“ چاچی نے میلے کی بھیڑ میں ایک عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماں کو بتایا تھا۔

”کہاں ہے حرام جادی؟“ ماں چلتے چلتے ٹھٹھک کر کھڑی ہوگئی تھی۔ رمیش بھی رُک گیا تھا۔

”وہ گوری چٹی ـــــ کاجل والی جس نے ماتھے پر چھلّے بنا رکھے ہیں جو ہنسے ہی جارہی ہے“ چاچی نے بتایا۔

تو یہ ہے چھنال!“ ماں نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ماں نے کس کو گالی دی؟ ماں جس طرف غور سے دیکھ رہی تھی رمیش نے اُدھر ہی دیکھا۔ ایک خوبصورت عورت مست چال سے چلتے ہوئے، دوسری عورتوں کے ساتھ ہنستی ہوئی بل کھاتی ہوئی جارہی تھی۔ وہ پاس سے گزر گئی۔ ماں دیر تک کھڑی اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ رمیش کو تو وہ اچھی معلوم ہوئی۔ اُس نے سوچا ماں اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے؟ نام سُنتے ہی گالیاں کیوں دیتی ہے؟ رمیش کی سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب بسنتی کی وجہ سے ماں کو پیٹا جانے لگا تو رمیش اُس سے نفرت کرنے لگا۔ اور جب بسنتی کے پیچھے ماں کو ختم کر دیا گیا تو وہ بسنتی سے ہی نہیں ہر خوبصورت بنی سنوری عورت سے نفرت کرنے لگا۔ اُسے ہر خوبصورت لڑکی بسنتی نظر آتی ـــــ ماں کی قاتل!

پندرھویں سال میں اُس کی شادی کردی گئی۔ دو دن کے لیے اُس کی بیوی آئی بھی اور چلی بھی گئی مگر رمیش کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ گٹھری سی بنی آئی اور گٹھری سی بنی چلی گئی۔ رمیش نے اس کی صورت تک نہیں دیکھی۔

دو سال اور بیتے۔

پھر ایک دن باپ کی طبیعت خراب ہوگئی اُسے موتی جھرا نکل آیا۔ بیٹے نے دن رات خدمت کی لیکن خاموشی اور نفرت برقرار رہی۔ کھیت کا گھر کا سارا کام سنبھالا رہا۔ باپ موتی جھرے سے نکلا تو بدن کے درد میں مبتلا ہوگیا اب تو سارا کام ہی رمیش کو سنبھالنا پڑا۔ جہاں محنت مشقت نے بیٹے کے جسم میں توانائی بھردی، خوبصورتی ملا دہاں بیماری نے باپ کے جسم کو کمزور بنادیا، پگھلا دیا۔ دھیرے دھیرے یہ درد گٹھیا کے مرض میں تبدیل ہوگیا۔ گھر گرہستی سنبھالنے کے لیے بوڑھے دادا، دادی کو رمیش کی بیوی لانا پڑا۔

جب رمیش کوٹھے میں داخل ہوا تو مرکنی دیواروں میں آئینے کے ٹکڑے میں اپنی صورت دیکھ رہی تھی آہٹ سُن کر پلٹ کر دیکھا۔ رمیش پر نظر پڑتے ہی بیچ ہوتی کو سکڑ گئی۔ مرکنی کے چہرے پر نظر پڑتے ہی رمیش کا دل رُک سا گیا۔ خوبصورت، دلکش چہرہ۔ کاجل کی تحریر بندھی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ اس کی نظروں میں

اور خوبصورت چہرہ گھوم گیا، جسے بچپن میں دیکھا تھا اور نظر پڑتے ہی من کو بھا گیا تھا ــــــ بسنتی کا چہرہ! ماں کے ساتھ بڑے گاؤں کے میلے میں اُسے دیکھا تھا۔ بسنتی کا چہرہ نظر آتے ہی اُسے اپنی مظلوم ماں یاد آگئی۔ تڑپتی، دم توڑتی ماں نظروں میں گھوم گئی۔ اور پھر اس منظر نے رمیش کے دماغ کو جکڑ لیا۔ اُس کے دل میں رُکمنی کے لیے چاہت کے بجائے نفرت اُبھر آئی ــــ

اور پھر یہ رات بہت لمبی ہو گئی۔ دونوں ہی الگ الگ بیٹھے انتظار کرتے رہے کہ اب صبح ہونے میں کتنی دیر اور ہے!

تہوار آئے اور چلے گئے لیکن رمیش کے دل میں کوئی ارمان پیدا نہ کر سکے۔ رُکمنی گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ رمیش جب گھر آتا تو دُور رہ کر ہی گھونگھٹ میں سے اُسے دیکھا کرتی۔ اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ رمیش بچپن میں بہت نٹ کھٹ تھا لیکن جب اُس کی ماں کی موت اُس کے سامنے ہوئی تو ایسی دہشت بیٹھی کہ ہنسنا کھیلنا، بولنا سب بھول سا گیا۔ رُکمنی اب اس انتظار میں تھی کہ کب رمیش کے دل کا غبار چھٹے اور وہ اُس سے بات کرے۔

اسی عرصہ میں دادا بیمار پڑا اور چل بسا۔ باپ گٹھیا کے روگ میں ایسا مبتلا تھا کہ دس قدم چلنا بھی بعض اوقات دوبھر ہو جاتا۔ دادا کی ہڈیوں کو گنگا میں بہانے کے لیے رمیش کو باپ کے ساتھ جانا پڑا۔ اُس کے ذہن پر اور بوجھ بڑھ گیا۔

رمیش کو خود پتہ نہیں تھا کہ وہ باپ کی خدمت کس جذبہ کے تحت کرتا ہے۔ اُس نے باپ کو دوا پلانے سے سہارا دے کر اُٹھانے یا دوسرے کسی کام سے کبھی مُنہ نہیں موڑا۔ اس کے باوجود وہ باپ سے دل میں نفرت کرتا تھا۔ جب وہ باپ کے ہاتھ پیروں کی مالش کرتا تو باپ کے ہاتھوں کو دیکھ کر سوچتا کہ یہ وہی ہاتھ ہیں جنھوں نے میری ماں کو کئی بار پیٹا تھا۔ مرتے وقت لاٹھیاں برسائیں تھیں۔ ٹانگوں کو دیکھ کر سوچتا کہ یہ وہی پاؤں ہیں جنھوں نے میری تڑپتی ماں کو لاتیں مار مار کر ختم کیا تھا پیٹ میں پل رہے بچے کو ختم کیا تھا اُس کے سامنے خون ہی خون پھیل جاتا جس پر ماں کی ننگی ٹانگیں لرزتی نظر آتیں۔ اس کا دماغ نفرت سے بھرنے لگتا۔ مگر پھر بھی وہ باپ کی خدمت خاموشی سے کرتا رہتا۔ اور اب ایسے باپ کے ساتھ اُسے تیرتھ یاترا کرنا تھی۔

استھیاں وسرجن کے لیے گاؤں سے پرستھان ہوا۔ کلش میں دادا کی ہڈیوں کی بھسمی تھی۔ سب سے پہلے وہ بنارس گئے گنگا کی دھارا میں استھیاں پروا ہت کیں۔ برہمنوں کو جیمایا۔ کئی مندروں میں جا کر درشن کیے۔ ہر جگہ وہ باپ کو سہارا دے کر دھیرے دھیرے لے گیا۔ لیکن باپ کی ہر وقت کی موجودگی اُسے ایسے کھلنے لگی جیسے باپ کا جسم اُس سے جڑا جا رہا ہو اور اُس کا جسم اُسے ہٹانے کے لیے بے چین ہو رہا ہو۔

بنارس سے دوسرے تیرتھوں اور گھاٹوں پر ہوتے ہوئے وہ رشی کیش پہنچے۔

شام کے وقت گھاٹ پر گنگا کے ٹھنڈے اور تیز بہتے پانی میں کمزور باپ نے زنجیر پکڑ کر دو بار ڈبکیاں لیں۔ بیٹا سہارا دیئے رہا۔ نہا کر وہ دوسرے کنارے پر پہاڑی پر بنے مندروں میں درشن کے لیے روانہ ہوئے۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ رمیش باپ کو سہارا دیے چڑھائی پر دھیرے دھیرے لے جا رہا تھا۔ لکشمن جھولے تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا شروع ہو گیا۔ مندروں میں جھالر بجنا شروع ہو گئی۔ اس وقت جھولے پر آمد و رفت بالکل نہیں تھی۔ باپ بائیں ہاتھ سے لکشمن جھولے کے تاروں سے بنے بارڈر کا سہارا لیتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی تھی جس کی کھٹ کھٹ سنسان ماحول میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی میں نہانے کی وجہ سے باپ کو کپکپی لگ رہی تھی۔ لرزتے ہونٹوں سے وہ شلوک پڑھ رہا تھا۔ رمیش باپ کا دائیں بازو ہولے سے پکڑے دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔

جھولے کے بائیں طرف گہری گھاٹی تھی جس کے بیچ میں سے گنگا نکل کر تیزی سے بہتی ہوئی جھولے کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ گہرے سناٹے اور شور نے پن نے اچانک رمیش کے دل میں اتھل پتھل پیدا کر دی۔ باپ شلوک پڑھ رہا تھا لیکن رمیش کے دماغ میں یہ شلوک ڈنک کی طرح لگ رہے تھے۔ باپ کے قرب نے شور نے پن نے، دماغ میں برسوں سے منجمد ماں کے مرنے کا منظر پگھلانا شروع کر دیا۔ اس کے دماغ میں کبھی ماں باپ کے جھگڑے کی آخری گفتگو گونجتی تو کبھی باپ کے شلوک گونجتے۔ رمیش کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

باپ لکشمن جھولے کے بارڈر کا سہارا لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ لرزتے ہونٹوں سے شلوک نکل رہے تھے

"آدم بھو بھو دِہ سو تہہ تسیہ وِ تُو دَر رٹم بھر گو دے دتے...

"لا ـــ لا ـ گھنے دے ـــ" شراب میں جھومتا باپ نظر آتا ہے۔

"دِھیم ہی دِھی یو یو نہ پر چو دیا تِہ!" باپ کے شلوک پڑھنے کی آواز۔

"کیا کہا ـــ" ماں کی آواز سنائی دیتی ہے۔

گارے میں سنے ہاتھ دکھائی دیتے ہیں۔

ماں پھر صندوق سے آلپٹتی ہے۔ باپ اس کے بال دونوں مٹھیوں میں کھینچ کر زور سے جھٹکے دے رہا ہے۔

"شنکر تسولی وہاری ٹریں دِ ملے تم مَتی راستام گو پکڑ کیلے!"

ماں چیختی ہوئی سر کو تھام لیتی ہے۔ باپ اسے بالوں سے پکڑے صندوق سے الگ کر دیتا ہے۔

"تو چل مُسلم تین نپی تم پَرَم پدم کھلو تین گر ہی تم ...."

باپ اچانک ماں کے تھوڑے سے پھولے پیٹ پر زور سے لات مارتا ہے۔ ماں کی دردناک چیخ!

"ماتر گنگے تری لو بھکتے ......"

ماں پیٹ پکڑے اوندھی لیٹ جاتی ہے اور لمبی لمبی چیخوں کے ساتھ چھٹ پٹاتی ہے۔

ماں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے خون چاروں طرف بہہ نکلا ہے۔ رمیش کی مٹھیاں کھنچ جاتی ہیں۔

"پرنٹر مَتی یتسوام ناپِتا تِی شُو کیے!"

خون چاروں طرف اور پھیل گیا ہے۔ ماں رمیش کو بار بار آواز دے رہی ہے۔

اچانک گرم گرم سنسناہٹ سے رمیش کا پورا دل و دماغ بھر گیا۔ جبڑے کھنچ گئے۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ برسوں سے دبا نفرت کا لاوا اچانک ابل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے باپ کی ٹانگیں بازوؤں میں جکڑیں اور اوپر اٹھا کر تیزی سے باپ کو ندی کی طرف الٹ دیا۔

"ہے ـــ!" باپ کے دل سے ایک کربناک آواز نکلی۔

"شڑاپ" ـــ باپ گنگا کے تیز بہتے پانی میں جا گرا۔ اُس کے جسم سے الگ ہوئی چادر ہوا میں لہرائی اور پانی میں جا گری۔

رمیش نے اپنا سر جھولے کے بارڈر پر رکھ دیا۔ پورے جسم کی سنسناہٹ دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ اُس کے دل و دماغ کو ایسا ہی سکون ملا جیسے دکھتے پکتے پھوڑے کو صاف کر کے زخم پر ٹھنڈا پھایہ رکھنے پر سکون ملتا ہے راحت ملتی ہے۔

چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مندروں میں جھالر اب بھی بج رہی تھی۔ ▲▲

الفریڈ ہچکوک سے (بقیہ صہ ۳۶)

اِسی بات نے اُس کے اندر شرمندگی اور کمتری کا احساس پیدا کیا اور وہ دوستوں سے دور ہوتا چلا گیا۔

ہچکوک کا دعویٰ ہے کہ اُس کی فلموں میں سنسنی خیز اور بھیانک مناظر کی بہتات کے باوجود کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شر خیر پر حاوی ہے یا خباثت شرافت پر چڑھی بیٹھی ہے۔ اُس کے خیال میں سب سے زیادہ سنجیدہ لمحہ وہ ہوتا ہے جب اُس کا کردار کہتا ہے ـــ "میرے مالک! میں نے ماں کو قتل کر دیا" ـــ مالک پوچھتا ہے ـــ

غزلیں

بشیر بدر

یہاں سورج ہنسیں گے آنسوؤں کو کون دیکھے گا
چمکتی دھوپ ہوگی جگنوؤں کو کون دیکھے گا

پھلوں کی باغبانی میں تو بارش کی دعا ہوگی
گزرتے خوبصورت بادلوں کو کون دیکھے گا

اگر ہم ساحلوں پر ڈور کا نٹے لے کے بیٹھیں گے
تو موجوں میں چمکتی تتلیوں کو کون دیکھے گا

یہ سردی واقعی لیکن گھنے کہرے کی بورش میں
پہاڑوں سے اُترتی ان ابسوں کو کون دیکھے گا

بہت اچھا سا کوئی سوٹ پہنو تنگدستی میں
اجالے میں چھپی اُن بدلیوں کو کون دیکھے گا

ابھی اپنے اشارے پر ہمیں چلنا نہیں آیا
سڑک کی لال پیلی بتیوں کو کون دیکھے گا

▲▲

خاک جب خاکسار لگتی ہے
کس قدر باوقار لگتی ہے

صبر کر صبر کرنے والوں کی
بے بسی شاندار لگتی ہے

خون پانی بنا کے پیتی ہے
دھوپ سرمایہ دار لگتی ہے

اب بجھا دو ہماری آنکھیں بھی
روشنی ناگوار لگتی ہے

صرف اخبار پڑھنے والوں کو
زندگی اشتہار لگتی ہے

گرم موسم میں گرم چائے بھی
بدمزاجوں کا پیار لگتی ہے

▲▲

محسن زیدی

دامن پہ داغ خون کا اشکوں سے دھوئیں گے
جب قتل کر چکیں گے بہت ہم کو روئیں گے
آئینے مسخ اور کریں گے نقوش کو
چہرے چمک کے اپنا بھرم اور کھوئیں گے
کاٹیں گے پہلے فصل، پرانے دکھوں کی ہم
پھر آنسوؤں کی ایک نئی قسم بوئیں گے
برسوں کے ساتھ کو بھی گنوا دیں گے راہ میں
اپنی تلاش میں ابھی کیا کیا نہ کھوئیں گے
خاک سیاہ بخت سے رکھیں بھی کیا امید
کانٹے ہی ہاتھ آئیں گے جب پھول بوئیں گے
چھینٹے بدن پہ ڈال کے اُڑ جائیں گے مگر
بادل برس کے دل کی کثافت نہ دھوئیں گے
پانی سے واقعات شہادت لکھیں گے کیا
جب تک قلم نہ لوگ لہو میں ڈبوئیں گے
غافل نہیں ہیں صبح کے امکانِ قتل سے
دھوکے میں آ کے جاگنے والے نہ سوئیں گے
محسن کبھی کا ٹوٹ چکا رشتۂ اُمید
کس تار میں اب آس کے موتی پروئیں گے

▲▲

قطعات و غزل

عروج زیدی

جذبۂ رحم ہر اک دل میں کہاں ہوتا ہے؟
سیکڑوں ہیں یہاں ہنسنے کو ستانے کے لیے
اوس روتی رہی انجام سے بچنے کو مگر
دھوپ بڑھتی رہی شبنم کو مٹانے کے لیے

اہلِ دُنیا جس کو کہتے ہیں سمندر اے عروج!
بے کراں وسعت میں اک آبی ذخیرہ کا ہے نام
وہ نہ پیاسا ہے نہ اُس پر سایۂ حرص و ہوس
پھر بھی خدمت میں لگے رہتے ہیں دریا صبح و شام

خلوص و مہر و محبت ہے عظمتِ کردار
بشر کو پیکرِ آشنا کہیے
ہوس ہے دامنِ انسانیت کو داغِ سیاہ
بری نظر کو بُرے دل کا آئنا کہیے

اپنی اس سادگیٔ دل پہ ہنسی آتی ہے
زہر امرت سے بدلنے کی توقع ہے مجھے
جو منافق ہے اُسے دوست کا درجہ دے کر
سانپ سے شہد اُگلنے کی توقع ہے مجھے

ہر شعر کے لفظوں کی دھنک یاد کرے گی
کردار کی تابندہ جھلک یاد کرے گی
فانی ہوں مگر ایسے نشاں چھوڑ رہا ہوں
ہر چیز مجھے زیرِ فلک یاد کرے گی

وہ محفلِ سخن نہیں، بزمِ نشاط تھی
اُس میں غزل کی نشو و نما کون دیکھتا
جادو جگا رہی تھی وہاں نغمگی عروج
حُسن و کمالِ فکرِ رسا کون دیکھتا

▲▲

ڈاکٹر نذر لیثی

تہذیبِ شہر گاؤں سے ہو کر نکل گئی
چہرے پہ آئینوں کے مگر دھول مل گئی

اب میں ہوں اور سکوتِ شبِ انتظار ہے
اک شمعِ غم گسار تھی، وہ بھی پگھل گئی

کیا اجنبی تھا عکس ان آنکھوں کی جھیل کا
آئینہ کیا عجیب تھا صورت بدل گئی

کیا خوب مختصر تھی شبِ انتظار بھی
وعدہ بنی، امید بنی، اور ڈھل گئی

کیسی عجیب بھیڑ تھی اس شہر کی نذر لیثی
جس پر نظر پڑی وہی چہرہ بدل گئی

▲▲

ٹرین کا ڈبہ

آنند لہر

ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ پھر اچانک کھڑی ہو گئی۔ مسافروں کو دھکا لگا۔ کچھ ڈر گئے۔

زندگی میں جب بھی کوئی کام اچانک ہوتا ہے تو دھکا ضرور لگتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس شخص نے ٹرین کی زنجیر کھینچ کر سنسنی پیدا کر دی ہے۔ حالانکہ اس کی جیب خالی ہے اس لیے اسے کسی چور کا ڈر نہیں اور نہ ہی وہ کسی شخص کو چور سمجھ سکتا ہے۔ کیونکہ آدمی دوسروں پر چور ہونے کا شک تب کرتا ہے جب اس کی اپنی جیب میں کچھ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرین کے اس ڈبے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ ایک دوسرے کو چور سمجھ رہے ہیں۔ اور ساس بابو کی بیوی باقی تمام عورتوں سے حد سے زیادہ خوبصورت ہے اور اسی وجہ سے وہ بابو ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے لوگوں کا کچھ چھینا ہے اور ریوڑ اس کے پیچھے بھاگ رہی ہے یہ بھیڑ اس سے کتنی دور ہے اس بات کو جاننے کے لیے اسے بار بار پیچھے دیکھنا پڑتا ہے۔

اور سیٹھ تمام مسافروں کو چور اور اپنے آپ کو سب سے شریف آدمی سمجھ رہا ہے۔ اسے شک ہے کہ تمام لوگ اس ڈبے میں اس لیے سفر کر رہے ہیں کیونکہ وہ اس سے روپیوں سے بھرا ہوا بیگ چھیننا چاہتے ہیں۔ اس بات کا شک اس کے دل میں اس وقت پیدا ہوا جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس دولت پر صرف اس کا ہی حق نہیں۔

اس ڈبے میں ایک جگہ لکھا ہے "شراب پینا منع ہے" اسی بات کو پڑھ کر مسافروں کو یاد آتا ہے "شراب پینے کی چیز ہے" اور وہ شراب پیتے ہیں۔

سامنے بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکی کے چہرے پر جو تل ہے وہ جیوتشی کے مطابق اس کی قسمت کی نشانی ہے مگر وہ لڑکی جو بیوہ ہے اور لیڈی ڈاکٹر ہے۔ جیوتشی کے مطابق اس حد تک تو خوش قسمت ہے کہ لیڈی ڈاکٹر ہے مگر لڑکی کے مطابق وہ بدقسمت ہے کیونکہ وہ بیوہ نہ ہوتی تو اسے نوکری نہ کرنا پڑتی۔ عجیب تضاد ہے۔ زندگی دراصل تضاد کا ہی نتیجہ ہے اور ٹرین کی رفتار بھی۔

ٹرین جب چلتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ٹرین چل نہیں رہی بلکہ ڈبے آپس میں لڑ رہے ہیں اور ڈبوں کی لڑائی سے تنگ آ کر انجن بھاگ رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح زندگی بھاگتی ہے جب دن۔ مہینے۔ برس۔ آپس میں لڑتے ہیں موسموں کی آپس میں نہ ختم ہونے والی جنگ ہوتی ہے۔ تبھی پرانے پتے گرتے ہیں اور نئے پتے جنم لیتے ہیں۔ کبھی کبھی لگتا ہے۔ زندگی موسموں کی جنگ کا ہی نتیجہ ہے۔

ریل کے اس ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہر شخص کو معلوم ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔ لیکن وہ سادھو منزل کی تلاش میں بغیر کسی وجہ کے سفر کر رہا ہے، وہ ٹرین میں بیٹھنے کے لیے بیٹھا ہے اور ٹرین چلنے کے لیے چل رہی ہے۔ اس کا ٹرین کے چلنے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لیکن باقی تمام لوگوں کا ٹرین کی رفتار کے ساتھ ایک باقاعدہ تعلق ہے جوں جوں ٹرین آگے جا رہی ہے ان کی منزل قریب آ رہی ہے۔ ان تمام

لوگوں کے دلوں میں ایک آس ہے ایک جذبہ ہے۔ وہ جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں پہنچیں یا نہ پہنچیں لیکن اس جذبے نے ان کا سفر ضرور دلچسپ بنا دیا ہے۔ ٹرین میں سفر کرتے وقت . . . انھوں نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی ہے۔ کیونکہ ٹرین کو حادثہ بھی پیش آسکتا ہے اور اس حادثے کا اثر تمام لوگوں کے علاوہ اس سادھو پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ سفر بامقصد ہونا چاہیے۔ ٹرین زور زور سے کہتی ہے "چلتے رہو۔ چلتے ہی جاؤ"۔

لیکن اس شخص نے نہ جانے کیوں زنجیر کھینچ کر ٹرین کو کھڑا کر دیا۔ ٹرین کے رکتے ہی ہر شخص نے ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھا حالانکہ کسی کا کچھ بھی گم نہیں ہوا ہے حادثے نہ جانے کیوں لوگوں کو شکی بنا دیتے ہیں۔ زمین پر چونکہ ہر روز نئے نئے حادثے ہوتے ہیں اس لیے ہم سب لوگ شکی ہو گئے ہیں۔

اتنے میں گارڈ اندر آیا اس نے زور سے کہا "تم جانتے ہو چلتی ٹرین کو کھڑا کرنا سنگین جرم ہے۔ پھر تم میں سے کس نے یہ جرأت کی؟" وہ شخص بڑی حلیمی سے بولا "کیا میں اپنے جرم کا اقبال کر سکتا ہوں؟" "کیوں نہیں؟" گارڈ نے جواب دیا۔

"دراصل میرا دل چاہا کہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی کے جسم کے ابھاروں، پیچھے بیٹھی ہوئی عورت کے چہرے اور درمیان بیٹھی ہوئی عورت کے بدن کو لے کر ایک خوبصورت بدن تیار کر دوں اور سیٹھ کے بیگ کو چرا کر ایک ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں وقت کے لمحے عمر کو اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں اور ہم صرف کنارے پر کھڑے ہو کر وقت کے دریا کو بہتے ہوئے دیکھیں۔ ایسا ممکن نہیں ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ ٹرین کے اس ڈبے کو باقی ٹرین سے الگ کر کے رفتار سمیت چرا کر بھاگ جاؤں، دراصل میں نے ٹرین کو نہیں بلکہ اس ڈبے کو کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی میں نہیں جانتا تھا کہ ٹرین کے ہر ڈبے کا سیدھا تعلق انجن سے ہے اور ڈرائیور کا اس پر مکمل کنٹرول ہے چاہے ڈبہ انجن سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو"۔

▲▲

جدید شاعری میں اظہار و بیان کا پہلو ۔ چند خیالات

ابوذر عثمانی

شاعری میں اظہار و بیان کے الفاظ مخصوص مفہوم
کے حامل ہیں جن سے شعری تخلیق کے عمل کے بعض اہم اور
یادی پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے ۔ یہاں اظہار و بیان
سے مراد دراصل شعری زبان اور محاورے کی وہ کارفرمائیاں
ہیں جن سے شاعر کے تجربات کی نئی تخلیق اور ترکیب عمل
میں آتی ہے ۔ شاعر کا کام کسی خیال کا تجریدی اظہار نہیں
ہے بلکہ اسے محسوس اور معنی خیز شکل عطا کرنا ہے ۔ شاعر
یہ کام امیجز اور استعارے سے لیتا ہے جس سے لسانی اظہار
کے نئے پیرایے جنم لیتے ہیں اور زبان نئے سانچوں میں
ڈھلتی ہے اور فطری طور پر زندگی کو نئے مفہوم اور معنی
مل جاتے ہیں ۔ ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ نے شاید اسی حقیقت کے
پیش نظر یہ کہا تھا کہ اگر کسی معاشرے سے شاعر اور ادیب
ناپید ہو جائیں تو وہ معاشرہ یقیناً بانجھ ہو جائے گا اور اس کا
تہذیبی و ثقافتی ارتقاء رک جائے گا ۔ شاعر چونکہ اپنے مشاہدات
و تجربات کا روپ دے کر ہمیں ایک نئی کیفیت اور تجربے
سے دوچار کرتا ہے اس لیے اس کے ذریعے ہمیں نئی آگہی
اور بصیرت حاصل ہوتی ہے ۔ گویا شاعر کا کام نیا مفہوم
دینا اور ہمارے ذہن اور مزاج کو نئے رخ کی طرف موڑنا
ہے جس کے ذریعہ اہم تہذیبی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے

یہ چیز اولاً شاعر کے تجربوں کے انفرادی اظہار کے ذریعے
عمل میں آتی ہے مگر رفتہ رفتہ کسی دور کا عمومی شعری
مزاج اور ادبی رجحان بن جاتی ہے اور اس طرح انسانی
زندگی اور اقدار کی نئی توجیہہ شروع ہوتی اور ایک نئے
ذہن اور مزاج کی نمائندگی ہونے لگتی ہے ۔ اسی کو
عصری حسیت کا نام دیا جاتا ہے اور ادبی اقدار کے نئے
شعور، پہچان اور پرکھ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ غور سے
دیکھا جائے تو اسی بنیاد پر کسی عہد کے ادبی و شعری مزاج
کا تعین ہوتا ہے اور ادب میں عصری حسیت کی جستجو
اور دریافت ایک اہم اور بامعنی عمل بن جاتی ہے ۔ ظاہر
ہے کہ یہ صورت شعری زبان و اظہار کے مخصوص وسائل
ہی کے ذریعہ بروئے کار آتی ہے جس میں نئے نئے
گوشوں کا پیدا ہونا، ترمیم اور تغیر کے ایک نہ ختم ہونے
والے سلسلے کا جاری رہنا اور اس کے نتیجے میں نئے نئے
رجحانات اور اسالیب کا وجود میں آنا ایک ناگزیر
عمل بن جاتا ہے ۔

جدید شاعری میں اظہار و بیان کے مسائل پر غور
کرتے ہوئے ہمیں اس اساسی حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے ۔
اس مرحلے پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جدید شاعری سے

ہماری مراد کیا ہے اور وہ کون سے شاعر ہیں جو جدید شاعری کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بہ ظاہر آج کی پوری شاعری ہی پر جدید شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر اس شاعری کو ایک علیحدہ اور جداگانہ میلان کی حیثیت سے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے کچھ مخصوص شعراء اور ان کے کلام کی مدد سے سمجھا جائے۔ بہرکیف اس وقت جدید شاعری سے میری مراد وہ شاعری ہے جس کی شروعات ۵۰ء کے آس پاس بتائی جاتی ہے اور جو ۶۰ء کے بعد پوری طرح ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ شاعری اپنے امتیازی خط و خال سے پہچانی جانے لگی ہے اور کئی اعتبار سے اپنی پیش رو شاعری سے بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔ اس کے موضوعات، اسالیب اور تخلیقی محرکات سب کچھ بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں یہ ضروری ہے کہ اس مطالعے میں اس کے فنی اظہار کی شکلوں اور سانچوں کو خاص طور پر سامنے رکھا جائے جنھیں جدید شعراء نے اپنے خیالات اور محسوسات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔

۱ جدید شاعری کا بنیادی رجحان علامت نگاری کی طرف ہے۔ یہ چیز بہ ظاہر شاعری اور ادب کے حقیقی منصب کی دریافت کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے جس میں الفاظ کے مفہوم میں تبدیلی پیدا کر کے انسانی ذہن اور احساس میں نئی جوت جگائی جاتی ہے اور شاعر کا وہ داخلی شعور سامنے آتا ہے جس میں حقائق کے نئے پہلوؤں کا ادراک شامل ہوتا ہے اور جس سے انسانی زندگی کی معنی خیز ترجمانی عمل میں آتی ہے۔ جدید شاعر الفاظ و اشیاء کے درمیان کسی تمیز کا قائل نہیں۔ وہ حقیقت کو موجود فی الخارج تصور کرنے کے بجائے اس کے باطنی ادراک کو ہی اصل حقیقت مانتا ہے۔ اس طرح جب وہ اپنے تجربات کو فن کا روپ دیتا ہے تو اس میں الفاظ و معنی کے درمیان کوئی فصل باقی نہیں رہتا اور اس کے تجربوں کو ایک ایسا سالم پیکر مل جاتا ہے جس کا فنی تجزیہ اور تحلیل آسان نہیں ہوتا۔ وہ علامتوں کو جہل کہ حیات کی متبادل شکل کے طور پر پیش کرتا ہے جس میں منطقی تنظیم اور ترتیب پیدا کرنا محال ہے اس لیے بالعموم اس کے یہاں ایک ابہام، ماورائی دھندلکا اور خواب ناک کیفیت نمایاں رہتی ہے، پھر وہ اپنی ذات اور شخصیت کے جن مخفی گوشوں، جن نجی اور ذاتی کوائف جن نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی پیچیدگیوں کو پیش کرتا ہے اُن کے لیے علامتی پیرائے سے زیادہ کوئی دوسرا پیرایہ مناسب نہیں ہو سکتا۔ دراصل اسی طریقے سے وہ داخلی تجربات کا بلیغ اور پر معنی اظہار کر سکتا ہے اور الفاظ اور اُن کے تلازمات سے کام لے کر شعری اظہار کے عمل کو بھرپور معنویت عطا کر سکتا ہے، پھر اس کے ذریعے وہ جمالیاتی فاصلہ بھی برقرار رکھتا ہے جو شعری اور ادبی اظہار کو ایک جداگانہ اور ممتاز حیثیت عطا کرتا اور اسے بلندی، وسعت اور گہرائی کا حامل بناتا ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جدید شاعر عقائد کی جس شکست و ریخت سے دوچار ہے اور اسے ادراک حقائق کے جن سرچشموں کی طرف رجوع کرنا پڑ رہا ہے انھوں نے اسے علامتی پیرایہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس پیرائے میں اس کے نجی احساسات، ذاتی درد و کرب اور داخلیت اور دروں بینی کے میلانات کے اظہار کی پوری گنجائش ہے یہ بات تعجب خیز نہیں کہ جدید شاعری کے علائم بھی بیشتر ذاتی اور نجی ہیں اور اسی لیے ان کے مفاہیم کی گہرائی تک پہنچنا بھی آسان نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کی شاعری میں ابہام کا پایا جانا ناگزیر ہے ویسے یہ ابہام اس لیے بھی پیدا ہوتا ہے کہ بسا اوقات شاعر کے تجربے، شعری تجربے نہیں بن پاتے۔ مثلاً ملارمے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شاعری میں جو ابہام ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کے تجربے شعری تجربے نہیں بن سکے ہیں اور اس کی علامتیں جذبے کے فطری اظہار کا روپ اختیار نہیں کر سکی ہیں اردو کے بعض جدید شعراء کے یہاں بھی یہ سقم نمایاں ہے ان کے یہاں تجربات کے اظہار میں ایک قسم کا دھندلا پن ملتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی علامتیں ذہنی تجریدی سطح پر استعمال ہوئی ہیں اور انھیں جذبے کے

فطری اظہار کا روپ نہیں مل سکا ہے۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں جا سکتا کہ اُن کی شعری کاوشوں سے اُردو شاعری کو نئے امیجز، نئے استعارے اور نئی علامتیں ملی ہیں۔ جن کے ذریعے ایک طرف تو جدید حسیت کا اظہار کیا جا رہا ہے دوسری طرف اظہارِ خیال کے پیرائے میں وسعت اور کشادگی پیدا ہو رہی ہے اور اُردو شاعری نئے آہنگ اور نئے لب و لہجے سے آشنا ہو رہی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو جدید شاعری اپنی پیش رو اردو شاعری سے یقیناً مختلف ہو گئی ہے۔ یہ اختلاف اور فرق کئی شکلوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے جن کی تفصیل پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔ جدید شاعری میں بالخصوص داخلی تجربات کی ترجمانی، نجی علامتوں کا استعمال اور بالواسطہ طرزِ اظہار اسے پچھلی شاعری سے مختلف کر دیتا ہے۔ اس نوع کی شاعری کے اولیں تجربے ہمارے یہاں میراجی، ن۔م۔ راشد اور تصدق حسین خالد نے کیے۔ اختر الایمان نے اسے اپنے مخصوص اور متوازن انداز میں آگے بڑھایا اور اسی کی نمائندگی آج نئی نسل کے بیشتر شعرا کر رہے ہیں جن کے کلام سے نئے انداز، مزاج اور لہجے کی غمازی ہوتی ہے۔ ان شعرا کے نام گنانا یہاں چنداں ضروری نہیں پھر بھی اس ضمن میں مجید امجد، خلیل الرحمن اعظمی، منیر نیازی، محمد علوی، عمیق حنفی، قاضی سلیم، بلراج کومل، کمار پاشی، ندا فاضلی، محمود سعیدی، شہریار، شاذ تمکنت، شہاب جعفری، ظہیر صدیقی، وہاب دانش، شفیق فاطمہ شعریٰ اور باقر مہدی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے نئی شاعری کے خط و خال کو نمایاں کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان شعرا کے کلام کے مطالعے سے جدید شعری اظہار کے عمومی رنگ اور میلان کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ یہ شعرا ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہیں اور اپنے مخصوص رنگِ سخن سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان شعرا کے کلام کے مطالعے سے کئی واضح فنی خصوصیتیں اُبھر کر سامنے آتی ہیں جو ان شاعروں کے یہاں علیحدہ علیحدہ بھی نمایاں ہیں اور انھیں جدید شاعری کا مجموعی آہنگ [illegible] جا سکتا ہے [illegible] ان میں سے کچھ شعرا ہیں جو اپنے لہجے کے نئے پن کے باوجود کلاسیکی مزاج سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔ کچھ کے یہاں رومانیت غالب ہے گو رمزی پیرائے میں اس میں نئے پہلو اُجاگر ہو گئے ہیں اور اس کی ایک طرح سے نئی توسیع اور بازیافت عمل میں آئی ہے۔ کچھ نثری نظمیں لکھنے کی طرف مائل ہیں اور اسی فارم کے ذریعے اپنے تجربات کے بامعنی اظہار کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس فارم میں شاعری کا حقیقی قالب اختیار کرنے کے امکانات محدود ہیں۔

جدید شاعری میں کچھ عرصے تک بے ہیئتی کا میلان بھی غالب رہا مگر اب بالعموم آزاد نظم ہی کو جدید شاعری کے فارم کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے۔ ابھی تک نسبتاً مختصر اور چھوٹی نظموں کے ذریعہ اظہار و بیان کے تقاضے پورے کیے جاتے رہے، مثلاً اختر الایمان، منیر نیازی، محمد علوی، شہریار اور عادل منصوری کی نظمیں لیکن ادھر کچھ طویل نظمیں بھی لکھی گئی ہیں جن سے جدید شاعری میں اظہار و بیان کے کچھ نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں اس ضمن میں کمار پاشی کی "ولاس یاترا"، عمیق حنفی کی "صلصلۃ الجرس" اور وحید اختر کی "صحرائے سکوت" کا ذکر ضروری ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بعض جدید شعرا کے یہاں اساطیر، دیومالا اور مذہبی قصص کو فنی اظہار کے وسیلے کے طور پر استعمال کرنے اور اُن میں نئی معنویت دریافت کرنے کا رجحان نمایاں ہے "صلصلۃ الجرس" اور "ولاس یاترا" اس کی مثال ہیں۔ اس کے علاوہ پرانے فارموں کو بھی نئے مفاہیم کے اظہار کے لیے برتنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ شعرا کے یہاں ہندی کے نرم اور رسیلے الفاظ سے کام لینے کا رجحان بھی نمایاں ہوا ہے۔ پھر [illegible] جیسے کلاسیکی شعرا کے لہجے اور اسالیب کی بازآفرینی بھی کی گئی ہے اور اس کے ذریعے شعری اظہار کو نئی جہتوں سے آشنا کیا گیا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو جدید شاعری میں اظہار و بیان کے مختلف اور متنوع وسائل سے کام لیا جا رہا ہے لیکن نظموں کے مقابلے میں جدید شاعری کا غزلوں کا حصہ نسبتاً زیادہ

کامیاب ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اُردو غزل نے جدید شعرار کے ہاتھوں نئی زندگی اور توانائی حاصل کی ہے پرانی اور از کار رفتہ علامتوں کی جگہ جو اب تک اُردو غزل کی جاگیر تھیں بے شمار نئی اور تازہ علامتیں وجود میں آگئی ہیں جن کے ذریعے جدید حسیت کا کامیابی سے اظہار کیا جا رہا ہے مثلاً سورج، دھوپ، سایہ، شام، رات، صحرا، ریت، شاخ، پتہ، آندھی، دُھواں، بیابان، جنگل وغیرہ، یہ صحیح ہے کہ جدید غزلوں میں ابھی وہ تہہ داری اور بھرپور معنویت نہیں آئی ہے جو کلاسیکی غزلوں کا خاصہ ہے لیکن جدید غزل نے جس نئی فضا مزاج، ذائقہ اور کیف سے آشنا کیا ہے اس کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ جدید غزل گو شاعروں میں جن کا سلسلہ ناصر کاظمی سے شروع ہوتا ہے، ظفر اقبال، شہزاد احمد، بانی، حسن نعیم، پرکاش فکری، بشیر بدر، سلطان اختر، وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ شمیم فاروقی اور لطف الرحمٰن نے بھی جدید رنگ میں اچھی غزلیں کہی ہیں۔

جدید شاعری کے اس جائزے سے اس کے اظہار و بیان کے کچھ اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ جدید شاعری میں شعری زبان اور محاورے کے برتاؤ میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اور اُن کے ذریعہ جس طرح تخلیقی اظہار کے امکانات اُجاگر ہوئے ہیں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ جدید شاعر طے شدہ موضوعات کے بجائے اپنے پرائیوٹ وژن کو پیش کرنے کا دعویدار ہے جس کے ذریعے خیالات کی نئی جذباتی تعبیریں اور حیاتی شکلیں سامنے آ رہی ہیں اور یہ یقیناً اُردو شاعری میں ایک بڑا انقلاب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جدید شاعری پر تجربے کی بے اعتدالی، ابہام اور ژولیدگی اور غیر معقول انحراف و انقطاع کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ افتخار جالب اور احمد ہمیش جیسے شعرا شاید اس کی مثال کے طور پر برابر پیش کیے جاتے رہیں۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید شاعر نے ہمیں ایک نئے مزاج، نئے آہنگ اور نئے لہجے سے روشناس کیا ہے اور اظہار و بیان کے نئے سانچے دیئے ہیں جن کے ذریعے اُردو شاعری کی روایات میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ جدید شاعری کا یہ پہلو یقیناً قابلِ توجہ اور اہم ہے۔

۱۸

غزلیں

تے علی کرامت

را جلنے لگی، وادی دصحرا آگ ہے
ندر آگ ہے، سارا جزیرہ آگ ہے

ئے سورج ذرا، میری طرف بس اک نظر!
سراپا آگ ہوں تو بھی سراپا آگ ہے

ساری مچھلیاں صحراؤں میں کیوں آگئیں؟
ساحلِ رواں، کیا اب وہ دریا آگ ہے؟

ریں سنگ کی کوندے تھے بجلی کے نہاں
ن کے تودوں سے بھی ہر دم ہویدا آگ ہے

وہ کون ہے، چھیڑی ہے جس نے بانسری
دل کا آئینہ گویا وہ نغمہ آگ ہے

رے عہد کا جلتا ہے اپنی آگ میں
رشتہ آگ ہے، ہر ایک ناتا آگ ہے

تا ہے یہاں، باطن پگھلتا ہے یہاں
ن دوڑاؤ نظر، پنہاں وپیدا آگ ہے

سگی کا خواب بھی جل کر نہ خاکستر بنے
ال ہر آرزو، ہر اک تمنا آگ ہے

ئی سے تری جلتی نہ کیوں غم کی ہوا
رامت شعر کا ہر درد لہجہ آگ ہے

▲▲

شباب للت

ہمیں خط لکھو چاہے عرضی لکھو
مگر صاف صاف اپنی مرضی لکھو

خلاف اُس کے بہتر ہے عرضی لکھو
مگر اُس میں نام اپنا فرضی لکھو

ثوابوں کو ایثار اپنا کہو
گناہوں کو مولا کی مرضی لکھو

بہت مختصر ہے مری فردِ جرم
کچھ الزام اور اس میں فرضی لکھو

میں ناداں اشارے سمجھتا نہیں
ذرا صاف صاف اپنی مرضی لکھو

تقاضا یہ ہے مصلحت کا شباب
حقیقی ہے جو اُس کو فرضی لکھو

▲▲

ذکاء الدین شایاں

کسی خیال، کسی روشنی میں ڈھل جائیں
تمہارے ہونٹوں پہ ہم لفظ بن کے جل جائیں

یہ گردِ سنگ دصدا چھنتی رہے پیچھے
ہوا کے ساتھ کہیں دور ہم نکل جائیں

مصفا رات ہے شب خوابی کا لباس لیے
یہ دن کے میلے کپڑے ذرا بدل جائیں

تمام عالمِ شورش ہے وہ بھیانک خواب
کہ دن کے جاگنے والے اُچھل اُچھل جائیں

یہ زندگی کبھی ہمیں پھر تلاش کر نہ سکے
کچھ اس طرح کہیں سانسوں میں ہم پگھل جائیں

▲▲

غزلیں

ساجد اثر

گھاٹیوں سے گزرنے کی باتیں نہ کر
خندقوں میں اترنے کی باتیں نہ کر

باغِ امید میں، غم کی مایوس کن
خوشبوؤں کے بکھرنے کی باتیں نہ کر

بے یقینی کا آسیب حادی سہی
اپنے سائے سے ڈرنے کی باتیں نہ کر

مصلحت ظلمتوں کی طلبگار ہے!
روشنی میں ٹھہرنے کی باتیں نہ کر

اے اثر! ملتجی ہے شعورِ انا:
وقت سے قبل مرنے کی باتیں نہ کر

▲▲

ظفر کلیم

قاضیِ شہر صداقت پہ نہیں بھول پہ ہے
بات کچھ بھی نہ سہی بحث مگر طول پہ ہے

خالقِ عدل ہی قاتل کو سزائیں دے گا
سازشِ قتل کا الزام تو مقتول پہ ہے

جانے کس موڑ پہ ہے معرکۂ جہدِ حیات
پاؤں انگاروں پہ پڑتے ہیں نظر پھول پہ ہے

کوئی تنقید کتب خانوں کی رونق پہ نہیں
تبصرہ اپنا کتابوں پہ جمی دھول پہ ہے

عشرتوں میں بھی ظفر طبع نہ بدلی اپنی
غربتوں میں بھی شب و روز کے معمول پہ ہے

▲▲

مہدی پرتاپگڑھی

تاروں کا خون کاسۂ شب میں اچھال دے
اے وقت! مجھ کو چہرۂ گیتی اجال دے

اے عصرِ نو! تو سخت پراگندہ ذہن ہے
مجھ سے جو حل نہ ہوں مجھے ایسے سوال دے

بال آنہ جائے آئینۂ اعتماد میں —
اب تو مزید وعدوں پہ مجھ کو نہ ٹال دے

درکار کب رہا مجھے چہرے کا رنگ روپ
اے ذوالجلال! روح کا مجھ کو جمال دے

پہچان اپنی کھو چکے چہروں کے آئنے
اے وقت! اب مزید نہ گردِ ملال دے

مہکی جو اس کی یادوں سے کٹ کر گزر گئے
وہ ماہ و سال زیست سے میری نکال دے

مٹھائی کا ڈبّہ

یوسف عارفی

اُس گھر میں جب ہر شام کمرے کے بیچوں بیچ جھولتا بلب
دشن ہو جاتا ہے —— تب ——
اسٹینڈ پر رکھے لمبے چوڑے ریڈیو سے فلمی گیت براڈ کاسٹ
رنے لگتے ہیں۔ بچّے اسکول کا ہوم ورک کرتے ہوئے بظاہر
دکو بے حد مصروف ثابت کرنے لگتے ہیں —— اور وہ
دسارا اخبار دیکھ چکنے کے بعد اپنی فرسودہ عادت کے مطابق
بار کی سرخیاں ذہن نشین کرنے لگتا ہے اور ساتھ ہی سامنے
ٹھے ہوئے دوست کے ادھورے اور بے کیف سوالوں
لے جواب انتہائی دلچسپ انداز میں دینے لگتا ہے۔ لیکن جب
ں کا دوست کوئی بچکانہ سوال کر بیٹھتا ہے تو وہ —— اور
ں کا دوست اور ہوم ورک کرتے بچّے اس کے جھلّائے ہوئے
رے کو دیکھ کر قہقہے لگا بیٹھتے ہیں —— قہقہے سُن کر اس
ی بیوی کچن روم سے نکلتی ہے ایک دو بار اس کے جھلّائے
ہوئے چہرے کو بڑے شریر انداز میں دیکھتی ہے، پھر
پھرتی ہے۔

"لال بھبھوکا ہو رہے ہیں!"

وہ سچ مچ لال بھبھوکا ہو کر ٹیبل پر پڑی سگرٹ پاکٹ
ٹھاتا ہے اور سگرٹ جلا کر ڈھیر سارا دھواں کمرے کے
یچ جھولتے بلب کی جانب چھوڑ دیتا ہے۔ بلب کی تیز شعاعیں
رسے دھندلا جاتی ہیں۔ اس کی بیوی کو یہ بات سخت ناگوار
زرتی ہے اور وہ بغیر ذہن پہ زور دیے معمول کے مطابق پوچھ
بیٹھتی ہے۔

"کتابوں اور اخباروں نے کیا آپ کو یہی سکھایا ہے؟"

جواب میں وہ احمقوں کی طرح ہنستا ہے۔ اور دوسرے
کمرے میں ہوم ورک کرتے بچّوں کو آواز دیتا ہے اور
کہتا ہے ——

"بدتمیزو! اپنے آپ کو دھوکا دینے کی حماقت کبھی نہ
کرنا" پھر وہ سوچتا ہے اس نصیحت میں کس قدر کھوکھلا پن
چھپا ہے۔

آج کی شام بھی ایسی ہی کچھ دلچسپ اور غیر دلچسپ شام
تھی —— وہ بدستور اخبار کی سرخیاں ذہن نشین کر رہا تھا کہ
دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔

۔ اخبار کی
سرخیاں لمحہ بھر کے لیے ایک دوسرے میں خلط ملط ہو گئیں،
بیوی کا چہرہ دروازے کی جانب اُٹھ گیا، دوست نے
گھوم کر پہلے گھڑی میں وقت دیکھا اور دروازے کی جانب
بڑھ گیا، بچّوں کے قلم ہوم ورک کی کاپیوں پر چلتے چلتے
رک گئے۔

"دستک بھیک مانگنے والے نہیں دیتے!" وہ آپ
ہی آپ بڑبڑایا۔

دوست نے دروازہ کھول دیا اور آنے والے کو
پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اجنبی، پڑوسی، راہ گیر،
دوست ——!

"فرمائیے!" لیکن آنے والے نے فرمایا کچھ بھی نہیں۔
سیدھا اندر داخل ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبّہ
تھا اور آنکھیں کمرے میں کچھ ڈھونڈھ رہی تھیں۔

"کون ہو ——— اور کیا ڈھونڈتے ہو"، طلسماتی کردار کی زبان میں اس نے پوچھا۔ جواب میں اجنبی نے اسے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اور بکھری بکھری سانسوں کے درمیان کہنے لگا۔

"کل ہمارا تہوار تھا۔ اور کل ہی مجھے یہاں آنا چاہیے تھا۔ مصروفیت حائل تھی نہ آسکا۔ آج آیا ہوں ——— یہ مٹھائی کا ڈبہ !" وہ لمحہ بھر کے لیے رُک گیا۔ بچے ہوم ورک چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے۔ بیوی رسوئی گھر کی چوکھٹ پر دم سادھے کھڑی رہی اور دوست بڑی بے نیازی سے اسٹینڈ پر رکھے ریڈیو کو گھورنے لگا۔ اور وہ خود اُٹھ کر اجنبی کے لیے کرسی خالی کرنے لگا۔

"نہیں۔ نہیں۔ آپ تشریف رکھیے، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

"ارے یار بیٹھو تو سہی۔ سارے راز فاش ہو جائیں گے۔"

"جی !" گھبرا کر اجنبی نے اسے دیکھا۔

"جی ہاں ——— بن بُلائے آئے ہو تو ——— کچھ تو مطلب ہوگا ——— اپنے بارے بتاؤ کہ کون ہو، کیا کرتے ہو ——— اور ——— ؟" ہونٹوں پر ادھورا سوال لٹکا کر اس نے اجنبی کو بڑی لاپروائی سے دیکھا۔

"بات یہ ہے، میں ——— میں" یک بیک اجنبی کا حلق جیسے خشک ہو گیا اور اس کی کپکپاتی نظریں کچن روم کی طرف اُٹھ گئیں۔

"میں انھیں جانتا ہوں۔ یہ پچھلے سوموار کو راستے میں ملی تھیں"

"اکیلی ہی" پورے انہماک کے ساتھ اس نے اجنبی سے پوچھا۔

"جی ہاں ——— سنسان اور لمبی سڑک پر اکیلی !"

"تب تو بڑا ہی دلفریب منظر رہا ہوگا ———" اس نے گھوم کر رسوئی گھر کی چوکھٹ پر کھڑی اپنی بیوی کو دیکھا۔ جو چپ تھی۔ یوں جیسے گیان کی سیڑھیاں طے کر رہی ہو۔

"پھر کیا ہوا بھائی ———" اس نے اجنبی کو پُر لطف نظروں سے دیکھا۔

"پھر میں نے ——— یعنی "ہم" نے بات چیت کر ——— وہ اچانک چُپ ہو گیا۔ یوں جیسے اس کے ذہن، دل اور سانسوں میں غبار پھیل گیا ہو۔ اسے سجھائی نہ دے رہا ہو کہ اب وہ آگے کیا کہے، کیسے دیکھے، یک بیک اس نے مٹھائی کا ڈبہ رسوئی گھر کی چوکھٹ پر کھڑی بیوی کی جانب بڑھا دیا۔

"تہوار کی خوشی میں، نیک کامناؤں کے ساتھ !" پل بھر کے لیے بیوی کی نظریں اُٹھیں اور ہاتھ بڑھا کر اس نے ڈبہ لے لیا۔ پھر کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی اہم مقدمے کی سماعت کی آخری گھڑی یکلخت قریب آگئی ہو۔

کچھ توقف کے بعد اجنبی کی بے چین نظریں رسوئی گھر کی خالی چوکھٹ پر اُٹھیں اور ٹھہر سی گئیں۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی اور بڑے ادب سے اجازت مانگنے کے بعد نمسکار کے لیے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

کمرے میں ایک بار پھر مقدمے کی سماعت کا آخری منظر لوٹ آیا۔ وہ سب خاموش تھے، سر جھکائے جیسے اپنے آپ کو کنٹرول کر رہے ہوں۔

"تعارف ادھورا ہی رہ گیا" سناٹے میں اس کی آواز یکلخت غیر دلچسپ تھی "کم از کم گھر آئے مہمان کی چائے۔ خاطر تواضع ہوتی، وہ کچھ دیر رُکتا اور ملاقات میں رنگ بھر جاتا ——— مجھے ایسی بے رُخی پسند نہیں" اس نے ٹیبل پر مُکا چلا دیا۔

بیوی گھبرا کر رسوئی گھر سے نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا ——— ڈبہ اس نے ٹیبل پر رکھ دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کے چہرے پر نہ جانے کیا کیا ٹٹولنے لگی۔ دوست نے بڑھ کر ڈبہ اُٹھا لیا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"اندر لذیذ مٹھائی ہوگی"

بیوی نے سوچا — بچوں نے سوچا اور دوست نے سوچا۔

"کیا اندر واقعی لذیذ مٹھائی ہوگی؟" اُس نے بھی سوچا۔ لذیذ مٹھائی کھاتے ہوئے کس قدر لطف آتا ہے چہرے پر کیف، انبساط کی لذت آگیں لہریں دھیرے دھیرے پھیلنے لگتی ہیں۔ آنکھ بھیچ کر کھاتے کھاتے جب مٹھائی حلق سے اُترنے لگتی ہے — تب کتنا سرور ملتا ہے۔

اُس نے آہستگی سے سر اُٹھایا۔ ایک نظر مٹھائی کے ڈبے کو دیکھا لذیذ مٹھائی، تبسّم آمیز چہرے — اس کی نظریں معصوم بچوں کے چہروں پر مرکوز ہوگئیں۔ دلفریب مسکراہٹ ان چہروں پر رینگ رہی تھی، لیکن اچانک ہی اس نے دیکھا کوئی کالا ناگ اس مسکراہٹ کے پیچھے اپنا پھن اُبھار رہا ہے۔

دوست کا چہرہ —!

بیوی کا چہرہ —!!

بچوں کا چہرہ —!!!

ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھ کر اس نے دیوار پر آویزاں آئینے میں اپنا چہرہ بھی دیکھ لیا۔ خوف زدہ سا چہرہ! پھنکاریں مارتا چہرہ —!!

پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چل کر ٹیبل کے قریب پہنچ گیا۔ مٹھائی کے خوبصورت ڈبے کو اُس نے بڑے غور سے دیکھا — اسے لگا — سارے چہروں کی خوف زدگی اس ایک ڈبے میں سمٹ آئی ہے۔ اور کچھ دیر میں جیسے ہی ڈبے کا ڈھکن کھلے گا — کوئی شئے ضرور اس ڈبے سے نکلے گی اور ڈس لے گی —

"ڈس!!" اُس نے ایک مضبوط گھونسہ ڈبے پر چلا دیا۔ دوسرے ہی لمحے مزیدار مٹھائی کے ٹکڑے سارے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔

▲▲

جب زوال مقدر بنا بقیہ ص۱۴

دامنِ کوہ ایک بڑے حصے پر قابض و دخیل ہو چکا تھا ابھی ربط باہم کے سلسلے استوار بھی نہیں ہوئے تھے کہ سیماب صفت پانی پہاڑ کو روندنے کی کوشش کرنے لگا۔ دراصل اُسے اپنے وجود کا احساس دلاتا تھا۔ وہ چاہتا کہ وہ پہاڑ کے پورے وجود پر چھا جائے اور پہاڑ اُسے اپنے اندر جذب کرنا، قید کرنا چاہتا تھا۔

بہتے پانی نے دھیرے دھیرے ندی کی شکل اختیار کی اور پہاڑ کا طواف کرنے کے بہانے اس کی جڑیں کھودنے لگا۔ پہاڑ اپنے گرد منڈلاتے خطرے کو محسوس کر کے کبھی چٹانیں کبھی برف کے تودے پھینک کر اُس کا راستہ روکنا چاہتا لیکن ندی عشوہ طرازی سے کبھی رفتار دھیمی کر کے۔ کبھی راستہ بدل کر اُسے جُل دے جاتی۔ پہاڑ جامد و ساکت اپنی پھٹی آنکھوں سے شب و روز یہ تماشہ دیکھتا اور اندر اندر گھول جاتا۔

ندی پہاڑ کو تسلّی دیا کرتی کہ دونوں کے میل جول کا نتیجہ کئی بستیاں ہیں۔ وہ صرف تخلیق کا ذکر کرتی اور اپنی تخریبی کارگزاریوں پر پردہ ڈالتی رہتی۔

آج وہ عظیم الشان پہاڑ ایک ادنیٰ سی چٹان بن کر رہ گیا ہے پانی کا معمولی ریلا بھی اُسے دھکیل سکتا ہے۔ مستانہ خرام دوشیزہ سی الہڑ ندی بھی اب کہاں ہے؟ پہاڑ سے اُبلتے سوتے ہیں نہ بارش کا جمع شدہ پانی نہ برف — اس کے سینے پر درخت کی ٹہنی بھی گراں معلوم ہوتی ہے تھکی ہاری ضعیفہ کی طرح بس رینگ رہی ہے! پہاڑ کا غرور سرنگوں ہو چکا ہے۔ اور ندی لامتناہی سلسلۂ ریگ میں ایک تھی سی پانی

تیردائی

پرویز رحمانی

میں آوازوں سے بھرے ہوئے اس وسیع وعریض
ہال میں داخل ہوا جہاں صرف آوازیں ہی آوازیں تھیں۔
رنگ برنگی، نیلی، پیلی، کالی، اُجلی —— ہری، نارنجی،
چیختی آوازیں جو ایک دوسرے پر چڑھتی اُترتی، پھیلتی
سمٹتی دکھائی دے رہی تھیں —— میں نے آنکھوں سے
سوچا کہ اس ہماہمی کو کوئی عنوان دیا جائے جو خود اپنے
طور پر ایک منفرد نام ہو —— مگر ناکامی سے سابقہ تھا
...... ان آوازوں کے بیچ میرے حلق میں خراشیں سی ہونے
لگیں —— میں بھی ان سے منسلک و مربوط ہوکر بکھرنے کا
متمنی سا ہو اتھا —— ابھی ارادے میں پختگی کا رنگ آنے
بھی نہ پایا تھا کہ تجربے نے مجھے ٹھوکا دیا —— میں نے دیکھا
ایک اُجلی صدا اوپر اُٹھ رہی ہے —— میری بھنویں
تن سی گئیں —— پھر یہ تناؤ یکبارگی ختم بھی ہو گیا ——
میری آنکھیں پُرسکون تھیں —— مجھے جب یہ یقین ہو گیا
کہ اُجلی صدا تمام آوازوں کی سرپرستی اختیار کر چکی ہے
تو میں ڈر گیا —— ابھی ایک قدم پیچھے کی طرف ہٹا ہی
تھا کہ ایک سسکاری میری پشت پر موجود تھی ——
پلٹ کر دیکھا تو ایک خوشبو اپنی کھلی ہوئی بے نوری کے
آگے مجھے سوالیہ دیکھ رہی تھی —— پھر اس نے
شاید جواب پالیا —— مہکتے ہوئے میرا ہاتھ تھاما ——
میں بھی مجبوری کے عالم میں اس کی خوشی کا ساتھ دے بیٹھا۔
لیکن کیوں —— مجھ میں یکے بعد دیگرے سات رنگوں
کی سوچ واؤ واؤ ہوتی چلی گئی —— پھر ——

"یہ خاموشی کیسی ہے" —— اس کی خود کلامی نے مجھے ٹوک
دیا —— چونک کر دیکھا تو افضل صدا اپنی پوری شخصیت
کے ساتھ ہر طرف روشن تھی —— جواباً میں نے بھی
خود کلامی برتی ——

"شاید خواب شروع ہونے کو ہے"

"کس کا؟"

"ایک گونگے کا" —— تمسخر گی نے کہا —— اور
وہ میرے کچھ اور قریب سمٹ آئی۔

صدا کے لب ہلے —— پھر ٹپ ٹپ موتی جیسے
الفاظ ٹپکنے لگے ...... اور اس کے بعد جملوں نے اپنا
چہرہ کھول دیا —— وہ مضطر ہو اُٹھی ——

"کیا اس کا چہرہ بھی اپنے بولوں کی طرح آئینہ
ہے"

"شاید" —— میں نے بہت دُور جاکر جواب دیا
اور پھر پلٹ آیا ——

اُس نے میرے بازو مضبوطی سے تھام لیے۔

صدا ابتدا سے انتہا کی طرف بڑھ چکی تھی ——
ابھی کہانی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی ہی تھی کہ وہ پھر ایک
بار سوال بن کر مڑی ——

"کیا اس کی آنکھیں بھی اس کے بیان کی طرح روشن
اور زندہ ہیں"

میرے اندر کوئی چیز بول پڑی —— اور کہانی
ختم ہو گئی —— اُجلی صدا یک بہ یک بجھی تھی ——

وعی چیخ ساعت بھر اُجلا کر دھند گئی ـــــ میں نے گھبرا
ر اپنا بازو ٹٹولا ـــــ وہ موجود تھی ـــــ اس یکبارگی
بدیلی نے اس پر بھی اثر ڈالا تھا ـــــ اس کی بے نوری کا
ہیں پتہ نہ تھا ـــــ آنکھوں سے روشنی جھلک رہی تھی ـــــ
یری پلکوں کے اندر تحیر نے جب کئی جھپکیاں لے ڈالیں تب
ں نے اطمینان کی سانس لی ـــــ مگر پھر دوسرے ہی
لمحے اس نے مجھے پورے وجود سے جھنجھوڑ دیا ـــــ
یری نگاہ اس کے لبوں پر جم گئی ـــــ جو متحرک تھے .....
یکن ...... میرا دم گھٹنے لگا ـــــ

اب روشنی اس کے گالوں پر بہہ رہی تھی اور میں اس
ی آواز کے لیے گھٹ رہا تھا ـــــ آوازیں رخصت ہو چکی
تھیں ـــــ ہال میں کوئی بھی نہ تھا سوائے ہم دونوں کے
ـــــ ہاں ایک خموشی تھی اور بس ـــــ

پھر اس نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں ـــــ ہاتھ تھاما
ور ...... وہاں سے نکل آئی ـــــ ہال سے باہر نکل
کر ہم دونوں نے ایک لاسمت سفر کیا ـــــ تھوڑی
ہی دیر بعد ایک کتاب گھر نے ہماری احاطہ بندی کر لی
ـــــ کتاب کی چھت، کتاب کی دیواریں اور فرش
بھی کتابی ـــــ کوئی دروازہ بظاہر نظر نہ آیا ـــــ
میں نے تمام چیزیں اُلٹ پلٹ ڈالیں ـــــ مگر کہیں
سے کوئی امکان روشن نہ ہو سکا ـــــ یہاں سے
وہاں تک خالی پن ـــــ کوئی نقطہ تک کہیں دکھائی
نہ دے سکا ـــــ

میں ششدر رشدر سوال بنتا رہا ـــــ مگر جواب
ـــــ ؟ جواب میرے شعور، میری فکر اور میرے احساس
میں ایک گونگے کی طرح بھانت بھانت کی آواز نکال رہا
تھا ـــــ میری بے چارگی نے اس کی طرف دیکھا
جس پر ہزاروں توقعات روشنی کے لیے آنکھ لگائے تھیں
ـــــ لیکن میری نگاہ خالی تھی ـ ذہن جامد تھا ـــــ
ہونٹ ساکت تھے ـــــ میں نے اوپر کی طرف دیکھا۔
پھر آنکھیں بند کر لیں ـــــ اور آنکھوں کے بند ہوتے
ہی پلکوں کے اندر کوئی چیز سرسرا اُٹھی ـــــ میں نے
دیکھا ایک انجانی زبان اور ایک اجنبی خط اپنا چہرہ
کھولے میرے سامنے ہیں ـــــ میں نے بدقت تمام
ان کی پہچان اپنے ہونٹوں پر محسوس کی ـــــ بڑی کالی
آواز نکلی تھی ـــــ

ـــــ "جہاں تم ہو وہاں کچھ بھی نہیں ہے"

▲▲

---

۱۹ جون کو اُردو کے مشہور افسانہ نگار ہربنس لال ساھنی کا فرید آباد میں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ساھنی صاحب ہمارے خاص کرم فرماؤں میں تھے اور آخر وقت تک تحریک کے لیے برابر لکھتے رہے تھے۔ آپ کی موت کا غم ہمارا ذاتی غم بھی ہے۔ خداوند کریم سے دُعا ہے کہ وہ ساھنی صاحب کی آتما کو شانتی دے اور پیچھے رہ جانے والوں کی دائمی جُدائی کا صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

(ادارہ)

تمل ناڈو کے منفرد شاعر و ادیب فرحت کیفی ۲۰ جون ۷۹ء کو ۴۴ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ایک تعزیتی اجلاس میں مختلف دانشوروں نے فرحت کیفی کی شخصیت اور شاعری پر تاثرات پیش کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کی موت کو اُردو زبان و ادب کا ایک عظیم نقصان قرار دیا۔ فرحت کیفی نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی خصوصاً فرانسیسی منعت تراشیلے کو اُردو میں منتقل کر کے بہت کم عمری میں بڑا نام پیدا کیا۔ مذکورہ جلسہ میں راز امتیاز، پروفیسر حامد صدیقی، کاوش بدری، عابد صفی اور دیگر حضرات نے مرحوم کی اچانک جدائی پر رنج و الم کا اظہار کیا۔ (ادارہ)

الفریڈ ہچکوک

کنور سین

انسانی دماغ انتہائی پیچیدہ مشین ہے۔ اس میں متضاد خیالات کی روئیں دوڑتی ہیں کبھی پہلو بہ پہلو کبھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی، ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتی ہوئی۔

کوئی بھی انسان جیسا نظر آتا ہے دراصل ویسا نہیں ہوتا۔ وہ تو خارجی محرکات کو بھی جھٹلانے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کا ردّعمل اکثر محرکات کے برعکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی سرشت انسان کے اندر کا عمل ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے معمّہ بنی رہتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کب اُس کے اندر کا شیطان اپنے گرد لپٹا دیوتا کا لبادہ اُتار کر ننگا ناچ دکھانے لگے یا کب اُس کے اندر کا دیوتا وقتی طور پر شیطان پر حاوی ہونے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

ڈراما اور سینما انسانی سرشت کی کارکردگی کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ عام آدمی کو اُس کے اپنے اندر کے باغی، بدمعاش اور مجرم کو کارنامے سرانجام دیتے اور انجام کار کیفرِ کردار کو پہنچتا ہوا دکھانے کے لیے سینما سب سے زیادہ طاقتور اور موثر ذریعہ ہے۔

ہندوستانی فلم کا ولن ——— کے این سنگھ، [illegible] شتروگھن سنہا ——— اپنی اداکاری کے لیے ہالی وڈ تک جاتا ہے۔ وہاں کی فلموں میں ولن کو کام کرتے دیکھتا ہے اور اپنے جوہر سنوارتا اور نکھارتا ہے۔

ہالی وڈ میں جرائم، اسرار، مار دھاڑ، قتل اور اغوا کے موضوع پر بننے والی فلموں کا بادشاہ آج بھی الفریڈ ہچکوک ہے۔ ہچکوک کی دُنیا تہہ خانوں، موت کے پھندوں اور اور بڑی چستی اور سوجھ بوجھ سے کیے جانے والے قتلوں اور اُن کے سُراغوں کی دُنیا ہے۔ اسرار، تذبذب، بھول بھلیاں اور دہشت و وحشت کے ماحول کا خالق کردار ہچکوک بھی ایک انسان ہے ——— فلموں کا نرمان کرنے والا ——— کرداروں کا جنم داتا! کردار جو جرائم کی دُنیا آباد کرتے ہوئے بالآخر وہیں اپنی قبر کھودتے ہیں اور اُس میں لیٹ کر اپنے گناہ کا بھاری پتھر اپنے اوپر رکھ لیتے ہیں۔

ہچکوک انسان کے اندر کے شیطان کو نمایاں کرتا ہے لیکن انجام کار اُسے انسان پر حاوی نہیں ہونے دیتا۔ وہ کوئی ایسا مجرم پیدا نہیں کرتا جو ساری دُنیا کو تہس نہس کر دینے کی طاقت رکھتا ہو، بے شک اپنے کیریر کے آغاز میں وہ ایسا دعوے کرتا ہے اور اُس کی کارگزاری ناظرین کو اس وہم میں مبتلا کر دیتی ہے کہ ولن جو سوچتا ہے اُسے عملی شکل دینے پر قادر ہے۔

عالمگیر شہرت کے مالک کریکٹر ایکٹر چارلی چپلن نے
ہچکوک کے ساتھ اُس وقت ملاقات کی جب شیطانیت
کا نمائندہ اسّی سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا۔ اُس وقت بھی ہچکوک
فلم انڈسٹری میں سرگرم تھا اور آج بھی وہ پورے جوش کے
ساتھ زندگی کو گھونٹ گھونٹ پیتا ہوا اُس کا لطف لے
رہا ہے۔

ہچکوک نے چارلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا
"تم عین وقت پر آئے۔ تمہارے سامنے ہی میرے دل
کی حرکت کو ہموار اور متوازن رکھنے والے آلے کی کارکردگی
کا معائنہ ہوگا اور وہ بھی ٹیلیفون پر۔" اُس نے سگار کا
کش لگایا اور دھواں اُگلنے لگا!

"تم سمجھتے ہو میرے چہرے کی رونق اور میری طبیعت
کا لاابالی پن مر گیا۔ شاید میں آج کل ہر وقت اپنے گٹھیا
زدہ اعضا کی بابت سوچتا رہتا ہوں۔ میرے اعصاب
کمزور ہو گئے ہیں اور مجھے اپنے ناکارہ ہوتے ہوئے دل و
دماغ کا احساس کھائے جاتا ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں!"

"پھر آج کل تم کیا....؟"

"آج کل بھی میں اپنی دُنیا تعمیر کرنے میں جُتا ہوا ہوں۔"
وہ رُکا "تم بلیک کو جانتے ہو؟" چارلی کو اپنی طرف حیرت
سے دیکھتے پاکر وہ ہنسا "تم نہیں جانتے۔ وہ تمہارا کردار
نہیں۔ تمہاری دُنیا الگ ہے۔" ہچکوک نے اپنے کو کرسی
میں فٹ کیا۔

"بلیک! انگریز جاسوس، جس نے سرکاری بھید
دُشمن کو بتا دیے۔ بیالیس انگریز جاسوسوں کی موت کا
ذمہ دار۔ آخر پکڑا گیا۔ عدالت نے اُسے بیالیس سال
کی سزائے قید دی۔ اتنی لمبی سزا انگریزی عدلیہ میں
اور کسی کو نہیں دی گئی۔" ہچکوک نے چارلی کا سگار
سلگایا۔

"یہ کہانی کا اختتام نہیں۔ شاید اُس کا آغاز ہے
بلیک چھ سال بعد جیل سے فرار ہونے میں کامیاب
ہو گیا۔ اب روس میں بڑے ٹھاٹھ سے زندگی گزار رہا
ہے۔" اُس نے چارلی کے ہاتھ سے ٹوپی پکڑ کر میز پر رکھ
دی۔

"کہانی کا یہ آغاز ہے نہ انجام۔ اگر میں اسے جوں کا
توں فلم پر اُتار دوں تو میں نے کیا کیا۔ خاک!
میں تو بلیک کے جاسوس بننے سے لے کر مخبر بننے تک
کی نفسیات کا تجزیہ کر کے ایک نئی کہانی کو جنم دوں گا۔
نیا پیرایہ، نیا انداز، نیا زاویۂ نظر.... بات کو
گھٹائے بڑھائے بغیر آرٹ پیدا نہیں ہوتا۔" چارلی کو
مسکراتا دیکھ کر ہچکوک جھینپ گیا۔

"تم مجھ سے بڑے شاطر ہو۔ لیکن تم سے کہا تھا
گاندھی نے کیا کہا تھا؟"

"مجھ سے؟" چارلی سنبھلنے لگا "اُس جادوگر کی
بات چھوڑ دو۔"

"پھر بھی۔"

"وہ کہتا تھا وہ مجھ سے بھی بڑا مسخرہ ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال سے زیادہ حالات گواہ ہیں۔ لیکن
یہ تو سیاست ہوئی۔" چارلی اُداس ہو گیا اور ہچکوک
نے بھی بات کو آگے نہیں بڑھایا۔

ہچکوک دوبارہ بلیک کی کہانی سُنانے لگا:
"میں بلیک کے پاس ایک امریکن ایجنٹ
بھیجوں گا۔ وہ ایک ایسے آدمی کا بھائی ہوگا جو

بلیک کی سازش کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ ایجنٹ بلیک کی بیوی کو اپنی محبت کے دام میں پھنسائے گا اور اُسے پھسلا کر اُس کے بچوں سمیت فن لینڈ لے جائے گا۔ بلیک اُن کی تلاش میں روس کی سرحد پار کر کے فن لینڈ میں داخل ہوگا اور پکڑا جائے گا۔" ہچکوک نے اپنے دفتر کے کمرے کی کھڑکی سے باہر پھیلے آکاش کو دیکھا۔ "شاید کہانی کو کوئی اور ہی موڑ دینا پڑے۔ آخری بات کا تو پردے پر آنے تک پتہ نہیں چلتا....." وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"اسّی سال کی عمر میں پیچھے پھیلی زندگی کو دیکھنا اور اُس کا جائزہ لینا کتنا رومانٹک ہے۔ ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہوا ـــــ شاید اُس میں ہماری مرضی کو کوئی دخل نہ تھا، شاید وہ سب ہماری مرضی کے مطابق تھا یا پھر ہماری اور اُس کی، مرضی کے بین بین۔

"آج بھی ۱۹۲۲ء میں بنائی جانے والی فلم کے لیے لگائے گئے سیٹ میری آنکھوں کے سامنے اُبھرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کچھ کمی رہ گئی تھی۔ سینما کے آرٹ کو سمجھنے اور پرکھنے والی نظر مجھے جرمن کمپنی UPA میں کام کرتے ہوئے نصیب ہوئی۔ اُس کمپنی جیسے سیٹ لگانے دوسری کوئی کمپنی نہ لگا سکی۔ ایک بار اُس نے ایک فلم تیار کرتے وقت ... انٹ کی گہرائی میں سیٹ لگا کر شوٹنگ کی۔"

ہچکوک کا عقیدہ ہے کہ یہ بات اتنی اہم نہیں کہ کردار کیا کہتے ہیں۔ اہم یہ ہے کہ وہ کس جگہ ہیں اور کون سے حالات میں ہیں۔ اُن کا گرد و پیش کیا ہے اور اُس کے پس منظر میں وہ کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی اہم ہے کہ کرداروں کے بولنے سے کیسا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ہچکوک فطری آرٹ کو بیانیہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اُس کی فلموں کے اداکاروں کو اکثر یہ شکایت کرتے دیکھا گیا ہے کہ انھیں خاص منظر میں سیٹ کرنے کے بعد ہچکوک اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس طرح کہتے ہیں۔ دراصل فلم کی سست رفتار فوٹوگرافی ہچکوک کو بور کر دیتی ہے۔

ہچکوک ہیئت، چہرے، شباہت اور آواز کا سب سے زیادہ شہرت یافتہ فلم کار ہے۔ وہ ایڈورٹائیزنگ ایجنسی چھوڑ کر فلم کی دنیا میں آیا اور اپنے تجربہ کو بروئے کار لا کر بہت جلد مشہور ہو گیا۔

اِس شہرۂ آفاق ایکٹر، ڈائرکٹر اور پروڈیوسر کی نجی زندگی بہت محتاط اور سادہ ہے۔ اُس کی فلموں کے ڈرامائی انداز اور سنسنی خیزی کا اُس کی گھریلو زندگی پر کوئی اثر نہیں۔ برسوں تک وہ ایک ہی رنگ کا کالا کوٹ اور پتلون، سفید قمیص اور کالی ٹائی پہنتا رہا۔ اُس کا گھر ایک راہب کی کٹیا جیسا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ کبھی کافی ہاؤس یا نائٹ کلب میں نہیں گیا۔ اُس کا کام ہی اُس کی زندگی ہے ـــــ زندگی جسے اُس نے محسوس کیا ہے، سمجھا ہے، جانا پہچانا ہے اور اپنے ذہن میں بو دیا ہے سینچ کر پروان چڑھایا ہے اور فلم پر اُتار کر دیوتا اور شیطان کا روپ پہنایا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ معصوم خیالات اور جذبات ہی جرم کی بنیاد بنتے ہیں۔ اُس کی اپنی نفسیات اُسے سکول میں پیش آنے والے ایک حادثے کی دین ہے ـــــ ایک بار معمولی سی غلطی کی پاداش میں اُسے ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور باقی [illegible] پر

نظمیں

ضیا فتح آبادی

نئی رُت

ٹھٹھر رہی ہے ہر کلی
شجر شجر ہے منجمد
ہوا خنک
فضا خنک
ہے سرد رات
سرد دن
تپش نہیں ہے دھوپ میں
حدّت آگ میں نہیں
مُردہ جسم
برف برف
ہونٹ سرد
گال زرد
دیا دیا بجھا بجھا
وہ گرمجوشیاں نہیں
وہ بادہ نوشیاں نہیں
مرے خدا، مرے خدا
بتا بتا
یہ زندگی کی رُت ہے کیا
یہ رُت ہے کیا

▲▲

نوبہار صابر

پڑھا یہ میں نے

پڑھا یہ میں نے
کہ "مسکرانا ہی زندگی ہے"
تو مسکرایا میں
لکھنے والے کی سادگی پر
کہ زندگی بھر کے تجربوں کا نچوڑ یہ ہے :-
یہ زندگی اک اتھاہ ساگر ہے آنسوؤں کا
کبھی کبھی جس کی سطح پر
مسکراہٹوں کا کوئی جزیرہ
اُبھر کے آتا ہے سامنے
اور پھر اچانک ہی
ڈوب جاتا ہے
آنسوؤں کے اتھاہ ساگر کی ظلمتوں میں

▲▲

نظمیں

سید فضل المتین

(۱)
اپنے کمرے کی تنہائیاں اوڑھ کر
اب / کہاں، جاؤں / میں
شہر کی بھیڑ میں
چہرہ چہرہ اسے دیکھنے کے لیے

(۲)
دن کی رسوائیاں اوڑھ کر
رات، سوتا رہا
میں، اکیلا
کسی کے لیے

(۳)
راہ رو کے رہو
آگے جانے نہ دو
حوصلہ ہار کے
بیٹھ جائیں گے، سب
آہی جائے گی، شب
ڈوب جائے گا، دن

(۴)
ہمارے بعد تم آئے
تو کیا لائے
وہی شام وسحر کی گردشوں سے آشنا چہرے
وہی ہم تم

نظمیں

اسلم آزاد

محرومی

خشک پتوں پر
جمی ہے کائی پیلی دھوپ کی
کیا
کوئی آوارہ بادل
اس طرف
آیا نہیں؟

▲▲

خوداعتمادی

بند کر کے
ذہن کے سارے دریچے
اپنے
ننگے جسم پر
صابن ملو
جھاگ سے رانوں پہ کوئی
نام لکھو
اور
پھر اس جھاگ کو
اپنی زباں سے
چاٹ جاؤ

▲▲

خلیل تنویر

(۱)

ان آنکھوں کو
کتنی حیرانی ہوگی
جب اُن آنکھوں میں
اشکوں کے بدلے
ریت ملے گی

▲▲

(۲)

جب وہ روتا ہے تو —
کچھ لوگ سہم جاتے ہیں
اُس کی آواز —
موت کا احساس دلاتی ہے

▲▲

(۳)

تیرے آنے سے پہلے بھی
اور تیرے جانے کے بعد
دِشائیں!
رنگوں میں ڈوب جاتی ہیں

▲▲

غزلیں

راج کھیتی

یہ وہم بن کر مچل جاؤں گا
میں پردے سے شب کے نکل جاؤں گا

اگر ساتھ میرا دیا شام نے
میں سورج کا گولا نگل جاؤں گا

یہ دنیا اگرچہ ہے گہری گپھا
گرا بھی تو گر کے سنبھل جاؤں گا

اگر بن سکا تیری آنکھیں نہ میں
تو اشعار میں اپنے ڈھل جاؤں گا

چمک جائے گی راج بزمِ سخن
جہاں سے میں لکھ کر غزل جاؤں گا

▲▲

صفدر

سپر تیر تلوار اور شپرہ
اندھیروں پہ یلغار اور شپرہ

لپکتی شعاعیں برہنہ بدن
ادھر سر پہ دستار اور شپرہ

سرکتی ہوئی سیڑھیوں پر ہوا
اندھیرا پُراسرار اور شپرہ

چھنے بند آنکھوں سے تارِ نظر
ترا پھر بھی اصرار اور شپرہ

سماعت، بصارت اُلجھتی رہیں
وہ تھا گرمِ گفتار اور شپرہ

▲▲

اعجاز تابش

یا تو میرا اپنا بن
یا مجھ سے بیگانہ بن

میں تیری تصویر بنوں
تو بھی میرا سایا بن

کب تک جھوٹے شعر لکھوں
تو بھی تو کچھ اچھا بن

تم بن دل کا حال ہے یہ
جیسے کوئی سونا بن

دل میں سب کے عیب چھپا
تابشؔ پیار کا دریا بن

▲▲

نظمیں

حفیظ آتش امروہوی

سیہ خوف

کالا کُتّا کئی روز سے
اپنی مخصوص آواز میں
بھونکتا ہے
رات کو گہری خاموشیاں
توڑتا ہے
تنگ رستوں پہ چلتے ہوئے آدمی
آنکھیں کھولے ہوئے
اونگھتے ہیں
اور خود اپنے قدموں کی ہی چاپ سے
چونک کر پیچھے
جانے کیا دیکھتے ہیں؟

ساغر کرنالی

مشقِ تازہ

دورِ ماضی
ہو گیا کب کا شہید
دورِ حاضر
کی
لبوں پر جان ہے
دورِ مستقبل
ابھی سے
خودکشی کی مشق میں مصروف ہے

نور اقبال

اجنبی چہرہ

آج کل
آئینے میں
ایک اجنبی چہرہ مجھے گھورتا ہوا
نظر آتا ہے
آج کل
میں بے حد پریشان رہتا ہوں سا

نظریہ

میرے
شہر میں
ایک
اندھا
اپنا
"اندھاپن"
بانٹ رہا ہے
اور
اب تک
نصف آبادی
اندھی ہو چکی ہے۔

تبصرے

وفیاتِ ماجدی یا نثری مرثیے

مرتب : حکیم عبدالقوی دریابادی ۔ ناشر : مولانا عبدالماجد دریابادی اکادمی (رجسٹرڈ) ۶۔ کچہری روڈ لکھنؤ ۔
قیمت : پندرہ روپے ۔

مجموعہ ہے مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے ان تعزیتی مضمونوں اور شذروں کا جو ان کی ادارت میں نکلنے والے اخبارات سچ، صدق اور صدقِ جدید میں شائع ہوتے رہے تھے ۔ جیسا کہ فاضل مرتب کا بیان ہے ، ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی جن میں سے ۲۶۲ اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں جن شخصیتوں کی دائمی مفارقت پر یہ مضامین لکھے گئے ہیں ۔ ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے خاندان والے بھی ہیں والدہ، بھائی، بہن، بیوی اور دوسرے اعزہ اقربا، علمائے کرام اور بزرگانِ طریقت بھی، سیاسی لیڈر بھی، شاعر، ادیب اور صحافی بھی اور اطبا بھی ۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مولانا کے تعلقات و مراسم کی نوعیت ایک سی نہیں تھی ۔ بعض سے خون کا رشتہ تھا، بعض سے دوستانہ تعلقات، بعض سے ارادت و عقیدت کا ناتا، بعض کے وہ خود مخدوم و محترم ۔ لیکن تعلقات و مراسم کی ان مختلف نوعیتوں کے باوجود یہ تعزیتی مضامین اثر آفرینی میں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں اور ان کی یہ اثر انگیزی کسی طرح کی جذباتیت کی مرہونِ منت نہیں ۔ "بوڑھی محبوبہ" کے عنوان سے جو تحریر شاملِ کتاب ہے وہ مولانا نے اپنی رفیقہ حیات کی رحلت پر سپردِ قرطاس کی تھی جن کے ساتھ مولانا کے "وفورِ انس" اور "افراطِ تعلق" کا یہ حال تھا کہ ایک بار انھوں نے اپنی اس کیفیت پر اپنے مرشد حضرت تھانوی رح کے سامنے اپنی تشویش بھی ظاہر کی تھی ۔۔۔ عین ممکن تھا کہ یہاں مولانا کا قلم جذبات کی رو میں بہ جائے لیکن ایسا نہیں ہوا وہی نظم وضبط ، وہی توازن اور اخلاقی نتائج کی طرف رہنمائی کا وہی انداز جو ان کی تحریروں کا عام خاصہ یہاں بھی برقرار ہے اور یہی اسے پُر اثر بناتا ہے ۔

یہ مضامین صرف تعزیتی تاثرات کا اظہار نہیں ہیں یہ مرنے والوں کے مختصر سوانحی خاکوں کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اور اسی حوالے سے ان کے زمانے کی کچھ جھلکیاں بھی ان میں نظر آجاتی ہیں ۔ اس طرح یہ کتاب ایک مخصوص عہد کا جو کم بیش تیس پنتیس سال پر پھیلا ہوا ہے ، معاشرتی اور تہذیبی مرقع بھی بن گئی ہے

★ ——— مخمور سعیدی

فن کار سے فن تک

مصنف : ابوذر عثمانی ۔ قیمت : تیس روپے
کچھ دیگر پتوں کے علاوہ نیشنل اکاڈمی نئی دہلی سے بھی طلب کی جا سکتی ہے ۔

ڈاکٹر ابوذر عثمانی کے مضامین کا مجموعہ ہے مضامین متنوع موضوعات پر ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عثمانی صاحب کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے ۔ پہلے چار مضامین چار شخصیتوں کے بارے میں ہیں یہ شخصیتیں ہیں غالب، اکبرالہ آبادی، اختر اورینوی اور پرویز شاہدی ۔ غالب کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اب بھی لکھا جا رہا ہے ، عثمانی صاحب نے غالب

کی سخن فہمی سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ سخنور ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے سخن فہم بھی تھے اور شعر کے معائب محاسن پر نہ صرف نظر رکھتے تھے بلکہ ایسی گفتگو بھی کر سکتے تھے جو تنقیدی بصیرت کی حامل ہوتی تھی۔ اکبر الہ آبادی کو بھی ہم ایک شاعر کی حیثیت ہی سے زیادہ جانتے پہچانتے ہیں لیکن اکبر نرے شاعر نہیں تھے، اپنے عہد کی سماجی، اور سیاسی اتھل پتھل اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر انھوں نے ایک مفکر کے انداز میں بھی سوچا ہے۔ عثمانی صاحب نے زبان کے مسئلے پر اکبر کے خیالات کا جائزہ لیا ہے اور اس ضمن میں ان کی غیر معمولی بصیرت کی شہادت دی ہے۔

یوں تو اس کتاب میں شامل بھی مضامین معلومات افزا ہیں اور ان میں خیال انگیز مقامات بھی آتے ہیں لیکن دو مضامین خصوصیت سے قابلِ توجہ ہیں۔ ایک وہ جس میں انھوں نے ہماری یونیورسٹیوں میں مروج اردو نصاب کی خرابیوں اور خامیوں سے بحث کرتے ہوئے اس کی اصلاح کے لیے عملی تجاویز پیش کی ہیں۔ عثمانی صاحب چونکہ خود ایک یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں اس لیے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر ان کی محرمانہ نظر ہے اور انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس قابل ہے کہ نصابات کے مرتب کرنے والے سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیں۔ دوسرا ادبی تنقید کی تدریس کے مسئلے سے تعلق ہے۔

عثمانی صاحب کے مضامین پڑھتے ہوئے ایک بات میں نے بہ طور خاص محسوس کی۔ ان کے مزاج میں ادعا بالکل نہیں ہے۔ وہ صاحبِ علم ہیں لیکن اپنی علمیت جتانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے۔ ان کی تحریروں کا مقصد ان سوالات کو سامنے لانا اور ان کے حل تلاش کرنے میں قاری کو شریک کرنا ہے جنھوں نے وقتاً فوقتاً ان کی توجہ اپنی طرف کھینچی ہے۔ ان سوالات پر ان سے پہلے اگر کسی نے غور و فکر کیا ہے تو انھوں نے اس کا بھی حوالہ دے دیا ہے۔

کتابت کی غلطیاں بعض مقامات پر بہت بری طرح کھٹکتی ہیں، بالخصوص اشعار میں جو بہ طور حوالہ درج ہوئے ہیں۔

★ —— مخمور سعیدی

ادب میں ابہام اور اس کے مسائل

مصنف: ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔ ناشر: نیشنل بکڈپو مچھلی کمان حیدر آباد۔ قیمت: بارہ روپے۔

یہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ۱۹ مضامین شامل ہیں جن میں سے ایک مضمون جو نئی شاعری کے بارے میں ہے ایک سوالنامے کے جوابات پر مشتمل ہے۔ میں نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ نئی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ان کے جوابات پڑھ کر یہ خیال گزرتا ہے کہ ان کی رائیں نئی شاعری کے براہِ راست مطالعے سے زیادہ کچھ ایسے مضامین کے مطالعے پر مبنی ہیں جو نئی شاعری کی موافقت یا مخالفت میں لکھے جاتے رہے ہیں کیسی نئی رجحان کو سمجھنے کے لیے یہ طریق کار درست نتائج تک نہیں پہنچا سکتا۔

مجموعے کا پہلا مضمون وہی ہے جس پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ اچھا مضمون ہے اور ڈاکٹر صاحب نے مسئلے کے مختلف پہلوؤں سے تفصیلی بحث کی ہے۔ "امیجزم —— ایک تحریک" "ساتویں دہائی کا طنز و مزاح" "پیروڈی اردو شاعری میں" یہ بھی اچھے معلومات افزا

مضامین ہیں ۔ ان کے علاوہ سات مضامین میں مختلف شاعروں کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ ان جائزوں میں ڈاکٹر صاحب نے عصری اور سماجی پس منظر کو خصوصی اہمیت دی ہے اس سے شعر و ادب کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو سمجھا جاسکتا ہے ۔

ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ کچھ ذہنی تحفظات کے حامل ہوتے ہوئے بھی مصنف کی وسیع النظری اور روشن خیالی کو ظاہر کرتے ہیں اور ان میں افہام و تفہیم کی مخلصانہ کوشش نظر آتی ہے ۔

★ ـــــــ مخمور سعیدی

صبا آوارہ (مراٹھی ڈرامے)

مترجم: نور پرکار ۔ ناشر: مرزا غالب اکیڈیمی ۔ ۲۸ ٹینک اسٹریٹ بمبئی ۸ ، قیمت لائبریری ایڈیشن: بیس روپے ۔ ڈی لکس ایڈیشن: تیس روپے ۔

نور پرکار ہمارے عہد کے ان اہلِ قلم میں ہیں جنھوں نے مراٹھی ادب کو اردو میں منتقل کرنے میں پہل کی ۔ اس سے پہلے مراٹھی کے منتخب افسانوں کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں وہ شائع کر چکے ہیں ۔ ان کے تعاون سے "کتاب" لکھنؤ کا ایک خصوصی شمارہ مراٹھی کہانی نمبر بھی شائع ہوا تھا ۔ ان کے بعد کچھ اور لوگوں نے بھی اس طرف توجہ کی ۔ مراٹھی ادب کے تعارف میں ڈاکٹر یونس اگاسکر نے ایک مستقل کتاب لکھی اور بدیع الزماں خاور نے مراٹھی نظموں کے منظوم ترجمے کیے ۔ اس طرح کے تراجم پر مشتمل ان کی ایک کتاب "تسبیل" حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔

مراٹھی کہانی کی طرح مراٹھی ڈراما بھی بہت ترقی یافتہ ہے ۔ نور پرکار صاحب نے ترجمے کے لیے ایسے چھ ڈرامے منتخب کیے ہیں جو ان کے بیان کے مطابق "معرکہ آرا" خیال کیے جاتے ہیں ۔ ڈرامے کی جان مکالمے ہوتے ہیں اور مکالمے چونکہ بول چال کی بامحاورہ زبان میں ہوتے ہیں اس لیے انھیں ان کی پوری معنویت کے ساتھ کسی دوسری زبان کے محاورے میں ڈھالنا آسان کام نہیں لیکن نور پرکار صاحب اس مشکل کام سے غالباً کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں ۔ غالباً اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اصل مراٹھی ڈرامے میرے سامنے نہیں، سامنے ہوتے بھی تو میں پڑھ نہ سکتا، لیکن ان کا جو اردو روپ نور پرکار صاحب نے پیش کیا ہے، اس میں مکالمے جاندار بھی ہیں، بامحاورہ بھی اور یہ ڈرامے کی عمومی فضا سے پوری مطابقت بھی رکھتے ہیں، اسے ترجمے کی کامیابی پر ہی محمول کیا جانا چاہیے ۔

اس طرح کے تراجم کی افادیت ظاہر ہے اور نور پرکار صاحب کو مبارکباد دی جانی چاہیے کہ یہ مفید کام انھوں نے اس طرح سرانجام دیا کہ اب عام طور پر اس کی اہمیت محسوس کی جانے لگی ہے ۔

★ ـــــــ مخمور سعیدی

کنور ـــ ایک عظیم بنگالی شاعر

مصنف: ابوبکر جیلانی، قیمت: بیس روپے،
ملنے کا پتہ: ادارہ کتاب گھر ۲۰/اے شمس الہدیٰ روڈ کلکتہ ۱۷ ،

مہاراجہ اپورو کرشن بہادر کنور بنگال کے ایک معزز اور ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ وہ اردو کے اچھے شاعر تھے اور غالب اور ذوق کے ہمعصر تھے لیکن ان کا ذکر تذکروں میں بہت کم ملتا ہے ۔ کلکتہ سے "بنگال میں اردو" کے موضوع

پر اکثر کتابیں چھپتی رہتی ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ تحقیق کے اصول اور معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔

کلکتہ کے نوجوان محقق ابوبکر جیلانی نے محنت اور لگن سے کنور کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کو روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے انھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ سے مواد فراہم کر کے مقدمہ اور تعارف کے ساتھ کنور کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے۔ کنور بنگالی تھے لیکن شاعری اُردو میں کرتے تھے۔ مرتّب نے مختلف ریکارڈس اور حوالوں کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ کنور اپنے دور کے ایک اہم شاعر تھے اور دلّی کے شاہی دربار میں بھی ان کی رسائی تھی۔

نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:

خالی نہ کشتگاں سے ترا کوچہ ہے کبھو
آیا جو اس گلی میں وہی چشمِ تر گیا

رات سے صبح تلک کبک دری کو یکدم
تیری بے غیرتِ رفتار نے سونے نہ دیا

اے کنور مت بیکسی پہ ہو ملول
دن سدا کس کا بھلا یکساں گیا

شب کو پاکر شراب خانے میں
ریش پر شیخ جی۔ کے میں تھوکا

کتابت اور طباعت دلکش اور سرورق خوشنما ہے اُمید ہے کہ ابوبکر جیلانی کے خلوص اور محنت کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

★—— معین اعجاز

ہماری لوک کہانیاں

ترتیب و تحریر: نخشب مسعود۔ ناشر: ایچ آرس ۱۲/۳، ۱۷ خوشامد پورہ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳۔ قیمت: آٹھ روپے۔

نخشب مسعود نے جو ایک نوجوان قلمکار ہیں، اس کتاب میں دُنیا کے مختلف ملکوں کی لوک کہانیاں جمع کر دی ہیں۔ لوک گیت ہوں یا لوک کہانیاں وہ دُنیا بھر کے ادب کا قدیم ترین سرمایہ ہیں اور جس طرح کسی قوم کا تحریری ادب زندگی کی طرف اس کے رویّے کو سمجھنے میں معاون ہوسکتا ہے اسی طرح یہ غیر تحریری ادب بھی حیات و کائنات کے بارے میں مختلف قوموں کے ... ... تصوّرات اور ان کے محسوسات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ صدیوں تک انسان خود اپنے اور اپنے گرد و پیش کے بارے میں کس طرح سوچتا رہا، اس کے ابتدائی اخلاقی معیار کیا تھے اور ان پر کس طرح عمل پیرا ہوتا تھا، یہ سب کچھ جاننے کے لیے اس قدیم سرمائے سے واقفیت بہت ضروری ہے۔

نخشب مسعود صاحب نے طرزِ تحریر ایسا اختیار کیا ہے جیسے کوئی زبانی کہانی سُنا رہا ہو اور یہ ان کی کامیابی ہے۔

★—— رزّاق ارشد

بزمِ احباب

● میں الہ آباد یونیورسٹی چھوڑ کر نئی مرکزی حیدر آباد یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہوں۔ دو دن قبل یہاں آیا۔ آج شعبے سے اپریل کا تحریک ملا۔ اس میں یہ خوش خبری پڑھی کہ آپ کو ایوانِ غالب کا نثر کا ایوارڈ ملا ہے۔ مجھے آج تک اس کی اطلاع نہ تھی۔ خبر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں گو بہت دیر سے۔

ــــــ ڈاکٹر گیان چند جین، الہ آباد

● غالب اوارڈ پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے میرے نزدیک کسی انعام یا اوارڈ کی اہمیت اس سے ہوتی ہے کہ وہ کسے دیا جا رہا ہے؟ اور اس بار سچ مچ غالب اوارڈ نے آپ کو تلاش کر کے اپنی اہمیت کو جتایا ہے۔

ــــــ ڈاکٹر قمر رئیس، دہلی

● آپ کو حال میں جو اعزاز ملا ہے اس سے مجھے دلی بلکہ روحانی مسرت ہوئی ہے جب اپنے ساتھیوں میں کسی کی عزت افزائی ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اپنی بھی گردن کچھ اونچی ہو گئی ہے۔

آپ نے تحریک کا جو سلور جوبلی نمبر شائع کیا وہ ایک ادبی کارنامہ ہے۔ میں دو بار اسے پڑھ چکا ہوں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا مطالعہ کر چکا ہوں لکھنؤ کے ادب کے متعلق میری اور آپ کی رائے میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن لکھنؤ میں جان صاحب اور رنگین ہی نہیں ہوئے ہیں بلکہ لسان الہند مولانا عزیز لکھنوی اور لسان القوم مولانا صفی لکھنوی ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں۔ ادب میں آپ کا مطالعہ وسیع بھی ہے اور رفاعر بھی اس پایہ کے ادیب اور عالم انگلیوں پر ہی گنے جا سکتے ہیں چند اشعار موزوں کیے ہیں ملاحظہ ہوں:

بِلا گوپال مِتّل کو جو اعزاز
ہر اک اہلِ ادب ہے اس سے سرشار
قلم کے اور زبان کے وہ دھنی ہیں
مِتّل یہ ہے رسیدہ حق بہ حق دار
میں آتا چل کے بہرِ تہنیت خود
مگر میں کیا کروں رہتا ہوں بیمار
بڑھے مِتّل کی عزت اور شہرت
دُعا دِل سے نکلتی ہے یہ ہر بار

ــــــ گوپی ناتھ امن لکھنوی، نئ

● مئی ۷۹ء کے تحریک میں جمشید پور کے فساد کا اداریہ دیکھا۔ مگر جمشید پور میں جو کچھ، اور جس نوعیت ہوا اسے فساد کہنا فساد کی اصطلاح پر شاید ظلم ہوگا۔ جو واقعہ فوری اشتعال کا نتیجہ ہو اسے فساد کہا جا سکتا ہے جو چیز ایک طویل اور منظم تیاری اور سلسلہ وار اشتعال کا نتیجہ ہو اسے فساد سے کچھ الگ نام دینا پڑے گا۔

عام نفرت اور انتقامی فضا میں ایک آدھ شرف تو اکثر سامنے آتے رہے ہیں مگر ایسی مثال شاید پہلی دیکھنے میں آئی کہ اپنے ہی فرقہ کے تشدد پر آمادہ کو تشدد سے روکنے کے لیے اسی فرقے کے لوگوں جم کر مزاحمت کی ہو اور حالات کا رُخ بدل دیا ہو

فسادات کا یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں کم نہیں ہوگا یا اِن کی بڑھتی ہوئی تشددی نوعیت نہیں ہوگی جب تک معاشرہ مصلحتوں کا اسیر رہے اُن سیاہ طاقتوں کی نقاب کشائی سے احتراز برتتا گا جو شب و روز، زندگی کی ہر سطح پر، خون آشام نفر

زہریلی فصل کی آب یاری میں مصروف ہیں اور کچھ بھی سرخرو ہیں ۔

—— پرکاش فکری، رانچی

● تحریک کا تازہ شمارہ ملا ۔ اداریہ "امید کی روشنی" دل کو چھو گیا ۔ اداریے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے روشن پہلو کو اجاگر کیا ہے اور مرض کے لیے درست نسخہ تجویز کیا ہے ۔

میرا خیال ہے اس ملک سے فرقہ پرستی کی وبا تبھی ختم ہو سکتی ہے جب لوگ اپنی زندگیوں کو اپنے اپنے مذہب کے سانچوں میں ڈھال لیں ۔ ہندو سچا ہندو بنے اور مسلمان حقیقی مسلمان بنے ۔

—— ادم پرکاش لاغر، فرید آباد

● تحریک کا تازہ شمارہ ملا ۔ حسب معمول پسند آیا مندرجات میں کئی چیزیں خاصے کی ہیں جمشید پور سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت ہی Appealing اور بروقت ہے ۔

افسانوں کی تعداد میں اضافہ خوشگوار ہے ۔ اچھے تنقیدی مضامین کی طرف بھی خاص توجہ دیں ۔ مضامین کی کمی کھٹکتی ہے

—— فاروق شفق، کلکتہ

● مئی کا تحریک دیکھا بلکہ ہر ماہ دیکھتا ہوں اور ایک ہی نشست میں پڑھ بھی لیتا ہوں ۔ لیکن خط لکھنے کی پہلی بار جرات کر رہا ہوں ۔ اس امید پر کہ آپ بزم احباب میں جگہ دیں گے ۔ اس بار جمشید پور کے فساد پر آپ کا اداریہ "امید کی روشنی" پڑھا ۔ آپ نے درندوں میں انسانیت کے ایک [illegible] کردار کو پیش کر کے بیشک روشنی پیدا کی ہے ۔ کہانیوں میں احمد عثمانی کی کہانی اچھی ہے ۔ مظہر الزماں خاں نے "انعام" میں جس قوم کا المیہ پیش کیا ہے کاش وہ بیدار ہو جاتی ۔ جلیل تنویر کا افسانہ اپنے عنوان کی طرح ہے ۔ نظموں میں ساجدہ زیدی اور شاہین بدر کی نظمیں اچھی ہیں ۔ بزم احباب میں ضرغام حیدر صاحب کا خط بہت خوب ہے ۔ آج کل ہمارے افسانہ نگار اچھا لکھ کم رہے ہیں اور شور زیادہ مچا رہے ہیں ۔ تقریباً سب افسانہ نگاروں کی یہی حالت ہے البتہ اقبال مجید، شفق، حسین الحق اور مظہر الزماں خاں کی تحریریں اپنے متعلق نظر سے نہیں گزریں یا شاید یہ لوگ دوسرے پرچوں میں شور مچا رہے ہوں گے حالانکہ یہ لوگ خاصے اچھے افسانے مسلسل لکھ رہے ہیں اور چھپ بھی رہے ہیں مگر چپکے چپکے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے ۔ اگر واقعی ایسا ہے تو بڑی اچھی بات ہے کیونکہ وقت ان کو ڈھونڈے گا بشرطیکہ یہ لوگ وقت کو پکڑ کر مٹھیوں میں اچھالتے نہ پھریں جو محض وہم ہوتا ہے وقت نہیں ۔ بہرحال آپ تحریک میں ایسے خطوط بھی چھاپتے رہیے دلچسپی رہے گی ۔

—— ساجد اختر، حیدر آباد

● تحریک مئی کا شمارہ ملا ۔ زکی انور کے تعلق سے آپ نے خوب لکھا ہے ۔ پتہ نہیں ہمارے اندر چھپے ہوئے بھیڑیے کب ہلاک ہوں گے ؟

اس شمارہ میں کرشن موہن، ساجدہ زیدی اور ساحل احمد کی نظمیں خوب ہیں ۔ افسانوں میں احمد عثمانی اور مظہر الزماں خاں کے افسانے ہی متاثر کر سکے ۔ عبدالرحیم نشتر صاحب خواہ مخواہ افسانے لکھ کر وقت ضائع کر رہے ہیں بزم احباب میں ضرغام حیدر کا خط خوب ہے ۔ لیکن اس بحث سے کیا حاصل ۔ چند افسانہ نگار جن کے نام شامل نہیں کیے جا رہے ہیں حیرت ہے کہ وہ اب تک کیوں خاموش ہیں ۔ انھیں بھی اس اکھاڑے میں اب تک تو اتر جانا چاہیے تھے ۔

—— عرفان فہمی، بمبئی

● تحریک مئی ۷۹ء باصرہ نواز ہوا ۔ اپریل کے شمارے میں پانچ کہانیوں کی شمولیت پر میں اظہار مسرت کر چکا ہوں جبکہ تازہ شمارہ میں آپ نے مزید ایک کہانی کا اضافہ کیا ہے اور لطف یہ کہ سر فہرست ایک ایسے فنکار کی کہانی ہے جو گزشتہ ۱۵ برسوں

سے جدید رجحانات اور عصری حیثیت پر مشتمل اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے ادبی حلقوں میں جدید شاعر کی حیثیت سے مقام حاصل کر چکا ہے۔ میری مراد عبدالرحیم نشتر اور اس کی کہانی "آس پاس" سے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ افسانہ نگار کی اپنی زندگی کی روداد ہے جسے اس نے فنکارانہ انداز میں کہانی کے روپ میں پیش کیا ہے۔

بزمِ احباب کے تحت میرا خط شایع ہوا ہے جس میں میرے نام کے ساتھ گلبرگہ چھاپ دیا ہے۔ غالباً کاتب کے ذہن میں راہی قریشی کا نام ہوگا جو تحریک میں اکثر چھپتے رہتے ہیں جبکہ آج تک میری کسی تخلیق کو تحریک میں شایع ہونے کی نہ جانے کس مصلحت کے تحت سعادت حاصل نہ ہو سکی۔

● ——— محبوب راہی، بارسی ٹاکلی

● مئی کا تحریک نظر نواز ہوا۔ جناب سحر سعیدی کی غزل مطالعے سے گزری۔ ان کا ایک شعر پڑھ کر فوراً مجھے جناب شاہد کلیم کا شعر یاد آگیا۔

سحر سعیدی کا شعر:

ہیں زیرِ آب گوہرِ نایاب بے شمار
کیا کیا سمیٹ لائیں گے چھوٹی سی ناؤ میں

شاہد کلیم کا شعر:

ہر سمت میرے قیمتی چیزوں کا ڈھیر ہے
کیا کیا رکھوں سمیٹ کے چھوٹی سی ناؤ میں

اطلاعاً عرض ہے کہ جناب شاہد کلیم کی غزل جس کا شعر اوپر درج ہے الفاظ کے شمارہ مارچ ۷۸ء میں شامل ہے۔ اس مماثلت کو میں توارد تو نہیں کہوں گا۔ از راہ کرم اس خط کو شایع کر دیں۔

● ——— حق اعظمی، گیا

● تحریک کا تازہ شمارہ دیکھا دیکھا ہے گوپال متل صاحب کی خاطر پرچہ دیکھا کرتا تھا اور تمام تحریروں پر بھی نظر ڈال لیا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ مظہر الزماں کا افسانہ جو ایک پروپگنڈہ ہے ترقی پسندوں کے خلاف اور شاید موصوف نے گوپال متل صاحب یا اُن جیسے بہت سوں کی توجہ کی خاطر اچھی کہانیاں لکھتے لکھتے "انعام" جیسی کہانی لکھی ہے تاکہ انھیں بانس کے درخت پر کھڑا کیا جائے تو یہ اُن کے لیے محض وہم ہے کیونکہ آج بھی علی سردار جعفری اور خواجہ احمد عباس وغیرہ وغیرہ ہمارے صحیح ادب میں پہاڑ کی حیثیت رکھتے ہیں جو انھیں یا اُن جیسے بونوں کی دیواریں نوچنے والی حرکتوں سے واقف بھی ہیں اور پھر آپ جیسے حضرات جو پرچہ محض نکال رہے ہیں اس قسم کی چیزوں سے باز رہنا چاہیے ورنہ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں اور رسالے میں کوئی نٹ اونچا قلم۔ یقین ہے کہ آپ توجہ دیں۔

● ——— مراسلہ نگار نے اپنا نام اور پتہ نہیں لکھا

● پیارے ہمدم، سلام محبت، تو پھر یوں ہوا کہ تم نے وہ خبر سُنائی جس نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ زکی انور کی موت کا صدمہ مجھے بہت طرح سے تڑپا گیا ہے جس مخلوط معاشرہ میں تمہارے اس ساتھی نے ہوش و حواس سنبھالے، وہاں مَن و تُو کی باتیں کم اور ہم آہنگی اور پیار و محبت کی نغمگی زیادہ تھی۔ زکی انور کی موت سے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا اپنا ہی کوئی بھائی مجھ سے جُدا ہو گیا ہے۔ کلام حیدری کے ایک افسانہ "بازو کیوں" کے یہ الفاظ" یہ وہ زمانہ تھا جب زمین شق ہو گئی تھی اور ایک بازو اس کا کٹ کر الگ تڑپ رہا تھا کیونکہ دوسرے بازو نے اُسے الگ کر دیا اور خود بھی تڑپ رہا تھا" میرے ذہن میں گونج رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ زکی انور کے قاتل خود بھی جیسے محسوس نہیں کر رہے ہوں گے۔

● ——— راج شرما۔ چنڈی گڑھ

● محترم المقام متل صاحب قبلہ، آداب و نیاز۔ امید کہ مزاج بخیر ہوں گے! "تحریک" نظروں سے گزرا۔ محمود صاحب کی تحریر جمشید پور کے فسادات پر دعوتِ فکر دیتی ہے! اے کاش لوگ اس پر عمل کر پائیں۔

● ——— علی امام نقوی۔ بمبئی

اردو کتابوں کا قومی میلہ

۲۰ر اپریل سے ۲۶ر اپریل تک لکھنؤ میں نیشنل بک ٹرسٹ اور یوپی اردو اکادمی کے مشترکہ اہتمام میں اردو کتابوں کا قومی میلہ ہوا۔ نمائش کا اہتمام بڑے سلیقے سے کیا گیا تھا۔ اس خیال سے کہ اردو کے زیادہ سے زیادہ ناشر اسٹال لے سکیں، کتابوں کے عالمی میلے کے مقابلے میں اسٹالوں کا کرایہ بہت کم تھا۔ نمائش میں داخلے کی فیس بھی نہیں تھی۔ دہلی میں جب اردو ناشرین کا جلسہ منعقد ہوا تو اس میں بعض ناشرین کی طرف سے یہ آواز اٹھائی گئی تھی کہ اس میلے میں اسٹال لگانا کاروباری اعتبار سے مفید نہیں ہوگا، ان کی تشفی کے لیے اردو اکادمی نے اپنی مرکزی لائبریری کے لیے ہر پبلشر سے کتابیں خریدنے کا وعدہ بھی کیا۔ راقم الحروف کا موقف یہ تھا کہ اردو کے ناشروں کو اس میلے میں نفع نقصان سے اوپر اٹھ کر شرکت کرنی چاہیے۔ اردو اکادمی نے اپنا وعدہ پورا کیا لیکن میرا خیال ہے کہ کتابوں کی فروخت ویسے بھی تسلی بخش تھی۔ البتہ زیادہ مانگ علمی کتابوں کی تھی۔ میلے کو کامیاب بنانے میں پروفیسر محمد حسن چیئرمین یوپی اردو اکادمی کی کوششوں کو خاص دخل ہے اگرچہ اس کے معنی یہ نہیں کہ نیشنل بک ٹرسٹ کے ارکان کی مساعیٔ جمیلہ قابلِ ستائش نہیں تھی۔ میلے کے دوران یوپی اردو اکادمی نے اردو ایڈیٹرز کانفرنس اور ناشرین کے سیمینار کا اہتمام بھی کیا تھا۔ یہ دونوں پروگرام ہر اعتبار سے کامیاب تھے، مشاعرہ اور بیت بازی کے ہنگامے بھی تھے جن کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ کامیاب رہے۔

میلے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جو لوگ اردو کے زوال کا ماتم کر رہے تھے ان کا ایمان پھر سے تازہ ہوگیا یہ دیکھ کر کہ اردو کے اتنے ناشر موجود ہیں اور وہ اتنی کثرت سے کتابیں شائع کر رہے ہیں، سبھی اردو والے خوش ہو رہے تھے۔ جناب شارب ردولوی سابق پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ترقی اردو بورڈ پر تو اچھی خاصی جذب کی کیفیت طاری تھی جس سے ملتے بے ساختہ کہتے: "ارے اتنی کتابیں!"۔ جو ناشر اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی کتابیں شائع کرتے ہیں انھیں بھی اعتراف تھا کہ اب اردو کتابوں کی فروخت بڑھ رہی ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں میں قومی اور علاقائی سطحوں پر کتابی میلوں اور کتابی نمائشوں کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔ ابھی کچھ مدت پہلے اردو طباعت و اشاعت کے مسائل پر نیشنل بک ٹرسٹ نے سری نگر میں ایک سیمینار کیا تھا جس کی سفارشات میں ایک سفارش یہ تھی کہ: "مناسب وقفوں سے اردو کتابوں کی نمائشوں کا اہتمام کیا جانا چاہیے تاکہ لوگوں میں کتابوں سے رغبت اور دلچسپی پیدا ہو سکے"۔ اسی لیے جب اردو اکادمی کی طرف سے لکھنؤ میں اردو کتابوں کا قومی میلہ لگانے کی تحریک ہوئی تو نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے اس کی فوراً پذیرائی ہوئی۔

گوپال متل

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ **تحریک** نئی دہلی

شمارہ: ۵ جلد: ۲۷

اگست ۱۹۷۹ء

ادارۂ تحریر:

گوپال متل

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ ۵۰ پیسے

بیرونی ممالک سے:

سالانہ تین پونڈ۔ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس، دہلی۔

کتابت: جمال گیاوی، الف/۱۱، نیو سیلم پور دہلی ۵۳

مقامِ اشاعت: ۹، انصاری مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

انجمن ترقی اردو

گوپال متل

جو لوگ اردو زبان اور اردو ادب کے سچے خیرخواہ ہیں انھیں اردو کے بیرونی دشمنوں کے ساتھ ساتھ داخلی دشمنوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اگر اردو کے جائز حقوق تسلیم نہیں کیے جاتے یا اردو کے خدمت گار اداروں کو مناسب امداد نہیں ملتی تو اس کے خلاف احتجاج ضرور کیا جانا چاہیے لیکن ان لوگوں کے خلاف احتجاج بھی ضروری ہے جو جوڑ توڑ سے سرکاری مدد پانے والے اردو اداروں کے عہدہ دار بن گئے ہیں اور حکومت سے ملنے والی رقوم کا جائز استعمال نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں ان دنوں انجمن ترقی اردو اور اس کے جنرل سیکریٹری خلیق انجم کا بہت تذکرہ ہے۔ الزام تراشی ہمارا شیوہ نہیں، بہت ممکن ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں ان کی بدنیتی کو نہیں بلکہ عدم صلاحیت کو دخل ہو لیکن ظاہر ہے کہ عدم صلاحیت بھی کوئی وصف نہیں جن امور پر لوگوں کی توجہ خاص طور پر مرکوز ہو رہی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ ساڑھے بارہ لاکھ روپے کے خرچ سے اردو گھر بنا۔ اس میں بہت سا روپیہ حکومت نے دیا تھا۔ اردو گھر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اردو سرگرمیوں کا مرکز ہونا چاہیے تھا لیکن خلیق انجم صاحب نے اس کے اسّی فیصد حصے کو تجارتی اداروں کو کرایے پر دے دیا۔ اصولاً وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس معاملے کی پوری پوری تحقیقات کی جانی چاہیے۔ تحقیقات کے دوران یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا کہ جو کرایے وصول کیے جا رہے ہیں وہ موجودہ شرح کے مطابق ہیں یا نہیں۔ یہ اس لیے کہ ان دنوں مکانات اور دفاتر پگڑی کی رقم لے کر کم کرایے پر دینے کا رواج بھی ہے ہم یہ ہرگز نہیں کہہ رہے کہ خلیق انجم صاحب نے ایسا کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ چھان بین کے بعد وہ کم از کم اس حد تک بے قصور ثابت ہوں لیکن اردو گھر کا اسّی فیصد حصہ کرایے پر دینا ایک ایسی بات ہے جس کی جواب دہی غالباً ان کے لیے ممکن نہیں ہوگی۔

۲۔ انجمن کی گذشتہ کارروائی دیکھ کر یہ پتہ چلایا جائے کہ ساڑھے بارہ لاکھ روپے کے صرفے کی تفصیلات کیا کمیٹی نے باقاعدہ طے کی تھیں۔ اصولاً ہر مرحلے پر سیکریٹری صاحب کو کمیٹی کے سامنے معاملہ پیش کر کے اس کی منظوری لینی چاہیے تھی۔ ایسا ہوا ہے یا نہیں اس کی چھان بین ہونی ضروری ہے۔ چھان بین کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ حکومت انجمن کے گذشتہ ریکارڈوں پر قبضہ کر لے اور ان کی چھان بین کر کے حسابات کو باقاعدہ آڈٹ کرائے۔

۳۔ انجمن کی ادبی سرگرمیوں کا صحیح اندازہ وہ لوگ لگا سکتے ہیں جو مولوی عبدالحق کے زمانے کی انجمن کی کارروائیوں سے واقف ہیں۔ اب بھی اگر آپ کسی پرانی لائبریری میں چلے جائیں تو آپ کو انجمن کی اس زمانے کی مختلف علمی اور ادبی موضوعات پر شایع کردہ بے شمار کتابیں مل جائیں گی — خلیق انجم کے زمانے میں کتنی علمی کتابیں شایع ہوئی ہیں اور ان کی پروڈکشن کا معیار کیا ہے؟ انھوں نے کچھ شاعروں کے مجموعے بھی شایع کیے ہیں۔ ان دنوں یہ عام رواج ہے کہ شاعر جب کسی ناشر سے اپنا مجموعہ شایع کراتا ہے تو لاگت

کا کچھ حصہ خود ادا کرتا ہے۔ کاروباری اداروں کو صرف تو ہم اپنے حسابات میں جمع کرنی پڑتی ہیں لیکن خلیق انجم صاحب کے توسط سے انجمن نے شاعروں کے جو مجموعے چھاپے ہیں کیا اُن میں سے کسی میں شاعر کا تعاون شامل تھا۔ اگر شامل تھا تو کیا وہ زرِ تعاون انجمن کے حساب میں جمع ہوا ہے؟

۴۔ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری چھاپ کر بھی کاروباری اداروں نے خوب روپیہ کمایا ہے خلیق انجم صاحب راقم الحروف سے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ ان اداروں کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے، قانونی چارہ جوئی شاید ممکن نہ ہو۔ لیکن کیا یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اس ڈکشنری کا ایک ایڈیشن انجمن کی طرف سے چھاپ دیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ قدرتی تھا کہ خریدار انجمن کی طرف سے شایع شدہ ایڈیشن کو ترجیح دیتے۔ خلیق انجم صاحب نے دونوں میں سے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ اس کی وجہ اُن سے ضرور معلوم کی جانی چاہیے۔ کہیں یہ زر دید قولاد نوم شد والا معاملہ تو نہیں؟ یہاں بھی ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کوئی واضح الزام نہیں لگا رہے۔ بہت ممکن ہے کہ معاملہ صرف کاہلی اور نااہلیت کا ہو لیکن ان "اوصاف جمیلہ" کے حامل کو انجمن کا سکریٹری نہیں رہنا چاہیے اور اگر خرد برد کا الزام ثابت ہو جائے تو اُن کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی ہونی چاہیے۔

انجمن اور خلیق انجم کے مسئلے پر غور کرتے وقت صرف اُردو کے مفادات کو پیش نظر رکھنا چاہیے گروہی سیاست کو نہیں۔ گروہی سیاست سے بلند ہو کر انجمن کے مسائل پر غور کرنا کچھ دشوار بھی نہیں کیونکہ خلیق انجم اپنی ذات کے سوا کسی کے وفادار نہیں۔ کسی زمانے میں یہ مسز گاندھی کے سرگرم حامی تھے اور مسز سبھدرا جوشی کے تو یہ پروردہ ہیں لیکن جیسے ہی حالات نے پلٹا کھایا انہوں نے جنتا پارٹی کے لیڈروں کی خوشامد شروع کر دی۔ ان میں وہ لیڈر بھی شامل ہیں جو مسز سبھدرا جوشی کی تنقید کے خصوصی ہدف تھے۔

غزل

کرشن موہن

کایا پیاس اکام ہوئی ہے
آج کی شام اشام ہوئی ہے
نیکی کی منزل ہے دریا
ڈوبی اور انام ہوئی ہے
شعر شرارت پہ اُترے ہیں
دیدہ وری بدنام ہوئی ہے
کویتا آج اکویتا بن کر
جیم ہوئی ہے لام ہوئی ہے
مست مگن میں تیری کایا
سرتاپا بادام ہوئی ہے
لفظوں سے اٹکھیلی کر کے
طبعِ خام اخام ہوئی ہے
حاضر ہے انبوہِ قوافی!
ایسی مشق تمام ہوئی ہے
ہنستے ہنستے باتیں کر کے
کیسی غزل ارقام ہوئی ہے
فعل فعولن فعل فعولن
عرضِ عروضی عام ہوئی ہے
کرشنا موہن شامِ شرارت
چاہت کا پیغام ہوئی ہے

کمیونسٹ نظریہ مچھلی کا کانٹا

گوپال متل

کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے گلے میں مچھلی کا کانٹا پھنس جائے تو وہ اسے نہ نگل سکتا ہے اور نہ اُگل سکتا ہے یہی حال چینی کمیونسٹوں کا ہے۔ رُوس کے ساتھ رقابت اور ملکی اقتصادی مجبوریاں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ وہ کمیونزم کے عقیدے کو خیرباد کہہ دیں لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کمیونزم کو خیرباد کہنے سے ان کا اپنا اقتدار بھی ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ گومگوں پالیسی اپنانے پر مجبور ہیں۔

کیمونسٹ عقیدے کے مطابق بڑی صنعتوں، خاص طور پر لوہے اور فولاد کی صنعت پر غیر معمولی زور دیا جاتا رہا ہے لیکن "نیوچائنا نیوز ایجنسی" کے ۷ اپریل ۱۹۷۹ء کے مطابق اب زیادہ سرمایہ کاری زراعت اور چھوٹی صنعتوں، مثلاً کوئلے بجلی، تیل وغیرہ میں کی جائے گی اور لوہے اور فولاد کی صنعت کو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ ایسے کئی کارخانے جن میں بہت زیادہ نقصان ہوتا تھا، یا تو بند کر دیے گئے ہیں یا انہیں ایک دوسرے میں مدغم کر دیا گیا ہے "نیوچائنا نیوز ایجنسی" کی ۲۳ مارچ کی اطلاع کے مطابق کنگھائی کے دُور دراز صوبے میں خام لوہے کے ایک ایسے کارخانے کو بند کیا گیا ہے جو ستر لاکھ ڈالر کے خسارے پر چل رہا تھا۔

"اکنامک ریسرچ" کے فروری کے شمارے کے ایک مضمون میں اقتصادی مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ جن کارخانوں کی تعمیر زیر تجویز ہے ان کے اخراجات ریاست کے وسائل سے باہر ہیں۔ اس مضمون کے مطابق یہ سب موجودہ صدی کے پانچویں دہے میں سوویٹ ماڈل کی اندھا دھند پیروی کا نتیجہ تھا۔

ایک طرف جہاں اقتصادی معاملات میں ڈھیلی طرح کا رویہ اپنایا جا رہا ہے وہاں سیاسی معاملات میں سخت گیری کا رویہ پھر سے واپس آ رہا ہے۔ مارچ اور اپریل کے دوران چینی حکام اس نتیجے پر پہنچے کہ خیالات کے آزادانہ اظہار کا رویہ جو نومبر ۱۹۷۸ء میں شروع ہوا تھا اُس پر کچھ پابندی لگنی چاہیے اور پارٹی کی بالادستی پھر سے قائم کی جانی چاہیے مارچ میں شنگھائی کی پارٹی قیادت نے ضابطہ پرستی کی حمایت میں سرکلر جاری کیا۔ مقررہ مقامات کو چھوڑ کر باقی جگہ نعرے اور پوسٹر لگانے کی ممانعت کر دی گئی اور ایسی تقریروں اور سرگرمیوں کی ممانعت بھی کر دی گئی جن سے پارٹی کے استحکام اور اس کی وحدت کو نقصان پہنچتا ہو اسی مہینے کے آخر میں ہوپی، ہیونان اور کوانگ تنگ کے صوبوں میں بھی اسی قسم کے اقدامات کیے گئے۔ خود پیکنگ میں بھی ۳۱ مارچ کو ۶ نکات پر مشتمل ایک ہدایت نامہ جاری کیا گیا اس کے مطابق پوسٹر اب صرف دیوارِ جمہوریت پر ہی چسپاں کیے جا سکتے تھے۔ ایسے تمام نعروں، پوسٹروں، کتابوں رسالوں اور فوٹوگرافوں پر پابندی لگا دی گئی جو سوشلزم، پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کمیونسٹ پارٹی کی لیڈرشپ، مارکسزم لینن ازم اور ماؤ کے افکار کی مخالفت کرتے ہوں۔

ان ہدایات کے نتیجے کے طور پر پولیس نے کئی احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کر لیا۔ چینیوں اور غیر ملکیوں میں پہلے غیر سرکاری سطح پر جو تھوڑا بہت میل جول ممکن تھا اس کا سلسلہ اب موقوف ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سوشلزم ایک ایسا اسم اعظم ہے جو تمام ملکی مشکلات کو چشم زدن میں حل کر دے گا۔ انہیں چین کی صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خوش نما نعروں سے دھوکا کھا کر ہم بھی ایسی دلدل میں کود جائیں جس سے باہر نکلنا ہمارے لیے ممکن نہ ہو۔

اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاعر کا کلام اس کے اپنے اخلاق و عادات کا آئینہ ہوتا ہے۔

یہ خیال اتنا یقینی مان لیا گیا ہے کہ ہمارے ناقدین جب کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے اندر انھیں خود شاعر کی اپنی زندگی جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اور اس خیال ہی کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ دورِ حاضر کے مورخ اور تذکرہ نگار جب کسی ادیب یا شاعر کے سوانح حیات کا بابِ اخلاق و عادات مرتب کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ اُس کے ساتھ زندگی گزارنے والوں سے پوچھ گچھ کریں خود اس کی نظم و نثر ہی سے مواد اکٹھا کر لیتے ہیں اور اس طرح بغیر کسی کد و کاوش کے شاعر کو اُس کے تمام معمولات اور اخلاق و عادات کے ساتھ ہمارے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔

بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو یہ خیال بڑی حد تک درست نہیں ہے اس کے برعکس یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ شاعر کے قول اور اس کے معمولات میں عموماً تطابق نہیں ہوا کرتا۔ یورپ کی شاعری اس کسوٹی پر کہاں تک پوری اُترتی ہے۔ اس کا فیصلہ وہ لوگ کریں جو وہاں کی زبانوں کے عالم ہیں لیکن شاید معاملہ وہاں بھی مختلف نہ ہوگا، جہاں تک مشرقی شعرا کا تعلق ہے کم از کم ڈیڑھ ہزار برس سے ان کے خلاف یہ الزام موجود ہے کہ:

اَنَّھُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ

یہ (شاعر) لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود نہیں کیا کرتے

اس مدعا کے ثبوت میں کچھ شعر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں انھیں سُن کر آپ کے خیال میں شاعر کا کیسا نقشہ بننا چاہیے یہ میں آپ کو بتاؤں گا اور پھر یہ بھی معتبر شہادتوں سے ثابت کروں گا کہ شاعر کی روزمرہ زندگی اُس کے کلام کے بالکل برعکس تھی۔

سب سے پہلے عرب کے ایک مشہور شاعر کے شعر سنیے:

عربی اشعار

إِذَا مَا الْأَشْرِبَاتُ ذُكِرْنَ يَوْماً   فَهُنَّ لِطَيِّبِ الرَّاحِ الْفِدَاءُ

جب کسی دن مختلف شرابوں کا ذکر آ جائے (اور انگوری شراب کا ذکر نہ ہو) تو وہ سب کی سب اس پر قربان کر دی جاتی ہیں۔

نُوَلِّيهَا الْمَلَامَةَ إِنْ أَلَمْنَا   إِذَا مَا كَانَ مَغْثٌ أَوْ لِحَاءُ [1]

ہم شراب انگوری کو ہلاکت کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اگر ہم سے کوئی قابلِ ملامت کام سرزد ہو جائے اس وقت جب کہ مجلس میں کشت و خون [illegible] ہو گئی ہو۔

[1] دیوان ص ۳۔

وَنَشْرَبُهَا فَتَتْرُكُنَا مُلُوكاً ۔۔۔ وَأُسْداً مَا يُنَهْنِهُنَا اللِّقَاءُ[1]

ہم انگوری شراب پیا کرتے ہیں اور وہ ہمیں بادشاہ کر کے چھوڑ جاتی ہے اور شیر بنا دیتی ہے کہ پھر ہمیں دشمن کی مڈبھیڑ کا خوف بھی مانع نہیں آتا۔

ان شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر:

(الف) شراب انگور پینے کا عادی ہے۔ اور

(ب) شراب انگور پینے کے بعد مارکوٹ اور گالی گلوچ سے بھی باز نہیں آتا۔ اور اگر اس پر کوئی ملامت کرتا ہے تو وہ اُسے برداشت کرنے کو تیار رہتا ہے۔ مگر اس کے ترک پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور وہ اُسے ترک بھی کیوں کرے اس لیے کہ،

(ج) جب وہ اور اُس کے ساتھی شراب انگور پی لیتے ہیں تو وہ بادشاہ اور شیر بن جاتے ہیں۔ بالفاظ دگر انگوری شراب کے استعمال سے ان کے اندر شاہانہ عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور جود وسخا اور شیرانہ شجاعت و بہادری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ اوصاف انسان کے تمام اوصاف و اخلاقِ حسنہ کے سرتاج ہیں۔

اسی قصیدے میں کہا ہے:

لَنَا فِي كُلِّ يَوْمٍ مِنْ مَعَدٍّ ۔۔۔ سِبَابٌ أَوْ قِتَالٌ أَوْ هِجَاءُ

ہمیں روزانہ خاندانِ مَعَدّ کی طرف سے گالی گلوچ، کشت وخون یا ہجو و مذمت کا سامنا رہتا ہے۔

فَنُحْكِمُ بِالْقَوَافِي مَنْ هَجَانَا ۔۔۔ وَنَضْرِبُ حِينَ تَخْتَلِطُ الدِّمَاءُ[2]

تو جو لوگ ہماری ہجو کرتے ہیں۔ انھیں ہم اشعار کی مدد سے روکتے ہیں اور زد و کشت سے کام لیتے ہیں جبکہ خون باہم ملتے ہوتے ہیں۔

ان شعروں سے شاعر کے دو کام معلوم ہوتے ہیں:

(الف) وہ خاندانِ مَعَد کی گالی گلوچ اور ہجو و مذمت کا جواب دل و جگر کو برما دینے والے اشعار سے دیتا رہتا ہے۔

(ب) اور تلوار کا جواب تلوار سے دینے سے بھی نہیں چوکتا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان شعروں میں شاعر نے جمع متکلم کے صیغے استعمال کیے ہیں۔ اس لیے یہ شعر اثباتِ مدعا کے لیے ناکافی ہیں۔ لیکن اوّلاً تو یہی صیغے خود شاعر کو بھی اُن اوصاف میں شریک بتاتے ہیں جن کا اشعار میں ذکر ہے۔ اور اگر انھیں کافی خیال نہ کیا جائے تو میں آپ کو کچھ ایسے شعر سناتا ہوں جن میں شاعر نے خاص طور پر اپنے متعلق کہا ہے۔

أَبْلِغْ رَبِيعَةَ وَابْنَ أُمِّهِ نَوْفَلاً ۔۔۔ أَنِّي مُصِيبُ الْعَظْمِ إِنْ لَمْ أُضْغِمِ

ربیعہ اور اُس کے ماں جائے نوفل کو یہ بات پہنچا دے کہ میں ہڈیوں تک پہنچنے والا ہوں۔ اگر درگزر نہ کروں۔

---

[1] ایضاً ص ۴ [2] ایضاً ص ۶۔

وَكَأَنَّنِي بِسِبَالِ غَابٍ ضَيْغَمٌ — يَقْرُو الأَمَاعِزَ بِالْفِجَاجِ الأَفْيَحِ[1]

گویا کہ میں جھاڑیوں کا چوڑے دہانے والا شیر ہوں جو پہاڑی چوڑے چکلے راستوں میں ہرنوں کا پیچھا کرتا ہے۔

غَرِثَتْ حَلِيلَتُهُ وَأَرْمَلَ لَيْلَةً — فَكَأَنَّهُ غَضْبَانُ مَا لَمْ يَجْرَحِ

اُس کی مادہ بھوکی ہے۔ اور وہ خود بھی رات بھر بے غذا رہا ہے تو گویا وہ غضب ناک رہے گا جب تک شکار نہ کرے گا۔

فَتَخَالُهُ .[2]. إِذْ جَرَّبَتْهُ — فَدَعِ الْفَضَاءَ إِلَى مَضِيقِكَ وَافْسَحِ[3]

تو تجربہ کرے ا۔ اُسے فلاں شخص جان لے گا۔ لہٰذا میدان چھوڑ کر اپنے تنگ گھر میں گھس جا۔

ان اشعار سے بالتصریح شاعر کے حسبِ ذیل صفات معلوم ہوتے ہیں :

(الف) وہ عموماً درگزر کیا کرتا ہے۔

(ب) لیکن جب معاملہ حدِ عفو و درگزر سے آگے نکل جاتا ہے تو پھر وہ دشمن کی ہڈیاں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

(ج) وجہ یہ ہے کہ وہ ہمت، شجاعت اور طاقت میں جنگل کے اُس شیر سے مشابہت رکھتا ہے، جو اس لیے غیظ و غضب سے بھرا ہوا ہو کہ اس نے اور اُس کے بال بچوں نے شکار نہ ملنے کے باعث فاقے سے رات گزاری ہو۔

(د) چنانچہ اس کا دشمن ڈر کے مارے میدان چھوڑ کر کونے کھودروں میں چھپتا پھرتا ہے۔

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے متعلق کہا ہے :

قَدْ ثَكِلَتْ أُمُّهُ مَنْ كُنْتُ وَاجِدَهُ — أَوْ كَانَ مُنْتَسِباً فِي بُرْثُنِ الأَسَدِ

جس کو میں پالیتا ہوں، وہ اپنی ماں کے پاس سے گم ہو جاتا ہے، یا وہ شیر کے پنجوں میں لٹکا ہوتا ہے۔

مَا الْبَحْرُ حِينَ تَهُبُّ الرِّيحُ شَامِيَةً — فَيَغْطَئِلُّ وَيَرْمِي الْعِبْرَ بِالزَّبَدِ

جب شامی ہوا چلتی ہے، اور سمندر میں موجیں اُٹھتی ہیں اور وہ کناروں پر جھاگ پھینکتا ہے۔

يَوْماً بِأَغْلَبَ مِنِّي يَوْمَ تُبْصِرُنِي — أَفْرِي مِنَ الْغَيْظِ فَرْيَ الْعَارِضِ الْبَرِدِ[4]

تو اُس دن بھی سمندر اتنا غالب نظر نہیں آتا جتنا تو مجھے اس دن غالب دیکھے گا جس دن میں اولوں بھرے بادل کی طرح غیظ و غضب دکھاتا ہوں۔

۱؎ دیوان ص ۲۷۔ ۲؎ یہاں شاعر کا تخلص ہے۔ ۳؎ دیوان ص ۳۷۔ ۴؎ دیوان ص ۱۰۵۔

مَا لِلْقَتِيلِ الَّذِى أَسْمُو فَآخُذُهُ		مِنْ دِيَةٍ يُعْطَاهَا وَلَا قَوَدِ [1]

جس شخص پر میں غالب آجاؤں اور اسے پکڑ کر قتل کر دوں اس کی نہ دیت دی جاتی ہے اور نہ بدلہ لیا جا سکتا ہے۔

ان اشعار سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بہادری اور شجاعت میں لاثانی ہے۔ موجیں مارتا سمندر بھی وہ ہول پیش نہیں کرتا جو اُسے غضب ناک دیکھ کر لوگوں پر طاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب وہ کسی کو جا پکڑتا ہے تو اُس شخص کی ماں اسے مُردہ مان کر رونے پیٹنے لگتی ہے۔ اور جسے وہ قتل کر ڈالتا ہے۔ اُس کے بدلے اور انتقام یا خون بہا اور دیت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اور قصیدے میں بھی اپنے بارے میں ظاہر کیا ہے کہ:

وَيَعْلَمُ أَكْفَائِى مِنَ النَّاسِ أَنَّنِى		أَنَا الْفَارِسُ الْحَامِى الذِّمَارَ الْمُنَاجِدُ [2]

جو لوگ میرے جوڑ کے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں شہسوار ہوں۔ قابلِ حفاظت چیزوں کا محافظ ہوں اور بہادر ہوں۔

وَمَا وَجَدَ الْأَعْدَاءُ فِيَّ غَمِيزَةً		وَلَا طَافَ لِى مِنْهُمْ بِوَحْشِىَ صَائِدُ [3]

دشمنوں نے میرے اندر کوئی کمزوری نہیں پائی اور نہ اُن میں سے کوئی میرے شکار کے جانور شکار کرنے کے لیے گھوما پھرا ہے۔

ایک اور قصیدے میں کہا ہے کہ:

لِسَانِى وَسَيْفِى صَارِمَانِ كِلَاهُمَا		وَيَبْلُغُ مَا لَا يَبْلُغُ السَّيْفُ مِذْوَدِى [4]

میری زبان اور تلوار دونوں کاٹنے والی ہیں اور جہاں تلوار نہیں پہنچ سکتی وہاں میری زبان پہنچ جاتی ہے۔

اسی سلسلے کے یہ دو شعر بھی ہیں۔

سَأُوتِى الْعَشِيرَةَ مَا حَاوَلَتْ		إِلَيَّ وَأَكْذِبُ إِيعَادَهَا

میں خاندان کو وہ دوں گا جو مجھ سے چاہے گا۔ اور اُس کو جو دھمکیاں دی جائیں گی انھیں جھٹلاؤں گا۔

وَأَحْمِلُ إِنْ مَغْرَمٌ نَابَهَا		وَأَضْرِبُ بِالسَّيْفِ مَنْ كَادَهَا [5]

اگر خاندان پر کوئی ذمہ داری (قرض وغیرہ کی) آپڑے گی تو میں اُسے اٹھاؤں گا۔ اور جو اُس کے ساتھ عیاری و چالاکی برتے گا۔ اُسے تلوار کے گھاٹ اتار دوں گا۔

---

[1] ایضاً ص ۱۰۶۔ [2] ایضاً ص ۱۱۳۔ [3] ایضاً ص ۱۱۴۔

[4] دیوان ص ۱۲۷۔ [5] دیوان ص ۱۳۹۔

ان اشعار سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کی زبان ہی میں دل دجگر کو برما دینے والی تیزی نہیں ہے، اس کی تلوار بھی غضب کا کاٹ رکھتی ہے اور وہ اپنی قوم کی مدد اپنے ان دونوں ہتھیاروں سے کرتا رہتا ہے۔

آپ یہ اوصاف حسن کر بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے کہ میں آپ کو اُن صاحب السیف و اللسان شاعر کا اسم گرامی بتاؤں۔ اچھا سنیے۔ یہ بزرگ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں۔ جو اسلام کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اور جن کے اشعار مسجد مبارک نبوی میں منبر رسولِ پاک سے نشر ہوا کرتے تھے۔ اور ان کے یہ شعر عہد اسلام کے کہے ہوئے ہیں۔[1]

آپ تاریخ و اسماء الرجال کی کتابیں اوّل سے آخر تک پڑھ ڈالیے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہے دیتا ہوں کہ اسلام لانے کے بعد آپ انھیں نہ شراب پیتا پائیں گے اور نہ تلوار چلاتا دیکھیں گے۔ ہاں یہ کام گویا تنہا یہی کرتے نظر آئیں گے کہ اپنی زبان اور اپنے دماغ کو ہمہ تن خدمتِ دینِ مبین کے لیے وقف کر دیا ہے اور ہر کافر انہ قصیدے کا جواب اس سے بڑھ چڑھ کر قصیدے سے دے رہے ہیں۔

ان کی بہادری کے متعلق دو دلچسپ قصے سنیے:

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ غزوۂ خندق میں عورتیں اور بچے قلعے کے سب سے اونچے حصّے میں بخیال حفاظت رکھے گئے تھے۔ اور خود حسان بھی وہاں (بطور محافظ) موجود تھے۔ اتفاق سے اُدھر کوئی یہودی نکل آیا۔ میں نے اُسے دیکھ لیا اور ڈری کہ کہیں یہ شخص یہاں سے واپس جا کر دشمنوں کو ہماری بے سروسامانی سے باخبر نہ کر دے۔ اور ہمیں اچانک کسی مصیبت کا سامنا کرنا نہ پڑ جائے یہ سوچ کر میں نے حسان سے کہا: " جاؤ اسے جا کر مار ڈالو"۔ حسانؓ نے کہا " بنتِ عبدالمطلب، اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کرے۔ تم تو جانتی ہو کہ میں اس کام کا آدمی نہیں ہوں"۔ میں نے یہ جواب سُنا تو خود ایک ڈنڈا لے کر نیچے اُتری اور اُسے مار گرایا۔ جب اس کام سے نبٹ کر اوپر واپس گئی تو پھر حسانؓ سے کہا: " اچھا تو جاؤ اور اس کے ہتھیار اور کپڑے وغیرہ اُتار لاؤ۔ وہ مرد ہے۔ میں اُس کے کپڑے نہیں اُتار سکتی۔" اس کا جواب حسانؓ نے یہ دیا کہ " بنتِ عبدالمطلب میں اُس کا سامان لے کر کیا کروں گا"۔[2]

---

[1] شراب والے اشعار کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں میں خود ان سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ یہ شعر انھوں نے عہدِ جاہلیت میں کہے تھے۔ اور بعد کے اشعار اسلام لا کر بڑھائے ہیں۔ مگر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر یہ شعر اس بنا پر عہدِ اسلام میں نہیں کہے جا سکتے۔ کہ ان میں شراب پینے کا ذکر ہے تو پھر انھیں مدح نبوی کا سرنامہ بنانا بھی کس طرح پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ رسولِ مقبولؐ نے شراب کے برتن تک برتنے کی بھی ممانعت فرما دی تھی۔ تاکہ وہ شراب کی یاد نہ دلائیں۔

یہ شعر تو اس بنا پر قابلِ ترک تھے کہ ایک طرف اُن سے کہنے والے کے شراب پینے کا اظہار ہوتا تھا جو اُس کو مستحق حد قرار دیتا ہے اور دوسری طرف تارکینِ شراب کو ترغیب شرب ہوتی تھی جو برتنوں کے استعمال سے کہیں زیادہ مؤثر تھی۔ لیکن آنحضرت نے اُن کے حذف کا حکم نہ دیا۔ صرف اس لیے کہ یہ شعراء کے دستور کے مطابق تشبیباً لکھے گئے تھے۔ ان کی پشت پر کوئی عمل نہ تھا۔ اور نہ اس کا ڈر تھا کہ یہ رسمی اشعار اور فرضی واقعات لوگوں کے دل و دماغ کو آلاتِ شرب کے مقابلے میں زیادہ متاثر کر سکیں گے۔

[2] دیکھیے تاریخ ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۱۰۸۔ ابن قتیبہ نے کتاب المعارف (صفحہ ۱۳ طبع مصر) میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت حسانؓ مرد میدان نہ ہونے کے باعث کسی غزوے میں شریک نہ ہو سکے۔ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں اُن کی دائمی عدم شجاعت کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر یہ بات مانی کہ سر کی چوٹ کے صدمے سے جنگ کے قابل نہ رہے تھے۔ اس لیے غزووں میں شرکت سے محروم رہے۔

ایک بار انھوں نے آنحضرتؐ کے حضور میں اپنے یہ دو شعر پڑھے :

لَقَدْ غَدَوْتُ أَمَامَ الْقَوْمِ مُنْتَطِقاً　　بِصَارِمٍ مِثْلِ لَوْنِ الْمِلْحِ قَطَّاعِ

میں صبح کو اپنی قوم کے روبرو ایک ایسی تلوار پرتلے میں ڈالے نکلا جو نمک کے رنگ کی اور بہت تیز تھی۔

تَحْفِزُ عَنِّي نِجَادَ السَّيْفِ سَابِغَةٌ　　فَضْفَاضَةٌ مِثْلُ لَوْنِ النِّهْيِ بِالْقَاعِ

اس تلوار کے پرتلے کو مجھ سے ایک زرہ نے دُور رکھا تھا جو وسیع ہے اور ایسی چمکتی ہے جیسے چٹیل میدان میں تالاب کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔

یہ شعر سن کر رسالت مآبؐ مسکرا دیے[2]

لیکن کیا یہ بات حضرت حسانؓ کے عیوب میں گنی جائے گی؟ حاشا و کلا ہرگز نہیں! اس لیے کہ جو صفت فطرتاً ان کے اندر موجود نہ تھی۔ اُسے اسلام کی راہ میں بروئے کار لانے کے وہ مکلف بھی نہ تھے۔ اور جو قوت انھیں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی تھی۔ اس سے انھوں نے دین الہٰی کی وہ خدمت کی کہ اُن کے بعد بھی کوئی اُن سے زیادہ نہ کر سکا۔ اللہ تعالیٰ اُن سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی رہے۔ اور یہی انسان کی آخری مراد ہے۔

فارسی اشعار

اب ایک مشہورِ آفاق فارسی شاعر کی غزلوں کے شعر آپ کو سناتا ہوں۔ دیکھیے کہ ان شاعر کے اخلاق و عادات کس قسم کے معلوم ہوتے ہیں :

برخیز تو، اے ساقی، کاستادہ صبح ما　　برچرخ دُر افشاں شد، روشن شد از و صحرا
مے را تو بیا پے زن چوں زد ز فلک سر خور　　مستی کن و شنگی کن در بزم فگن غوغا
اے زاہد، و اے عابد، جائے تو بود مسجد　　رندانِ خدا کے را میخانہ بود ماوا

کیست کہ بنمایدم راہِ خرابات را　　تا بدہم مُزدِ او حاصلِ طاعات را
لذتِ ساقی و مے ذوقِ خراباتِ عشق　　چاشنی از دل برد تقویٰ طامات را
کاش دہندم بہشت عاریتم زاہدا　　تا بہ گرو کردمے وجہِ خرابات را
تقوی و دین را بشو دست بآبِ قدح　　تقوی چہ و رسم چہ، دین چہ، عادات را

امروز نشستیم چو رنداں بخرابات　　امروز نداریم سرِ زہد و مناجات
امروز شکستیم در توبہ و پیماں　　امروز بجز بادہ مداں جانِ خرابات
امروز ندانیم ز مستی سحر از شام　　امروز ز آفات گذشتیم ز ساعات

---

[1] دیوان ص ۲۵۰۔ [2] دیباچہ دیوان حسانؓ مع شرح برقوقی صفحہ ق، طبع مصر ۱۹۲۹ء۔

دین و مذہب بر ما عشقِ رخِ دلبر ماست　　پیش اربابِ نظر، دین صحیح این است
چند لافی بر عشاق ز تقویٰ و ورع　　بگذر اے شیخ کہ ہما اثرِ تلوین است

گر تو ملولی اے پدر، جانب یارِ من بیا　　تا کہ بہار جانہا تازہ کند دل ترا

معشوقہ بسامان شد، تا باد چنین بادا　　کفرش ہمہ ایمان شد، تا باد چنین بادا
یارے کہ دلم خستے، در بر رخِ ما بستے　　غمخوارۂ یاراں شد، تا باد چنین بادا
ہم بادہ جدا خوردے، ہم عیش جدا کردے　　نک[۱] سر دہ مستاں شد، تا باد چنین بادا
شب رفت و صبوح آمد، غم رفت فتوح آمد　　خورشید درخشاں شد، تا باد چنین بادا

چہ باشد گر نگارینم، بگیرد دستِ من فردا　　ز روزن سر در آویزد، چو قرصِ ماہِ خوش سیما
در آید جانفزائے من، کشاید دست و پائے من　　کہ دستم بست و پایم ہم، کفِ ہجرانِ ما بیجا
بدگویم بجانِ تو کہ بے تو، اے حیاتِ جان　　نہ شادم می کند عشرت، نہ مستم می کند صہبا
دگر از ناز او گوید برو، از من چہ میخواہی؟　　ز سودائے تو می ترسم کہ پیوندد بکس سودا
برم تیغ و کفن پیشش چو قربانی نہم گردن　　گر از من ہر دو سرداری مرا گردن بزن عمدا
تو میدانی کہ من بے تو نخواہم زندگانی را　　مرا مردن بہ از ہجراں، بیزداں کا شرح ملولی[۲]
مرا باور نمی آید کہ از بندہ تو بر گردی　　ہمی گفتم: الا جیف است و بہتان گفتا عدا
توئی جانِ من و بے جان نمانم زیست من بارے　　توئی چشمِ من و بے تو ندارم دیدۂ بینا
رہا کن این سخنہا را، بزن المطرب یکے پردہ　　رباب و دف بہ پیش آور، اگر نبود ترا سرنا
رہا کن ماجرا یکدم کہ من مردم، دلا، از غم　　مبادا کہ سرِ مستی شہم گوید، برو بہ نا

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کہنے والا پہلے نیک اور متقی مسلمان تھا۔ ممنوعات شرعیہ سے پرہیز کرتا تھا۔ اوامر الٰہی کا پابند تھا۔ لیکن ایک کافر معشوقہ کے عشق نے اُس کی زندگی میں یکسر تغیر پیدا کر دیا۔ اُس نے ایمان و اسلام چھوڑ کر کفر اور پارسایانہ زندگی کو خیرباد کہہ کر رندانہ و لاابالیانہ رہن سہن اختیار کر لیا۔ اب وہ ہے اور شراب کی بھٹی اور رندوں کا جمگھٹ۔ اگر کسی دن گرہ میں دام نہ ہوں تو مقدس ترین سامان بیچ کر شراب حاصل کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ چنانچہ اگر جنت پر قبضہ مل جائے تو اسے بھی گرو رکھ کر شراب ہی پی لے گا۔ اور حاصل طاعات کو مُردے بنانے میں بھی اُسے مطلق باک نہ ہوگا۔ اب وہ زاہدوں پر بھی آوازے کستا ہے، اور زہد و مناجات کا دل میں خیال تک نہیں لاتا۔

اس کی معشوقہ بھی آوارہ عورت ہے۔ جس کا تنہا اس شاعر ہی سے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اوروں سے بھی ربط ضبط رکھتی ہے، اور یہ اس کے ہرجائی پن سے نہ صرف یہ کہ ناخوش نہیں ہے۔ بلکہ دوسروں کو اس پر مرنے کی دعوت بھ

---

[۱] یہ اینک کا مخفف ہے۔　[۲] اس عربی جملے کا مطلب یہ ہے کہ جو خدا مُردے زندہ کرتا ہے۔

دیتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اُس کا باپ کسی وجہ سے رنجیدہ وملول ہو گیا ہے۔ تو اُس سے کہتا ہے کہ آیا، میرے پاس سے چل کر ملو سب غم غلط ہو جائے گا۔ اور تازہ دل ہو کر لوٹو گے۔ بتائیے۔ اس قسم کے چال چلن کے آدمی کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے؟ اور کیا رنگ سمجھنا تو درکنار، ایسے انسان کو بھلا مانس ماننے کو بھی آمادہ ہو جائیں گے؟

اب سنیے کہ ان اشعار کے قائل کون صاحب ہیں۔ آپ نے فارسی زبان کی مشہور عالم کتاب "مثنوی معنوی" کا نام ضرور سنا ہوگا جس کے متعلق مولانا جامی علیہ الرحمہ نے یہاں تک مبالغے سے کام لیا ہے کہ وہ اسے "ہست قرآن در زبان پہلوی" سمجھتے ہیں بہرحال ہمیشہ سے یہ مثنوی متقیانِ عالم کے زیرِ مطالعہ رہی ہے اور آج بھی اسے اخلاق وتصوف کی سب سے اچھی اور اونچی کتاب مانا جاتا ہے۔ اس مثنوی کے مؤلف مولانائے روم ہیں جو تمام تذکرہ نگاروں کے نزدیک عمر بھر متقی و پارسا رہے اور کبھی رندی و اوباشی کے پاس تک نہ پھٹکے۔ انہی مولانائے روم کے کہے ہوئے وہ فارسی شعر بھی ہیں جو آپ نے ابھی پڑھے۔ کہیے، اب آپ کیا فرماتے ہیں۔ کیا ان اشعار سے ان کی زندگی کا نقشہ کھینچنا کوئی صحیح نا قدانہ اور درست مورخانہ کام ہوگا؟ میری رائے میں ہرگز نہیں کیونکہ یہ ہرگز ہرگز ایسے نہ تھے۔

اُردو اشعار

اب اُردو اشعار سنیے۔ یہ شعر کسی معاصر شاعر کے تو نہیں ہیں۔ لیکن ایسے شاعر کے ضرور ہیں جس کے جاننے والے ابھی تک رامپور اور اُس کے باہر موجود ہیں۔ دیکھیے، ان شعروں سے شاعر کا چال چلن کیسا ثابت ہوتا ہے:

کیا رسوائے عالم چھپ کے پردے میں مجھے تُونے — تری عصمت کے سر پر خون میری پارسائی کا
کرے کوئی جہاں کیں مجھ سے بڑھ کر بندگی تیری — تعجب کیا ہے اے بت، کارخانہ ہے خدائی کا

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا — کچھ اور بلا ہوتا ہے، وہ دل نہیں ہوتا
پہلو میں انھیں غیر کے بے چین ہی کر دے — اتنا بھی تو تجھ سے تپش دل نہیں ہوتا
مرنے کی بتوں پر یہ ہوئی مشق کہ مرنا — سب کہتے ہیں مشکل، مجھے مشکل نہیں ہوتا

مانعِ بادہ کشی مجھ کو ہیں ناحق واعظ — خرچ کیا ہوتا ہے ان حلق کے دریاؤں کا

کیا کیا ہے شبِ وصل نگہبانیٔ عصمت — چوکی ہے نزاکت کی، تو پہرہ ہے حیا کا

دل وہی، آنکھیں وہی، لیکن جوانی وہ کہاں — ہائے، اب وہ تاکنا، وہ جھانکنا جاتا رہا
گھور کے دیکھا جو ہم چشموں میں جھلا کر کہا — کیا لحاظ آنکھوں کا بھی، اب بے حیا جاتا رہا

کیا بُری شے ہے جوانی، رات دن ہے تاک جھانک
دُور بتوں کا اک طرف، خوفِ خدا جاتا رہا

دل بتوں سے اُٹھا نہیں سکتا — شکر کرتا ہوں ناتوانی کا

چلّو ہی سے پلا دے مجھے ساقیا شراب — ہوں ناتواں، جام اُٹھایا نہ جائے گا

جی میں ہے شیخ و برہمن کو دکھا دوں دو یار — تالا کعبے پہ اُلٹتے ہے، راستے بُت خانے پر

سنتا ہوں محتسب نے کیا میکدے کو غرق — بٹھلا دیا یزید نے پہرہ فرات پر

ہماری مستی تو دیکھ زاہد کہ بتکدے میں شراب اگر پی — ہوئی نہ نشے میں لغزشِ پا، حرم میں ہم جا گرے بہک کر

زاہد تو کیا شیخِ حرم آ کے رہ چلے کھینچتا — ملتی جو تھوڑی سی جگہ میخواروں کی محفل کے پاس

ساقی بھی کو دے میں سر آنکھوں پہ لوں اُسے — ایسی اگر ہے تاک کی دخترِ دیال و دش

وہ رند ہوں کہ گاڑوں پیرِ مغاں کا جھنڈا — عمامہ کرکے پُرزے لے کر عصائے واعظ
کہتا ہے میکدے کا رستہ ہے راہِ دوزخ — چلتا ہے چال اُلٹی ٹھوکر نہ کھائے واعظ

بتوں کی بندگی ہے فرض واعظ — یہ کہہ دیں گے خدا کے روبرو ہم

پھول اُن کو پہنا پہنا کے اغیار — کانٹے مرے حق میں بو رہے ہیں

بُتخانے میں آؤ کبھی اے حضرتِ زاہد — دیکھو کہ تماشے ہیں عجب قدرتِ رب کے

جب وہ بُت ہی نہیں جنت میں تو جنت کیسی — ایسی جنت سے تو دوزخ میں خدا رہنے دے

میخانے سے دل اپنا نہ کعبے سے بھرا ہے — کچھ سوچ کے انجام، اِدھر بھی ہیں اُدھر بھی

میں وہ بدمست وحشی ہوں بجھا دستر سے چلتا — بناتا بوتلوں کی ڈاٹ واعظ کے گریباں کو

جاگ کر کاٹتے ہیں ہجر میں ہم بھی راتیں — رات جگے ہوتے ہیں گر غیر کے گھر ہونے دو

ڈرتا ہوں اور کچھ نہ سمجھ کر وہ جھینپ جائے ‏ سینے پہ اپنے رکھ نہیں سکتا اُٹھا کے ہاتھ

بت سنگِ طور کے ہیں، تر سے سنگ ہی نہیں ‏ زاہد کدھر خیال ہے، نورِ خدا تو دیکھ

خفا کیوں ہو جو آوازے کسے عاشق نے غیروں پر ‏ یہ آزادوں کی باتیں ہیں، یہ اُن کی بولی ٹھولی ہے
عجب ملبوس ہے ہم وحشیوں کا رختِ عُریانی ‏ گریباں ہے نہ دامن ہے نہ پردہ ہے نہ چولی ہے

گزرتے جاتے ہیں کیا جلد وصل کے دن رات ‏ مرے رقیب سے شاید ہیں مہر و ماہ ملے

ہوں وہ میکش کہ دمِ طوف بھی ہے شغلِ شراب ‏ جام پوشیدہ مرے جامۂ احرام میں ہے

مجھ سا دیوانہ ہے کون اس باغ میں نازک مزاج ‏ موجِ بوئے گل مجھے زنجیرِ آہن ہو گئی

قاضی سے جا کے دارِ قضا میں کوئی کہے ‏ سبزی قلندروں کی ذرا چھان جائیے

ان اشعار کو پڑھ کر بتائیے کہ جس شخص کا یہ حال ہو وہ بھلے آدمیوں کے سماج میں رہنے سہنے کے قابل مانا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص سلمان نہیں ہے۔ کافر ہے۔ ہو، دُنیا میں ہر مسلم و کافر کی گزر ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ مگر یہ ایسا مسلم ہے جس نے اپنا مذہب چھوڑ کر ت پرستی ہی اختیار نہیں کی۔ تمام نیکیوں اور بھلمنساہتوں کو بھی طاق پر رکھ دیا۔ نیکوں اور خدا ترسوں کو چھیڑنا اور بھلائیوں کی ہنسی اُڑانا۔ ڈنکے کی چوٹ شراب اور بھنگ پینا اور چرس کے کش لگانا ہی اُس کا وتیرہ نہیں ہے۔ آوارہ عورتوں کی تاک جھانک رچھیڑ چھاڑ میں بھی پرلے درجے کا بیباک ہے۔ نہ قاضی کو خیال خطرے میں لاتا ہے نہ محتسب کو، اس کی جوانی جن رنگ رلیوں ں بیتی ہے اُس کی یاد آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے اور بڑھاپے میں بجائے پچھلے گناہوں پر نادم ہونے کے اور اُلٹا یادِ شباب میں کُڑھتا تا ہے۔

اب آپ یہ سُنیئے کہ ان اشعار کا قائل کون ہے۔ آپ منشی امیر مینائی مرحوم سے ضرور واقف ہوں گے۔ وہ انیسویں صدی کے عرائے اُردو میں بہت مشہور اور ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔ بظاہر یہ اُن کا حال ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ن شعروں میں اُن کا اپنا حال ہرگز بیان نہیں ہوا ہے۔ اب اُن کا حال سُنیئے :

امیر مرحوم جید عالم اور رام پور میں مفتیِ عدالت مرافعہ (یعنی چیف مجسٹریٹ) تھے اور قانونِ شرع کے مطابق فیصلِ عوامات کیا کرتے تھے۔ عدل و انصاف کا یہ عالم تھا کہ نواب کلبِ علی خاں والی رام پور نے اپنی ولیعہدی کے زمانے میں کسی ادم خاص کے مقدمے میں سفارش کی، امیر نے اس سفارش کی مطلق پروا نہ کی اور حق کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ لبِ علی خاں اس پر بہت ناخوش ہوئے۔ جب نواب یوسف علی خاں کا انتقال ہوا اور کلبِ علی خاں تخت نشین ہوکر نواب وئے تو منشی صاحب نے پچھلی خفگی کے پیش نظر اپنا سامان درست کر کے لکھنؤ جانے کی ٹھان لی۔ نواب صاحب کو خبر ہوئی انھوں نے باصرار روکا اور اُن کی اس صفتِ عدل و انصاف پر بڑی قدر و منزلت کی اور آخر اپنا اُستاد بنا لیا۔

اگر آپ نے اُن کی تصویر دیکھی ہے تو اُن کا ظاہر بالکل احکامِ خدا اور رسول کے موافق نظر آیا ہوگا۔ یہ میں عرض کر دوں کہ اُن کا باطن بھی اُن کے ظاہر کی طرح روشن اور پاکیزہ تھا۔ وہ رام پور کے ایک بڑے خدا رسیدہ بزرگ حضرت سید امیر شاہ صاحبؒ سے بیعت تھے اور وِرد و وظائف اور ریاضت و مجاہدے کے مراحل سے برابر گزرتے رہتے تھے۔ اُن کے دن سے زیادہ ان کی رات روشن رہتی تھی۔ اور وہ اس حال کے انسان تھے کہ اگر شعر و شاعری کو چھوڑ کر راہِ سلوک کے ہو رہتے تو آج اُن کے مریدوں کی تعداد اُن کے شاگردوں سے کہیں زیادہ ہوتی۔

میں نے امیر مینائی کے متعلق جو باتیں اوپر لکھی ہیں یہ نہ کہانی ہے اور نہ اس میں مبالغہ ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ابھی تک رام پور میں ان واقعات کے دو چار گواہ ضرور مل جائیں گے۔

اب آپ عصرِ حاضر کے شعراء پر ایک طائرانہ نظر ڈال جائیے۔ ان میں جو حضرات مذہب کے حامی نظر آئیں گے ان کی زندگیاں عموماً اس کی مخالف ملیں گی۔ اور جو صاحبان سرمائے کے خلاف شعلہ افشانی کر رہے ہوں گے، اُن کی شعلہ افشانی دیبا و حریر کے گدوں اور ریشم کے پردوں میں سے باہر نکلی ہوگی۔ جو دُنیا کو حرکت و عمل کی تعلیم دیتے ملیں گے۔ وہ خود یکسر عمل سے کورے ہوں گے۔ اور جو انقلاب کے داعی و منادِ ثابت ہو رہے ہوں گے۔ وہ اپنی زندگی کے طور طریق کے پیشِ نظر انقلاب کے سخت دشمن نظر آئیں گے۔

حقیقتِ حال

دراصل شاعر جو کچھ کہتا ہے اُس میں اُس کے اپنے حال سے زیادہ اُن روایاتِ شعر کو دخل ہوتا ہے جو سینکڑوں برس سے ایک ایک لفظ اور ایک ایک مطلب کے اندر رَس بس گئی ہیں۔ اُردو نے فارسی اور فارسی نے عربی سے مطالب کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی ورثے میں پائے ہیں۔ چنانچہ زبانِ شعر کے اکثر لفظ اپنے وضعی معنی میں استعمال نہیں کیے جاتے وہ اب اشارے اور رموز اور اصطلاحیں بن چکے ہیں۔ ان کا آپ لغوی مطلب مراد لیں تو یہ آپ کی غلطی ہوگی۔ اس کا الزام شاعر پر ہرگز نہیں آتا۔ اس بات کو غالب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

مطلب ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اگر آپ غالب کی اس رائے کو تسلیم نہ کریں تو سچ مچ شاعر کبھی آپ کو پرند معلوم ہوگا۔ جو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے اور کبھی ایک پاگل اور سِڑی جیسے یا تو پاگل خانے کی کوٹھری رہنے کو ملی ہے اور یا ویرانے اور جنگل اس کی جولاں گاہ ہیں۔ اور کبھی شرابی اور بھنگڑ جس کو رندی و اوباشی کے سوا کچھ کام ہی نہیں۔

اُس کی عاشقانہ زندگی بھی آپ کو بیحد ناپاک اور گندی نظر آئے گی۔ وہ کبھی معشوق اور کبھی رقیبوں کے ہاتھوں بار بار قتل ہوگا اور جیئے گا۔ وہ قبرستان کو جاتے میں اور بعدِ دفن بھی آپ کو باتیں کرتا سُنائی دے گا۔ اور وہ سب کچھ کرے گا۔ جو نہ کبھی ہوا اور نہ ہو۔ کبھی وہ اپنے آپ پر رشک کرے گا اور کبھی کہے گا کہ:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ شاعر قوم کی زبان ہوا کرتا ہے وہ اپنا حال ہی نہیں اپنی پوری قوم کا حال بھی بیان کرنا اپنا فرض

سمجھتا ہے۔ اس لیے جو کام اور جو رسم و رواج اُس کی قوم کو پسند ہیں۔ انھیں وہ بھی اپنے یہاں بیان کرے گا اور قوم کے ہر طبقے کے لیے اپنے شعروں میں سامان دلچسپی مہیا کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ دُنیا کی ہر قوم میں اور ہر زمانے کے اندر ہر رنگ کے انسان رہے اور اب بھی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر قوم کی پسندیدگی یکسر پاک باز نہیں ہوا کرتی۔ وہ اچھی باتوں کے ساتھ کچھ برائیوں میں بھی آلودہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی مسلّمہ ہے کہ سب شاعر مصلح بھی نہیں ہوا کرتے جو گلستاں اور بوستاں ہی لکھنے کو بیٹھ جائیں۔ وہ رندوں کی بھی زبان ہوتے ہیں اور اولیا اللہ کی بھی۔ اور اس بنا پر دونوں کی محفلوں کے لیے سامان لطف و انبساط مہیا کرتے ہیں۔ تو کیا یہ اُن پر ظلم نہ ہوگا کہ اُن کی ہر بات کو آپ اُن کا حال قرار دے کر اُن پر نقد و نظر شروع کر دیں؟ میری دانست میں یقیناً یہ ناانصافی اور حقیقت فراموشی ہے۔ ہمارے نقّادوں اور تذکرہ نگاروں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ شاعر کی زندگی کو اُس کے کلام سے نہ سمجھیں۔ بلکہ اُس کی زندگی کو اُس کے ساتھ زندگی گزارنے والوں سے دریافت کریں۔ اور کلام کے جو حصّے اُس کی زندگی سے میل کھا جائیں۔ انھیں اُس کا عمل قرار دیں۔ اور جو زندگی سے الگ تھلگ نظر آئیں۔ انھیں اس کی پسند یا اُس کے ماحول کی پسند پر محمول کریں۔ اور جو ان دونوں سے جدا اور متغایر ہوں۔ انھیں روایاتِ شاعری کا نتیجہ قرار دیں۔ ورنہ مشرقی شعراء اور مشرقی شاعر دونوں پر ظلم ہوگا اور تنقید و تذکرہ بھی اپنے حق سے محروم رہ جائیں گے۔

غزلیں

حسن نعیم

بچ گئے ہم کتنے ہی آلام سے
کام رکھا بس جنوں کے کام سے
شب نے مانگیں کیا چمک خورشید کی
غم کو ناپیں کیوں خوشی کے جام سے
نیند کے آنچل کا سایہ بھی گیا
کہہ دیا جب دن نے سب کچھ شام سے!
سچ تجھے جانا اس کی نسبت نے مجھے
کل اسے جانیں گے میرے نام سے
ایک گردش میں رہا میں آپ ہی
کیا شکایت گردشِ ایام سے
ایک شاعر تھا کہ جاگا رات بھر
سارے احمق سو گئے آرام سے
بھر رہا ہے تو ملو اس سے کبھی
کیا ملے گا نامہ و پیغام سے

مصور سبزواری

یہ ناشنیدہ ہوا کی زبان یاد رکھو
نکل رہی ہے کسی رُت کی جان یاد رکھو
ہے شرق غرب میں بے انت پانیوں کا بہاؤ
کھلیں نہ کشتیوں کے بادبان یاد رکھو
تمہاری جیب میں اک مٹھی آسمان بھی نہیں
زمین بھی ہے معلق چٹان یاد رکھو
ہیں کھوکھلے بھی بزرگانہ شفقتوں کے مدار
سروں پہ گرتے ہیں سائبان یاد رکھو
کدھر کو بھاگو گے تنہا وجود کے ڈر سے؟
ملیں گے ایسے ہی خالی مکان یاد رکھو
جہاں ملے تھے اسی موڑ پہ بچھڑنا ہے
بہت ہی سخت ہے یہ امتحان یاد رکھو

دور آفریدی

عمر بھر کی گھٹن ہے اک یعنی
چوٹ کھائی تھی خوبصورت سی
پھول سے رُخ پہ آنسوؤں کی جھڑی
تو کہاں کھو گئی کسی کی خوشی
پتھروں سے نہ سر کو ٹکراؤ
کوئی تعبیر کب ہے خوابوں کی
تو وہ اک داستاں کہ ختم نہ ہو
اور مرا کام داستاں گوئی
تو وہ نغمہ کہ جس کو ہم نے سنا
ہم وہ ناداں کہ داد بھی ہم نے دی
سونے چاندی کے جسم و جاں کے لیے
دورِ ہنگی کہاں ہے کوئی خوشی!

غزلیں

کرشن مراری

کاوشِ دل کے سوا کچھ بھی یہاں پایا نہ تھا
چند لمحوں کا سکوں بھی اپنا سرمایہ نہ تھا
کوئی عکسِ منتشر پیکر میں ڈھل پایا نہ تھا
اور کچھ احساس بھی ہونے کا ہو پایا نہ تھا
مسکراتی شام تھی منظر بھی اُسایا نہ تھا
سوچ کی دلبر تھکن نے دل کو گرمایا نہ تھا
بیتتے موسم نے شاخِ دل کو جھلسایا نہ تھا
آرزو کا ایک لمحہ بھی نکھر پایا نہ تھا
کس قدر خاموش تھا وہ زندگی کا حادثہ
حادثہ جو حادثوں کے درمیاں آیا نہ تھا
پاس ہی دل سے رہا اک شخص اپنا روز و شب
اُس کی آہٹ کا بھی دھوکا کبھی کھایا نہ تھا
مدتوں سے لے رہا تھا قربتوں کا جائزہ
رنجشوں کا فاصلہ جو درمیاں آیا نہ تھا
دو دلوں کی دھڑکنوں کا [illegible] تھا شاید اسے
قربتوں کی تشنگی کا ڈھب اُسے آیا نہ تھا
بے وفاموں نے بھی [illegible] اسے
ڈوبنے والے کو شاید [illegible] آیا نہ تھا

عروج زیدی

وقت کی سُرعت خرامی، نقشِ پا کوئی نہیں
اس روش کا چلنے والا دوسرا کوئی نہیں
آپ جتنے باوفا ہیں دوسرا کوئی نہیں
صرف میں کہتا ہوں، میرا ہم نوا کوئی نہیں
مجھ کو اس "فرقِ نظر" سے بھی گلا کوئی نہیں
جانتے سب ہیں مگر پہچانتا کوئی نہیں
اے فریبِ التفاتِ دوست! تیرا شکریہ
اب کسی سے میرا پیمانِ وفا کوئی نہیں
آرزوئے خود نمائی نے کہاں پہنچا دیا
پتھروں کا شہر جس میں آشنا کوئی نہیں
شوخیِ الفاظ تردیدِ محبت ہائے ہائے
تھا تسلی [illegible] مدعا کوئی نہیں
[illegible]
دل کی بربادی سے اُن کا واسطہ کوئی نہیں

غزلیں

منور تقی منور

اے صحرا اے مرے بے نام سفر دم لے لے
دشت میں دیکھ ہی اپنے ہی گھر دم لے لے
تیری صورت بھی ابھر آئے گی ان خاکوں میں
اک ذرا مشغلۂ حرف و ہنر دم لے لے
چار جانب ہے دھواں شہر کے میناروں میں
ہوش بیدار پرندے ہیں کدھر دم لے لے
کوئی منظر کہیں آئینہ صفت ہی نہ ملا
ایسے عالم میں کہاں عکسِ نظر دم لے لے
میں بھی سہلاؤں گا زخموں کے سفر کی روداد
پہلے تھم جائے ذرا راہ گزر دم لے لے
چیختی پھرتی ہے بے امن ہوا شہروں میں
سوچ پہ چھا جائے سماعت یہ اگر دم لے لے
کور یہ نقطہ و معانی کے نگر میرے ہیں
فکر آوارہ کہیں ہو تو ادھر دم لے لے

مظفر حنفی

دیا تو کیسے بجھا کہاں سے
نہ جانے آئی ہوا کہاں سے
یہ شہر در شہر تشنگی کیوں
فرات میں کربلا کہاں سے
وہ سر سے پا تک تمام شعلہ
اسے کوئی چومتا کہاں سے
نجات کی آرزو نہیں کی
معاف ہوگی سزا کہاں سے
غزل کے ہر باب میں مظفر
تمھارا نام آ گیا کہاں سے

حامدی کاشمیری

ہر شجر شعلۂ خوں خود نظر آئے گا
ایک دن راہ میں آسیب نظر آئے گا
پہلے بھی روٹھ کے نکلا ہے مسافر کہیں وہ
شام سے پہلے ہی وہ لوٹ کے گھر آئے گا
در و دیوار پہ ہوں لاکھ مسلط آسیب
یک بیک خواب گہ ناز میں در آئے گا
پاؤں مٹی پہ رہیں گے نہ فلک ہاتھ لگے
مرحلہ ایسا کبھی دورانِ سفر آئے گا
بستیاں چھوڑ کے ساحل پہ اگر آئے ہیں
ایک بادل نے کہا [illegible] آئے گا

نظمیں

ناگن

مشتاق علی شاہد

میں منتظر ہوں
یہ شام جب کینچلی بدل لے
تو اپنے گھر سے —— بھاگ نکلوں!
شام کی ناگن سے کھیلوں
مست ہو کر اُس کو چھیڑوں
اور اُس کا زہر جب چڑھ جائے
تو
کرب کے عالم میں
ساری رات تڑپوں ——

اور پھر
شام نے جو کینچلی چھوڑی ہو
اُس میں جا چھپوں ——!

کھوج

شاہ ظہیر

صحرائی سمندر کی بیکرانی میں
وقت بھٹکتا رہا
میں اپنی لاش اُٹھائے
خاموش تن تنہا کھڑا رہا
لوگ مجھ پر پھبتے لگاتے رہے

صلیب پہ چہرے لٹکے تھے
فضاؤں میں ہواؤں کے ماتم کا شور تھا
اندھیری لاش متعفن تھی
میں شہرِ خموشاں کی جانب بڑھا
اپنے تعفن سے بچنے کے لیے
اپنی تدفین کی خاطر . . .

تاکہ
وقت کی چھیڑ سے
اپنے کو محفوظ رکھ سکوں
جی سکوں۔

ایک وحشی لمحہ میں

شاہد کلیم

چاند
سورج
اور ستارے
نیلگوں آکاش کے ماتھے سے نوچ لوں
اور بے پایاں سمندر کے تہی داماں میں پھینک دوں
اس طرح
دور تک پھیلی ہوئی دھرتی کا خطہ
اندھیرے کے گڑھے میں گر پڑے گا
میری آنکھوں کی متاعِ روشنی لٹ جائے گی
ناشناسی کا اک پیرہن ہوگا

پھر سے تنی رہ گئیں۔

وہ شش سے بستر پر پڑا تھا۔ بیبے، دعانیے کے اس طرف کہہ رہی تھی۔ "اسے کیا ہو گیا ہے!" وہ بیٹھا بیٹھا مسکرا دیا۔ یہ عجیب لوگ ہیں۔ قصوں میں ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ ماسی کنتو کو ہر گھر کی خبر رہتی ہے۔ منشی چرن داس کا دکھ ہے کہ سب جو اچھا تھا پچھلے پچاس سالوں میں ملیا میٹ ہو چکا ہے، اس کے زمانے میں گھی اور عورت دونوں ہی چیزیں خالص ملتی تھیں۔

"اس نے تو کلنڈر، تصویریں سب اُتار دیں۔" لڑکا کہہ رہا تھا۔

"شنو یا روتی کی بھی اُتار دی" سرلا دکھی تھی۔

"اپنی فوٹو بھی نہ جانے کہاں گم کر آیا ہے۔" بیبے کو اس کا نکلا حق تھا۔

بیبے نے یہ بات اُس سے بھی پوچھی تھی اور اس نے جواب دیا تھا۔ "اس فوٹو میں مجھے میرا کچھ نظر نہیں آتا تھا، لگتا تھا میں نے کیمرے سے جھوٹ بولا ہے۔" تب بیبے نے یہ بات سارے محلے کو بتائی تھی اور تب ہر چہرہ اسے حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔ کشن اسکوٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تو سب اُس کی تعریف کرنے لگے۔ چرن داس تو اسے ہیرو بنائے دے رہا تھا۔ تب وہ خاموش نہ رہ سکا۔ 'نہیں' وہ ایسا شریف اور نیک بھی نہیں تھا، پشاوری لال کے گھر گیا ہوا تھا۔ مجھ سے پچیس روپے لے گیا تھا، پھر واپس نہیں کیے۔ سب نے اسے اس طرح دیکھا جیسے کشن کا قاتل وہی ہو۔

بیبے کے دالان میں کھلنے والا دروازہ چرچرا کر کھلا اور سرلا جھلکتی ہوئی اندر آگئی۔ ایک نظر اُس پر ڈال کر وہ صراحی لے کر چلی گئی۔ چند منٹ بعد بھری ہوئی صراحی رکھ گئی۔

"میں نے سوچا تمہیں پیاس لگی ہو گی۔"

"پیاس تو —— ہاں بہت پیاس لگی تھی۔"

"تو پانی [illegible] نہیں۔" مسکرا دی۔

"ہاں —— [illegible] —— [illegible] کچھ نہیں کرنے دیتیں۔"

سرلا کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ کمرے سے چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ وہ اُٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا پھر کرسی پر جا بیٹھا۔ سامنے میز پر پیپر ویٹ کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا تھا جس پر ایک سطر لکھی تھی —— وہ تھا بھی اور نہیں بھی —— وہ بار بار اس سطر کو پڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ الفاظ اس کے ذہن میں گونجنے لگے —— وہ تھا بھی اور نہیں بھی۔

نہیں وہ ایسے شخص کی کہانی نہیں لکھے گا جو تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ پشاوری لال کی بیوی کی کہانی لکھے گا جس کی چوڑیاں کانچ سے نہیں، نغموں سے ڈھالی گئی ہیں یا پر کاشو کی جو پیارے لال آوارہ کے گرم ناول پڑھتی ہے۔

ایسی کی تیسی ان سب کی، یہ سب چہرے اور ان کی کالی کرتوتیں پہلے ہی سینکڑوں کہانیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ اس کو کیوں نہ تلاش کرے جو تھا بھی اور نہیں بھی ——

اور وہ کمرے کو تالا لگا کر سڑک پر آ گیا۔

اس نے 'بلیو ہیون' میں جہاں ہر میز پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور ریڈیو پوری آواز سے فلمی گیت فضا میں اچھال رہا تھا، بیٹھ کر چائے پی، سگریٹ ختم کیا اور اس دوران بلیو ہیون کے گنجے، کالے مالک کی باتیں سنیں۔ جو وہ کئی برسوں سے کر رہا ہے۔

"میں پرشوتم سے ملنے گیا، سالے نے پہچانا ہی نہیں۔ یہیں اُدھار چائے پینے آتا تھا۔"

"ہاں چاچا، دراصل 'پہچان' ہمارے اس دور کا اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ میں اکثر اپنا ہی کمرہ بھول جاتا ہوں۔ وہ نام کی تخلیق دیو تو ——" اس نے دیکھا چاچا پلاسٹک کی دستی سے مکھیاں مار رہا تھا۔ وہ پیسے چاچے کے سامنے رکھ کر 'بلیو ہیون' سے نکل آیا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" آواز اور چہرہ جانا پہچانا تھا۔

"ہیل (HELL) سے۔"

"تم میٹنگ میں نہیں آئے، تمہیں افسانہ پڑھنا تھا۔"

"میں افسانے کے ہیرو کی تلاش میں ہوں۔"

وہ جانا پہچانا چہرہ غیر ہو گیا اور وہ اسے وہیں [illegible]

بلا ن چھوڑ کر بس پر سوار ہو گیا جو ابھی ابھی آکر رکی تھی۔
"کہاں جا رہے ہو ؟" اس نے فٹ پاتھ سے پوچھا۔
"پتہ نہیں۔"
بس گھنٹی بجاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
بہت دیر بعد وہ بس سے اترا۔ یونہی منہ اٹھاتے چلتے ہوئے وہ ایک فلک بوس عمارت کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس عمارت سے واقف ہے ——— وہ سیڑھیاں طے کر کے ہال میں پہنچا اور سیدھا لفٹ میں سوار ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے لفٹ مین نے اس سے پوچھا کہ وہ کون سی منزل پر جائے گا۔ اس نے بنا سوچے سمجھے آٹھویں کہہ دیا اور لفٹ اسے اوپر لے جانے لگی۔ اندر لگے آئینہ میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے اس نے سوچا۔ وہ آٹھویں منزل پر کیوں جا رہا ہے۔ وہاں کون ہے کس سے ملنا ہے اُسے۔ ایک بات ٹھیک تھی کہ اس عمارت کی کوئی آٹھویں منزل تھی ضرور۔
آٹھویں منزل پر دروازہ کھل گیا اور وہ لفٹ سے باہر آ گیا۔
اب وہ ایک بڑے دفتر کے سامنے تھا۔ وہ اس دفتر سے بھی واقف ہے۔ کمال ہے۔ وہ ہال میں داخل ہو گیا۔ ٹائپ رائٹروں کی آواز باتوں کی آواز، فائیلوں اور کاغذوں کی آواز۔ ہاں وہ ان سب سے واقف ہے۔ لیکن وہ اکثر غلط جگہوں پر پہنچ جاتا ہے۔
کام میں مصروف کچھ لوگوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر باسی اخبار کی طرح نظر انداز کر دیا۔
"کس سے ملنا ہے ؟" ایک بارعب چپراسی نے پوچھا۔
اس نے دماغ پر بہت زور دیا لیکن اُسے ایسا کوئی نام یاد نہیں آیا جس سے اُسے ملنا ہو اور جو یہاں کام کرتا ہو۔
"دراصل میں یہاں سب کو جانتا ہوں، کوئی مجھے نہیں جانتا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس سے ملوں۔"
"نوکری کے لیے آئے ہو ؟"
"آیا تھا، لیکن تب سفارش نہیں تھی۔"
"اب ہے ؟"
"اب بھی نہیں ہے۔"
چپراسی حیران سا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بظاہر بے ضرر آدمی سے کیسا سلوک کرے۔ تب ہی کسی نے چپراسی کو آواز دے لی اور وہ اُدھر چلا گیا۔
وہ چلتا ہوا ایک میز پر گیا جہاں ایک نوجوان ٹائپ کر رہا تھا۔
"آئیے۔"
"دراصل اس کرسی پر مجھے کام کرنا تھا، لیکن میں کسی بڑے آدمی کا سالا یا بھتیجہ نہیں ہوں۔"
"کیا مطلب ؟"
"میری نوکری کے لیے درخواست بغیر کسی وجہ کے ریجیکٹ کر دی گئی تھی۔"
"تو پھر میں کیا کروں۔"
"کچھ نہیں، لیکن یہ جگہ میری بھی ہو سکتی تھی۔"
اُس نوجوان نے چپراسی کو آواز دی اور اسے باہر نکالنے کے لیے کہہ کر ٹائپ کرنے لگا۔ چپراسی اُسے باہر سیڑھیوں کے سامنے چھوڑ آیا۔
وہ ایک ایک سیڑھی اترتا نیچے سڑک پر پہنچ گیا۔ ہری روشنی ہونے پر اس نے سڑک کراس کی اور اُس شخص کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جو لکڑی کی صلیب پر پیتل کا مسیح لٹکائے بیچ رہا تھا۔
"ایک ہی رہ گیا ہے، پانچ روپے میں۔"
وہ جانے لگا تو وہ شخص بولا۔
"چار دے دو۔"
وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تو اس شخص کی آواز سنائی دی۔
"آ جاتے ہیں سالے ———"

●●

لباس

عبدالرحیم نشتر

لبس میں قدم رکھتے ہی اونچی نیچی آوازوں نے مجھے گھیر
لیا۔ کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ لمبی اونچی پشت والی برتھ پر
لڑکی کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاس گنجائش نکل سکتی تھی۔ لیکن
ایک بڑھا مگر اس نے ایسی بھرپور نگاہ ڈالی کہ میں جگہ ہوتے
ہوئے بھی اس کے پاس نہیں بیٹھ سکا۔ نہ جانے کیوں ——؟
بنڈارا روڈ کو جانے والی ناگپور سیکشن کی یہ آخری بس تھی۔
مختلف دفاتر میں کام کرنے والے بابو لوگ ایک دوسرے سے
لگتے ہوئے اسٹینڈنگ بار کا ہینڈل پکڑے کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح
ان کی چہلیں، ہنسی مذاق، [illegible] اور فقرے بالکل آج بھی
شباب پر تھیں۔ ایک جھٹکے سے مجھے داہنی بازو سے دھچکا ہوا
کہ بڑھا اور لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ایک تیز نگاہ مجھ
پر ڈالی اور پہلے کی طرح بُننے میں منہمک ہو گئی۔

وہ کون تھی ——؟ میں جانتا نہ تھا۔ شاید کسی آفس میں
کلرک ہو مگر ملازمت کرنے والی اور لڑکیوں کی طرح فلرٹ نہیں
تھی۔ سانولا رنگ ——! ایک انوکھی جاذبیت اور کشش سے
بھرا ہوا گول چہرہ ——! [illegible]
ابھری سیاہ آنکھیں ——! اعتماد سے بھری ہوئی [illegible]
ہلکی چاکلیٹ رنگ ساڑی میں لپٹی ہوئی بائیں پہلو پر اس کا بیگ
رکھا ہوا تھا اور ہاتھوں میں دو سوئیاں تیزی سے گردش کر رہی
تھیں۔ سلائی کے گولے دھیرے دھیرے کھلتے تھے، اور پیچھے
رستے تھے [illegible] لگائے چلی جا رہی تھی۔ مجھے
یہ بات میں کچھ چبھتا ہوا سا محسوس ہوا۔

آس پاس کی نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اس پر نظریں
گاڑے ہوئے تھے مگر اس کی جھکی ہوئی پلکیں اور سنجیدہ چہرے کا
کوئی رنگ نہ ابھرا۔ وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ تیزی سے حرکت کرتی
انگلیاں، دھاگوں سے الجھتی ہوئی سلائیاں دھیرے دھیرے
کھلتے ہوئے اون کے گولے اور [illegible]
اس کے پاس بیٹھ گیا تھا اب کچھ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ اس
نے دونوں ہاتھ باندھ لیے تھے اور بس سے ٹیک لگا کر آنکھیں
میچ لی تھیں۔ لڑکی نے اپنی ساڑی کو درست کیا۔ [illegible]
آزمائشی نگاہ ڈالی اور پھر سے بُننے لگی۔ [illegible]
اور پاس بیٹھا ہوا تھا۔ نکلتا ہوا قد، بھرا بھرا جسم، [illegible] آنکھیں
اونچی سی ناک اور چوڑی پیشانی ——! [illegible] بال اڑے
ہوئے نہ ہوتے تو وہ کچھ اور [illegible] پرکشش ہوتا۔ سر کے پچھلے حصے میں
تھوڑے تھوڑے بال رہ گئے تھے اور وہ تقریباً دس منٹ سے
ان میں کنگھا پھیر رہا تھا۔ بار بار اس کا ہاتھ بالوں کو [illegible]
سجانے کے لیے اٹھتا اور بار بار بال بکھر جاتے۔ [illegible]
سے لڑکی کی طرف دیکھ لیتا اور [illegible]
[illegible]
نے مجھے اپنی طرف تکتا دیکھ لیا ہے۔ [illegible]
بناتے ہوئے کنگھا اس نے جیب میں ڈال لیا تھا [illegible]
سے جھانک کر بھاگتے ہوئے منظر دیکھنے لگا۔ [illegible] اس کی
آنکھوں میں عجیب سی بے چینی اور سراپے میں [illegible] کیفیت
نظر آتی ہے۔ وہ ٹھیک طرح سے اپنی سیٹ پر [illegible]
وہ مسافر جو اس کے بازو بیٹھا ہوا ہے [illegible] تکلیف [illegible]
اٹھا اور اس نے غصیلی آواز میں [illegible]

پل کو لگا جیسے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہو مگر وہ لڑکی
بے حسی لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ اس نے لڑکی کو سوئی دھاگے میں
لیا ہوا دیکھا طمانیت سی محسوس کی اور . . .

سارے مسافر سہمے ہوئے بچوں کی طرح بیٹھے ہوئے
تھے کسی کی بھی ہمت نہیں تھی وہ اس نظریں اٹھتیں، لڑکی کے
چہرے پر کوئی احساس کا نشان [illegible] اطمینان دیکھ کر
[illegible] میں گھورنے لگتیں۔ میں لڑکی کے بالکل سامنے کھڑا ہوا
تھا۔ ایک بار میرا پاؤں اس کی سلائی کو چھو گیا۔ اس نے اس
طرح دیکھا جیسے مجھے ڈانٹ رہی ہو اور اس کے اس طرح دیکھنے
سے مجھے لگا وہ کوئی لڑکی نہیں ہے، ایک ذمہ دار اور سیانی عورت
ہے۔ میرا پاؤں پیچھے لوٹ آیا اور وہ اسی طرح ٹانکے لگانے میں
مصروف ہو گئی۔ اب الگ الگ دھاگوں نے سوئیوں کے بے شمار
پھیرے کھا کر [illegible] ایک شکل اختیار کر لی تھی۔ شاید وہ کوئی
سوئٹر بُن رہی تھی۔

اس کے سامنے والی بنچ پر ایک بڑھیا اور دو عورتیں بیٹھی
ہوئی تھیں۔ ایک عورت ضعیف تھی۔ اس کے بال سفید اور
[illegible] تھا۔ وہ چکنی سپاری چبا رہی تھی۔ اس کی بجھتی ہوئی
آنکھیں کھڑکی کے باہر کچھ دیکھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کیا ——؟
اڑتے ہوئے پنچھی، گزرتے ہوئے درخت، سمٹتے ہوئے کھیت،
لہراتی ہوئی پگڈنڈیاں، بھاگتی ہوئی سڑک، لاریوں سے لٹکتی ہوئی
سواری —— یا شاید —— کھوئے ہوئے دن، بیتے ہوئے
لمحے، بھولا بسرا گیت، سلونی سی شام، پیلا سا آنگن، کھیلتے
کودتے بچے، اور . . .

بڑھیا کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کی گود میں لیٹا ہوا بچہ
اچانک رونے لگا اور وہ اسے تھپکنے لگی مگر بچہ کسی طرح چپ
نہ ہوتا تھا۔ بچے کے بلکنے سے آس پاس کا ماحول کچھ تبدیل سا
ہو گیا۔ کچھ کی آنکھوں میں شفقت اتر آئی۔ کچھ جھلاہٹ میں جلتا
ہو گئے۔ اور کچھ کے چہروں پر ہمدردی کے آثار نظر آ رہے تھے۔
اُون کے گولے تھم گئے۔ سلائیاں [illegible]
پلکیں ادھر [illegible] سیدھی ہو گئیں اور اس نے [illegible]
لے لیا [illegible] اس کے ہاتھوں میں [illegible]
دھیرے دھیرے خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا وہ لڑکی اب کسی سگھڑ
عورت کے بجائے ایک شفیق ماں بن گئی تھی۔ مگر بچہ بڑا شیطان
تھا۔ اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔ بچے کی چیخیں، بس کی گھن
گرج اور مسافروں کے شور سے کسی ہفتہ واری بازار کا ماحول
بن گیا تھا۔ بس اپنی رفتار سے دوڑی جا رہی تھی اور بچہ اپنی
قوت سے روئے جا رہا تھا۔ اس کی ماں نے اسے اپنی گود
میں لے لیا اور آنچل میں چھپا کر اسے دودھ پلانے لگی۔ اُون
کے گولے مسکرانے لگے۔ اس کے چہرے کی ملاحت مزید
جاذب نظر ہو گئی اور اس نے پھر سے سوئیاں سنبھال لیں۔

سوئی کی ہر نوک سیدھی میرے سینے میں پیوست ہو جاتی
ہے اور ایک ایک ریشہ ٹوٹ کر اور جڑ کر کوئی ٹانکا بنتا
جاتا ہے۔ یہ عمل اسی طرح چلتا رہا تو میں لہولہان ہو جاؤں گا۔
میرے بدن میں انیک دراڑیں پڑ جائیں گی۔ ہر دراڑ ایک
ٹانکا، ہر ٹانکا ایک شگاف اور ہر شگاف سے میری برہنہ
آتما کی جھانکی، جو دیکھنے والوں کی آنکھوں میں اٹکنے لگے گی
اور وہاں سے گر کر ان کی گالیوں کی زد پہ آ جائے گی۔ میں نے
کوشش کر کے جسم پر ضبط کے پھاہے رکھنے شروع کیے مگر
اس کی انگلیاں اسی طرح گردش میں ہیں۔ وہی سوئی اور
اُون کے گولے ——!

بس رکی ہے۔ میں ہڑبڑا کر، گرتا پڑتا نیچے اترتا ہوں۔
گھر پہنچتے ہی کچھ نوالے توڑ کر میں نے ہاتھ دھو لیے اور بستر
میں گھس پڑا۔ میری بیوی برتن دھو کر اُٹھی تو میں نے اسے
آواز دی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی قریب آئی تو میں
نے اسے کھینچ لیا۔ اور اُون کے گولے دھیرے دھیرے کھلنے
لگے اور . . . مجھے لگا جیسے میری برہنہ آتما کو لباس
مل گیا ہو۔

حادثہ

راج شرما

وہ آلتی پالتی مارے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اُس نے کمرے میں آتے ہی پہلے اُس کی طرف دیکھا اور پھر صوفے کی طرف، صوفہ پر ریشمی دھاری دار کپڑے کا ایک باریک سا غلاف چڑھا تھا اور اُس پر ایک صوفہ پیس بچھا تھا۔ اس پر تین جگہ ہین دھاگے کے کٹ ورک میں ایک عورت کا بنا ہوا تھا جو ہاتھوں میں پھول لیے ماتھے کو چھو رہی تھی جیسے آنے والے اور صوفے پر بیٹھنے والے کا خیر مقدم کر رہی ہو۔ اس کی بیوی اس صوفے کا بہت دھیان رکھتی تھی۔ اُس پر کسی کو کم ہی بیٹھنے دیتی تھی۔ اسپرنگ خراب ہو جائیں گے۔ غلاف خراب ہو جائے گا یا پھر صوفہ پیس میلا ہو جائے گا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تھا کہ ایک متوسط گھر میں صوفہ STATUS SYMBLE کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔ بیٹھنے کے لیے نہیں۔ جو آدمی بیٹھا تھا، آلتی پالتی مارے، اس نے انگلیوں میں بیڑی دبا رکھی تھی اور اسے ہونٹوں سے لگائے کش پر کش کھینچ رہا تھا۔ اُس کی مونچھیں سفید اور بیڑی کے دھوئیں سے بھوری بھوری ہو گئی تھیں۔ اُس کے کانوں میں پیتل کی بالیاں تھیں۔ اُس نے پتلی سی سفید رنگ کی پاپلین کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اور نیچے سفید رنگ کی مگر قدرے میلی سی دھوتی تھی پاؤں اس کے گندے تھے، جن پر راستوں کی گرد جم کر جسم کی میل کا حصہ بن گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے نہایا نہ ہو۔

اسے دیکھتے ہی اس کی باچھیں کھل گئی تھیں۔

"آ گئے ہو، رام لال جی۔"

"جی۔" اُس نے اُس کے سراپا کا جائزہ پہلے ہی سے لیا تھا اور دوسرے کمرے میں چل دیا وہ بولا "پرنام، بہت دنوں کے بعد نظر آئے پنڈت جی۔ خیریت تو ہے نا!"

"ہاں بھئی، سب کُشل پورو ک ہے۔ تم سناؤ۔"

وہ دوسرے ملحقہ کمرے میں چلا گیا تھا۔ اُس کی بیوی اُس کی منتظر تھی۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے کچھ جاننا چاہا تھا مگر اُس کی بیوی کے چہرے پر مسکان تھی۔ پھر وہ اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے رسوئی میں چلی گئی۔ اس نے اپنا بیگ میز پر رکھ دیا اور اس کے پیچھے پیچھے رسوئی میں چلا گیا۔

"ہاں" اُس نے سرگوشی کے انداز سے پوچھا تھا "کیسے آیا ہے یہ پنڈت؟"

"وہ آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ لڑکے کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ کیا کر رہا ہے؟ کتنی عمر ہے؟ ہمارا اُس کی شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟؟"

"تو یہ بات ہے؟" اب وہ بھی مسکرایا "چائے پلائی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، آپ کا ہی انتظار تھا۔"

"بچے کہاں ہیں؟"

"موہن کی آج شام کی شفٹ ہے۔ چھوٹا پکچر دیکھنے گیا ہے۔ میں چائے لاتی ہوں۔ آپ چل کر بیٹھیے۔"

وہ پھر ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا اور کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ پنڈت جی جیسے کسی گہرے انہماک سے ابھرے تھے بولے "تو پھر سناؤ بھائی۔ دفتر کا کام کاج تو ٹھیک چل رہا ہے نا؟"

"جی یہ سب بھگوان کی مہربانی ہے۔ آپ نے ابھی تک چائے وغیرہ کیوں نہیں پی؟"

"لو بھئی۔ اب تم آگئے ہو تو چائے بھی پی لیں گے!"

اتنے میں چائے آگئی۔ ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے پنڈت جی بولے۔ "میں نے سوچا، بہت دنوں سے درشن نہیں کیے۔ ملتا ہی چلوں۔"

"بہت اچھا کیا پنڈت جی آپ نے۔"

"ہاں بھئی، جب تمھارے پتا جی زندہ تھے تو اکثر آنا رہتا تھا مگر . . ."

"اب بھی آپ آیا کیجیے نا!"

"بنا کام کے کہاں آیا جاتا ہے، بیٹے،" پنڈت جی نے دوسرا بسکٹ منہ میں ڈال لیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی!" اس کے دل میں ایک بے چینی سی تھی کہ پنڈت اس کے لڑکے کے لیے کس لڑکی کی تجویز لے کر آیا ہے۔

چوتھا بسکٹ کھاتے ہوئے پنڈت کہہ رہا تھا "تو جی میں حاضر ہوا تھا۔ موہن کے لیے۔"

"جی۔ کہیے" وہ پنڈت کی کھانے کی عادت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اسے اپنے گھر آنے والے لوگوں کی کھانے کی عادتوں کا تجزیہ کرنے کا شوق سا تھا۔ کون زیادہ کھانے کا شوقین ہے اور کون کم۔ وہ خود اگر کبھی کسی کے گھر جاتا تھا تو صرف چائے ہی پیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آج کل کی مہنگائی کے زمانے میں اس جیسے متوسط گھروں میں کھانے کے لیے کچھ رکھنا ہی نہیں چاہیے۔ مگر لوگ تو آنکھ جھپکنے میں بازار سے لپک کر سموسے لے آتے ہیں۔ مٹھائی لے آتے ہیں —— دال موٹھ اور بسکٹ —— اس بات کا انحصار آنے والے کے درجہ پر ہوتا ہے۔ اس پر خرچ ہوتا ہے اور مہنگائی کے زمانے میں جب کہ . . . تو وہ کھانے کے لیے کچھ رکھنے کے خلاف تھا اور اگر رکھا بھی جائے تو آنے والے کو کھانا نہیں چاہیے۔ دوسروں کی عزت افزائی سے سیر ہو جانا چاہیے۔

اس دوران پنڈت کہے جا رہا تھا "لڑکا اب جوان ہے۔ ہوشیار بھی تھی کہ اب بھگوان کی کرپا سے چھبیسواں برس لگ رہا ہے۔ برسر روزگار ہے اور . . ."

اس نے اپنے خیالات کے تانے بانے سے نکلتے ہوئے کہا تھا "ہاں، وہ تو ٹھیک ہے پنڈت جی۔ میں نے تو کئی بار کہا ہے، بھائی شادی وادی کر لو مگر وہ اس طرف دھیان ہی نہیں دے رہا۔"

پنڈت جی عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے بولے "شادی اسے کرنی ہے۔ ارے مورکھا نند، شادی تو اس کی تمھیں کرنی ہے۔ کیا تم نے کوئی لڑکی دیکھی ہے؟"

"میں نے . . ." اب اس کے ہنسنے کی باری تھی۔

"ہاں" پنڈت جی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں نے لڑکی تو نہیں دیکھی مگر لڑکی مجھے دیکھ کر کیا کرنی ہے۔ شادی تو لڑکے کو کرنی ہے۔"

اب تک اس کی بیوی ان کے پاس آکر بیٹھ چکی تھی۔ بولی۔ "یہ تو پنڈت جی۔ ایسے ہی الاپ شناپ بولتے رہتے ہیں بھلا ان کی لڑکی دیکھنے وہ لوگ نہیں آئے تھے۔" وہ مسکرائی۔

"ارے بیٹی، آج کل تو لوگ کئی کئی لڑکیاں دیکھتے ہیں۔ جہاں بھی جاتے ہیں، ان کی خوب سیوا ہوتی ہے۔ چائے پانی الگ اور کھانا الگ اور پھر یہ کہہ کر آجاتے ہیں کہ سوچ کر بتائیں گے۔ کون بتاتا ہے بھائی کسی کو۔"

"یہ بھی خوب رہی۔" وہ کہنے لگا۔ دراصل وہ پنڈت جی کو کھاتے اور چائے پیتے دیکھتے دیکھتے کھیج گیا تھا۔ "لڑکے کے لیے وہ دیکھنا ہوا یہ تو جیسے کوئی بھینس یا گائے خریدنا ہوا۔ کبھی یہاں دیکھی کبھی وہاں دیکھی۔ اسی لیے تو . . ."

"پنڈت جی۔ یہ تو ان سے بھی لڑ پڑے تھے۔ وہ لوگ اپنی دنیا کو دیکھنے آئے تو یہ کہنے لگے، دو چار منٹ میں آپ اس لڑکی کی کون سی خوبی جان سکیں گے۔ چہرے کے رنگ سے یا بولنے کے ڈھنگ سے کیا آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس لڑکی میں وہ تمام صفات ہیں جو ایک اچھی گھر چلانے والی لڑکی میں

مل جائیں۔ بس پنڈت جی۔ وہ جو ہمارے سمجھندی ہیں وہ ان کی باتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے جاتے ہی ہاں لکھ دی۔ اب پرماتما کی کرپا سے لڑکی اپنے گھر خوش ہے۔"

"ہاں جی" پنڈت اس اثنا میں دال موٹھ کا ایک چمچہ منہ میں ڈال چکا تھا اور چائے کی پیالی اٹھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ باتوں کی لڑی بھی وہ توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ "تو میں کہہ رہا تھا۔ وہ منگل داس جی ہیں نا! جالندھر والے، ان کی لڑکی بی۔ اے پاس ہے۔ سوشیل ہے۔ گھر بھی اچھا ہے۔"

"قد کتنا ہے؟" اب اس کی بیوی نے پوچھا۔

"یہی کوئی پانچ فٹ تین انچ ہوگا۔" پنڈت کو جیسے ساری باتیں معلوم تھیں۔ وہ اب چائے اور کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔

"اپنا موہن تو پانچ فٹ چھ انچ کا ہے نا جی۔ قد تو ٹھیک ہے۔ ان کی ذات کیا ہے پنڈت جی۔"

"جی وہ ملہوترہ ہیں اور اُن کی سسرال کی ذات سیٹھی ہے۔"

"تب تو ٹھیک ہی ہے۔"

"آپ کی کوئی ڈیمانڈ ہے؟"

"ڈیمانڈ؟" اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ پہلے بھی وہ حیران سا سوال جواب سن رہا تھا۔

"ہماری کوئی ڈیمانڈ نہیں۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔" اس نے فوراً جواب دیا۔

"ہاں جی۔ ذرا شادی ٹھیک ڈھنگ سے ہو جائے بس" اس کی بیوی نے اپنی بات کہہ ہی دی۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ معاملہ کہیں بالکل ہی بگڑ نہ جائے۔

"انھوں نے لڑکے کو تو دیکھا نہیں۔ پہلے وہ لڑکا تو دیکھ لیں۔"

"وہ تو انھوں نے جالندھر میں ہی دیکھ لیا تھا۔ اللہ راسے شام کے گھر، پچھلے دنوں۔ انھوں نے مجھ سے بات کی تو میں نے کہہ دیا کہ وہ تو گھر والی بات ہی ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔" اس کی بیوی بولی تھی۔

"تو آپ لڑکی دیکھنے کب آ رہے ہیں۔" پنڈت جی نے پوچھا تھا۔

یہ بات کوئی دس دن پہلے کی ہے۔ اُسے یاد ہے جس میں یہ طے پایا تھا کہ لڑکے والے لڑکی کو سے اگر چندی گڑھ آ جائیں گے جہاں وہ اپنے کسی رشتہ دار کے گھر لڑکے کو بلا لیں گے۔ اُسی شام اُس کے لڑکے نے ضد کی تھی کہ وہ اپنی بہن اور چچا کے بغیر لڑکی دیکھنے نہیں جائے گا۔ تار دے کر ان دونوں کو دہلی سے بلوایا گیا تھا۔ پھر وہ لڑکی دیکھنے گئے تھے۔ لڑکی اچھی تھی۔ ویسی ہی جیسی عام لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اس کا اپنا خیال تو اس بارے میں یہ تھا کہ لڑکی کو زیادہ خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔ زیادہ خوبصورتی لڑکیوں میں ایک طرح کا غرور بھر دیتی ہے۔

اور پھر ایسی لڑکیاں اپنے خاوندوں پر [illegible]ت کرتی ہیں۔ ویسے تو شادی کے بعد لڑکا اپنا رہتا بھی نہیں۔ پھر بھی۔

واپس آتے تھے تو لڑکی نے کہا تھا۔ "رشتہ ٹھیک ہے۔"

لڑکے کا کہنا تھا "اگر لڑکی نوکری کرنے والی ہوتی تو اچھا تھا۔"

اس کی بیوی کا کہنا تھا "مجھے نوکری کرنے والی لڑکی نہیں چاہیے۔"

اس کا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ نوکری کرنا لڑکیوں کے لیے اچھا نہیں۔ گو یہ دقیانوسی خیال تھا اور اس جیسے آزاد خیال آدمی کے لیے موزوں نہیں تھا مگر پھر۔۔۔ بحث چلی تھی اور پھر کچھ دنوں بعد اُن لوگوں کا خط آیا تھا۔ وہ خط بھی زیر بحث آیا۔ پھر اس نے گھر والوں کے کہنے پر لکھ دیا کہ ویسے تو لڑکی پسند ہے مگر پھر بھی وہ لوگ لڑکی کی جنم کنڈلی بھیج دیں تاکہ وہ لڑکے کی جنم کنڈلی سے ملا لیں۔ وہ لڑکے والے تھے۔ کچھ تو رکھ رکھاؤ چاہیے تھا۔ یہ جنم کنڈلی کا چکر اُس کی بیوی نے ڈالا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اگر جنم کنڈلیاں نہیں ملتیں تو ان کی زندگی دوبھر ہو کر رہ جاتی ہے۔

پھر ایک دن لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کی جنم کنڈلی لے کر اُس کے ہاں آیا تھا۔ وہ اپنے لڑکے کی جنم کنڈلی لے کر اس

جیوتشی پنڈت کے ہاں گئے تھے جو محلے میں ہی اپنے گھر کے ایک کمرے میں اپنا کاروبار چلا رہا تھا۔

جیوتشی کی بیٹھک میں بے ترتیبی تھی، کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ جیوتشی بیٹا کوئی جنم کنڈلی بنا رہا تھا۔ جیوتشی نے اسے دیکھا تو مسکرایا اور بولا "آئیے آئیے۔"

جب وہ بیٹھ چکے تو اس نے دونوں کنڈلیاں پکڑ لیں۔ پہلے اس نے ایک کنڈلی کھولی اُسے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے دوسری کنڈلی کھولی۔ اُسے بھی دھیان سے دیکھتا رہا۔ کچھ سوچنے کے بعد بولا "جی۔ دراصل بات یہ ہے کہ یہ کنڈلیاں نہیں ملتیں۔ ہمارے شاستروں میں لکھا ہے کہ لڑکی اور لڑکے کی جنم کنڈلیوں میں چھتیس گُن ہوتے ہیں۔ ان میں سے کم از کم ۱۸ گُن ملنے چاہئیں اس سے کم ملتے ہوں تو رشتہ ٹھیک نہیں رہتا۔"

لڑکی کے باپ نے پوچھا تھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

جیوتشی نے پہلے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی بیوی کی طرف۔ پھر کہنے لگا۔ "لڑکے کا منگل ساتویں گھر میں ہے اور برہسپت چھٹے گھر میں۔ اس سے منگل دوش تو ختم ہو جاتا ہے مگر پھر بھی ان دونوں کنڈلیوں کے صرف گیارہ گُن ملتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ رشتہ کسی بھی طرح ٹھیک نہیں۔"

لڑکی والے نے پنڈت کو دو روپے دیے تھے اور پھر وہ گھر لوٹ آئے تھے۔ لڑکی کا باپ وہیں سے رخصت لینا چاہتا تھا مگر وہ اُسے گھر لے آئے تھے۔ "چائے پی کر جائیے گا اور پھر کچھ بات چیت بھی کرتے ہیں۔" اس نے کہا تھا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھے تو وہ بولا "یہ کنڈلیوں وغیرہ کا چکر بھی ہے۔"

"جی" لڑکی کا باپ جو کسی سوچ میں ڈوبا سا معلوم ہوتا تھا بولا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ کنڈلیوں کا چکر بھی ہم لوگوں کا وہم ہی تو ہے۔ دیکھیے نا، ہمارے زمانے میں کون تیس چالیس سال پہلے کنڈلیاں کون ملاتا تھا۔"

"ہاں جی۔ مگر اب تو" لڑکی کا باپ جیسے سوچ رہا تھا کہ [illegible] کیا کرنا ہوگا۔

"مگر کنڈلیاں مل جائیں تو اچھا ہی ہوتا ہے۔" اس کی بیوی نے کہا تھا۔

"یہ بھی کوئی بات ہے۔ دروپدی کو سوئمبر میں مچھلی کی آنکھ چھید کر جیتا گیا تھا۔ جنک دُلاری سیتا کو رام نے شِو دھنش توڑ کر حاصل کیا تھا۔"

"وہ تو پرانے دیوی دیوتاؤں کی باتیں ہیں" اُس کی بیوی نے دلیل دی تھی۔

پھر اس کی بیوی اُٹھ کر رسوئی میں چلی گئی تھی۔

اُس کے دل میں کئی بار یہ خیال آیا تھا کہ یہ جو عشق و محبت کی شادیاں ہوتی ہیں۔ کیا ان میں کنڈلیاں ملائی جاتی ہیں۔ ہمارے سِکھ گورووں نے بھی اس قسم کے رواجوں کو نہیں جانا تھا۔

لڑکی کا باپ اپنی ہی سوچ میں منہمک تھا۔

باتوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے اُس نے کہا تھا "سنجوگ کی بات ہوتی ہے۔ اب دیکھیے نا، ہماری طرف سے تو سب ٹھیک ہے مگر۔۔۔؟"

لڑکی کا باپ کہہ رہا تھا "جی وہ تو ٹھیک ہے۔ سنجوگ کی بات تو ہوتی ہے۔"

"مگر میں تو ان کنڈلیوں وغیرہ میں یقین نہیں رکھتا۔"

"آج کل کے رواج کے مطابق تو انہیں ماننا ہی پڑتا ہے ورنہ یونہی دماغ میں اُلجھن سی رہ جاتی ہے۔"

اُس کی بیوی چائے بنا کر لے آئی۔ اُس نے پیالیوں میں چائے اُنڈیلتے ہوئے کہا "لیجیے۔ چائے لیجیے۔"

لڑکی کے والد نے پہلے تو انکار کیا مگر پھر اس نے چائے پی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر لڑکی کا والد چلا گیا۔

رات کو پھر بحث چل نکلی اُس کا خیال تھا "لڑکی ہمیں یہ رشتہ مان لینا چاہیے۔ کنڈلیوں وغیرہ کا کیا ہوتا ہے؟"

مگر اس کی بیوی نہیں مانی۔ اُس کا کہنا تھا کہ اب لڑکی کو بھی نہیں مانیں گے۔

دفتر میں اُس نے ان کنڈلیوں کے چکر کا ذکر کیا تھا۔ مذاق سا اُڑا رہا تھا۔ اس کے ایک ساتھی یا دوست نے کہا۔ "جی! بات نہیں۔ یہ جو مہورت وغیرہ ہوتے ہیں ان [illegible]

ہوتی ہی ہے۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔" اس نے اپنی بات کہہ ڈالی تھی۔

تب کمل بابو نے جو شاید خود بھی تھوڑا بہت جیوتش جانتا تھا اسے کہا تھا۔

"جی۔ ہمارے دیش میں بھرگو، پراشر جیسے مشہور جیوتشی تھے۔ اُن لوگوں کی بتائی ہوئی باتیں اب تک ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔" اور پھر اس بابو نے اُسے ایک کہانی سُنا ڈالی تھی "ایک راجکمار اور ایک راج جیوتشی کا لڑکا آپس میں دوست تھے۔ راج جیوتشی کے لڑکے نے اپنے والد سے جیوتش کا کام سیکھا تھا اور جب راجہ مر گیا اور اتفاق سے راج جیوتشی کی موت ہو گئی تو راج جیوتشی کے لڑکے نے اپنے باپ کی جگہ لے لی اور پھر مہورت وغیرہ نکال کر راجکمار کو گدی پر بٹھایا۔ راجکمار اب راج جیوتشی کے مشورے سے سب کچھ کرنے لگا۔ مہورت سے کیے گئے کام ٹھیک چلتے گئے۔ یہاں تک کہ راجکمار کی شادی اور پھر بچے بھی مہورتوں کے مطابق ہوئے مگر راج جیوتشی اپنے معاملے میں مہورت وغیرہ کی اہمیت بھول گیا۔ اس کی اولاد ناخلف اور نالائق نکلی۔ مگر راجہ کے لڑکے تابعدار اور عقلمند۔"

اُس نے کہانی سُن کر قہقہہ لگایا تھا۔ "یہ سب باتیں یونہی ہیں۔"

بحث چلی تھی مگر بحثوں سے کبھی کوئی مسئلہ حل ہوا ہے کیا!

ایسی ہی باتیں وہ کئی دنوں سے سوچتا آ رہا تھا۔ وہ ہر معاملے میں آزاد خیال ہونے کا دعویٰ کرتا تھا مگر جہاں تک ان مسائل کا تعلق تھا جو اس کے گھریلو زندگی سے متعلق تھے۔ اس کا رویہ کچھ اس طرح کا رہتا تھا کہ جو کام بیوی کی پسند کا ہو، وہی اچھا ہے۔ معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے وہ اپنا گھریلو سکون اور خوشیاں نہیں کھونا چاہتا تھا۔

آج بھی وہ ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا گھر واپس آیا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی نے اس کی آواز کو پہچانتے ہوئے رسوئی سے ہی صدا دی تھی۔

"آپ نے سُنا کچھ؟"

"کیا، میں تو دفتر سے سیدھا چلا آ رہا ہوں۔" اس نے اپنی نکٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ جیوتشی جی ہیں نا اپنے محلے والے۔"

"ہاں، کیا ہوا؟" اس نے اپنا کوٹ اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔

اس کی بیوی بھی رسوئی سے چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آ گئی تھی مگر اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

"انھوں نے کچھ مہینے پہلے اپنی لڑکی کی شادی کی تھی نا؟"

"ہاں کی تو تھی۔ کیا ہوا اُسے؟"

"آج جیوتشی کے داماد کی موت کی تار آئی تھی۔ ہم سب محلے والیاں افسوس کر آئی ہیں۔" اس کی بیوی نے چائے کی پیالی اسے تھماتے ہوئے کہا۔

وہ چائے کی چُسکی لیتے ہوئے سوچ رہا تھا "شادیاں تو آسمان میں طے ہوتی ہیں اور دھرتی پر رسم نبھائی جاتی ہے۔" مگر اس نے بیوی سے پوچھ ہی لیا "اچھا؟ کیا جیوتشی نے کنڈلیاں نہیں ملائی تھیں؟"

"وہ تو۔ . . یہ تو قسمت کی بات ہے۔" وہ چائے پی رہی تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اس نے اپنے خاوند کا حملہ ناکام بنا دیا ہو۔

●●

ادبی جریدوں کا معیار اور تعدادِ اشاعت

گوپال مِتّل

اُردو کے ادبی جریدوں کے معیار اور ان کی تعداد اشاعت پر بیک وقت اظہارِ خیال مَیں اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک ان میں ربطِ باہم ہے۔ اُردو کے ادبی جریدوں کی تعدادِ اشاعت اس لیے کم ہے کہ وہ ادبی جریدے ہیں۔ اردو کے سنسنی پھیلانے والے جریدوں اور فلمی جریدوں کی اشاعت اب بھی کم نہیں ہے اور جہاں تک ادبی جریدوں کا تعلق ہے ان کی کم اشاعتی کوئی نیا حادثہ نہیں۔ ادبی جرائد کی اشاعت شروع ہی سے محدود رہی ہے۔ دراصل یہ صورتِ حال صرف اُردو تک محدود نہیں۔ دُنیا کی تمام زبانوں میں جن میں یورپ کی ترقی یافتہ زبانیں بھی شامل ہیں، سنجیدہ جرائد کی تعداد اشاعت ان جرائد کے مقابلے میں جنھیں عرفِ عام میں عام پسند کہا جاتا ہے، کم ہے۔ لفظ پاپولر جس کا ترجمہ اُردو میں عوام پسند بھی ہوسکتا ہے، سنجیدہ جرائد کے نزدیک کلمۂ تحقیر ہے۔ صحافت ایک فن کے طور پر شروع ہوئی تھی بعد میں یہ تجارت یعنی اور پھر (انڈسٹری) بن گئی۔ سنجیدہ جرائد، جن میں [illegible] بھی شامل ہیں، پاپولر کی طرح لفظ کمرشل یعنی تجارتی کو بھی کلمۂ تحقیر سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں یہ ناگزیر ہے کہ ان کی اشاعت محدود رہے۔

کم اشاعت کا شکوہ سراسر حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ گلدستے جن میں غزلیں وغیرہ شائع ہوا کرتی تھیں، ان کی تعداد اشاعت سو دو سو ہی ہوا کرتی تھی۔ بعض جریدوں کے مدیر تو بالقصد یہ کوشش کرتے تھے کہ ان کی اشاعت بڑھنے نہ پائے مبادا وہ نااہلوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں۔ شاہد احمد دہلوی نے "صلائے عام" کے ایڈیٹر میر ناصر علی کا ایک واقعہ اپنی کتاب "گنجینۂ گوہر" میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک خاصے نامی گرامی ادیب دلّی آئے تو فرطِ عقیدت سے میر صاحب کے گھر ان سے ملنے پہنچ گئے۔ نہایت ادب جھک کر سلام کیا۔ جواب ملا: بندگی! وہ بے چارے سٹپٹا گئے، گھبرا کر بولے۔ "صلائے عام" میرے نام جاری کر دیجیے۔ یہ پانچ روپے ہیں چندے کے۔ میر صاحب نے سر سے پاؤں تک انھیں دیکھا اور بولے: "صلائے عام" تمھاری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ کہہ کر کتاب پڑھنے لگے۔ عقیدت مند نے لجاجت سے کہا: آپ کو زحمت دینے کی معافی مانگتا ہوں۔ میر صاحب نے تنک کر کہا: میاں صاحبزادے معافی کیا مانگتے ہو، بھیک مانگو بھیک۔ وہ بے چارے اپنا سا منہ لے کر واپس چلے آئے۔"

میر صاحب کے رویے کو آپ بدماغی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور کلاہی سے بھی لیکن نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوسکتا تھا کہ ان کے رسالے کی اشاعت محدود رہے۔

بعد میں اُردو جرائد کے مدیروں نے اپنے رویے میں کچھ تبدیلی کی لیکن اس کی سمجھ میں آگیا کہ رسالے کو کمرشل بنانا تو ممکن نہیں لیکن اسے زندہ رکھنے کے لیے تھوڑی بہت کامیابی کو بھی [illegible] ضروری ہے۔ چنانچہ ہم [illegible] مولوی نذیر احمد کی اولادِ ضمیر نکالتا کسی بھی رسالے کے ہاتھ پا سکتی ہیں یہ [illegible] کہ وہ [illegible] برداشت کر سکتا ہے۔ "ساقی"، "نیرنگِ خیال"، "ادبی دنیا"، "شاہکار" اور

"ادبِ لطیف" وغیرہ، ان سب کے پیچھے انتظامی صلاحیت موجود تھی یہ بات البتہ سب جانتے تھے کہ ادبی جریدہ اپنی طباعت وغیرہ کے مصارف کی حد تک خود کفیل ہو جائے تو ہو جائے مالک یا مدیر کو منفعت نہیں دے سکتا۔

"ساقی" کی پشت پر کتب خانہ تھا پھر بھی اس کے مدیر اور مالک کی جو حالت تھی، اس کا بیان جمیل جالبی نے "گنجینۂ گوہر" کے مقدمے میں ان لفظوں میں کیا ہے:

"شاہد صاحب ہیں کہ بے چارے صبح سے شام تک اپنے بھرے پُرے کنبے کا پیٹ پالنے میں لگے رہتے ہیں، کبھی ترجمے کر رہے ہیں، کبھی فرمائشی مضامین لکھ رہے ہیں، کبھی فیچر لکھ رہے ہیں اور کبھی ریڈیو پر بچے گانے گا رہے ہیں۔ پیٹ کا دوزخ تو کسی نہ کسی طرح بھرنا ہی ہے۔"

"ادبِ لطیف" کی پشت پر بھی کتب خانہ تھا اور اس کے مالک صاحب جائداد بھی تھے۔ "ادبی دُنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے کرتا دھرتا تھے۔ ظاہر ہے جو شخص دوسرے جرائد کو اشتہار دے سکتا ہو وہ اپنے جریدے کو ان سے کیوں محروم رکھے گا۔ "شاہکار" کے ایڈیٹر مولانا تاجور نجیب آبادی دیال سنگھ کالج میں پروفیسری کرتے تھے اور "نیرنگِ خیال" کے ایڈیٹر مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ طبیب بھی تھے۔

ادبی جرائد کے جاری رہنے میں ایک اور بات کو بھی دخل تھا اور اب بھی ہے۔ ادبی جریدوں کے مضمون نگار اپنی تحریروں کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے حالانکہ ان میں سے بعض تحریریں بالخصوص تحقیقی مضامین تو لکھنے والوں کی مہینوں کی محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ مدد کم اہم نہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب تک "نیرنگِ خیال" کو [illegible] لاہور کی پشت پناہی حاصل رہی یہ عروج پر رہا لیکن جب اس حلقے کے اراکین زندگی کے دوسرے معاملات میں الجھ گئے [illegible] کی قلمی معاونت جس میں غالباً [illegible] کے مشورے بھی شامل ہوتے تھے جاری نہ رہ سکی تو اس رسالے کا زوال شروع ہو گیا۔

اب اُردو کے ادبی جرائد کے لیے حالات زیادہ ناسازگار ہو گئے ہیں۔ اُردو کتابوں کی فروخت کی رفتار اتنی سست ہو گئی ہے کہ کتب خانہ بھی کسی ادبی جریدے کی خاطر خواہ پشت پناہی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مدیرانِ جرائد حوصلہ ہار بیٹھے ہیں اور مظلومی کو تمغۂ امتیاز سمجھ کر اس کی جا بے جا نمائش کرتے رہتے ہیں۔ اقبال کا شعر:

خودی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

یوں تو ہر اُردو والے کی زبان پر رہتا ہے لیکن اس پر عمل کی توفیق کسی کو نہیں اور جن لوگوں میں توفیقِ عمل نہیں ہوتی ان کے لیے اقبال ہی کہہ گئے ہیں:

تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات
تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات

ادبی جریدوں کے مدیروں کے خلاف جن میں میں خود بھی شامل ہوں جو فہرست جرم مرتب ہو سکتی تھی، میں نے کر دی لیکن ادبی صحافت کی پس ماندگی کے لیے کیا صرف وہی ذمہ دار ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ ادبی جرائد کو اگر واقعی زندہ رکھنا ہے تو صرف یہی کافی نہیں کہ مدیرانِ جرائد زیادہ با صلاحیت ہونے کا ثبوت دیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنے رویے میں کچھ اصلاح کرنی ہو گی۔ اشتہارات کے معاملے ہی کو لیجیے۔ مشتہرین جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقے شامل ہیں، اشتہار دیتے ہوئے صرف تعدادِ اشاعت دیکھتے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جہاں عام اخبارات و رسائل پر لوگ ایک نگاہ ڈال کر ردی کے ڈھیر میں پھینک دیتے ہیں وہاں ادبی جریدوں کی ایک ایک کاپی متعدد لوگوں کی نظر سے گزرتی ہے اور ان کے بیشتر خریدار، خواہ وہ لائبریریاں ہوں یا انفرادی خریدار ان کی فائلیں جلد کرا کے اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں اور پھر یہ فائلیں بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک [illegible] لوگوں کی نظر سے گزرتا ہے۔ اشتہاروں کے [illegible]

ت حکومت کی ایجنسیوں کو بھی اور نجی کاروباری اداروں کو بھی
قیقت پیش نظر رکھنی چاہیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ادبی جرائد کے شائقین کو یہ
یال ذہن سے نکال دینا چاہیے کہ رسالہ مفت حاصل کرنے سے
معزز ترین جائیں گے۔ اگر یہ نکتہ لوگوں کی سمجھ میں آ جائے تو
ریداری فہرست مختصر اور خریداروں کی فہرست طویل تر ہو سکتی
ہے، جس کی افادیت ظاہر ہے۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ رسالہ
فت حاصل کرنے کی عادت کے ساتھ ساتھ مانگ کر پرچہ
ھنے کی عادت بھی اردو والوں کو ترک کرنی چاہیے۔ اگر آپ
وسروں سے مانگ کر کپڑے نہیں پہنتے تو رسالہ مانگ کر کیوں
پڑھیں۔

ایک افتاد ادبی جرائد پر اور پڑی ہے۔ پہلے یہ رواج تھا کہ
سرکار کے تعلیمی محکمے ادبی جرائد کی یک مشت خریداری کیا
رتے تھے۔ یہ سلسلہ اب موقوف ہو گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ
سے دوبارہ جاری نہ کیا جائے۔

مختلف صوبائی حکومتوں نے اردو اکادمیاں قائم کی ہیں۔
ان میں سے بعض کو وافر گرانٹ ملتی ہے۔ اس گرانٹ کا کچھ
حصہ ادبی رسائل کی یک مشت خریداری پر لازماً خرچ ہونا
چاہیے اور صوبائی حد بندیوں سے اوپر اٹھ کر۔ اکاڈمیاں
اپنی مطبوعات وغیرہ کے اشتہار بھی ان جرائد کو دے
سکتی ہیں۔

باقی زبانوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن
انگریزی اور ہندی کے ایسے سنجیدہ جرائد سے میں واقف
ہوں جن کی اشاعت کچھ زیادہ نہیں لیکن انھیں کاروباری
اداروں کے اشتہار ملتے ہیں اور مناسب نرخوں پر۔ ایسے
کئی اداروں میں اردو والے مؤثر حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنے
اثر و رسوخ سے اردو کے ادبی جرائد کو اشتہار کیوں نہ دلوائیں؟

اردو ادب ایک قیمتی ورثہ ہے۔ اردو کے اہلِ قلم کو
داد دی جانی چاہیے کہ وہ ان تمام سہولتوں سے محروم ہونے
کے باوجود جو دوسری زبانوں کے مصنفین کو حاصل ہیں اس
ورثے میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ادبی جرائد اس ورثے کے
تحفظ کا اہم وسیلہ ہیں لہٰذا ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے
کہ یہ جرائد زندہ رہیں۔

●●

(لکھنؤ میں اتر پردیش اردو اکاڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) کے مشترکہ انتظام میں اردو کتابوں کا جو قومی میلہ ہوا تھا
اس موقع پر اردو کے ادبی جرائد کے مدیروں کی کانفرنس ہوئی تھی۔ یہ مقالہ میں نے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے
پڑھا تھا)

غزلیں

عابد ادیب

ایک جگہ ہی کب رہتا ہے دیکھو تو
من بادل ہے، آوارہ ہے دیکھو تو

ایک صدا، آوازوں کا شور اٹھا
پورا جنگل چیخ پڑا ہے دیکھو تو

جھگڑے کی آواز نہیں آتی ہے اب
شاید وہ گھر بند پڑا ہے دیکھو تو

شور دھماکے کچھ لمحوں کی باتیں تھیں
اب سڑکوں پہ سناٹا ہے دیکھو تو

ہر دم طنز کیا کرتا ہے وحشی ہے
پھر بھی وہ اپنا لگتا ہے دیکھو تو

دھوپ سے کیسا اندیشہ گھر سے نکلو
پیڑوں کا سایہ گہرا ہے دیکھو تو

روشنیاں تو قید میں سب دیواروں میں
گھور اندھیرا پھیل گیا ہے دیکھو تو

آوازوں کی بھیڑ میں معنی کھو بیٹھا
یوں ہر لفظ بہت گہرا ہے دیکھو تو

عابد اب سب آشاؤں کا تیاگ کرو
کون یہاں کس کا ہوتا ہے دیکھو تو

ڈاکٹر اختر نظمی

کوئی موسم کسی خانے میں رکھیے
بہاروں کو نہ ویرانے میں رکھیے

مسرت دل کے کاشانے میں رکھیے
تو پھر غم کون سے خانے میں رکھیے

ہمارا نام آئے یا نہ آئے
ہماری بات افسانے میں رکھیے

ہزاروں داستانیں سو رہی ہیں
قدم آہستہ ویرانے میں رکھیے

جو لمحہ ہے گریزاں زندگی سے
نہ ٹھہرے گا کسی خانے میں رکھیے

جگہ پا جائیں کچھ سچائیاں بھی
یہ گنجائش تو افسانے میں رکھیے

لکیریں پڑھنے والا کب ملے گا
کہاں تک ہاتھ دستانے میں رکھیے

نشہ نظمی اچانک ٹوٹتا ہے
بچا کر کچھ تو پیمانے میں رکھیے

شکیل مظہری

یہ زمیں ریتیلی، دھندلا آسماں ہو جائے
ہم جدا ہو جائیں گے، منظر دھواں ہو جائے

کشتیاں ان دیکھے ساحل کی طرف بہہ جائیں
جب ہوا کے رخ سے منکر بادباں ہو جائے

بخت میں جن کے لکھی ہے تیرے غم کی شع
ان تمناؤں کا چہرہ کہکشاں ہو جائے

لوگ جو گزرے زمانوں کے اجالوں میں
ان کا قصہ مثلِ یادِ رفتگاں ہو جائے

منجمد سی تیرگی، تب بہہ اٹھے کی منظ
میری آوازوں کا چہرہ جب جواں ہو جائے۔

غزلیں

شاہ حسین نہری

سایۂ گردِ آسماں، اور میں!
ہر حصارِ جنِ بے اماں اور میں!
بدگماں اپنے آپ پر کیا کیا
بے یقین سرِ گماں اور میں!
قفِ حال دن کا ہے سورج
اندھے شب کا لا انداز اور میں
ستے بھولتے ہوئے تارے
وچتی رات آسماں اور میں!
زہ نالہ دوں کی گفتگو اور وہ
دبنارِ گل زباں اور میں!
[illegible] خوشبو نے تنگ بھی نہیں
[illegible] تتلیاں اور میں!

عتیق احمد عتیق

بھٹک رہا ہوں من میں تیری آس لیے
کتنے سُندر سپنوں کا بن باس لیے
سونا سا ڈھلکا کے افق میں ڈوب گیا
گھائل پنچھی خون میں لتھڑی آس لیے
اپنے ہی قدموں سے خود کو کچلیں کیا
بھیڑ میں بھی تنہائی کا احساس لیے
دل پہ ابھرا ایک انوکھا گھاؤ مگر
کتنے پرانے زخموں کی بو باس لیے
رات کوئی تھا اور کہ سچ مچ تم تھے عتیق
جس کی اک اک بات نئی اتہاس لیے

اے۔ ڈی۔ راہی

کیسے جل رہے ہیں شہر کہاں دیکھتے ہیں لوگ
بن کر تماشبین دھواں دیکھتے ہیں لوگ
گزرے بہت قریب سے کانوں پہ رکھ کے ہاتھ
دل دیکھتے ہیں اب نہ زباں دیکھتے ہیں لوگ
اپنی نظر کا اور ہے معیارِ جستجو!
ہم دیکھتے نہیں ہیں جہاں دیکھتے ہیں لوگ
آرائشِ جمال کا دلدادہ ہے جہاں
ٹوٹی عمارتوں کو کہاں دیکھتے ہیں لوگ
راہی بدل بدل کے کئی زاویے ابھی
شاید مرا یقین و گماں دیکھتے ہیں لوگ

غزلیں

عابد مناوری

پانیوں پر نقش، خوشبوؤں کے پیکر دیکھنا
آنکھ مانگے بے نقط ان دیکھے منظر دیکھنا

کس جزیرے پر نظر آئے گی ہریالی مجھے
اور ابھی قسمت میں ہیں کتنے سمندر دیکھنا

ایک رستہ ان گنت رستوں کا بن جائے گا جال
اس طلسمی راہ میں پیچھے نہ مڑ کر دیکھنا

کچھ پرانے جو نشاں ساحل پہ باقی ہیں ابھی
شاید ان میں کوئی مل جائے شناور دیکھنا

ریزہ ریزہ ہو کے گلیوں میں بکھر جاؤ گے تم
ایک دن میری طرح گھر سے نکل کر دیکھنا

کر دیا تقسیم اسے بھی سرحدوں کی ضرب نے
کیوں کر اب اسکو ہوا ہے ماہ بنا کر دیکھنا

شاہد کبیر

نیند سے آنکھ کھلی ہے ابھی دیکھا کیا ہے
دیکھ لینا ابھی کچھ دیر میں دنیا کیا ہے

باندھ رکھا ہے کسی سوچ نے گھر سے ہم کو
ورنہ اپنا در و دیوار سے رشتہ کیا ہے

گھیر کر مجھ کو بھی لٹکا دیا مصلوب کے ساتھ
میں نے لوگوں سے یہ پوچھا تھا کہ قصہ کیا ہے

سنگ ریزوں کے سوا کچھ ترے دامن میں نہیں
کیا سمجھ کر تو لپکتا ہے، اٹھاتا کیا ہے

اپنی دانست میں سمجھے کوئی دنیا شاہد
ورنہ ہاتھوں میں لکیروں کے علاوہ کیا ہے

فاروق شفق

ہر طرف بوئے صدا بن کے بکھرنا چاہو[illegible]
زینۂ شب سے میں چپ چاپ اترنا چاہو[illegible]

پھڑپھڑائے نہ کہیں سویا پرندہ کوئی
دشت دل سے میں دبے پاؤں گزرنا چاہو[illegible]

شبنمی دھند میں جگنو کے اجالے کی طر[illegible]
سونی یادوں کے اندھیرے میں بکھرنا چاہو[illegible]

یاد کے گنبد سے ممکن ہے کوئی آجا[illegible]
میں سرِ شام یہ کچھ دیر ٹھہرنا چاہو[illegible]

زندگی بھر جسے [illegible]
میری خواہش [illegible]

دربدر

شمیم صادقہ

رات کے دس گئے ہیں۔ جب میں اپنی کوٹھری میں لوٹ جاتا ہوں تو میلی سیلی دیواروں پہ لرزاں سائے مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں ——— اس سناٹے میں دن کا لمحہ لمحہ بولنے لگتا ہے۔ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ لیکن میں نے زندگی سے تجربوں کا درس حاصل کیا ہے۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔ عمر کی ایک الگ زبان ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے بوڑھے لوگ بہت بولتے ہیں ——— مجھے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ پھر بھی ان سے گریز نہیں کر سکتا۔ یہ باتیں میری تقدیر ہیں۔

یہ ایک روپے کا مڑا ہوا نوٹ اور دس پیسوں والے پانچ سکے ہیں ———

"نہ جانے ایریر کب ملے گا ——— کتنا سارا کام پنڈنگ ہے" ——— عورت کی آواز۔

"اس بار روپیہ آنے پر تم اچھی سی ساری خریدنا" مرد نے کہا۔

"نہیں جناب ——— بچی کی تین کتابیں لینی ہیں ——— بیچو کا بستا ——— اور پھر بیڈ شیٹ" ———

"دیکھو ——— کل راد ھے شیام اگر آ گیا تو سو روپے دے گا ——— اس کا ایریا بیشو ہو رہا ہے ——— کچھ تو کام بنے گا۔" یہ ایک اٹھنی اور ایک چونی۔

سکوں کے نام اور اوزان بدل گئے۔ لیکن میں ابھی ان دونوں کو اٹھنی اور چونی ہی کہتا ہوں۔ کچھ پرانی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں چاہ کر بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان پرانے ناموں سے میرے بابا کی روح وابستہ ہے۔ جب میں گاؤں کے اسکول میں پڑھنے جایا کرتا تھا ——— تب سے میرے اسکول کے گرو نے چار آنے مانگے تھے۔ اور میں نے ڈرتے ڈرتے اپنے بابا سے کہا تھا ——— وہ برآمدہ میں بیٹھے ناریل کا پانی بدلتے ہوئے بولے تھے ———

"مارا اسکول کے ——— جب دیکھو تب پیسا چاہیں ——— جو ——— لے لے ——— کرتا کے پاکٹ میں ایک اٹھنی اور ایک چونی ہو ——— اٹھنی چھوٹی ہے تو دیکھیے!" ———

میں نے جلدی سے بابا کے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور پیسے لے کر اسکول کی طرف بھاگا ——— وہ چونی ہی تھی۔ جو میں نے نکالی تھی ——— مگر نہ جانے کیسے اسکول پہنچ کر چونی اٹھنی میں بدل گئی ——— بہت حیران اور شرمندہ تھا ——— میرے بہت اندر کہیں ایسی بزدلی نہاں تھی جو جونک کی طرح میری روح میں پیوست ہو کر میری ہمت اور جرأت کا خون چوستی رہتی ——— میں جائز اور صحیح باتوں کے اظہار میں بھی جھجکتا ——— ڈرتا ——— اور گھبرا جاتا۔ شاید اسی لیے اکثر میرا سچ بھی جھوٹ سمجھا جاتا۔ پتہ نہیں میری روح کیسی تھی۔ میں غلط الزامات کے خلاف بھی کچھ نہ بولتا۔ اس دن بھی یہی ہوا۔

بقیہ چار آنے میرے دوستوں نے جھپٹ لیے۔ گھر آنے کے بعد بابا نے مجھے مار مار کے ادھ موا کر دیا۔ وہ مارتے مارتے تھک جاتے اور مجھ سے پوچھتے ——— "بول کس سے چھینی کیسے کر لے ———" شاید وہ مجھ سے کہلوانا چاہتے تھے کہ جلدی میں غلطی سے میں نے اٹھنی نکال لی تھی ——— میں نے چوری نہیں کی تھی۔ مگر میں ایسا بزدل اور خوفزدہ تھا کہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ اس اٹھنی اور چونی میں ——— اور اس اٹھنی اور چونی

میں جو میری ہتھیلی پہ ہے ——— کتنا بڑا فرق ہے!

پڑھ لکھ کے نوکری کرنا یوں بھی میرے بس کا نہ تھا۔ پھر بھی اسکول کا تھیلا لے کر پاٹھ شالہ جاتے ہوئے مجھے عجیب سا احساس ہوتا۔ جیسے تھیلا نہ ہو، کہانی کا جادو کا چراغ ہو جو مجھے اچانک غریبی اور غورتوں کی دُنیا سے نکال کر سکون اور فراغت کی بستی میں پہنچا دے گا۔ میں نے پانچویں کلاس پاس کی کہ بابا ختم ہو گئے۔ ماں ردی دھوتی اپنے بتاپ کر بیچنے لگی اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا مجھے اس ٹوٹے پھوٹے سائبان کے نیچے اپنا وجود اجنبی، بے معنی، بے ضرورتی اور ان فٹ محسوس ہونے لگا۔ دو سال تک گاؤں کے چھوٹے موٹے کام کر کے خود کو بہلانے کی کوششیں کیں ——— پھر اچانک، اپنے جیسے ہزاروں کی طرح، میں بھی خود کو زندگی میں فٹ کرنے کے لیے وسعتوں کی راہ پہ نکل پڑا۔ مجھے بے حد وعریض سڑکیں۔ جھلملاتی روشنی میں دُھندلی دیواریں، یہ چند سکے مل گئے ہیں۔ لیکن میں خود کہاں ہوں؟ ——— جب دیواریں بولنے لگتی ہیں تو میں خود کو زائل ہوتا ہوا محسوس کرنے لگتا ہوں۔

"یار ——— آج رو پا کا اسکرٹ دیکھا تھا؟"

"ہاں بھئی۔ کیسے مٹک مٹک کے چلتی ہے۔"

یہ ایک لال نوٹ ——— ایک اس سے کچھ چھوٹا ہلکا فاسئی نوٹ ——— اور یہ پچاس پیسے مل کر ساڑھے تین روپے ہوتے ہیں۔ رات کے اس پُرہول سناٹے میں یہ روپے بھی بولنے لگتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں پسینے میں نہاتا جا رہا ہوں۔ لمبا فاصلہ دو مرد اور ایک مریض۔ دونوں نے مل کر مریض کو سنبھال رکھا تھا۔ اور بڑے فرعونی انداز سے کہا تھا۔

"چلو بھائی ——— زیادہ دے دیں گے۔ دیکھتے نہیں، مریض کی حالت کیسی ہے" ———

اگر وہ زیادہ نہ بھی دیتے تو بھی میں پہنچا ہی دیتا۔ کیونکہ میرے اندر لمحے اور وقت کی پہچان تھی یہ پہچان بڑی خراج طلب ہوتی ہے۔ مگر میں اسے اپنے آپ سے الگ نہیں کر سکتا کیونکہ میں جانتا ہوں۔ اگر میں نے ایسا کیا تو میں مر جاؤں گا۔ اور مرے ہوئے وجود کا بوجھ ان تین آدمیوں کے وزن سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

"ساڑھے سات روپے تو چھوٹے ڈاکٹر نے لے لیے اور اب جا کے بولا ——— شہر لے جا کر دکھاؤ ——— کیا یہ ڈاکٹر کبھی بیمار نہیں پڑتے۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ علاج کا سلسلہ روگی کو دیتا ہے۔"

"سب کچھ قسمت کی بات ہے بھائی۔ دیکھو ٹھیک ہوتا ہے کہ نہیں۔"

"علی ——— علی ———" پہلے شخص نے مریض کو پکارا جس پر غشی طاری تھی۔ شاید اسی غشی نے ان کے ذہنوں کے گھٹے ہوئے کمروں کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ وہ کھل کر باتیں کرنے لگے۔

"اب لگتا ہے بو کھیرے والی زمین کا اجارہ کرنا ہی پڑے گا۔"

"بھائی، یہ تو کینسر ہے۔ لیکن خون کی پکار کان کے پردے پھاڑ دیتی ہے ——— جانتے ہوئے بھی تو ہم پرچھائیں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔"

ہاسپٹل کمپاؤنڈ کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دونوں چونک کر چپ ہو گئے۔ سامنے زمین پر ایک لاش رکھی تھی۔ اور دو تین عورتیں وہیں بیٹھی رو رہی تھیں۔ ہسپتال میں لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں اس لاش کا وجود، مجھے بھی ——— ایک غیر متعلق شخص کو بھی، شگونِ بد کی طرح محسوس ہوا۔ ان لوگوں نے مریض کو اتار کر بنچ پر لٹا دیا۔ میری ہتھیلی پر روپے رکھے اور چپ چاپ چلے گئے۔ میرا ان سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ پھر بھی جیسے تعلق کا انا محسوس سا احساس مجھے روکے ہوئے تھا۔ جیسے ان کے دکھ کے بوجھ کا ایک انش میرے اندر سرایت کر گیا ہو۔ ان کے جسم سے سرک کے۔ حالانکہ احساسات کے ردّ و بدل کے متعلق کبھی کسی نے سوچا تک نہیں۔ لوگ تو یونہی اپنا سب کچھ، اپنے اندر کا سارا کرب، جسے وہ دوستوں، گھر والوں کے سامنے نہیں کہہ سکتے۔ میرے سامنے، میرے وجود سے لاپروا ہو کے کہہ ڈالتے ہیں۔ کیا میں کنفیوشس ہا کس ہوں۔ پتہ نہیں ان دونوں ادمیوں کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ دونوں دوست ہیں یا نہیں۔ ایک دفعہ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔

"چلو، آج چپکے سے سینما دیکھا جائے۔"

"اگر معلوم ہو گیا تو جانتی ہو فضول کا سر درد ـــ اس میں انڈر اسٹینڈنگ تو ہے ہی نہیں۔ ایسے لوگوں کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ یا ڈپ کے ـــ یا دیا کے یوں ہی ـــ وقت کٹتا ہے۔"

"اور اگر زیادہ اہمیت دوں تو بھی BEHAVIOUR بالکل ڈس بیلنسڈ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہی کہتی ہو۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں، اگر یہ ملازمت نہ ہوتی تو شاید ایسے شخص کا ساتھ مجھے مار ڈالتا۔"

"ہاں، اس کے سوا چھ گھنٹے کی محنت سے اور حاصل بھی کیا ہوتا ہے۔"

"ہر مہینے رشتے، محلّے اور فرینڈز سرکل میں کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی رہتی ہے۔"

"اور کیا ـــ اور سب کی توقعات بھی ورکنگ وومینس سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔"

"اسٹینڈرڈ کو بھی مین ٹین کرنا آسان نہیں۔"

دونوں چپ ہو گئیں۔ اچانک پہلی والی نے اپنے مخصوص خوابناک انداز سے کہا۔ اور اچانک مجھے لگا جیسے اس کی آواز میں بڑی نشتریت اور کچھ ایسی بیکارسی ہے کہ بھلایا نہیں جا سکتا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں۔ ہم اپنے پلاسٹک لائف کی ساری پالش کھرچ ڈالیں۔ زندگی کی اصل شکل جو ہم چاہتے ہیں، سوچتے ہیں، نفرت ـــ محبت ـــ انتقام سب کچھ ویسا ہی نظر آئے جیسے اندر اندر ہوا کرتا ہے"۔

دوسری ہنس پڑی۔

"تمھارے خواب، تمھاری جان لے لیں گے ـــ زندگی کی پہچان پیدا کرو بھئی ـــ ڈونٹ بی سلف ایکزائیلڈ۔"

یہ لفظ سلف ایکزائیلڈ، مجھے بہت گہرائی تک گھائل کر گیا۔ اور نہ سمجھتے ہوئے بھی، میں اس کے معنی سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے یہ ایک روپیہ اور ساٹھ پیسے، اس دن کی آخری کمائی سامنے رکھ کر، میں ان پیسوں سے ہی زندگی کی پہچان پوچھنا چاہتا تھا۔

رگھو ـــ املی کے پیڑ کے نیچے ستو کھا رہا تھا۔ اس نے مجھے پکارا۔ اور اپنے مخصوص مکار لہجے میں بولا۔ "جو تم اتنی محنت کر کے کماتے ہو، وہ میں بڑی آسانی سے کما لیتا ہوں۔"

"کیسے بھئی ؟"

"ایک تو میں اسٹیشن اور ایروڈرم پر ایسے لوگوں کی تاک میں رہتا ہوں جو کچھ گول مال کیے ہوتے ہیں۔ جلدی سے جلدی بھاگنا چاہتے ہیں۔ اور منہ مانگے پیسے دیتے ہیں۔"

"اور ؟"

"اور، آئی، ڈی، ایم ہاسپٹل کے سامنے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد، ایک لاش باہر کی جاتی ہے۔ اس کے لیے سواری کی ضرورت ہوتی ہے نا ـــ وہ لوگ بھی جتنا مانگو دے دیتے ہیں۔"

"لاش لے جانے والے جن کا کوئی مر گیا ہوتا ہے ؟"

"اور نہیں تو کیا۔ وہاں وہی لوگ آتے ہیں جنھیں مرنا ہوتا ہے" ـــ میں خاموشی سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔ رگھو جن سے پورے پیسے لیتا ہے اُن سے میں شاید مناسب پیسے بھی نہ لے سکوں۔ کیونکہ کرائے کے پیسے اُس دُکھ کے پاسنگ بھی نہیں ہوتے جو ایک نا محسوس طریقے سے میرے ذہن کو مفلوج کر جاتا ہے اور رات کے اندھیرے میں یہ مڑے تڑے نوٹ یہ میلے اور صاف سکے، یہ میلی دیواریں۔ اور لالٹین کی زرد اور بیمار سی روشنی ـــ یہ گھٹتے اور بڑھتے ہوئے سائے سب کے سب مجھ پر یلغار کر دیتے ہیں۔ آج بھی یہی ہوا ـــ جب ہی مجھے اس عورت کی بات یاد آئی۔ ایک لفظ، مبہم سا واضح ہو کر ابھرا۔ سلف ایکزائیلڈ، اور اچانک لگا جیسے وہی نہیں، میں ہی نہیں، بلکہ سبھی تو سلف ایکزائیلڈ ہیں ـــ یہ اجتماعی جلاوطنی ہے۔

●●

غزلیں

بسیم حیرتی

پُو جاگی دھوپ کا دھواں ہوں
خوشبو لیے ہوئے رواں ہوں
پر ٹوٹ گئے، اُڑان کیسی؟
مدّت سے اسیرِ آشیاں ہوں
واپس نہ کوئی بلا سکے گا
جو بیت چلا میں وہ سماں ہوں
مجھ میں ہیں شہود و غیب دونوں
آخر میں نشانِ بے نشاں ہوں
ہستی مری نیستی کے برابر
ایسے میں کہوں تو کیا ہوں
اعمال پہ منحصر نتیجہ
میں آپ اپنا امتحاں ہوں
گردش میں ہوں اے بسیم ازل سے
ہر چند زمیں نہ آسماں ہوں

معصوم نظر

ابھی پھر شام کے چشمے سے اک دریا رواں ہوگا
گھنی تاریک لہروں کے بھنور میں آسماں ہوگا
گریں گے پر کٹے طائر گھنے بن کے درختوں سے
پہاڑوں کی فضاؤں میں اُداسی کا سماں ہوگا
ہوا بن کر کبھی اُڑ جائے گا موسم بہاروں کا
ہمارے اور تمہارے درمیاں گہرا کنواں ہوگا
ہزاروں ہی کھڑے ہیں کھوکھلے اشجار کے جنگل
جلے گا جب کوئی تنکا ہر اک بن میں دھواں ہوگا
کھلیں گے ایک ہی آہٹ سے دروازے حویلی کے
کئی آسیب بولیں گے صداؤں کا گماں ہوگا

ست نام سنگھ خمار

اب بھی جو ہم نے کھینچ کے باندھا تھا کیل سے
خیمہ گرے گا سر پہ طنابوں کی ڈھیل سے
لازم ہے دل کے پاس ہو کچھ تشنگی کی آگ
یہ سوچ کر گزر گیا میں ہر سبیل سے
معلوم ہیں سفر کی دل آزاریاں مجھے
آیا ہوں اپنے پاس میں راہِ طویل سے
آندھی میں بھی جو جھومتی ہے ٹوٹتی نہیں
وہ شاخ سربلند ہے میری قبیل سے
اُس کی بھی سُن لے جو ترے سینے میں انتشار
ٹکرا رہا ہے سر کو بدن کی فصیل سے

نظمیں

دل کا فیصلہ

ماہر منصور

مناظر، شاہراہیں، خوبصورت سی دکانیں
کہیں سہ منزلہ، دو منزلہ اونچے مکانوں کی قطاریں
گھروں پر نام کی اور ڈگریوں کی جگمگاتی تختیاں
شاہراہوں سے گزرتی بے خطر، دلکش
سجیلی اور تنہا عورتیں
درسگاہوں سے نکلتے پھول سے معصوم بچے
بارہا کہتے ہیں مجھ سے شہر میں آکر رہوں میں
دل مگر کہتا ہے مجھ سے
ہر قدم پر گاؤں یاد آئے گا مجھ کو

ایسا کیوں ؟

احمد حسین شمس

رات خوابیدہ تھی
ظلمت کا لبادہ اوڑھ کر
اور تقدس کی پہاڑی پر
ادھر تھیں جگنوؤں کی ولولہ انگیز بزم آرائیاں
اڑ رہی تھیں ہر طرف چنگاریاں
خود سری بینش کا لاشریٔ وجود
روشنی کی ننھی ننھی کرچیوں سے
کیف زا زخموں سے چکنا چور تھا

زندہ پاینده کیا ٹکرا گیا
اہرمن کے تن پہ لرزش چھا گئی
اور یزداں مسکرا کر رہ گیا
خود سری بینش کسی کی غیر مرئی ذات میں
تحلیل ہو کر کھو گئی

آواز جب نغمہ بنی

محمد عبد القادر ادیبؔ

ضبط احساس کے
زنداں ہی میں
جل جل کے بجھ
میری آواز کا دیا بھی جو لمحۂ
نوک صد خار
صداؤں نے دیے
زخم نئے
ہر اک طرح مجھ کو جلتے ہی ا
جلتے ہی
آواز مری
شعر کے سانچے میں ڈھلی
نغمگی پھوٹ پڑی
جھوم اٹھی روح مری

نظمیں

اعتراف

مظہر محی الدین

نہیں - اس شہر میں تنہا نہیں میں
یہاں میرے شناسا ان گنت ہیں
میں جب گھر سے نکلتا ہوں
سلام بے ارادہ
اور زیرِ لب تبسّم
بچھا دیتے ہیں راہوں میں
نہیں - اس شہر میں تنہا نہیں میں
یہاں میرے شناسا ان گنت ہیں!

مغائرت

حق اعظمی

سجائے پلکوں پہ تارے
صدا پہ کان لگائے
میں چل رہا ہوں
کہاں !
میں خود سے اجنبی، انجان اپنی راہوں سے

مگر یہ جو نکلے
بیاباں سے رُوح کے اٹھ کر
مرے تھکے ہوئے قدموں کو کھینچے جاتے ہیں

میں ان کی انگلیاں تھامے
اندھیری سمت میں
چُپ چاپ چلتا رہتا ہوں
کبھی تو ان سے پوچھیں
کہ تیرا نام ہے کیا؟

ندی کی روانی قائم

خالد سعید

اس بہتی ہوئی ندی میں
میرا بھی کچھ حصّہ ہے
سو اک کھیل میں نے کھیلا ہے
کاغذ کی ننھی کشتی
لہروں پہ میں نے چھوڑ دی
مجھے معلوم ہے،
کہ کچھ دیر تک، کچھ دور تک
چل کر
وہ ڈوب جائے گی
لیکن
ڈوبنے تک — جو کچھ بھی ہے میرا
اور باقی
ندی کی روانی قائم

نظمیں

ہرے ہرے کھیت

صفدر

برسے بادل
اُمڈتے دریا
اُبلتے چشمے
مچلتی نہریں
کہیں نہیں ہیں

ہرے ہرے ہیں
گناہ کے کھیت
رات کی نم
سے پل رہے ہیں

نسبتِ نور

اختر بستوی

جس سے منسوب اُجالے کا تصوّر ہو وہ شے
بخشتی ہے مجھے ہر حال میں خوشیوں کی بہار
وہ جو بے مصرف و بیکار بھی ہو جائے تو میں
اُس کے مٹنے سے ہوا کرتا ہوں کلفت کا شکار
مجھ کو ہوتی ہے مسرت، جو دیے کی تصویر
کھیل ہی کھیل میں کاغذ پہ بناتا ہے کوئی
ٹیس اُٹھتی ہے مرے قلب و جگر میں اختر
صبح کے وقت بھی جب شمع بجھاتا ہے کوئی

ایسا بھی اک دن آئے گا

صابر فخرالدین

آج سنیچر
کل یکشنبہ
پھر دوشنبہ آئے گا
دن
یوں ہی
گھٹتے جائیں گے
ہم سب
بھولی بسری، یادیں
ہو جائیں گے
دُور خلا میں کھو جائیں گے
ایسا بھی اک دن آئے گا

اس سے آگے تو بہت لمبی کہانی آئے گی

اختر واصف

دھوپ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا گورنمنٹ اُردو لائبریری کی بالکونی سے چپکا ہولے ہولے مسکرا رہا ہے۔ ایسے میں وہاں، میں اکیلا چُپ چاپ کھڑا بار بار اپنی گھڑی کی جانب دیکھ رہا ہوں۔ (کسی ادارے کا سکریٹری ہونا ایک مصیبت سے کم نہیں) پونے دس بج چکے ہیں۔ ہال کے صدر دروازے سے کچھ آگے ایک بڑی سی چوکور میز رکھی ہے جس کے تین کناروں سے ہٹ کر سات آٹھ خالی کُرسیاں ہیں۔ میز کے سامنے خالی کُرسیاں قطار باندھ کر چُپ چاپ ہیں۔ خالی ہال کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ میں پھر باہر آکر بالکونی میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ گھڑی کے کانٹے سرک رہے ہیں۔ میں جانے کیا سوچ رہا ہوں کہ بے دھیانی میں ڈھیر سارے لمحے اغل بغل سے نکلتے جا رہے ہیں....

.... اب ساڑھے گیارہ بجے ہیں .... اور سارا منظر بدل چکا ہے ....

میز کے گرد رکھی کُرسیاں بھر گئی ہیں۔ میز کے سامنے قطار سے رکھی ہوئی کُرسیاں بھی دُور تک بھری بھری سی ہیں۔ میں میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں کی پہلی صف میں آخری کُرسی پر ہوں۔ میرے برابر میں ہیں رضوان احمد، پھر نسیم مظفر پوری۔ پھر شکیب ایاز.... دوسرے کنارے پر نظر آ رہے ہیں عبدالصمد، ان کے بازو میں ڈاکٹر حلیم اللہ حالی اور ظہیر صدیقی۔

میرے سامنے، میز کے گرد، ایک کنارے پر ڈاکٹر قدوس جاوید اور فخرالدین عارفی دبی دبی آواز میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اور ان لوگوں کے ٹھیک سامنے رکھی کرسی پر شام رضوی ٹیپ رکاٹور کے اُلجھے تاروں کو سلجھانے میں بُری طرح مصروف ہیں۔ میز کے درمیانی حصّے میں نظر آ رہے ہیں صدر حلقۂ ادب بہار ڈاکٹر عبدالمغنی اور ان کی بغل میں پریم چند اسکول کے بزرگ افسانہ نگار جناب سہیل عظیم آبادی۔

میرے پیچھے صف بہ صف رکھی ہوئی کُرسیاں خاصی دُوری تک بھر گئی ہیں اور پیچھے سے دبی دبی آوازوں، قہقہوں اور کُرسیوں کو ہٹاتے بڑھانے کی آوازیں برابر آ رہی ہیں۔

اس وقت فخرالدین عارفی مائکروفون کے سامنے ہیں۔ ابھی ابھی انھوں نے اس "یوم افسانہ" کی پہلی نشست کی صدارت کے لیے جناب سہیل عظیم آبادی کے نام کا اعلان کیا ہے نسیم مظفر پوری اپنی جگہ پہ کھڑے ہو کر اس کی تائید کر رہے ہیں۔ پیچھے سے بھی بیک وقت تائید کی کئی آوازیں اُبھری ہیں اور اب مائکروفون کے سامنے ہیں ڈاکٹر قدوس جاوید کہ اس محفل کی نظامت ان کے ہی حصّے میں آئی ہے ——

—— یوں تو شعری محفلیں گلی گلی۔ محلے محلے ہر روز آراستہ ہوا کرتی ہیں لیکن افسانے کو خاص کر جدید افسانے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش خال خال ہی نظر آتی ہے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ حلقۂ ادب بہار پٹنہ کی جانب سے ایسی ہی

ایک محفل آراستہ ہو رہی ہے جہاں نئے افسانے پہ کھل کر بات چیت ہو سکے گی۔

نئی نسل کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں سب سے پہلا نام میرا ہی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوں اور مائکروفون کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں ......

باہر والے دروازے کے پاس دو تین چھوٹے چھوٹے بچے دیوار سے چپکے ہوئے بڑی حیرت بھری نگاہوں سے یہ ساری کاروائی دیکھ رہے ہیں۔

میں اپنی کہانی پڑھ رہا ہوں ——— "بیچ سے کٹا ہوا اندھیرا"

پورے ہال میں سنجیدگی منجمد سی ہو گئی ہے۔ باہر دروازے کے پاس کھڑے ہوئے بچے ایک ایک کر کے غائب ہو جاتے ہیں شاید ان کی دلچسپی کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں۔

اچانک میں اپنی ہی کہانی پڑھتے پڑھتے اُکتا سا جاتا ہوں کہ میرے بعد جن افسانہ نگاروں کو کہانی پڑھنی ہے۔ ان لوگوں نے بہت ہی قلیل مدت میں اردو کو چند ایسے افسانے دیئے ہیں جو ان افسانہ نگاروں کے روشن مستقبل کی سمت اشارہ کرتے ہیں۔

میں اپنی کہانی ختم کر کے واپس لوٹتا ہوں اور میری جگہ لیتے ہیں عبدالصمد۔

انکی کہانی کا عنوان ہے ——— "زرمبادلہ"

پیچھے سے کرسیوں کو آگے پیچھے کھسکانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اشوک راج پتھ پہ شاید سواریاں تیزی سے آ جا رہی ہیں کہ سائیکل اور رکشے کی گھنٹیوں اور موٹر کے ہارن کی آواز ہال کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر برابر آ رہی ہے۔ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ آوازیں عبدالصمد کی کہانی کے لفظوں کے نیچے سے بھی جہاں تہاں سر نکالے کھڑی ہیں ....

طے شدہ پروگرام کے مطابق عبدالصمد کے بعد نسیم مظفرپوری اپنی کہانی قیدی کا مسودہ ہاتھ میں لئے مائکروفون کے سامنے ہیں۔ اسپیکر میں کچھ خرابی ہو جانے کے باعث ان کی کہانی کے بعض بعض جملے مجھ تک ٹھیک طور پر نہیں پہنچ پا رہے ہیں۔

میں نسیم مظفرپوری صاحب کو بحیثیت شاعر جانتا اور پہچانتا ہوں۔ گرچہ انکی ایک یا دو کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔ لیکن یہ کہانی میرے لئے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کسی منجھے ہوئے کہانی کار کی طرح علامتوں کے سہارے اپنی کہانی کو پھیلا رہے ہیں۔

جناب نسیم مظفرپوری کے بعد ایک ہاتھ میں کہانی کا مسودہ لئے اور دوسرے ہاتھ سے شال سنبھالتی ہوئیں مائکروفون کے سامنے کھڑی ہیں محترمہ شمیم صادقہ کہ ڈاکٹر قدوس جاوید نے ابھی ابھی ان کے نام کا اعلان کیا ہے۔ محترمہ شمیم صادقہ کی بھی کئی ایک کہانیاں میں نے پڑھی ہیں۔ اور محسوس کیا ہے کہ بہار کی نئی خاتون افسانہ نگاروں میں شمیم صادقہ ایک معتبر نام بن سکتا ہے۔

محترمہ شمیم صادقہ کے بعد رضوان احمد اپنی جگہ سے اُٹھتے ہیں کہ ان کے نام کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ ان کی کہانی کا عنوان ہے ——— "اس شام کی کہانی" مجھے یاد آتا ہے کہ میں یہ کہانی پہلے پڑھ چکا ہوں۔ اور جب کہانی کے بعد قدوس جاوید اپنے تبصرے میں کہتے ہیں کہ ۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں نے علامتی پیرائے کو اختیار کیا لیکن وہ علائم کو کامیابی کے ساتھ برت نہیں پائے تو میں سمجھ نہیں پاتا کہ قدوس جاوید صاحب کا اشارہ ۷۰ء کے بعد لکھی جانے والی تمام کہانیوں کی طرف ہے یا صرف رضوان احمد کی اس کہانی کی جانب ویسے میرا خیال ہے کہ رضوان احمد ان افسانہ نگاروں میں نہیں جن کی کہانیاں ابہام کے خلا میں جھولتی رہتی ہیں۔ پیش نظر کہانی میں انہوں نے پاگل گھوڑے کو ایک علامت کے طور پہ استعمال کیا ہے۔ کہانی میں پاگل گھوڑے کا کردار کئی پرتیں اور مختلف جہتیں رکھتا ہے۔

رضوان احمد کے بعد اب صرف دو افسانہ نگار کہانی پڑھنے کو رہ گئے ہیں۔ م۔ ق۔ خان اور فخر الدین عارفی اس سے پہلے کہ م۔ ق۔ خان اپنی کہانی سنائیں ہال میں چائے کی پیالیاں گردش کرنے لگتی ہیں اور سوندھی سی خوشبو سارے میں بکھر جاتی ہے۔

ایک کپ چائے اور ایک سگریٹ کے بعد میں تازہ دم ہو کر اپنی نشست پہ بیٹھ جاتا ہوں۔ اب م۔ ق۔ خان اپنی کہانی "ہمسایہ" سنا رہے ہیں۔ عبد الصمد نے اپنے ایک مضمون میں م۔ ق۔ خان صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ ——— م۔ ق۔ خان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے D. R. P کی لانبی چوڑی لاری لیکر نہیں چل رہے ہیں۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ آج کی بھیڑ میں کتنا مشکل ہے اس کے بغیر چلنا اور اپنے آپ کو پہچنوانا ——— ضرور ان کا قد بہت اونچا ہے۔

جی نہیں، اتنا اونچا بھی نہیں۔ ہاں نکلتا ہوا ضرور ہے لیکن ایسے تو بہت ہیں۔ دراصل آپ م۔ ق۔ خان کو اس لئے پہچان لیتے ہیں کہ اونچا، نکلتا ہوا، پست جو بھی قد ہے انکا اپنا ہے۔ کسی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں۔ انہیں دیکھنے کے لئے آنکھیں نہیں پھاڑنا پڑتیں۔

م۔ ق۔ خان صاحب کی کہانی قدرے طویل ہے لیکن اس کے اختتامیہ جملوں تک پہنچنے کے بعد وہ اپنی نشست پہ واپس جا چکے ہیں اور ڈاکٹر قدوس جاوید فخر الدین عارفی کے نام کا اعلان کر رہے ہیں۔ فخر الدین عارفی کی کہانی کا عنوان ہے ——— "میں"

اس کہانی کا کردار "میں" وہ پرندہ ہے جو صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد اب بے بسی کے عالم میں خشک جھاڑیوں کے درمیان پھنسا ہوا پھڑ پھڑا رہا ہے کہ اس کے دونوں بازو ٹوٹ چکے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ فخر الدین عارفی کی اس کہانی اور سامعین کے درمیان ترسیل کی ایسی کوئی کھائی نہیں جس کا غلغلہ آج ہر گوشے سے سنائی پڑتا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عارفی کہانی لکھنے کے ساتھ کہانی کہنے کا فن بھی خوب جانتے ہیں۔

فخر الدین عارفی کی کہانی کے بعد اب پھر ہمارے سامنے ہیں ڈاکٹر قدوس جاوید۔ وہ کہانی کے نئے رجحانات سے بحث کرنے کے بعد فرما رہے ہیں......

..... ہمارا اس معاملے میں خوش قسمت ہے کہ کم از ہر پانچ سال کے بعد یہاں افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل آ جاتی ہے۔ اس وقت کئی نسل کے افسانہ نگار ایک ساتھ افسانے لکھ رہے ہیں۔ ایک نسل سہیل عظیم آبادی کی ہے دوسری غیاث احمد گدی۔ انور عظیم، کلام حیدری، ذکی انور کی، تیسری احمد یوسف شفیع شہیدی، شفیع جاوید کی، چوتھی شفق، رضوان احمد، شوکت حیات کی اور سب سے نئی نسل فخر الدین عارفی، اختر واصف، عبد الصمد م۔ ق۔ خان وغیرہ کی ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ کا روا دارں کارواں چل رہا ہے.......

ڈاکٹر قدوس جاوید کے بعد جناب سہیل عظیم آبادی نے گویا اس پوری بحث کو سم اپ (sum up) کرتے ہوئے کہا ——— ہر دور مختلف ہوتا ہے۔ اس کے مسائل الگ ہوتے ہیں اور ہر دور کے ساتھ اسلوب بھی بدل جاتے ہیں میں اس سے نہیں گھبراتا کہ آج کے افسانہ نگار ہماری نسل سے مختلف انداز میں لکھ رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے بھی اپنے دور میں اپنے پیش روں سے الگ ہٹ کر کہانیاں لکھیں ادب میں تجربے ہونے چاہئیں یہ بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر آگے کا سفر طے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن، اگر تجربہ ناکام ہو جائے تو وسیع القلبی کا ثبوت دیکر اس کا اقرار کرنا بھی ضروری ہے۔ ساتھ ہی نئے راستوں کا تعین بھی.......

ڈاکٹر قدوس جاوید نے جناب سہیل عظیم آبادی کی اس مختصر صدارتی تقریر کے بعد یوم افسانہ کی پہلی نشست کے خاتمے کا اعلان کیا۔

میں اپنی گھڑی کی جانب دیکھتا ہوں۔ تین بجنے والے ہیں اور اب دوسری نشست کا آغاز ہو رہا ہے

اس نشست کی صدارت فرمائیں گے جناب عبدالمغنی...

جیسی کہ مجھے توقع تھی اس نشست میں سامعین کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اگرچہ آگے کی نشستیں بھری ہوئی ہیں پچھلی کرسیاں کچھ خالی خالی نظر آ رہی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نظر نہیں آ رہے ہیں۔ ظہیر صدیقی بھی غالباً گھر جا چکے ہیں۔

ابھی ابھی ڈاکٹر قدوس جاوید نے اس نشست کے پہلے مضمون نگار جناب قیصر رضا کے نام کا اعلان کیا ہے۔ قیصر رضا صاحب کے مقالے کا عنوان ہے "نیا افسانہ ۷۰ کے بعد"۔ قیصر رضا کو کہانی کے ساتھ نئی یا پرانی کی اصطلاح غلط نظر آتی ہے۔ ان کے خیال میں کہانی نئی یا پرانی نہیں ہوتی۔ اگر وہ کہانی ہو۔ جیسے منٹو کی کہانیاں آج بھی تازہ اور زندہ ہیں۔ ۶۵ء کے بعد لکھی جانے والی بیشتر کہانیاں شعبدہ بازی کا شکار ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور فن کار کا رشتہ قاری سے ایک دم کٹ گیا ہے۔

قیصر رضا کے بعد ڈاکٹر علیم اللہ حالی اپنا مقالہ ـــــ "اردو کا نیا افسانہ" کے عنوان سے شروع کرتے ہیں مقالے کی شروعات اس جملے سے ہوتی ہے ـــــ

"۵۰ء کے بعد لکھے گئے افسانوں پر بحث قبل از وقت کی جا رہی ہے کیونکہ سفر کا جائزہ ختم سفر کے بعد ہی لیا جا سکتا ہے۔"

اس شاعرانہ جملے پر خاصی واہ واہ ہو رہی ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ اگر سفر کا جائزہ شروع سفر سے ہی لیتے چلیں تو کیا حرج ہے؟

ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے اس مضمون کے بعد اب قدوس جاوید اس نشست کے تیسرے مضمون نگار احمد حسین آزاد کو مضمون پڑھنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ آزاد صاحب "بہار میں افسانہ نگاری" کے عنوان سے اپنا مقالہ شروع کرتے ہیں۔ آزاد صاحب نے ڈھیر سارے ضروری اور غیر ضروری ناموں کی فہرست تیار کرلی ہے اور انہیں مختلف خانوں میں سجاتے جا رہے ہیں۔

ـــــ لیکن بھائی..... صرف ناموں میں کیا رکھا ہے.......؟

اور اب ڈاکٹر قدوس جاوید اپنا مقالہ "۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانہ" سنا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو افسانے میں حقیقت پسندی ۴۷ء کے بعد ہی آئی۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے حقیقتوں کی حقیقت تلاش کی۔

نئے افسانے کے بارے میں وہ فرماتے ہیں ـــــ

"۶۰ء کے بعد آنے والی نسل نے علامت نگاری کی جانب قدم بڑھایا لیکن علائم کو برتنے میں وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ نئے افسانہ نگار علائم کا استعمال تو کر لیتے ہیں لیکن وہ علامت کی مختلف سطحوں سے واقف نہیں ہیں اور اسی ناواقفیت کی وجہ سے نئے افسانہ نگاروں کی بیشتر کہانیوں میں توازن برقرار نہیں رہ سکا ہے۔"

اتنے سنجیدہ ماحول میں کافی دیر سے بیٹھے بیٹھے ہم لوگ خاصے تھک چکے ہیں۔ قدوس جاوید..... عبدالصمد..... م۔ ق۔ خان..... فخرالدین عارفی سب کے چہروں سے تھکن عیاں ہے۔ میں پیچھے گھوم کر دیکھتا ہوں۔ کچھ نئے چہرے بھی نظر آ رہے ہیں ـــــ خورشید سحر..... احسن شفیعی اور دوسرے کئی حضرات ادھر علامت نگاری، افسانہ اور اس کے مستقبل پر خاصی زوردار بحث چل نکلی ہے۔ لیکن تھکن کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ **تحریک** نئی دہلی

شمارہ : ۶ جلد : ۲۷

ستمبر ۱۹۷۹ء

ادارۂ تحریر :

گوپال مِتّل

پریم گوپال مِتّل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے، فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال مِتّل

مطبع : لمانی پریس، دہلی

مقامِ اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات

جنتا انتظامیہ کے دو سال

ہمہ جہت ترقی کی سمت میں ٹھوس قدم

ہریجنوں اور کمزور طبقوں پر سب سے زیادہ توجہ :

- ہریجن اور پسماندہ طبقوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ۷۷-۱۹۷۶ء کے ۳۴ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۱۰۴ لاکھ روپے اور پہلی بار ۳۰۰ ہریجنوں کو بسیں خریدنے کے لیے اقتصادی امداد اور بس کا مالک بنانا۔
- نو آباد کالونیوں، شہریائے گاؤں، غیر منظور شدہ بستیوں، کٹڑوں اور جمنا پار کی ۵۰ فیصد سے بھی زیادہ آبادی کو پہلی بار زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنا۔
- ۵۶۴۴ مزدوروں کو کرایہ خرید پر مکان مہیا کرنا۔
- گاؤں کے فروغ پر ۲۶ کروڑ روپے خرچ۔ ایک سال کے اندر ہر گاؤں میں پینے کا پانی دینے کے لیے گیارہ کروڑ روپے کی اسکیم۔ گزشتہ ۳۰ برسوں میں ۲۵ گاؤں کو یہ سہولت حاصل ہو سکی ہے۔ اسی طرح پہلی بار گاؤں کا لال ڈورا بڑھایا گیا ہے۔
- دو لاکھ لوگوں کو کام مہیا کرانے کے لیے کئی صنعتی بستیوں کی تعمیر و تشکیل۔ جن گھروں میں کوئی بھی کام پر نہیں لگا ہے ان میں کم سے کم ایک کو کام پر لگانے کے لیے انقلابی اسکیم۔
- ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک مکمل طور پر نشہ بندی نافذ کرنے کے سلسلے میں مؤثر اقدامات۔
- دور دراز کی کالونیوں اور گاؤں میں گھر کے نزدیک طبی سہولیات مہیا کرنے کی اسکیم کے تحت ۵۰ بستروں والے دو اور ۱۰۰-۱۰۰ بستروں والے سات اسپتالوں کی تعمیر کی اسکیم۔
- ڈھائی لاکھ بچوں کو تغذیہ بخش غذا اور دوپہر کا کھانا۔ ۲۰۰۰۰ بچوں کو وظیفے۔ ہر غریب بچے کو مفت وردی اور کتابیں۔ ۱۴۵۰۰ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ۲۶ اداروں میں پیشہ ورانہ تعلیم۔ صرف قابلیت کی بنیاد پر داخلہ۔ ۱۰۰-۱۰۰ آنگن واڑیوں کی سات اسکیموں کے تحت ایک لاکھ بچوں اور ماؤں کو تعلیم، تغذیہ بخش غذا اور طبی سہولیات۔
- پہلی بار دلی میں ایک سال میں ۱۱۰۰۰ مکان تیار ہوئے اور اس سال ۲۰۰۰۰ مکانوں، ۲۴۰۰۰ بشمول سروس پلاٹوں کی تعمیر کی اسکیم۔ ۸۰ فیصد مکانات کم آمدنی اور اقتصادی طور پر کمزور طبقے کے لیے۔
- پانچ سال میں ۱۲ لاکھ لوگوں کو حروف شناس بنانے کی اسکیم۔

آئیے ہم سب اپنے ملک کی راجدھانی کو دنیا کی خوبصورت اور مکمل شہری سہولیات مہیا کرنے والی راجدھانیوں میں سے ایک بنانے کے لیے عہد کریں۔

جاری کردہ : **محکمہ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ دلی۔**

موزوں ترین انتخاب

گوپال متل

نائب صدارت کے لیے جناب ہدایت اللہ کا انتخاب موزوں ترین ہے۔ یہ بات کم اہم نہیں کہ انتخاب تمام پارٹیوں کے متفقہ فیصلے کا نتیجہ ہے جو جناب ہدایت اللہ کی صلاحیتوں کا بہترین اعتراف ہے۔

جناب ہدایت اللہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہ چکے ہیں اور کچھ دنوں کے لیے ہندستان کے صدر بھی۔ ظاہر ہے کہ نائب صدارت کے لیے اُن سے بہتر اُمیدوار اور کون ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ سیاسی لوگوں کی یہ بات البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اُن کا تعلق ایک اقلیتی فرقے سے ہے۔ عدم فرقہ واریت کا ڈھونگ صحیح لیکن اس کا موقع بے موقع ڈھنڈورا پیٹنا ہمارے نزدیک موزوں نہیں۔

اتفاق سے ممتاز عہدوں کے لیے اُمیدوار کے انتخاب کا صحیح معیار ایک ایسے شخص نے مقرر کیا ہے جو سیکولر نہیں تھا اور بعض مورخ تو اُسے انتہائی متعصب بھی قرار دیتے ہیں۔ ہماری مُراد اورنگ زیب سے ہے۔ جب اُس کے کسی عزیز نے یہ شکایت کی کہ فلاں فلاں ممتاز عہدوں پر ہندو مقرر ہیں، اُن کی جگہ مسلمانوں کو کیوں نہیں لیا جاتا تو اُس نے جواب میں لکھا تھا کہ حکمراں کو ممتاز عہدوں کے لیے اُمیدوار منتخب کرتے وقت صرف اُن کی صلاحیت پر نظر رکھنی چاہیے، اُن کے مذہب پر نہیں۔ یہ خط رقعاتِ عالمگیری میں موجود ہے۔

راقم الحروف کے دفتر میں کئی مسلمان ملازم ہیں۔ جب بھی کوئی اس کا سلسلہ میرے غیر فرقہ وارانہ رویے سے جوڑتا ہے تو میں فوراً اس کی اصلاح کر دیتا ہوں کہ یہ لوگ اس لیے ملازم ہیں کہ باصلاحیت ہیں، مثلاً میرا ڈرائیور مسلمان ہے۔ مجھے اپنی جان بھی عزیز ہے اور اپنی کار بھی۔ اگر وہ اچھا ڈرائیور نہ ہوتا تو میں اسے ہرگز ملازم نہ رکھتا۔

OO

غزل

کرشن موہن

ایک البیلی جس کی شان ہے اپناپن
کومل تا اور چنچلتا کا سنگم ہے
بھرمائے من اس کے رخشاں روپ کی دھوپ
کاہش کا کارن ہے خواہش کی آندھی
جوگی بن کر پھرتے ہیں ہم دیش بدیش
اپنی خوشبو دُنیا کے ہر گوشے میں!
اپنی سوچ ہے اس سنسار کی سُندرتا
وحدت کی آئینہ دار ہے اپنی زبان
اپنی چاہت، اپنا جنوں صحرا صحرا
چند انسانوں کے باعث ہی قائم ہے
صدیوں کے بعد آتا ہے ایسا انساں
بھول گئے ہم آہیں بھرتی دھرتی کو
کاش ترا اندر بھی پریم کا مندر ہو!
تیرا کرم بے جوش ہے کیوں خاموش ہے کیوں

جیت چکی ہے اپنے پیار سے میرا من
پنکج ہے وہ، سورج سچ اُس کا جوبن
اور اُس کے لہراتے پاتوں کا ساون
پتّہ پتّہ بکھرا ہے اپنا جیون!
ہم وہ انساں ساری دھرتی جن کا وطن
ہم وہ پھول ہیں سارا عالم جن کا چمن
اور اپنا مَن ہے مانوتا کا دَرپن
فرق مٹانا پیار نبھانا اپنا فن
اپنی رنگت، اپنا فسوں گلشن گلشن
علم کا دھن، جیون کی لگن، دھرتی کا چین
جس کی فکر ہو ساری دُنیا کا درشن
جب سے بنا ہے چاند خیالوں کا آنگن
تیرا تبسم تیری باتیں من موہن!
مدت سے پھیلائے ہوں اپنا دامن

جگ کی ریت ہے مطلب ہو تو کہتے ہیں
کرشنا موہن، تجھ پر ارپن تن مَن دَھن

کمیونسٹ آئڈیالوجی اور سوویٹ حکمتِ عملی

گوپال مِتل

پچھلے دنوں اُردو کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر نے ایک ملاقات میں کہا کہ اب آپ ترقی پسند ادب کی تحریک اور کمیونزم کے خلاف کیوں لکھتے ہیں اب تو یہ مُردہ گھوڑے کو چابک لگانے کے مترادف ہے۔ اُن کے اس خیال کے مؤید یورپ میں بھی موجود ہیں اور ایسے کئی مشہور رُوسی بھی جو کمیونزم کے مخالف ہونے کی بنا پر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے۔ مثال کے طور پر الیگزنڈر سولنسٹین۔ بی بی سی میں انھوں نے کمیونزم کو "مُردہ کتا" قرار دیا۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ ساٹھ برس گزرنے کے باوجود روسی کمیونزم سے متاثر نہیں ہوئے، یہ کمیونزم پر اُن کی فتح ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "لینن اور ٹراٹسکی نے جس نظریاتی ظفر مندی کا ذکر کیا تھا اور روحوں پر قابض ہونے کا جو اعلان کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا ہے، ہم رُوسی ذہنی طور پر اب بھی آزاد ہیں۔"

لیکن اس سب کے باوجود روسیوں کا پروپیگنڈائی جہاد جاری ہے۔ مثال کے طور پر ۱۶ جولائی کو "پراودا" نے نظریاتی اسلحہ گھر" کا ذکر کیا اور اعلان کیا کہ پروپیگنڈائی محاذ پر زرِ کثیر صرف کیا جا رہا ہے۔ بقول "پراودا" روسیوں کو بہتر کمیونسٹ بنانے کے لیے سیاسی تربیت کے ساڑھے سات ہزار ادارے اور دفاتر مصروفِ کار ہیں۔ ایک لاکھ چھتیس ہزار کلب ہیں۔ ایک لاکھ اکتیس ہزار لائبریریاں ہیں۔ ایک ہزار چار سو میوزیم ہیں۔ ایک لاکھ ترپن ہزار فلم پروجیکٹر ہیں۔

ان سب باتوں کو سولنسٹین کی تائید میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کیونکہ جس نظریے کو مقبول بنانے کے لیے ساٹھ برس کے بعد بھی اتنا کچھ کرنا پڑے تو اس میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہوگی۔

رُوسی حکام کے لیے البتہ یہ تسلیم کرنا نا ممکن ہے کہ کمیونسٹ نظریہ بجائے خود ناکام ہو گیا ہے کیونکہ اس صورت میں کمیونسٹ پارٹی کے برسرِ اقتدار رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا اور سوویٹ یونین کے سامراجی اور توسیع پسندانہ عزائم کو بھی اس سے ضعف پہنچتا ہے۔

موجودہ سوویٹ حکمران مغرب کے تئیں اگر کبھی صلح جویانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں تو اسے لینن آئڈیالوجی سے انحراف قرار دینا غلط ہے کیونکہ یہ تو لینن کی پالیسی کے عین مطابق ہے۔ ۱۹۲۰ء میں اُس نے کہا تھا "ہمیں چالاکی سے کام لے کر سرمایہ دار دُنیا کی کوتاہیوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور ان کے دل میں خام مال کے لیے جو لالچ ہے اُس سے فائدہ اُٹھا کر اپنی اقتصادی پوزیشن کو مستحکم بنانا چاہیے۔" دراصل ۱۹۱۹ء میں ہی اس نے امریکہ کو کچھ مراعات دے دی تھیں تاکہ "وہ مشرقی سائبیریا میں جہازرانی کے امکانات اور کوئلے اور دوسری کانوں کو مالی منفعت کے لیے ترقی دے۔"

اس کے ساتھ ساتھ سوویٹ یونین نے اپنے توسیع پسندانہ عزائم کو بھی کبھی خیرباد نہیں کہا۔ اپنا تازہ ترین توسیع پسندانہ اقدام اُس نے افغانستان میں کیا ہے۔ افغانستان کی وہ جی توڑ کر مدد کر رہا ہے۔ تراقی حکومت کے رُوسی مشیروں کی تعداد اب ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ اسلحہ بھی اسے سوویٹ یونین وسیع پیمانے پر دے رہا ہے اور حکومت کے مخالفوں کے خلاف جو ہیلی کاپٹر استعمال ہوتے ہیں اُسے چلانے والے

بھی رُوسی ہیں۔ اس قسم کی اطلاعات بھی ہیں کہ تراقی حکومت کے مخالفوں کے خلاف رُوسی فوجیں استعمال کی گئیں۔ کابل میں ہوائی اڈے کے پاس رُوسی افسروں کے لیے جو عمارات بن رہی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ روسیوں کا وہاں مستقل قیام کا ارادہ ہے۔

لیکن اپنی تمام منصوبہ بندیوں کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ رُوسی اپنے عزائم میں کامیاب بھی ہو جائیں۔ اگر زیر کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تو دُنیا پر شیطان کی حکومت ہوتی۔ سوویٹ یونین کی تمام مدد کے باوجود تراقی حکومت خطرے سے دوچار ہے۔ اُس کے مخالف بنیادی طور پر دو گروپ ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور حزبِ اسلامی۔ ان دونوں گروپوں میں اختلافِ رائے موجود ہے۔ جہاں جماعتِ اسلامی اسلامی ری پبلک قائم کرنا چاہتی ہے، وہاں حزبِ اسلامی شاہ محمد صاحب کو واپس لانے کی خواہاں ہے جنہیں ۷۳ء میں اُن کے بھتیجے جنرل داؤد نے بالجبر برطرف کر دیا تھا لیکن ان دونوں گروپوں نے اپنے اختلافات بالائے طاق رکھ کر تراقی کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تراقی کی بے بصیرتی یہ ہے کہ اُس نے جوش میں کچھ باتیں اسلام کے خلاف بھی کہہ دیں جنھوں نے قبائلیوں کو بُری طرح مشتعل کر دیا۔ اب روسیوں کے خلاف اُن کے غصّے کا یہ عالم ہے کہ اکا دُکا روسی کو اپنے گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ جب بھی باہر نکلتے ہیں تو مسلح ہو کر گروپوں کی شکل میں نکلتے ہیں۔ قبائلی انھیں صرف قتل کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی لاشوں کی بے حرمتی بھی کرتے ہیں۔ پاکستان کے بعض اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق جب قبائلی کسی رُوسی کو قتل کرتے ہیں تو قتل کے بعد اُس کا عضوِ مخصوص کاٹ کر اُس کے مُنہ میں ٹھونس دیتے ہیں۔

اگر افغانستان میں رُوس کی مداخلت ناکام رہی تو اُسے دو نتائج بد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک تو چین کے گرد گھیرا ڈالنے کی اُس کی حکمتِ عملی ناکام ہو جائے گی اور دوسرے پاکستان اور ایران کے واقعات پر اثر انداز ہونے کی اُس کی صلاحیت بھی ختم ہو جائے گی۔ ایک تیسرا نتیجہ جو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے وہ یہ ہوگا کہ وسطی ایشیا کے وہ مُسلم خطے، جن پر سوویٹ یونین کا قبضہ ہے وہ بھی نئی رَو سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکیں گے۔

غالب کا ایک شعر

محمد مشتاق شارق

غالبؔ صدی کے موقع پر پروفیسر بیخود موہانی کی شرح کلامِ غالب، دیکھ رہا تھا۔ اتفاق سے نظر اس شعر پر ٹھہر گئی۔

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بیخود مرحوم لفظ 'بہادر' سے دھوکا کھا گئے اور علی بہادر کو بہادر شاہ ظفر سمجھ لیا۔ تصدیق کے لیے میں نے دوسری شرحوں کو دیکھا۔ اس سلسلے میں کلامِ غالب کے شارحین نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ سمندِ ناز سے وہ سمند مراد ہے جو ناز سے چلے۔ اضافت کے لیے ادنیٰ تعلق کافی ہوتا ہے۔ (طبا طبائی)

۲۔ حسرت موہانی نے اس شعر پر روشنی نہیں ڈالی۔

۳۔ سمندِ ناز۔ وہ گھوڑا جو ناز و ادا سے قدم اٹھائے۔ اے غالب! خدا کرے کہ عالی گہر علی بہادر کو میں سمندِ ناز پر سوار دیکھوں۔ (آغا محمد باقر)

۴۔ عالی گہر = عالی خاندان
علی بہادر = بہادر شاہ ظفر
حل = خدا وہ دن دکھائے کہ میں علی بہادر کو چل پل کرنے والے گھوڑے پر سوار دیکھوں (علامہ سید محمد بیخود موہانی)

۵۔ یہ مقطع اگرچہ مدحیہ ہے مگر مدح کے لیے ہے۔ سمندِ ناز وہ گھوڑا جس کی رفتار میں ناز و ادا ہو۔ عالی گہر یعنی عالی خاندان بلند نسب۔ علی بہادر شہزادے کا نام ہے۔ (جوش ملسیانی)

۶۔ سمندِ ناز کے لیے معنی کرتے ہیں کہ وہ شاہ [illegible]۔ ([illegible])

بنیادی تصور - آرزوے دیدارِ نواب علی بہادر۔

(نوٹ) نواب علی بہادر والیٔ ریاست باندہ تھے جنھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے فاتحین نے ریاست سے معزول کر کے اندور میں نظر بند کر دیا تھا۔ وہ غالب کے بڑے قدردانوں میں سے تھے۔ (پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

علی بہادر کے بارے میں صرف پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کچھ باتیں کہی ہیں لیکن شرح میں وہ بھی دوسرے شارحین سے کچھ آگے نہیں بڑھے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شعر کہتے وقت کیا غالب کے ذہن میں صرف یہی مفہوم تھا کہ خدا کرے میں علی بہادر کو چل پل کرنے والے گھوڑے پر سوار دیکھوں۔ اتنے سے مطلب کے لیے تو غالب شعر نہیں کہہ سکتے تھے۔

غالب تو بات سے بات پیدا کرنے والا شاعر تھا۔ اس نے بہادر شاہ کے ولی عہد کا سہرا کہا تو چیلنج دے دیا:

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

اور جب بات آگے بڑھی تو قطعہ معذرت لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا مگر مقطع میں پھر ایک سخن گسترانہ بات کہہ دی:

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کہنا یہ ہے کہ غالب ایسا شاعر نہیں جو سیدھا سادا شعر کہہ دے جس کا مطلب صرف یہ ہو کہ خدا کرے میں ممدوح کو سمندِ ناز پر سوار دیکھوں۔ [illegible] [illegible] تو شعر کے مفہوم تک رسائی ہو۔ پھر تو اس شعر کے معنی یہ ہوں [illegible]

اس کے لیے چار باتوں کی وضاحت ضروری ہے جس کے بغیر شعر کے صحیح مفہوم کو متعین کرنا ممکن نہیں۔ وہ باتیں یہ ہیں :

۱۔ علی بہادر کون تھے ؟

۲۔ غالب سے علی بہادر کا کیا رشتہ تھا ؟

۳۔ 'مسندِ ناز' سے کیا مفہوم مراد ہے ؟

۴۔ غالب نے 'عالی گہر' کا استعمال قافیے کی مجبوری کی وجہ سے کیا یا قصداً ؟

اب آپ علیحدہ علیحدہ ان سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیں :

۱۔ علی بہادر کون تھے ؟

نواب علی بہادر ثانی اپنے باپ نواب ذوالفقار بہادر کی وفات کے بعد مئی ۱۸۰۱ء میں ریاست باندہ کی گدی پر بیٹھے۔ وہ نہایت شجاع اور سخن فہم تھے۔ باندہ میں اُن کا عہد بڑے سکون و اطمینان کا تھا۔ منیر شکوہ آبادی نے قصیدے کے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہتے ہیں :

نواب کے کرم سے زمانہ ہے کامیاب
باندے میں روز دیکھیے چاہے عید کا

مگر یہ امن و سکون کا زمانہ بہت جلدی ختم ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں نواب علی بہادر بھی عملاً شریک ہو گئے اور ولی جھانسی کے دستِ راست بن کر انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے مگر جب حالات نے پلٹا کھایا تو انھیں مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے۔ چونکہ انھوں نے بذاتِ خود کسی انگریز کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ بعض انگریز کی جانیں اُن کی وجہ سے بچ گئی تھیں، اس وجہ سے اُن پر بغاوت کا مقدمہ نہ چلایا جا سکا مگر ان کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ اور ہتھیار رکھنے کے حق کو بھی اُن سے چھین لیا گیا۔ ہاں ازراہِ ہمدردی گورنمنٹ نے تین ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ[1] مقرر کر کے انھیں اندور میں نظر بند کر دیا۔

نواب علی بہادر کا انتقال [illegible] کے مارچ میں سہ [illegible]
[illegible] کے مقام پر ہوا [illegible] اجازت

سے کسی نیاز کی کام سے گئے ہوئے تھے۔

نواب علی بہادر کو شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ علی تخلص تھا۔ ابتدا میں عباس بریلوی کو کلام دکھایا۔ اُن کے بعد شیخ مصحفی ہمدانی سے رجوع کیا جو ان کے درباری شاعر تھے۔ غالب سے بھی استفادہ کیا۔ ایک دیوان اور مثنوی مہر افشاں انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی۔ غزل کے کچھ منتخب اشعار دیکھیے :

ترے خدنگِ ادا کا وہی نشانہ ہوا
کہ جس کے عشق سے تو آفتِ زمانہ ہوا
یہ کچھ نہ سوجھی کہ مجھ پہ گزر گئی کیا کیا
تمھیں تو وجہ مسرّت مرا فسانہ ہوا
یہ کیا کیا جو کیا دعوئے وفا تو اب
کہ اس کو اور جفا کے لیے بہانہ ہوا

ہمیں سمجھتے ہیں اس رنگ سرخ کی تہ کو
عتاب چہرے سے ظاہر ہے پیارے دل میں
بغیر ابر کے برسے نہ جائے گی گرمی
گلائے شوق سے مجھ کو بخار ہے دل میں

۲۔ غالب سے علی بہادر کا رشتہ۔

نوابانِ باندہ سے غالب کی رشتہ داری کا آغاز نواب علی بہادر اول کے زمانے سے ہوتا ہے جنھوں نے اپنی دوسری شادی آگرہ میں غالب کی نانی کی ہمشیرہ سے کی تھی اور جن کے بطن سے ۱۸۰۰ء میں کالنجر کے مقام پر ذوالفقار بہادر کی ولادت ہوئی۔ اس تعلق کا حوالہ دیتے ہوئے غالب ایک خط میں انوارالدولہ نواب سعدالدین خاں شفق کو جن کے دورہ کالپی کو لکھتے ہیں :

"میرا دل جانتا ہے کہ آپ کو دیکھنے کا میں کس قدر آرزومند ہوں۔ میرا ایک بھائی باندہ کا بیٹا کہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسندنشینِ حال کا چچا تھا اور

---

[1] [illegible] تمام جاگیر ضبط ہو گئی تھی۔ غلام رسول مہر نے تین ہزار [illegible] نے چار سو روپیہ ماہوار لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اثمارستان کے حواشی، مرتبہ: غلام رسول مہر

میرا بھی شبہ یہی تھا یعنی میں نے اپنی بیماری کا اور اُس نے اپنی پھوپی کا وہ وہم پیا تھا جو باعث ہوا تھا بندیل کھنڈ آنے کا . . . . وہ ارادہ قوت سے فعل میں نہ آیا - اے میرزا اذبک خاں میرا بھائی مرگیا[1]

علی بہادر کے والد نواب ذوالفقار بہادر کے عہد میں غالب باندہ میں چھ ماہ کے قریب مقیم رہے - اُن کی کئی غزلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں - اُن کے مقطع ملاحظہ ہوں :

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں[2]

علی بہادر ثانی ذوالفقار بہادر کے صاحبزادے تھے - پنج آہنگ سے ثابت ہے کہ انھوں نے غالب سے اصلاح بھی لی تھی -
اس سے معلوم ہوا کہ علی بہادر اور غالب کی باہم رشتہ داری بھی تھی اور باہمی تعلقات میں خلوص کا بھی دخل تھا -

۲ - ' سوارِ سمندِ ناز ' سے کیا مفہوم مراد ہے ؟
اس کے دو مفہوم ہیں :

ا - باندہ کی ریاست ایک زمانہ میں با اختیار تھی مگر شمشیر بہادر کے عہدِ حکومت میں ۱۸۰۴ء میں اسے انگریزوں نے لے لیا - حاکم وقت کا چار لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ بطور گزارہ مقرر کر دیا - بعد میں سکونت کے لیے ایک بڑا علاقہ عطا کرکے انھیں حفاظتی دستہ رکھنے کی اجازت بھی دے دی -

شمشیر بہادر کے بعد ذوالفقار بہادر اور ذوالفقار بہادر کے بعد ۱۸۵۰ء میں علی بہادر وارثِ جائداد مقرر ہوئے مگر اس وقت اُن کی حیثیت بااختیار نواب کی نہ تھی وہ صرف رئیس باندہ تھے - لازمی بات ہے کہ اقتدار سے محرومی کا احساس علی بہادر کو ہوگا اور شاید اسی اندرونی جذبے سے مجبور ہوکر وہ غدر میں انگریزوں کے خلاف کھڑے ہوئے تھے

غالب کو بھی علی بہادر کی اس بےبسی اور اندرونی کرب کا احساس تھا اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے یعنی خدا کرے کہ علی بہادر کو پھر کھویا ہوا وقار حاصل ہو جائے، اُن کی ضبط شدہ ریاست انھیں واپس مل جائے اور حقیقی طور پر ریاست کے مسند نشین ہو جائیں -

(ب) " نواب علی بہادر نے اپنی عمر میں تین نکاح کیے - اُن کی پہلی بیوی کا نام مبارک محل تھا جن سے باندہ میں نکاح ہوا تھا - بعد میں انھوں نے ان کی چھوٹی بہن افتخار محل سے بھی نکاح کرنا چاہا لیکن چونکہ شریعتِ اسلام میں دو بہنوں سے بیک وقت نکاح ممانعت ہے، اسی لیے وہ کھلے بندوں تو ایسا نہ کر سکے البتہ افتخار محل ان کی بیوی تسلیم کی جاتی تھی -"[3]

میرے خیال میں جس وقت غالب نے یہ شعر کہا ہے اس وقت نواب کا رومان افتخار محل سے چل رہا تھا - غالب کو بھی اس کا علم ہوگا - انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ شریعت کی رو سے دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا - ہو سکتا ہے - اس نزاکت کا احساس افتخار محل کو بھی ہو اور وہ ابتدا میں نواب

---

۱ خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد و اُردوئے معلی ص ۲۳ - خطوطِ غالب : مرتبہ : مالک رام میں اذبک خاں کی بجائے یہ نام اورنگ خاں اور اذبک جان لکھا ہوا ہے -

۲ غالب از غلام رسول مہر ص ۹۸ - ۹۹ - طبع چہارم -

۳ مضمون نواب علی بہادر خاں باندہ ، از مالک رام مطبوعہ " آجکل " اردو بابت ماہ فروری ۱۹۵۵ء - پنڈت شیام لال نے اپنی مرتبہ تاریخ بندیل کھنڈ میں بھی اس واقعہ کا اظہار کیا ہے - مگر علی بہادر ایسے متبع شریعت سے اس گناہ کا ارتکاب بعید از قیاس ہے - ہو سکتا ہے کہ مبارک محل اور افتخار محل آپس میں کسی دوسرے رشتے سے بہنیں ہوں جن سے شریعت کی رو سے نکاح جائز ہو -

تو اپنے قریب دیکھتے دیتی ہو۔ اس معنائی فضا کو دیکھیے اور غالب کی دعا پر نظر کیجیے۔ کہتے ہیں خدا کرے کہ نواب کی رسائی اُمّیدوار تک ہو جائے اور وہ اپنی مُراد پالیں۔ اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر آپ غالب کے دعائیہ فقرے "سوارِ سمند ناز" کی معنوی خوبی کو دیکھیے۔ لفظ "ناز" پر خصوصی نظر رہے۔ اب آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس چھوٹے سے فقرے کے پس منظر میں کتنی بڑی داستان پوشیدہ ہے۔ یہ اندازِ بیان غالب اور صرف غالب ہی اختیار کر سکتا تھا۔ اس اشارے کو علی بہادر کے سوائے اور کس نے سمجھا ہوگا؟

۴۔ غالب نے عالی گہر کا استعمال قافیے کی مجبوری سے کیا یا قصداً؟

اگر غالب کے مذکورہ بالا مقطع کی نثر کی جائے تو یہ ہوگی۔ "غالب خدا کرے کہ میں عالی گہر علی بہادر کو سوارِ سمند ناز دیکھوں"۔ یہاں عالی گہر، صفت کے طور پر آیا ہے۔ جہاں تک قافیے کی مجبوری کا سوال ہے۔ غالب تھوڑی سی فکر کے بعد کوئی اور مناسب قافیہ یہاں استعمال کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر فطرتِ غالب کے اداشناس ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ غالب کی انا دوسروں کے مقابلے میں کچھ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو باعتبارِ نسب ارفع و اعلیٰ سمجھتے تھے۔ علی بہادر اس حیثیت سے، اُن سے کم تر تھے۔ مگر پھر بھی غالب محض شاعر تھے۔ علی بہادر ایک ریاست کے نواب تھے۔ اُن کا اپنی جگہ ایک بلند مقام تھا۔ غالب اپنی نسبی برتری کا اظہار علانیہ طور پر کر بھی نہیں سکتے تھے مگر "عالی گہر" کے پردے میں انھوں نے اپنی انا کی تسکین کر لی۔

لغوی اعتبار سے "عالی گہر" کے معنی ہیں عالی نسب، عالی خاندان۔ مگر یہاں مفہوم اُلٹا ہے۔ اسی طرح جس طرح ہم کسی بزدل آدمی سے کہیں کہ آپ تو بڑے بہادر ہیں۔ چنانچہ غالب نے لفظ "عالی گہر" کو استعمال کر کے بڑی خوبصورتی سے بصد معصومیت بتا دیا کہ علی بہادر شہزادہ نواب ہوں مگر عالی نسب نہیں۔ اس کی تفصیل بڑی دلچسپ ہے۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

ضلع ہمیر پور کے جنوبی حصّے میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جیت پور۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہاں راجا چھتر سال بندیلے کی حکومت تھی۔ جب نواب محمد خاں بنگش نے جیت پور کا محاصرہ کیا تو والیِ ریاست نے پیشوا باجی راؤ اوّل کو اپنی مدد کے لیے بلایا۔ یہ ۱۷۲۹ء کا واقعہ ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر بنگش کو صلح کرنی پڑی اور وہ جیت پور کو خالی کر کے واپس اپنے علاقے فرخ آباد کو چلا گیا۔ راجا چھتر سال نے اس احسان کا بدلہ اس طرح چکایا کہ باجی راؤ کو باندہ میں ایک بڑی جاگیر دے دی اور اس کے ساتھ بطور تحفہ ایک نہایت خوبصورت عورت مستانی کو ہمراہ کر دیا۔ مستانی کون تھی، اس کے بارے میں صحیح معلومات تو نہیں ہو سکتیں مگر اتنا پتا ہے کہ اُس کا باپ ہندو اور ماں مسلمان تھی۔ مستانی بھی مذہباً مسلمان تھی اور گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔[۱]

مستانی سے باجی راؤ کے ایک لڑکا شمشیر بہادر پیدا ہوا۔ چونکہ مستانی مسلمان تھی، اس لیے شمشیر بہادر کی پرورش اسلامی شعائر کے مطابق کی گئی۔ شمشیر بہادر کے ایک لڑکا علی بہادر اوّل نام کا پیدا ہوا۔ علی بہادر کے بعد شمشیر بہادر ثانی[۲] اس کے بعد ذوالفقار علی بہادر اور آخر میں علی بہادر ثانی وارث خاندان قرار پائے۔

علی بہادر ثانی فطرتاً نیک اور شجاع تھے مگر دوسرے رؤسا

---

[۱] غلام رسول مہر اپنی مشہور تصنیف مجاہدینِ آزادی میں لکھتے ہیں کہ "چھتر سال بندیلے کی ایک لڑکی کسی لڑائی میں محمد خاں بنگش کے ہاتھوں قید ہوئی۔ باجی راؤ پیشوا نے قیدی رہا کر دیے تو چھتر سال نے لڑکی کو واپس لینے میں پس و پیش کی اس لیے کہ وہ مسلمان کی قید میں رہ چکی تھی۔ نیز وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ باجی راؤ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا۔" صفحہ ۲۵۹ لاہور ایڈیشن۔ خاندانی روایت یہ ہے کہ وہ مدھیہ پردیش کے کسی جاگیردار کی لڑکی تھی۔ باجی راؤ نے اس کا ڈولا اس طرح لیا جیسے مغل راجپوت لڑکیوں کے ڈولے لیتے تھے۔

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

کے مقابلے میں اُن کی خاندانی حیثیت وسیع نہ تھی۔ غالب کب
چوکنے والے تھے۔ انھوں نے 'عالی گہر' کا استعمال کر ہی دیا مگر
کتنی معصومیت کے ساتھ۔ اگر کوئی 'خدا کرے' پر غور کرے تو
سوچ بھی نہیں سکتا کہ 'عالی گہر' کا استعمال غالب نے کیوں کیا؟

بایں ہمہ غالب اور علی بہادر ثانی کے تعلقات خلوص پر مبنی تھے
اس کی روشنی میں ہم غالب کی نیت پر زیادہ شک بھی نہیں
کر سکتے۔ ہو سکتا ہے شعر کہتے وقت اُن کے ذہن میں یہ مفہوم
" اے غالب خدا کرے علی بہادر کو صحیح معنی میں وقار حاصل

(بقیہ فٹ نوٹ)

[۷] شمشیر بہادر اول (۱۷۳۵ء - ۱۷۶۲ء) پانی پت کی آخری لڑائی میں جب مرہٹے احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ کر رہے تھے شمشیر نے بڑی بے جگری سے مرہٹوں کا ساتھ دیا۔ اس لڑائی میں اُنھیں کاری زخم آئے۔ اسی حال میں بھرت پور پہنچ کر اُس کا انتقال ہوگیا۔ ڈیگ میں مدفون ہوئے۔

[۸] علی بہادر اول (۱۷۵۸ - ۱۸۰۲ء) جب مرہٹوں نے شاہ عالم کو غلام قادر روہیلے سے نجات دلائی تو وہ علی بہادر اول ہی تھا جس نے غلام قادر کا پیچھا کیا اور اسے گرفتار کر کے سندھیا کے سامنے پیش کیا بعد میں جب سندھیا سے بگاڑ ہوگیا تو واپس اپنی جاگیر باندہ چلا گیا اور گرد و نواح کے علاقے پر قبضہ کر کے ایک مضبوط ریاست قائم کر دی۔ کالنجر کے محاصرے کے دوران ۱۸۰۲ء میں معمولی علالت کے بعد اُس کا انتقال ہوگیا۔ قطب صاحب دہلی میں مدفون ہوئے۔

[۹] شمشیر بہادر ثانی۔ علی بہادر اول کے بعد وارثِ تخت ہوا مگر ۱۸۰۴ء میں انگریزوں نے باندہ کی ریاست کو واپس۔ شمشیر بہادر کا چار لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ بعد میں باندہ کے قریب ایک وسیع علاقہ دے کر حفاظتی دستہ رکھنے کی اجازت بھی دے دی۔ شمشیر بہادر ثانی کا انتقال ۳۱ اگست ۱۸۲۳ء کو ہوا۔ یہ لاولد فوت ہوا۔

[۱۰] ذوالفقار علی بہادر۔ (۱۸۰۰ء - ۱۸۴۹ء) یہ شمشیر بہادر ثانی کا علاتی بھائی تھا۔ شمشیر بہادر ثانی کو جب پونا میں اپنے باپ کی وفات کا علم ہوا تو وہ فوج لے کر باندہ آیا اور ذوالفقار بہادر کو جس کی عمر اس وقت ڈھائی سال تھی، تخت سے اُتار کر خود ریاست پر قابض ہوگیا۔ شمشیر بہادر کے چونکہ اولاد نرینہ نہیں تھی، اس لیے اس نے ذوالفقار بہادر کی پرورش اولاد کی طرح کی۔ اور اُس کی وفات کے بعد حسبِ وصیت ذوالفقار بہادر وارثِ جائداد تسلیم کیا گیا۔ ذوالفقار بہادر نے ستائیس سال تک باندہ پر حکومت کی اور باندہ کو بہت ترقی دی۔ ذوالفقار بہادر کو دینی امور میں غلو تھا اور وہ شاہ عبدالعزیز سے بیعت تھا۔ ۱۸۲۷ء میں غالب کی آمد کے وقت ذوالفقار بہادر ہی سربراہِ ریاست باندہ تھا۔

[۱۱] علی بہادر ثانی۔ (۱۸۳۳ء - ۱۸۷۳ء) پندرہ سال کی عمر میں ذوالفقار بہادر کے بعد مسند نشین ہوا۔ حافظِ قرآن اور صاحبِ علم تھا۔ چونکہ علی بہادر کے عہد میں تخفیفِ اختیارات عمل میں آئی تھی اس لیے حکومت سے بددل تھا۔ غدر میں شرکت کے باعث اندور میں وظیفہ دے کر نظر بند کر دیا گیا۔

ہو جائے اور بدنامی کا جو دھبہ اُن کے خاندان پر لگ گیا ہے وہ
مٹ جائے۔

آخر میں غالب کے مقطع کو دہرا کر [illegible]
ساتھ لکھا جاتا ہے:

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

"اے غالب خدا کرے علی بہادر کو ضبط شدہ ریاست
واپس مل جائے اور [illegible] یا اعلیٰ ریاست کا

(بقیہ: ص [illegible] پر)

فنؔ اور شخصیت

پروفیسر خورشید سمیع

فنؔ اور فنکار کی شخصیت کو جُدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مسلّمہ ہے۔ ویسے بھی سوچنے کی بات ہے کہ اُسی فن میں تازگی، حُسن اور زندگی کیوں ہوتی ہے جس میں فنکار کی اپنی شخصیت اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ اور رسکن کے الفاظ میں "پورے خلوص دل کے ساتھ" نمایاں ہوئی ہو۔ اگر ایک طرف یہ کہنا صحیح ہے کہ فنکار کا کام اپنی شخصیت کے رشتے سے آزاد نہیں ہو پاتا بلکہ اُس کے فن میں رُوح اُسی کی شخصیت کے رشتے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ صحیح لکھنا اس بات کی دلیل کب ہے کہ جو چیز لکھی گئی ہے وہ دلکش، جاذب نظر اور مؤثر بھی ہو اور اگر اسے میں تسلیم بھی کرلوں کہ یہ محض ایک تکنیک ہے جس کے سہارے تاثر پیدا کیا جاتا ہے، دلکشی کو وجود میں لایا جاسکتا ہے تو پھر الفاظ کی شعلہ افشانی گرمی اور توانائی کے بابت کیا کہیں گے۔ کیا یہ کیفیت الفاظ میں شخصیت کے اکتساب سے جُدا ہے؟

فن برائے فنکار کا نظریہ جدید دبستان تنقید کا نظریہ ہونے کے باعث کچھ لوگوں کی نظر میں بہت ہی نیا نظریہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ میری ناچیز رائے میں یہ معاملہ قدیم ہی نہیں، بلکہ بہت ہی قدیم ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے جدید شاعری دراصل قدیم ترین شاعری ہے۔ آپ خصوصاً [illegible] بائبل یا خود قرآن پاک کی تمام آیات کو غور سے پڑھیے یہ سب آزاد تکنیک میں ہیں۔ بہرحال! آپ انگریزی تنقید بلکہ فرانسیسی تنقید کے ستاروں پر دیکھیں تو سنت بیو کا نام چمکتا ہوا نظر آئے گا۔ اُس کے نزدیک کسی فن پارہ کو سمجھنے کے لیے فنکار کا سمجھنا بھی ضروری ہے۔ بقول اُس کے یہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسے کہ پھل کو سمجھنے کے لیے درخت کا سمجھنا ضروری ہے۔ دو باتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فنکار کی شخصیت [illegible] اہم ہو اور اُس کی [illegible] شکل [illegible] اہم ہے۔ دوسری

صورت یہ کہ شخصیت اہم ہے۔ یہ دونوں باتیں یقیناً متضاد ہیں۔ اب ان متضاد باتوں کے تضاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کا معاملہ یہ نسبتاً دقت طلب ہے۔ بات بہت ہی نازک ہے اور دقت نظری کی متقاضی بھی۔ اس لیے اب میں یہ کہوں گا کیوں نہیں یہ دیکھا جائے کہ فن کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کشمکش ہے۔ جو دراصل فنکار میں اُس کے ماحول کے تضاد سے پیدا ہوتی ہے۔ اب فنکار کے سامنے مسئلہ صرف اظہار کا نہیں۔ بلکہ فن اُس کی شخصیت کے اظہار کا اتنا ہی اہم پہلو ہے جتنا کہ اسے مناسب اور موزوں ترین الفاظ پہنانے کا مسئلہ۔ ایسی صورت میں شخصیت کو فن سے جُدا کرنے سے بات نہیں بنتی۔ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا "شاعری شخصیت کا اظہار نہیں، شخصیت سے فرار ہے۔" مسئلہ دراصل شخصیت کو فن سے خارج کرنے کا اُس حد تک نہیں، جس حد تک یہ مسئلہ شخصیت کو فن کے تابع کرنے کا ہے۔ ممکن ہے شخصیت اُتنی اہم نہیں رہ جاتی ہو، جتنا کہ فن، لیکن یہ بھی نتیجہ نہیں نکلتا کہ شخصیت بالکل ہی غیر اہم ہے۔ فن کی یہ کاوش خونِ جگر کی آمیزش سے ہوتی ہے۔ اور فن تو محض ایک شعوری کوشش ہے اُس لاشعوری احساس کو پیش کرنے کا۔ اور جب فنکار اپنے احساس کو پیش کرتا ہے۔ وہ اصل میں تو شخصیت ہی بولتی ہے۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اس رشتے کو اُبھارنا اس لیے بھی اہم ہے کہ [illegible] جو انفرادیت جھلکتی ہے شخصیت سے ہی اثر پذیر ہوتی ہے۔ بعض ناقدوں کے نظریے کے مطابق فن تو محض حُسن کا [illegible]

معیار ہوتا ہے اور اسے کوئی شخص بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہ کہنا کہ ایک ہی چیز کے بیان کرنے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، غلط ہے، اور اگر صحیح بھی ہو تو اسلوب اس سے نہیں وجود میں آتا کہ مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ اپنایا گیا ہے، کیونکہ یہ بات ہم کسی منشی یا محرر کے حوالے سے نہیں کر رہے ہیں، بلکہ فنکار کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ اسلوب کی انفرادیت یا جذبات کی انفرادیت اہم نہیں بلکہ طریقِ فکر اور آواز کی انفرادیت اہم ہے۔ یہ دراصل ایگو کی تفریق ہے۔ اور یہی وہ پہلو ہے، جو کسی شاعر کو ایک منفرد آواز اور لب و لہجہ بخشتا ہے۔ اور یہی اسلوب کی بنیاد بھی ہے۔

ذوق کے یہاں اسلوب نہ تھا، باوجودیکہ وہ فن میں طاق بھی تھے:

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا

لیکن شاعری محض استادی نہیں، اس کے لیے ایک شخصیت اور ایک مخصوص اسلوبِ فکر درکار ہے۔ ذوق کے یہاں کچھ اسی بات کی کمی ہے۔ اب آپ غالب کے کلام کو دیکھیں، معاشی اور معاشرتی تقاضوں کی تصویر کھینچنا۔ اور اپنی آواز میں انفرادیت پیدا کرنا جس میں انسانیت کا سوز بھی ہو، پل صراط پر گزرنے کی سی بات ہے۔ تمثیل کے طور پر غالب کا وہ قطعہ لیجیے:

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اس میں خیال کی [illegible]
[illegible]

شعراء اور فنکار کی فہرست ہر زمانے میں بہت طویل ہوا کرتی ہے لیکن ان میں سے شاعر اور فنکار بقول غالب یہی دو ڈھائی ہی نکلا کرتے ہیں۔ غالب تو شیفتہ کو بھی بحیثیت شاعر قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ دراصل بڑا فنکار وہ ہے جو اپنے اظہارِ شخصیت اور فن کے مطالبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی خودی (Egoistic Character) اور غیر خودی (Altruistic Character) کے درمیان بھی ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اور جو فنکار توازن پیدا نہیں کر پاتا اس کی شخصیت پارہ پارہ اور منتشر ہو جاتی ہے۔

علم نفسیات کے مطابق شخصیت منظم ہوتی ہے ایگو کے گرد۔ اور ایگو محض خودنگری یا خودگری نہیں۔ بلکہ اپنی مدافعت بھی ہے۔ کسی بھی انسان میں کیریکٹر ایگو کی اسی مدافعت سے پیدا ہوتا ہے۔ کیریکٹر شخصیت کی ضد نہیں ہے جیسا کہ ہربرٹ ریڈ (Herbert Reid) نے لکھا ہے۔
(Collected Essays in Literary Criticism by Herbert Reid)
بلکہ شخصیت، کیریکٹر کا جزوِ اعظم ہے یا الگ بنیاد ہے۔ [illegible] کیریکٹر کے یہ معنی نہیں کہ وہ مکمل اور مستقل ہو۔ اس میں کوئی لچک [illegible] شخصیت [illegible] جھکتی ہے اور اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرتی ہے لیکن اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹتی نہیں ہے۔ اس میں ایک اور صفت بھی ہے، جس صفت کے باعث شخصیت میں وزن پیدا ہوتا ہے اور اس کی ترقی میں وقار پیدا ہوتا ہے۔ اور شخصیت کا یہ معیار صرف عام انسانوں کے بارے میں ہی ہے، بلکہ فنکار کے بارے میں تو خاص طور پر صحیح ہے کیونکہ اگر فن کسی ایگو کی کشمکش کا نتیجہ ہے، جو کہ وہ اپنے ماحول کے بالمقابل محسوس کرتا ہے تو پھر اس کی کشمکش کا تعین تو اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے، جبکہ وہ اس کشمکش میں کسی جگہ پر کھڑا ہو [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

انھوں نے جو جوگی کا سوانگ بھرا۔ وہ اُن کی اصل شخصیت پر کچھ اس طرح مستولی ہو گیا کہ بالعموم اُن کی اسی آواز کو لوگ میر تقی میر کی آواز سمجھنے لگے :

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یہ صحیح ہے کہ بے نیازی اور استغنا اُن کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔ لیکن اُن کی درد مند آواز کی صرف یہی ایک لے نہیں ہے۔ ایک لے وہ بھی ہے، جس کا تعلق اُن کے اپنے احترامِ نفس سے ہے :

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

تاوقتیکہ اُن کی شخصیت کی اس پیچیدگی کو ہم سامنے نہ رکھیں جو ان کے احترامِ نفس اور احترامِ آدمیت کے درمیان ایک توازن کا رشتہ قائم کرتی ہے، ہم ان کی آواز کو پہچاننے میں غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری سے ایک بار یہ غلطی ہوئی تھی :

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مجنوں گورکھپوری غلطی سے اسے میر کی آواز سمجھ بیٹھے اور بھول گئے کہ یہ لب و لہجہ تو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی مخصوص نسائیت کا حامل ہے۔ میر ستم دیدہ کے لہجے میں ایسی کوئی بھی نسائیت نہیں ہے۔ وہ اظہارِ شکست کرتے بھی ہیں تو لہجے میں بہادری ملتی ہے :

بارے کل بھڑ گئے اُس ظالم خونخوار سے ہم
منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

"کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا" یہ ہے میر کا لہجہ نہ کہ مقابلہ دلِ ناتواں نے خوب کیا۔ میر زخمی ہوتے ہیں، قتل ہوتے ہیں، لڑتے بھڑتے ہیں اور بے حمیت ہو کر پھر جاتے ہیں :

آج پھر تھا بے حمیت میر واں
کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

لیکن نہ تو عاجزی آن بان میں فرق آنے دیتے ہیں اور نہ اُن کے لہجے میں نسائیت پیدا ہو پاتی ہے۔ درد مندی کی آواز اور نسائیت کے لہجے میں بڑا فرق ہے :

سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو
لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد

اصل شخصیت میر کی یہ ہے جو کبھی کبھی اس قدر بلند بانگ بھی ہو جاتی ہے :

میں کون ہوں اے ہم نفسانِ سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

یہ در اصل اسلوب کی شناخت ہے۔ اور انفرادیت کو شخصیت کے آئینے میں دیکھنا ہے۔ اسلوب در اصل افکار یا جذبات کی نوعیت پر منحصر نہیں بلکہ اس کی شناخت شخصیت کے رشتے سے ہوتی ہے۔ اسلوب اُس نقش کا نام ہے جو کہ شخصیت تحریر میں چھوڑتی ہے۔ اور یہیں منفرد اندازِ فکر پیدا ہوتا ہے اور اپنے اس نقش کو انسان اُس وقت مرتسم کرتا ہے جبکہ وہ اندازِ بیان کے تمام مستعمل اسلوبوں سے درگزر تا ہے۔ بہترین اسلوب اس وقت وجود میں آتا ہے جبکہ فنکار اسلوب سے بے خبر ہو، مگر شخصیت سے باخبر ہو۔

ہم شاہ نصیر، شیخ ناسخ، عبد الحلیم شرر یا بعض ترقی پسند یا رجعت پسند ادیبوں کے بارے میں یہ کہنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ اُن کے فن میں انفرادیت ہے۔ جبکہ اُن کی الگ الگ خصوصیات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان فنکاروں نے کچھ نہ کچھ زبان و ادب کی خدمت بھی کی ہے۔ لیکن حقیقت کی ترجمانی نہیں کی۔ ایک ایسے جزو کی ترجمانی کرتے رہے جس کو انھوں نے "کل" کے ساتھ مطابقت نہیں دی۔ تو انھوں نے قارئین اور سامعین میں خاصی مقبولیت بھی حاصل کی تھی۔ لیکن مقبولیت تو داغ نے بھی بہت حاصل کی کیا داغ کو مومن سے بڑا فنکار کہا جائے گا؟ ظاہر ہے داغ کے یہاں سستی جذباتیت ہے۔ مومن کا موضوع بھی گو داغ اور جرأت والا ہی ہے۔ لیکن اُس نے فنی تقاضوں کا خیال داغ اور جرأت کے مقابلے میں زیادہ رکھا ہے۔ اُس نے اپنے محسوسات کو فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے اس لیے ہم مومن کے بارے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ اس سلسلے میں منفرد شاعر ہے۔ جس میں

جبلّات، داغ وغیرہ بھی آتے ہیں۔ فنکار کے شخصی میلانات، اپنی شخصیت کا گرد و پیش، اپنے سماج کا نیز وہم بہت وقعت رکھتے ہیں۔ جو فن کار اپنے فن کا موضوع اپنی باتوں کو بنائے گا، اس کو ہرگز ہرگز ہم محدود نہیں کر سکتے لیکن یہ بھی نہ ہو کہ وہ اس موضوع کو کسی دوسری شخصیت، کسی دوسرے سماج کے خلاف ایک پروپیگنڈا کی شکل بنا دے گا۔ تو اس کے بھٹک جانے کا خطرہ ہے۔ فنکار اپنے شخصی پہلوؤں میں بھی اتنا گہرا جا سکتا ہے کہ وہ شخصی پہلو شخصی نہ رہیں انسانی بن جائیں۔ اس جزو کے رشتے "کل" سے ملتے نظر آئیں۔ وہ اپنی سوسائٹی کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کرے کہ اس میں ایک دُنیا سمٹتی ہوئی نظر آئے۔ فنکار جب اپنے سماج کو اپنے فن میں منتقل کرے تو وہ ایک کڑی بنتی ہوئی نظر آئے گی۔ دُنیائے ادب کی زنجیر کی ایک مضبوط کڑی جس کی پوری زنجیر نہ توڑی جا سکتی ہے۔ اور نہ اس کی توقع ہے۔

میلارمے کے نظریے کے مطابق کائنات کے وجود کا مقصد اظہار میں تبدیل ہو جانا ہے یعنی فنکار کی کائنات میں بدل جانا ہے، کیونکہ کائنات کے انتشار اور بد نظمی کو دُور کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اُس کو فنکار کی کائنات میں بدل دیا جائے یعنی اس کا جمالیاتی اظہار میلارمے کے نزدیک لفظ "شئے" کا آغاز نہیں بلکہ انتہا اور اختتام ہے۔ اشاریت الفاظ کا ایک ایسا استعمال ہے جو انہیں قابلِ فہم یا ورنہ فنا ہونے سے بچا سکے کیونکہ میلارمے کے احساس کے تابعین قابلِ فہم ہونے کو فنا ہونے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ الفاظ کو فنا ہونے سے بچانے کے لیے وہ انھیں علامتوں (Symbols) کے خول پہنا دیتے ہیں اور پیچیدہ ہئیت کی دیواریں ان کے گرد کھڑی کر دیتے ہیں۔ اسی لیے علامت نگاری الفاظ کے تحفظ پر بے حد زور دیتی ہے۔ ادعان کا ایک نیا تصور پیش کرتی ہے۔ ایلیٹ نے اس تحریک کی حمایت کی تھی۔ لیکن اس اسکول کے فن کاروں کے فن میں ابہام پسندی بلکہ ابہام پرستی کا بہت عمل دخل ہے۔ ان کے فن پاروں میں یہاں تک اشکال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ اپنا کہا یا تو خود سمجھتے ہیں یا خدا، بلکہ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اکثر وہ اپنا کہا خود بھی نہیں سمجھ پائے۔ یہ بات بہر حال سامنے آ جاتی ہے کہ فن میں جب تک "ملاحظہ خیال نہ ہو، جب تک کسی فن میں تکمیل کا احساس نہ ہو، جب تک فنکار کی تخلیقات سے یہ بات مترشح نہ ہو کہ وہ اپنے موضوع میں اتنا ڈوب گیا ہے کہ اس کو جڑ تک دیکھ آیا ہے اور متعلقات بھی۔ اُس وقت تک ہم فنکار کو کامل نہ کہہ سکیں گے۔ فنکار کو اپنی بات کا پورا یقین ہونا ضروری ہے ورنہ وہ خود بھی بھٹک سکتا ہے اور اس کے قارئین بھی۔

غزلیں

فضا ابنِ فیضی

آدمی اور مقدر کی لکیر
کس سے مٹتی ہے یہ پتھر کی لکیر

دونوں اک ساتھ ہی کٹ جاتی ہیں
زندگی، موت، برابر کی لکیر

کیا خطوط میں ہیں کتنے شگاف
ہے شکن چہروں کی باہر کی لکیر

اک جزیرے کی طرح پیاس مری
دور تک گھیرے سمندر کی لکیر

ساری دنیا ہے گزرگاہِ خلیل
دیکھ! یہ تیشۂ آزر کی لکیر

قیدیِ دائرۂ خاک سہی
آسماں سے بھی ہوں اوپر کی لکیر

موجِ صہبا ہے، بدن جامِ شراب
لبِ جاں ہے کسی ساغر کی لکیر

کرشن مراری

فراغت ایک لمحے کی فضا کو راس آئی ہے
مچلتی بے کراں مستی گگن میں گنگنائی ہے

مری اس کھوج کا حاصل بھی مجھ کو مل گیا شاید
بہت ہی دور سے مجھ تک مری آواز آئی ہے

وہی قربت کے ہنگامے، وہی کچھ اجنبی رشتے
کشش اک قطرۂ خوں کی مسلسل رنگ لائی ہے

کہیں کیا بس نہیں اپنے پہ یارو ہم کو اب کوئی
ہماری بے قراری ہی ہمیں یاں کھینچ لائی ہے

وہی پھر عشق کی مستی وہی حسنِ حیا پرور
فضا پھر شعلہ و شبنم ہوئی ہے جھلملائی ہے

بکھرتے سے خیالوں کا وہی منظر ہے جلوہ گر!
وہی اک تشنگی حرف و صدا کی گنگنائی ہے

بدل کر روپ کتنے من کے جوگی نے یہاں نِت دن
مسلسل نِت نئے رنگوں کی اک دنیا بسائی ہے

اُسی کا روپ بکھرا ہے جواں راتوں کی بانہوں میں
وہی پل بھر کی بے چینی جو آنکھوں میں سمائی ہے

بدلتی کچھ رُتوں پہ آس ہے شاید ستمگر کی
چمن پھر شوخ رعنائی فضا پھر مسکرائی ہے

وہی پھر رقص کا عالم، چھلکتی پائلیں چھم چھم
وہی اک شوخیِ انداز کی نغمہ سرائی ہے

کسی اک بیتتے لمحے کی رنگینی کے عالم میں
کوئی تخیلِ آوارہ فضا میں جھنجھنائی ہے

غزلیں

ممتاز راشد

روح میں زخم تھے احساس بھی پیاسا نکلا
غیر سمجھے تھے جسے اپنا ہی سایہ نکلا

وہ گھٹن ہے کہ کوئی راستہ ملتا ہی نہیں
میں ترے شہر کی گلیوں میں کہاں آ نکلا

سادگی نے مری جس بت کو تراشا تھا کبھی
کیا ستم ہے کہ وہ ہم رنگِ زمانہ نکلا

چند کنکر کہ جنھیں اشکِ ندامت کہیے
بند مٹھی میں تری ان کے سوا کیا نکلا

غم نہیں یہ کہ مٹے اس کی رفاقت کے نشاں
دکھ یہ ہے وہ بھی مرے ماضی کا ورثہ نکلا

مطمئن تھے کہ مٹا دے گا اسے وقت کا ہاتھ
اب پریشاں ہیں کہ یہ رنگ تو گہرا نکلا

مدحت الاختر

رنگ و آہنگ زمانے سے جدا ہے اپنا
تو سمجھتا ہے جسے سنگ خدا ہے اپنا

کس کے حصے میں گئی اس کے کرم کی دولت
وہ تو ہر شخص کو محسوس ہوا ہے اپنا

ہم جہازوں کو کنارے پہ جلا آئے ہیں
اے سمندر! سفر آغاز ہوا ہے اپنا

گالیاں دیتے ہوئے لوگ گزر جاتے ہیں
تو نے دیوار پہ کیوں نام لکھا ہے اپنا

ایسے گمنام ہوئے تیری رفاقت کھو کر
آج ہر شخص پتا پوچھ رہا ہے اپنا

ہر کمینے کو ملی دولتِ دنیا مدحت
نیک روحوں میں مگر نام لکھا ہے اپنا

شاہد میر

کسی صدا کے جزیرے میں کب ٹھہرنا
اسے تو چپ کے سمندر کو پار کرنا

چمکتی دھوپ کی ہمسائگی پہ ناز
ابھی تو رات کی دلدل پہ پاؤں دھرنا

کھلا رہا ہوں شفق زار اپنے ہونٹوں پر
کہ چند گمشدہ رشتوں میں رنگ بھرنا

اس آس پاس کی یکسانیت سے تنگ
مرے شعور کو بھی آ گیا اڑان بھرنا

اتر تو آئے پہاڑوں سے آب جو کی
اب اک ندی کو نئے جنگل سے بھی گزرنا

[illegible] کہیں گھر کھلے اصول
کہ تیز گام بہت خواہشوں کا جھرنا

غزلیں

ساحل احمد

مخالف ہوا جنگلوں میں
نہ نقشِ پا جنگلوں میں

پہاڑوں سے اُتری ہوا تو
ہوا حادثہ جنگلوں میں

شکستہ ہوا رو پڑی ہے
نہیں تھا خدا جنگلوں میں

نہ زنجیر بجتی ہوا کی
نہ روتی فضا جنگلوں میں

ہواؤں سے لڑتی کہاں تک
اکیلی دعا جنگلوں میں

ہرا رنگ پیڑوں کا ساحل
ہمیشہ تپا جنگلوں میں

ظفر غوری

شریکِ غم ہو کبھی، دل پہ لالہ کاری کر
خدائے غم مرے زخموں کی آبیاری کر

یہ بیل بوٹے تو لگتے ہیں جیسے کاغذ کے
زمیں پہ خون سے کچھ تازہ چترکاری کر

کھلے ہیں کب سے سرِ رہ چمن ستاروں کے
نکل کے چاند کے رتھ پہ ذرا سواری کر

یہ دشتِ شام کا بے آب بے صدا موسم
تو سنگِ لب سے کوئی جوئے حرف جاری کر

میں لوحِ وقت پہ محفوظ شعرِ ناگفتہ
ادائے تو سے مجھے اپنے دل پہ طاری کر

ہوں کب سے شہرِ نوا میں ظفر زباں بستہ
سکھا کے حرفِ سخن میری رستگاری کر

نجم عثمانی

عروج ہوگا تو اک دن زوال بھی ہوگا
ہمارے زخم کا پھر اندمال بھی ہوگا

وہ جس کی ذات سے قائم ہے شہر کی رونق
اسی کا شہر میں جینا محال بھی ہوگا

کرے گا سن کے وہ رودادِ غم تعجب کیوں
جسے خبر تھی ہمارا یہ حال بھی ہوگا

ہر اک خیال کا دل ہی میں ٹوٹ جائے گا دم
وہ دور آئے گا شبدوں کا کال بھی ہوگا

لہو سے دل کے اسے نجم سینچتے رہیے
تو فن میں آپ کے پیدا کمال بھی ہوگا

غزلیں

شباب للت

مجھ کو بھی روشنی کے ذخیروں میں لے چلو
خوابوں کے تابناک جزیروں میں لے چلو

میری ہتھیلیوں پہ مقدر لکھا نہیں
مجھ کو نہ پُر فریب لکیروں میں لے چلو

آزاد پنچھیوں میں وہ آکر ہے بدحواس
پھر سے اُسے قفس کے اسیروں میں لے چلو

سنگین تنگنائے سے کشتی گزار کر
بے نام لذتوں کے جزیروں میں لے چلو

آسیب اس کے سر پہ انا کا سوار ہے
اس سر پھرے کو پیر فقیروں میں لے چلو

کھل جائے اُن پہ اپنی ذرا بے بضاعتی
اربابِ سیم و زر کو فقیروں میں لے چلو

شاید ملے شباب کو صحبت سے آب و تاب
پتھر ہے یہ تو اس کو بھی ہیروں میں لے چلو

خالد محمود

آ گیا پیروں میں چہرا ٹوٹ کر
گر گیا ہاتھوں سے شیشا ٹوٹ کر

وہ سدا سے مل رہا تھا ٹوٹ کر
آج بچھڑا ہے تو بچھڑا ٹوٹ کر

جگمگاتا تھا تو کتنا دور تھا
بن گیا تقدیر تارا ٹوٹ کر

"ہر زیاں پیشِ نظر ہشیار باش"
شاخ سے گرتا ہے پتا ٹوٹ کر

ربط کی دیوار سے کیا فائدہ
عمر کا رہتا ہے رشتا ٹوٹ کر

خالدِ مینا کی بینائی گئی
گر گیا آنکھوں سے سپنا ٹوٹ کر

راجیش کمار اوج

اس بے وفا جہان میں کیا آرزو کریں
ہم عارضی نشاط کی کیا جستجو کریں

دامن کلی کلی کا ہے جب چاک دوستو
ایسے میں ہم بہار کی کیا گفتگو کریں

پینے کا کچھ شعور نہیں ہے جنھیں وہ لوگ
کیوں محفلِ شراب کو بے آبرو کریں

کٹتی نظر ہمیں نہیں آتی شبِ فراق!
آخر امیدِ وصل کا کب تک لہو کریں

وہ تو نظر اُٹھا کے بھی جب دیکھتے نہیں
کیا اوج خود کو ان کے بھلا روبرو کریں

غزلیں

شاہد نعیم

ٹوٹ جانے سے میں اپنے دل کی آس
زندگی سے ہوگیا کتنا اُداس

کس طرح گزریں گے میرے روز و شب
شہر کا ہر فرد مجھ سے ناشناس

صاحبِ احساس کیوں ہونے لگے
جسم پر انسانیت کا ہے لباس

وہ بھی لوگو نذرِ طوفاں ہوگیا!
ریت پر اک نام تھا، میری اساس

گھر میں جس دن سے نہیں دیکھا تمھیں
میرا دل اور گھر کا آنگن ہے اداس

اک جھلک پاتا ہوں وہ بھی دور سے
گویا شبنم سے بجھا لیتا ہوں پیاس

اُس کو شاہد بادلوں سے کیا غرض
کرب کی دھوپ آگئی ہے جس کو راس

عبدالمتین نیاز

۴ کیسے سمجھوں کہ گم ہوا جنگل
ہے خلا میں بھی زیبا جنگل

ہم نہ ہوتے اگر ہوس کے اسیر
چاروں جانب نہ پھیلتا جنگل

سنگ، سیمنٹ، کولتار کے ڈھیر
کھا گئے سب ہرا بھرا جنگل

آنے دیتا نہیں تری جانب
یہ اہنکار کا گھنا جنگل

پیچ در پیچ سلسلوں میں چلو
داستانوں سا گھنا ہے جنگل

شام ہونے سے پہلے ہم کو نیاز
پار کرنا ہے زیست کا جنگل

شان بھارتی

۴ اک نظر دیکھ تو لو اپنے اسیروں کی طرف
کیوں اُڑے جاتے ہو گمنام جزیروں کی طرف

ہم مقدر مانگ رہے ہیں تو نہ دینا لیکن
کچھ توجہ تو ہو ہم جیسے فقیروں کی طرف

بے سبب گُل ہوئی جاتی ہے جو شمعِ محفل
اک اشارہ ہے یہ تاریک ضمیروں کی طرف

کاش سانپوں کی حقیقت سے وہ واقف ہوتے
لاٹھیاں لے کے جو دوڑے ہیں لکیروں کی طرف

مصلحت کوش ہیں یہ شانؔ انھیں کچھ نہ کہو
طنز کے تیر اچھالو نہ [illegible] کی طرف

غزلیں

خالد کفایت

پرانی یاد سے اب دل کو مت دکھا سائیں
عبث ہے عہدِ گزشتہ کا تذکرا سائیں

اب اس کے غم میں پڑا جان کو گھلا سائیں
کہا نہیں تھا کہ یہ روگ مت لگا سائیں

خوشی کا گیت کہ ہو دکھ بھری کتھا سائیں
بڑے دنوں سے نہیں کچھ کہا سنا سائیں

فقیر ڈھونڈتے پھرتے ہیں خود کو چاروں کھونٹ
نہ کوئی راہ، نہ منزل، نہ رہنما سائیں

ہوائیں راستہ بدلیں گی یا نہ بدلیں گی
تری بلا سے، تو سلگنے کا دم لگا سائیں

نہ پوچھ کیسا بُرا حال ہوگیا جی کا
کہا جب اس نے بچھڑتی گھڑی خدا سائیں

پلٹ کے دیکھا کسی نے نہ کوئی در بولا
ہزار دیتے رہے در بدر صدا سائیں

خیال چھوڑ زمانے کو رام کرنے کا
یہ بے لحاظ ہے کرتا نہیں وفا سائیں

نظر تھی اس کی زمانہ تھا بھنگ کا پیالہ
اسی گمان کے شعلوں میں جل بجھا سائیں

کس طرح سے کٹے گی پہاڑ سی رات
ہوا پہ بیٹھ کے کچھ گیت ہی سنا سائیں

جمیل کلیمی

زہر کے پیتے ہیں ہنس ہنس کے پیالے لوگو
ہم ہی اس شہر میں ہیں سب سے نرالے لوگو

ہم تو یہ رات بھی رو رو کے بسر کرلیں گے
ساتھ لے جاؤ ستاروں کے اُجالے لوگو

تم تو شیشے کے گھروں میں رہو آرام کے ساتھ
سنگِ آلام کرو میرے حوالے لوگو

سہمی سہمی ہوئی آنکھیں ہیں سوالی کب سے
کچھ بتاؤ تو ہمیں روٹھنے والے لوگو

خواب دکھلاتے ہیں ہم اپنی تمناؤں کو
شہر کی بھیڑ میں ہر دکھ کو سنبھالے لوگو

زبیر شفائی

یہ سارے نقش نامانوس پل بھر میں بدل دوں میں
کہ آئینوں میں کونپل کے پروں کا رنگ مل دوں میں

مرے چاروں طرف جیسے بچھا ہے جال لہروں کا
ہوا پتوار تھامے ہے کہ اپنا رخ بدل دوں میں

مزاجاً پتھروں سے میں بہت نزدیک ہوں لیکن
چھوئے تیشہ زن مس ہو تو چنگاری اگل دوں میں

یہ غنچے غنچے خوشبو، سبزہ سبزہ اوس کی بوندیں
کرن کے پھوٹتے تک [illegible] دوں میں

زبیرؔ آنکھوں سے تلووں تک چھپے ہیں سانحے کتنے
کوئی دامن نہیں خالی کہ سوغاتِ غزل دوں میں

غزلیں

شمیم طارق

آئنے تو بے حیا تھے آئنے ہنستے رہے
عکس لیکن ٹوٹ کر کس واسطے ہنستے رہے؟

عالمِ دیوانگی میں کہہ گئے ہم ایک بات
وہ بھی ایسی سوچنے کے زاویے ہنستے رہے

ترجمے کے پیچ و خم میں اصل مطلب کھو گیا
لفظ و معنی کی خطا پر حاشیے ہنستے رہے

اتفاقاً وہ بھی تھا تقدیر کا مارا ہوا
اک نجومی پر سبھی کے زائچے ہنستے رہے

شب کے سناٹے میں کس کو آنکھ ماری چاند نے
کھلکھلا کر آسمانی قمقمے ہنستے رہے

ہم سے پوچھو شخص جاں کس کو کہتے ہیں شمیم
اپنا ہی گھر پھونک کر ہم دل جلے ہنستے رہے

حبیب احمر

لفظوں میں کہاں معنی کی قندیل بتا دے
ہوتی ہے کہاں حرف کی تکمیل بتا دے

کیوں پھینکوں خموشی کے ہر اک پیڑ پہ آخر
اک جال صدا کا کوئی تاویل بتا دے

سرمے کی طرح درد بھی آنکھوں میں گھلے گا
اس خواب کی ہوگی کبھی تشکیل بتا دے

پھیلی ہے تعاقب میں جو احساس کی زردی
کب ہوگی اجالے میں یہ تحلیل بتا دے

موسم کی نظر پڑتے ہی شرمائی تھیں شاخیں
احمر وہ فضا ہو گئی تبدیل بتا دے

غلام حسین ایاز

عجیب شکل بنائی گئی ہے اس گھ
ہمارا جسم ہے شیشے کا آنکھ پتھ
لہو کے قطرے گلابوں کی آنکھ سے
چلی جو بات گلستاں میں دامنِ تر
ادھورا جسم لیے گھومتا رہا تن
لکیریں مٹ نہیں پائیں مرے مقد
میں بوند بوند سمندر میں ہو گیا تح
وہ ناپتے رہے گہرائیاں سمند
ہمارے شہر کے شیشوں میں سنسنی
چلی جو بات سرِ راہ آج پتھ
نہ جھانک پایا میں اپنے وجود کے
گزشتہ برس نے کچھ اس درجہ سخت مجھ
فراریت کے ہوئے بند سارے دروا
گھروں میں رہ کے چھپیں کیسے متو
ابھی آنا اور کہاں تک یہ دشت
کچھ بڑھتی ہیں تنہائیاں ترے گھ

دو نظمیں

بمل کرشن اشک

ایک

میں زینہ زینہ اتر کے دھرتی کی گود میں کھلکھلا رہا تھا
وہ مجھ سے چھو کر صبا سی گزری
مجھے خبر تھی کہ اس کی کٹیا یہیں کہیں ہے
مجھے خبر تھی وہ لوٹ آئے گی اور میں اس کا منتظر ہوں
میں اس کے ہونٹوں سے شہد پی کر اسی کی کٹیا میں سو رہوں گا
میں جاگ کر پالن کوئی سا بھی ڈھونڈوں گا۔

وہ مجھ سے چھو کر صبا سی گزرے گی جانتا ہوں
یہ علم مجھ کو وہ لوٹ آئے گی اور میں منتظر رہوں گا
مجھے خبر ہے میں اس کے ہونٹوں سے شہد پی کر اسی کی کٹیا میں سو رہوں گا
میں جاگ کر . . . !

دو

عجب غلط فہمیاں تھیں اس کو
وہ سوچتا تھا کہ آئینہ میں خدا ملے گا
بالآخر اس نے بھی پیری، بیماری، موت دیکھے ہیں زندگی میں
وہ مٹی کے نیچے رکا تو اس پر خدائے برتر کی کشش کا نزول ہوگا
وہ جب بھی تکتا تھا سوچتا تھا سب آسماں سے اترنا ہے
وہ جب مچھیروں کو، دستکاروں کو دیکھتا تھا تو سوچتا تھا
یہ کب سے میرے ہی منتظر ہیں

صلیب کی آرزو میں دسیوں برس گزارے
اور ایک دن اک درخت ـــــــ بوڑھا درخت
اس کے نحیف قدموں میں آگرا تو
درخت کو اس نے ایک کرسی کی شکل بخشی

صلیب اس کے دماغ میں کلبلا رہی تھی
صلیب اس کے دماغ میں کلبلا رہی ہے۔

انکشافِ حقیقت

احمد رئیس

میرا قاتل
میرے نام سے ڈر گیا
میرا قاتل
مجھے دیکھ کر مر گیا
اس کو ڈر تھا
کہ میں اُس کے مکروہ چہرے کو نہ نوچ لوں
اُس کے ہاتھوں کو نہ کاٹ دوں
ایسے 'ناپاک ہاتھوں' کو
جس نے ہزاروں
محبت کے ماروں کو
زندہ دفن کر دیا
جس نے شاداب دھرتی پہ
لفظوں کی کھلتی ہوئی چاندنی کو بھسم کر دیا
صرف اپنی اَنا کے لیے
اُس کو یہ شوق تھا
اُس کو یہ وہم تھا
یہ زمیں اُس سے منسوب ہو!
یہ زمیں اُس سے منسوب ہے!!

اس نے اپنے ارادوں کی تکمیل کے واسطے
اپنی تشکیل کے واسطے
سب کے 'مال و متاعِ ہنر' کو
مقفل کیا
سب کے فن کو
معطل کیا
سب پہ یلغار کی
اُس نے اپنے بزرگوں پہ یلغار کی
اُس نے اپنے عزیزوں پہ یلغار کی
اُس نے اپنے رفیقوں پہ یلغار کی
اُس نے بڑھتے ہوئے ہر شجر کو قلم کر دیا
اس نے جلتے ہوئے سب چراغوں پہ یلغار کی
صرف اپنی انا کے لیے
صرف اپنی بقا کے لیے
وہ مگر مر گیا
یہ زمیں منبعِ نور ہے
دلکشی ہے یہاں
دلکشی ہے یہاں . . .

ہم نہ بھولیں گے

(فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر)

منظر شہاب

○

وہ صبحِ غم وہ شامِ سوگواراں ہم نہ بھولیں گے
لہو کی آگ میں جلتا گلستاں ہم نہ بھولیں گے

خزاں سامانیِ بدخواہیِ گلچیں معاذ اللہ!
شکستہ سازیِ رنگِ بہاراں ہم نہ بھولیں گے

جنوں کی گرد سے اہلِ خرد کی آنکھ کجلائی
تعصب کا غبار آلود طوفاں ہم نہ بھولیں گے

کلیجہ چھلنی نوکِ خار سے معصوم کلیوں کا
دریدہ جا بجا پھولوں کے داماں ہم نہ بھولیں گے

ستم کے گھاٹ پر روشن چتائیں مہ جبینوں کی
ہوس کی سیج پر بے خواب خوباں ہم نہ بھولیں گے

نہ جانے کیا وہ کہتی تھیں نہ جانے کس کو تکتی تھیں
وہ پتھرائی ہوئی چشمِ غزالاں ہم نہ بھولیں گے

شہیدوں کے لہو سے تر بہ تر راہیں اہنسا کی!
اہنسا کی قسم خونِ شہیداں ہم نہ بھولیں گے

مگر اس تیرگی میں بھی تھے ایسے چند اہلِ دل
کہ جن کا اضطرابِ سوزِ پنہاں ہم نہ بھولیں گے

بلا تفریقِ رنگ و بو جو ہر اک گل کی مونس ہیں
وہ چشمِ دشمنِ خارِ مغیلاں ہم نہ بھولیں گے

ابھی انسانیت کا نام زندہ ہے زمانے میں
بہ حالِ صد جفا کاریِ انساں ہم نہ بھولیں گے

نظمیں

شمس فریدی

نظم

کھجوروں کے اشجار،
اب دھیرے دھیرے
نحیف ہو رہے ہیں،
رتیلی زمینوں کی پستانوں سے،
دودھ کے تیز دھارے اُبلتے ہیں اب بھی،
پہاڑوں کے سینوں میں جو دفن ہے،
خزانوں کا اک بے کراں سلسلہ
ختم ہو جائے گا!
آنے والے دنوں میں
اونٹوں کے قافلے
ریت کی وادیوں میں جو کھوئے گئے ہیں،
پلٹ آئیں گے!

نور اقبال

بونا

ہر بار میں نے
اپنے سے کم عمر اور کوتاہ قد "انسان" کو "سلام" کرکے
اپنے قد کو بلند تر کرنا چاہا
لیکن ہر بار
میرے اندر کا متکبر انسان
اپنی جھوٹی "انا" کی ننگی تلوار سے
مجھ پر وار کرتا ہے
اور ہر بار میرا قد
اپنے سے کم عمر اور کوتاہ قد انسان کے سامنے
بونا کا بونا ہی رہتا ہے

آٹھواں عجوبہ

میں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں
یقیں نہ ہو تو میری نبض پہ انگلی رکھ کر دیکھ لو
یہ اب تک چل رہی ہے

نظمیں

شتاق احمد اعظمی

ڈوبتا جزیرہ

یک جزیرہ
س کے ہر سو
حر کی پاگل لہریں ہیں
لفظ لفظ کاٹ رہی ہیں
بھیگے نرم کناروں کو
ولحہ گھلتا جائے
لتا جائے
ٹتا جائے
جیسے ایک نمک کا بھاری ٹکڑا
پانی میں
اجیسے
برف کی کہرآلودہ چٹانیں
لتی، گھٹتی جاتی ہیں
زاد تند ہواؤں میں
یک جزیرہ
س کے اندر
ہوس کی ایک فصل اگی ہے
تہ رفتہ
ابھی اب تو
تی گھٹتی جاتی ہے
ٹوٹتا جاتا ہے
جزیرہ ڈوب رہا ہے
کی پاگل لہروں میں

حفیظ آتش

ورثہ

آؤ — پھر — آج ہم
اپنے ساتھی کے مرنے کا غم بھول کر
چند لمحے جئیں
یہ دریدہ قبائیں سئیں
اور پھر
اپنے مرنے کی تیاریوں میں لگیں
آنے والوں کی خاطر، یہاں
کچھ نہ کچھ چھوڑ دیں!

اور زندگی مرکزیت کی تلاش سے، یقین کی کھوج میں سرگرداں ہے!

اس نے پھر بتی روشن کر دی۔ وہ روشنی میں گھر گئی۔ تاریکی اور روشنی کے فرق کی گتھی سلجھانے میں اس کا ذہن الجھ گیا۔ اس کے ذہن میں سوالوں کی ریت اُڑنے لگی۔ بگولے اُٹھتے رہے . . . وہ چکراتی رہی۔

خواب میں کبھی روشنی کا شاہزادہ اس کی جانب بڑھتا۔ کبھی تاریکی کا دیو اسے اپنی بانہوں میں جکڑنے کے لیے لپکتا۔ اسی کشمکش میں اس نے محسوس کیا وہ ایک اندھے کنویں میں گرتی جا رہی ہے۔

اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ اُٹھ بیٹھی۔ صبح کی اجلی سفیدی دبے پاؤں کھڑکیوں سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ چھت کے نیچے چل پڑی۔ اس نے ثمینہ کے کمرے میں جھانکا، ثمینہ تکیہ بھینچے بے خبر سو رہی تھی۔

سورج کا سرخ گولا ابھی اُبھر رہا تھا۔ شہر کے در و بام محو خواب تھے۔ سڑکیں ویران تھیں۔ سورج کی کرنیں دھیرے دھیرے روپہلی ہو گئیں۔ مشرقی افق پر سفید و کبود بدلیوں کا غول ہواؤں میں ادھر اُدھر تیر رہا تھا۔ باغ میں چڑیوں کا شور اب مدھم پڑتا جا رہا تھا۔

پھر عجیب سے احساس سے اس کا دل دھڑکنے لگا . . .

وہ نیچے اُتر آئی۔ غسل خانے سے پانی کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ قریب ہی کوئی گنگنانے کی آواز نے اس کے احساس پر تازیانہ لگایا۔ وہ سوچنے لگی۔

"یہ نغمے کے سوتے کہاں سے اُبلتے ہیں . . . ؟

"یہ نغمے کس بات کی غمازی کرتے ہیں؟؟

وہ غسل خانے کے دروازے کے پاس گئی کر کان لگا کر سننے [illegible] ——— [illegible] دروازہ کھلا۔ ثمینہ نے اس کی جانب دیکھا۔

ثمینہ کی آنکھوں میں [illegible] لیکن اسے دیکھ کر ان آنکھوں میں [illegible]

[illegible]

[illegible] وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے کتاب کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ نظریں کتاب پر تھیں لیکن ذہن میں عجیب سی آندھی چل رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ یہ سب کیا ہے؟

اُس دن کالج میں اس کا جی مطلق نہ لگا۔ وہ ثمینہ سے ملے بغیر ہی گھر لوٹ آئی۔

اپنے کمرے میں آ کر اس نے سوچنا شروع کیا۔ اسی درمیان اُسے نیند آ گئی۔ نیند ٹوٹی تو دیکھا کمرے میں تاریکی پھیل گئی ہے۔ باہر جھانکا۔ وہاں سائے یکسر غائب تھے۔ وہ جلدی سے چھت پر آ گئی۔

لیکن وہاں نہ سورج تھا نہ رنگ شفق! مغربی افق پر بادل سمٹ آئے تھے اور فضا سلیٹی رنگ کی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی رُکی ہوئی تھی۔ کہیں ایک [illegible] نہیں ہل رہا تھا۔ اس نے عجیب سی گھٹن محسوس کی۔ دم بہ دم اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اندھیرا اس کی سانسوں سے ہو کر اس کے اندر داخل ہونے لگا۔ وہ گھبرا کر نیچے اُتر آئی۔

اس نے ثمینہ کے کمرے میں جھانکا۔ ثمینہ گم سم کھڑکی کے پاس بیٹھی باہر خلا میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اُس کے پاس چلی گئی۔ ثمینہ کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ کا خول چڑھا کر پوچھا "نفیسہ! تم کالج سے کیسے چلی آئیں مجھے خبر تک نہیں کی؟"

"آپا! اصل بات یہ تھی . . . بس یونہی . . ."

اسی درمیان ان کا بھائی حفیظ اپنے ساتھ انور اور شاہد کو لیے داخل ہوا۔ نفیسہ انھیں دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگی۔ حفیظ نے اُسے روکتے ہوئے اس کا تعارف کرایا "یہ شاہد ہیں اور انور کو تم جانتی ہی ہو۔"

حفیظ کی باتوں سے بے نیاز وہ کمرے سے جانے لگی تو اس نے پھر کہا: "یہ میری چھوٹی بہن نفیسہ ہے بڑی عجیب لڑکی ہے!"

نفیسہ بپھری ہوئی کمرے میں آئی "بڑی عجیب لڑکی ہے!" اس نے حفیظ کے اس جملے کی [illegible]

ابھی اس کا غصہ فرو بھی نہیں ہوا تھا [illegible] کتاب

بے آدھمکا۔

"امی! یہ دن رات کیوں ہوتے ہیں؟"

"سورج غروب ہو جاتا ہے تو رات ہو جاتی ہے اور نکل آتا ہے تو دن۔"

"جی ہاں بجا فرمایا آپ نے . . . ! اب یہ بتلایئے کہ سورج رات کو کہاں چلا جاتا ہے اور پھر صبح کو آپ ہی آپ کہاں سے چلا آتا ہے؟"

"یہ زمین کی روزانہ گردش کی وجہ سے ہوتا ہے۔"

"بھلا اس زمین کو بیٹھے بٹھائے گردش کی کیا سوجھی ہے؟ ایک جگہ قائم کیوں نہیں رہتی؟ دن رات ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس کے بیٹے کو جواب دینے کی کوشش کی لیکن جب جواب ڈھونڈ پڑا تو اس نے اُسے ڈانٹ کر کہا "جاؤ، اپنے استاد سے پوچھنا۔"

اس رات اس نے خواب میں دیکھا کہ زمین نے گردش کرنا بند کر دیا ہے اور سورج کو غروب ہوئے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ سورج طلوع ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔!

اور اب شام کا وہ عجیب سا بے کیف منظر ہے نہ طلوع آفتاب کے بعد کی زندگی!

نہ شام وسحر کی قید، نہ روشنی اور تاریکی کا فرق!
وقت کے سارے پیمانے ٹوٹ چکے ہیں!

نہ جانے وہ کب تک اسی کشمکش میں مبتلا رہتی کہ اذان کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

تاریکی کا سحر ٹوٹ رہا تھا۔ وہ بے تحاشہ چھت کی جانب دوڑ پڑی۔ چند ہی ثانیوں کے بعد سورج زینے چڑھنے لگا۔ فضا کا ذرّہ ذرّہ رنگ و نور سے بھر گیا۔ ہوا پائیں باغ کے پودوں سے الجھ رہی تھی۔ چڑیوں کا جھنڈ مختلف سمتوں میں اُڑتا ہوا نظر آیا۔

اس کے دل میں خواہش مچلنے لگی کہ وہ ننگے پاؤں بھیگی ہوئی گھاس پر چوکڑی بھرنے لگے۔ وہ فوراً چھت سے نیچے اتائی اور پائیں باغ میں ٹہلتی چلی گئی۔

اس نے ایک خوبصورت تتلی کو ایک کلی پر بیٹھے دیکھا۔ اُسے تتلی کی حرکت بری لگی۔ اس نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا — تتلی اُڑ گئی لیکن ایک کانٹا اس کی انگلی میں چبھ گیا۔ ایک ہلکی سی "سی" کی آواز نکلی۔ اس نے کلی کو توڑ لیا اور تتلی کو تلاش کرنے لگی۔

اس کی انگلیوں میں پھنسی کلی اس کے ہونٹوں کے قریب آگئی اور اس نے انجانے میں کئی بار کلی کو ہونٹوں پر پھیرا۔ اس کے ہونٹ ایک عجیب لذت سے آشنا ہو رہے تھے۔

کالج میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ کالج کا ذرّہ ذرّہ جیسے اس کو گھور رہا ہو۔ وہ اپنے میں سمٹتی جا رہی تھی۔ گھر آئی تو اس کا دل اپنے کمرے میں بھی نہ لگا۔ وہ چھت پر چلی گئی۔ سورج دھیرے دھیرے درختوں سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا افق کی گود میں سو گیا وہ تاریکی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ اس تاریکی کو اوڑھ لینا چاہتی تھی۔ جب دیر تک تاریکی نہیں پھیلی تو اکتاہٹ سے اس نے مشرق کی جانب دیکھا۔

حفیظ کے ساتھ ایک اور ہیولی سا نظر آیا۔ ہیولے کی سیاہ محرابوں میں دو قندیلیں روشن تھیں۔ انجانے ہی اس کا دل ان کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔ دل اگر پانی ہوتا تو ضرور باہر نکل آتا۔ منجمد ہوتا تو جم جاتا . . . اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ہوا میں معلق تیر رہی ہے اس نے دونوں ہاتھوں سے ریلنگ کو کس کے پکڑ لیا۔ چاندنی کی شیتل کرنوں سے اس کا سارا جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سناٹا پرہول ہو چکا تھا۔ پُراسرار ماحول سے ان گنت ہاتھ اس کی طرف بڑھتے نظر آ رہے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ لیکن اس کی طبیعت سیماب صفت ہو رہی تھی کسی پہلو چین نہ تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کیا۔ پائیں باغ میں روشنی اور تاریکی ایک دوسرے سے ہم آغوش تھیں عجیب شبہیں تاریکی سے نکل کر اس کی کھڑکی کی جانب بڑھتی آتیں اور پھر فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔ نہ کوئی واضح نقش ابھرتا نہ پیکر! یہ خیال کی طرح ابھرتیں اور اس کی نگاہیں اس سنہری ہرن کا تعاقب کرنے لگیں۔ ایک

ہٹ بھی اس کے کانوں میں آ رہی تھی لیکن ان آہٹوں کی تکرار اس کے لیے قطعی نا آشنا تھی . . . !

بغیر کسی ارادے کے تکیہ رات بھر اس کی باہوں میں بھنچا رہا اور گرم آنسوؤں سے رخسار جلتے رہے۔ خلافِ معمول اس دن اس کی نیند بہت دیر سے ٹوٹی۔ وہ تیزی سے غسل خانے میں گھس گئی۔ شاور کی سرد دھارا جیسے انگلیوں کی طرح گدگدی پیدا کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اسی طرح شاور کے نیچے کھڑی رہے اور پانی کی دھارا اس کے جسم کو چھلنی کرتی رہے۔ اسی وقت دستک ہوئی۔ دروازے پر ثمینہ کھڑی تھی۔

نفیسہ کا گنگنانا بند ہو چکا تھا۔ ثمینہ نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ نفیسہ جھینپ گئی۔ "جلدی کرو" کالج کا وقت ہو گیا ہے" کہتی ہوئی ثمینہ آگے بڑھ گئی۔ کالج میں پھر وہی وحشت تھی۔ آنکھوں میں کبھی دھند سی چھا جاتی۔ اور کبھی دھندلی سی شبیہیں آنکھوں کے سامنے آویزاں ہو جاتیں۔ وہ سر جھٹک دیتی، سامنے بیکراں خلا ہوتا یا بے شمار آنکھیں عجیب ڈھنگ سے گھورتی آنکھیں! وہ عجیب عجیب سی سرگوشی اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔

وہ گھبرا کر گھر چلی آئی۔

جب دھوپ سنولانے لگی تو پھر اس کا جی مچلنے لگا۔ چٹ پٹائی۔ سورج آج شفق تھی کی طرح انجھا کامل تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اُسے امید تھی وقت اس طرح چپکے سے گزر جائے گا!

اس نے اپنے عقب میں آہٹ محسوس کی اور چیخ اُٹھی۔ ثمینہ نے اُسے سنبھالتے ہوئے کہا "یہاں اکیلی کھڑی کیا کر رہی ہو؟"

"چلیے نیچے چلیں . . ." کہتی ہوئی نفیسہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں اُترنے لگی۔ جب دونوں ڈرائنگ روم کے پاس سے گزر رہی تھیں ثمینہ نے نفیسہ کو ڈرائنگ روم میں کھینچ لیا۔

شاہد نے نظریں اُٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور پھر شطرنج کی بساط پر نظریں جما دیں۔ نفیسہ موم کی طرح پگھلنے لگی۔

شاہد چلا گیا۔ کمرہ تاریک تاریک سا لگنے لگا۔

اب اس کے دل میں یہ سوال نہیں اُٹھتا۔ سیمبان سے تار میں روشنی کہاں سے آتی ہے ؟؟

ڈوبتے سورج کے ساتھ روشنی کا ہالہ اسے اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے اور روشنی اس کی روح میں اُترنے لگتی ہے۔

○○

ٹھنڈی دھوپ

مُظہرُ الزّماں خاں

وہ اسلحہ کی دُنیا سے آزاد ہوا تو رنگوں کی دُنیا میں اُتر گیا تھا کیونکہ شروع ہی سے اُسے آرٹ سے دلچسپی تھی اور جب کبھی موقع ملتا وہ برش لے کر بیٹھ جاتا تھا۔ اور کینوس پر کچھ نہ کچھ اُتار لیتا تھا۔ پھر اپنی ہی بنائی ہوئی تصویروں کو بڑے اشتیاق سے دیکھ کر اندر ہی اندر خوش ہوتا تھا۔ لیکن جب سے اُس کی خوشبودار پسلی ٹوٹ کر ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا ہوئی تھی۔ اُس کے دماغ پر دھواں چھا گیا تھا، آنکھوں میں تیز دھوپ اُتر آئی تھی اور جسم کے اندر سُرخ بجلیاں کوندنے لگی تھیں جو پہلی اُسے ٹوٹ کر ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والی پسلی کا دھیان دلاتی تھیں اور وہ اُن کوندتی ہوئی بجلیوں کو سرد کرنے کی خاطر رنگوں کی دُنیا میں ڈوب گیا تھا اور دن رات تصویریں ہی بنانے لگا تھا۔ شروع شروع میں وہ بچھڑی ہوئی خوشبو کو مختلف انداز اور مختلف زاویوں سے کینوس پر بکھیر دیتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی بنائی ہوئی تصویروں میں تبدیلی آتی گئی اور یہ گمان ہونے لگا کہ وہ تنہائی سے اُکتا کر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر زندگی کے خلا کو پُر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ اُس کی ان تصویروں میں بڑی معنویت تھی۔ اور وہ رنگوں کے استعمال اور اُن کی صفات سے خوب واقف تھا کیونکہ وہ خود آرٹسٹوں سے مل چکا تھا رنگوں اور تصویروں کے تعلق سے [illegible] چکا تھا لیکن اُس کے [illegible] یا خود اُس کے احباب یہی سمجھتے تھے کہ وہ اسلحہ کی [illegible] یا پسلی کے جدا ہونے کے صدمے سے جنون ہو گیا ہے اور جنون میں وہ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا ہے۔ تاہم اُس کے احباب میں ایک ایسا بھی تھا جو اس کی [illegible] تصویروں کو سمجھتا تھا وہ متعجب لہجے میں اکثر اُس سے کہا کرتا تھا کہ تم ہمیشہ کٹے ہوئے نازک اعضا کیوں دکھاتے ہو؟ کبھی اُٹھتے ہوئے سینے پر آنکھیں اُتار دیتے ہو تو کبھی کولھوں پر ہونٹ پیوست کر دیتے ہو کبھی جلتے ہوئے الاؤ پر نازک جسم کے پوشیدہ اعضا بکھیر دیتے ہو۔ اور وہ اپنے دوست کی تنقید پر صرف اتنا کہتا تھا "میرے دانت ابھی گرے نہیں اور میں گوشت کھا سکتا ہوں۔ لیکن مجھے تم جیسے لوگوں سے ڈر لگتا ہے کیونکہ تم لوگ مجھے بے دانت کا کیڑا سمجھتے ہو"

"تمھاری پسلی ٹوٹ چکی ہے" اُس کا دوست کہتا۔ اور تمھاری کھوپڑی میں دھواں بھر گیا ہے۔ تم گوشت کھا نہیں سکتے صرف اُس کی بُو سے پیٹ بھر سکتے ہو" لیکن وہ اپنے دوست کی اس بات کا جواب دینے کی بجائے اپنی بنائی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کر دیتا تھا۔ جس میں ایک سبز رنگ درخت سے شرارے نکلتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

تصویریں بنانے کے علاوہ اُس کی کچھ اور عادتیں بھی تھیں۔ مثلاً وہ کیلنڈر یا رسائل میں چھپے ہوئے جوان جسموں کو سگریٹ سے جلا کر جا بجا سوراخ ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ اُس کے پاس جتنے رسائل اور کیلنڈر تھے۔ اُن میں چھپی ہوئی تصویروں کے اجسام داغدار تھے جنھیں وہ سیف میں رکھا کرتا تھا۔ اور کبھی کبھی نکال کر گھورتا رہتا تھا۔ یا پھر جب تصویروں سے اُس کی طبیعت اُکتا جاتی تو وہ شوکیس میں رکھی ہوئی بیوٹی کی بڑی سی گڑیا کو نکالتا اور اُس کے کپڑے تبدیل کرنے لگتا تھا یا اپنے پڑوسی کی چار سالہ لڑکی کو گھر لے آتا تھا اور اُس کے ساتھ دیر تک کھیلتے رہنے کے بعد اُسے جامن کے

درخت کے نیچے کھڑا کر دیتا، جہاں ہمیشہ چیونٹیاں رہا کرتی تھیں - اور جب لال لال چیونٹیاں بچی کو کاٹتیں اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگتی تو اُسے سمجھا بجھا کر گھر چھوڑ آتا۔ ایسی حرکتیں وہ اس وقت کرتا تھا جب گھر میں کوئی بھی نہ ہوتا - اور پھر یوں بھی سوائے اُس کے گھر میں کوئی بھی نہ تھا - بیٹا ملازم تھا اور وہ اکثر رات گئے لوٹتا تھا۔ اس کو اپنے باپ کی ان حرکتوں کا پتہ نہ تھا۔ وہ تو بس یہ سمجھتا تھا کہ اس کا باپ تنہائی سے اُکتا کر تصویریں بناتا رہتا ہے اور اب جب سے تھرڈ لیفٹ اپنی کی ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کی تھی۔ اس نے پڑوس کی بچی کو گھر لانا چھوڑ دیا تھا - گڑیا کو نکالنا بند کر دیا تھا کیلنڈر اور رسائل پھینک دیے تھے - البتہ تصویریں پابندی سے بنایا کرتا تھا لیکن اب وہ ایک ہی طرح کی تصویر بنایا کرتا تھا - یعنی ایک ڈھانچا پرندہ جس کے جسم پر متعدد آنکھیں ہوتی تھیں اور جو پنجوں میں نارنگیاں دبوچے خلا میں گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس ایک ہی قسم کی تصویر کو وہ مختلف انداز اور مختلف زاویوں سے بنایا کرتا تھا اور جب تصویر مکمل ہو جاتی تو گھنٹوں گھورتا رہتا تھا - اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتا تھا - لیکن بہو اور بیٹے کی واپسی سے پہلے ہی وہ اپنے کمرے میں چلا آتا اور آتش دان کے قریب بیٹھ کر آگ تاپا کرتا - ایک دن اچانک اور غیر متوقع طور پر جب اُس کا بیٹا گھر آیا تو اس نے دیکھا کہ اُس کا باپ اُس کے بستر پر لیٹا ہوا ہے اور اُس کے چہرے پر اُس کی بیوی کا میلا لباس پڑا ہوا ہے اور وہ زور زور سے سانسیں لے رہا ہے -

○○

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

قمر الحسن زیدی

حضرات! اپنی زندگی کے متعلق تو بہت کچھ کہا سُنا چکا ہوں۔ آج آپ کو اپنی موت کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب میری موت واقع ہوئی تھی۔ کیا عرض کروں کہ کیا سماں تھا۔ لیکن پہلے یہ تو بتائیں کہ آپ اس قدر حیرت زدہ کیوں نظر آرہے ہیں۔ میں سچ عرض کر رہا ہوں یقین مانیے کہ میری موت واقع ہو چکی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ پھر اس وقت آپ سے مخاطب کون ہے؟ اس کے متعلق تو میں خود بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے یہ میری رُوح ہو۔ کہتے ہیں کہ رُوح کو موت نہیں آتی اور وہ اپنے ناکردہ گناہوں کی پاداش اور نادیدہ خوابوں کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہے۔ ممکن ہے خود آپ کی ہی رُوح آپ سے مخاطب ہو اور قصہ میری موت کا سُنا رہی ہو۔ میں نے بھی کئی بار اپنی رُوح سے پرلے قصے سُنے ہیں۔ وَاللّٰہُ اَعلَم بِالصَّوَاب۔ فی الحال اس مسئلہ کو چھوڑیے کیونکہ اس واقعہ سے میری رُوح یا آپ کے ضمیر کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو ایک ادنیٰ انسان کی موت کی کہانی ہے۔

ہاں تو صاحبو! میری موت کی خبر سنتے ہی میری لاش کے گرد و پیش بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ وہ سب مختلف مذاہب نظریات، اصول و شرع کے لوگ تھے۔ ان کی شکلیں جانی پہچانی تھیں لیکن رنگ و ساخت کے اعتبار سے الگ الگ تھیں۔ ان کی پوشاکیں خوبصورت تھیں لیکن ایک دوسرے سے جدا تھیں۔ وہ شیریں دہن تھے لیکن سب کی بولیاں الگ سی تھیں اور اگر ان میں کوئی شے مشترک تھی تو بس یہ کہ وہ سب اشرف المخلوقات تھے [illegible] اور میں . . . مُردہ تھا۔

ان کے سامنے مسئلہ بھی ایک ہی تھا۔ میری تکفین و تدفین۔ المیہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہماری لاشوں کے ساتھ ایک سا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر مذہب و ملت اور ہر قوم نے تکفین و تدفین کے الگ الگ اصول مرتب کیے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے تلاش یہ ہوئی کہ میرا اپنا مذہب کیا تھا۔ دقت یہ تھی کہ چونکہ میری موت قدرتی موت نہیں تھی بلکہ ایک حادثہ کا نتیجہ تھی اور حادثہ بھی کیا کہ حادثاتِ زمانہ کی ایک بھری گاڑی مجھے کچلتی ہوئی گزر گئی تھی اور چہرہ کچھ اس طرح سے مسخ ہو گیا تھا کہ محض شکل دیکھ کر کچھ پتہ چلانا ممکن نہیں تھا لہٰذا میرے مذہب کی شناخت نہیں ہو پا رہی تھی اور اس تلاش حق میں میری معصوم اور بے گناہ لاش دھیرے دھیرے سڑ رہی تھی۔

خیر صاحب کچھ نہ کچھ فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔ لہٰذا کچھ لوگ عزم لے کر آگے بڑھے تھوڑی دیر تک انھوں نے میری لاش کا معائنہ کیا اور پھر اعلان کر دیا "برادرانِ اسلام۔ مرنے والا مسلمان تھا۔ لہٰذا اس کی تکفین و تدفین اسلامی شرع کے مطابق ہونی چاہیے۔"

"وہ کیسے۔ وہ کیسے؟" ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ شخص مسلمان تھا؟"

"اس لیے کہ یہ ایک مسلم خاندان میں پیدا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کے آباؤ اجداد مسلمان تھے۔" پہلے شخص نے اونچی آواز میں کہا۔ "سبحان اللہ۔ الحمدللہ" مجمع کے اندر سے ایک ساتھ بہت سی آوازیں بلند ہوئیں۔ غالباً انھیں میری موت کے غم سے زیادہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں ایک مسلمان تھا

تم ہندو ہیں یا نہیں میں ان کے اس جذبۂ ایمانی کی قدر کرتا ہوں - انسان تو مرتے ہی رہتے ہیں - مرتے ہی رہیں گے - دیکھنا یہ چاہیے کہ مرنے والا کس عقائد کا آدمی تھا - کیا دھرم لے کر مرا -

بہرحال اس فیصلہ کے بعد بہت سے لوگ ایک ساتھ آگے بڑھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری لاش اُٹھاتے کچھ دوسرے افراد تیزی سے سامنے آئے اور انھوں نے چلا کر کہا - "رُک جاؤ - رُک جاؤ - ہاتھ مت لگانا - ورنہ نجس ہو جاؤ گے - ہم نہیں مانتے کہ یہ شخص مسلمان تھا"

"کیوں نہیں مانتے ؟ کیوں نہیں مانتے ؟" مجمع میں ایک بار پھر کھلبلی مچ گئی اور پھر سے ہر طرف شور بلند ہونے لگا -

"اس لیے کہ اس کے اعمال و افعال ہمارے عقائد پر پورے نہیں اُترتے - مسلمان خاندان سے ہے تو کیا - اگر کوئی ضامن ہو اس کے اعمال و افعال سامنے آئے"

میں نے دیکھا کہ اس آواز کے بعد یکایک چاروں طرف خاموشی چھا گئی اور مجمع دھیرے دھیرے پیچھے لوٹنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں سارے مسلمان بالکل پیچھے ہو گئے - میں نے گھبرا کر چاروں طرف نظر دوڑائی کہ شاید اس بھیڑ میں کہیں گلشن بائی بھی ہو تو وہ اس موقع پر میری ضمانت لے لے لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی -

گلشن بائی ایک سن رسیدہ طوائف ہے جو عرصے سے چوک کی ایک نیم تاریک گلی میں عبدالکریم نان بائی کے کوٹھے پر رہتی ہے - کبھی اس کے دن اچھے تھے - گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی - اب جوانی نہیں رہی تو گاہک بھی کاہے کے - دو دو دن گزر جاتا ہے کوئی جھانکنے بھی نہیں آتا - میں جب بھی اس کے لیے کوئی گاہک پھنسا کر لاتا وہ مجھے بیٹوں کی طرح پیار کرتی، دعائیں دیتی اور میری بلائیں اُتارتی اور اکثر ایک عجیب فقرہ ادا کرتی کہ "بیٹا اللہ قسم تو ایک سچّا مسلمان ہے"

غالباً میں خود بھی ساری زندگی اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا لیکن آج حقیقت کھلی جب مسلمانوں کے اتنے بڑے اجتماع نے مجھے اتفاق رائے سے رد کر دیا اور مسلمان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا -

مسلمانوں کو پیچھے جاتا ہوا دیکھ کر ایک دوسرا گروہ کچھ ہندوؤں کا آگے بڑھا - اب ان کی باری تھی - بڑی دیر تک وہ لوگ بھی میری لاش کا معائنہ کرتے رہے اور پھر جیسے انھیں میری لاش کے اندر میرے دھرم کا پتہ چل گیا - وہ ایک دم چلا اُٹھے "ارے بھائیو یہ کیا اندھیر کر رہے ہو - یہ تو ایک ہندو ہے - اسے تم مسلمان کیوں سمجھ رہے ہو - آؤ فوراً اس کا کریا کرم کریں - ایک ہندو مردے کے ساتھ یہ اتیاچار - رام رام - رام رام - کیسا ادھرم ہے"

مجھے ہندوؤں کا یہ فیصلہ سن کر ایک بار پھر روحانی سکون محسوس ہوا - چلو میرے مذہب کا کوئی فیصلہ تو ہوا - میری تکلیف دہ ذہنی کا کوئی حل تو نکلا - اب میری لاش پڑی سڑتی تو نہ رہے گی - میں نے خدا کا شکر ادا کیا - لیکن میرا یہ اطمینان بہت لمحاتی ثابت ہوا - اور جلدی ہی ایک پرابلم پھر اُٹھ کھڑی ہوئی - میں نے دیکھا کہ مجمع میں کچھ ایسی بے کیفی تھی کہ جیسے ابھی انھیں پورے طور پر اطمینان نہ ہوا ہو - ایک بار پھر چاروں جانب سے صدائیں بلند ہونے لگیں "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک ہندو ہے - ابھی ابھی تو مسلمانوں نے تسلیم کیا تھا کہ یہ ایک مسلمان کی سنتان ہے - پھر یہ ہندو کیسے ہوا ؟"

"یہ سچ ہے کہ یہ ایک مسلمان کی سنتان ہے" مجمع سے کچھ آوازیں اُبھریں - "یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ ہندو کب ہوا کیسے ہوا - لیکن اس کے وچار اور عقائد ہندوؤں کے سے تھے - یہ کرشن کا بھگت تھا - کیا نہیں ؟ بتاؤ - کوئی بتائے ؟"

"اس سے کیا ہوا - اس سے کیا ہوا" چاروں طرف سے ایک بار پھر شور بلند ہونے لگا - "وچاروں سے کیا ہوتا ہے - عقائد کا کسے معلوم - کون جانتا ہے کہ یہ کب ہندو ہوا - کس نے اسے ہندو بنایا - یہ ایک مسلمان کی اولاد ہے - یہ جنم سے مسلمان ہے ہمیں ثبوت چاہیے - ہمیں ثبوت چاہیے" ہر طرف یہی ایک شور تھا - ایک ہی سوال تھا - "ہندو کب ہوا - ہندو کب ہوا - جنم تو مسلمان کا ہے"

ان سوالات کو سن کر تو میں بھی تذبذب میں پڑ گیا - کوئی کیا بتائے گا خود میرے لیے بھی یہ بتانا ممکن نہیں تھا کہ میں ہندو کب ہوا - میں مسلمان کب سے ہوں - میں کس قماش کا مسلمان ہوں - مجھے ہندو کیوں کہا جائے - بہت سے سوالات میرے ذہن میں سڑتی ہوئی لاش پر مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگے - یہ سوالات اپنے حل کے متلاشی نہیں - انھیں اپنی زندگی کا تحفظ چاہیے - ان کی موت کوئی نہیں چاہتا کیونکہ ان کی موت میں ہی جسموں کو غذا درکار ہے - جب تک یہ سوال زندہ رہیں گے سماج زندہ رہے گا - آؤ کہ ان سوالوں کو مٹنے نہ دیں -

ہاں تو میں کہہ رہا تھا اُدھر مجمع کو ثبوت چاہیے تھا اور ثبوت

کے نام پر ایک بار پھر سب چپ تھے۔ بھیڑ کچھ دیر کے انتظار کے بعد ایک بار پھر پیچھے کھسکنے لگی اور میں بے چین ہو اٹھا۔ ایک بار پھر مجھے دائرۂ مذہب سے خارج کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس بھیڑ میں چاروں طرف رکمنی کو ڈھونڈھنا چاہا۔ میں نے چاہا کہ میں مجمع سے التجا کروں کہ ایک بار بس ایک بار وہ رکمنی سے بھی دریافت کر لیں کہ میں کون ہوں۔ میرا دھرم کیا ہے۔ شاید انھیں کوئی معقول ثبوت کوئی خاطر خواہ جواب مل سکے۔ لیکن گلشن بائی کی طرح وہ بھی مجھے اس بھیڑ میں کہیں نظر نہ آئی۔

اور جب وہی نہیں ملی تو میں خود اپنے منہ سے کیا کہتا کہ ایک شب رکمنی میرے سینے سے لگ کر کیوں گھنٹوں روتی رہی تھی حتیٰ کہ اسے نیند آ گئی تھی۔ اور وہ میرے سینے پہ سر رکھے ایک معصوم چڑیا کی طرح لپٹی سمٹی، رات بھر سوتی رہی۔ اس کی بانہیں میری بانہوں میں پیوست تھیں اور اس کی چھوٹی چھوٹی گرم سانسیں میری گردن اور رخساروں کو گدگدا رہی تھیں۔

میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون تھی اور اس معصوم کنواری لڑکی کے ساتھ خود اس کے ہم مذہب انسانوں نے کیسا سلوک کیا تھا۔ تم میرا مذہب تول رہے ہو نا۔ میں تم سب کا ایمان تولوں گا۔ فیصلہ رکمنی کے ہاتھوں میں دیا۔ لیکن وہ تو ہے نہیں۔

ہندوؤں کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر عیسائیوں کا گروہ آگے بڑھا کہ ان کے بیچ بھی کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ کچھ لوگ ادھر تھے، کچھ عیسائیوں کا خیال تھا کہ میں عیسائی ہوں کیونکہ بڑے اعلانیہ جیک سے میری بڑی دوستی ہے اور میں روزانہ صبح چرچ کے گیٹ تک چھوڑنے جاتا ہوں جہاں بیٹھ کر وہ بھیک مانگتا ہے لیکن پنتیرا اس بات سے متفق نہیں تھے اور پھر فیصلہ یہی ہوا کہ میں عیسائی بھی نہیں ہوں۔

پھر کچھ لوگ اور آئے، پھر کچھ اور۔ قصہ مختصر بہت دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ مختلف مذاہب، عقائد اور نظریات کے لوگ آگے بڑھتے۔ مجھے جانچتے۔ پرکھتے اور رد کر دیتے۔ ہر طرف اعمال افعال کا شور تھا۔ ہر طرف عقائد کی تلاش تھی۔ ہر سو نسل و قوم کی دریافت تھی۔

حتیٰ کہ رات ہو گئی اور اندھیرا گھر آیا اور کوئی فیصلہ نہ ہوا اور وہ سب میری لاش کو وہیں اندھیرے فٹ پاتھ پر چھوڑ کر اپنی عبادت گاہوں میں چراغاں کرنے لوٹ گئے۔ کہ عبادت گاہ میں اندھیرا اچھا نہیں مانا جاتا۔ روشنی بیداری کا ثبوت ہے۔ بڑی رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ کچھ سیاہ پوش عورتیں میری لاش کے گرد بیٹھی گریہ کر رہی ہیں۔

○

اپنی لاش

عبدالمتین

وہ مچھلی کی طرح اس کی آغوش سے پھسل گئی اور بولی :
" اب میں چلی، آشیم کے آنے کا وقت ہو گیا ہے ۔"
" کچھ دیر اور ٹھہر جاؤ ڈارلنگ !" وہ تڑپ اُٹھا۔
" ذرا عقل سے کام لو کمار !"
اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے کمرے سے نکل گئی ۔
اس کے جاتے ہی اس کے کمرے کے رنگ و بُو کی دُنیا غائب
ئی۔ کمرہ سُونا سُونا ہو گیا - دریچے سے چاند جھانک رہا تھا اور
ندنی اب بھی اس کے بستر پر رقصاں تھی، مگر اسے یہ بہت پھیکی
سوس ہوئی - اس میں اب کوئی کشش نہیں تھی ۔ شیلا جب اس کے
س تھی تو یہ چاندنی کتنی سُرور آگیں تھیں - مگر اب کیا ہو گیا ؟ کیوں
گیا ؟ وہ مضطرب ہو کر بستر سے اُٹھا اور چند لمحوں تک ٹہلتا رہا،
ر دریچے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور باہر گھورنے لگا - باہر بھی کولتار
سڑک ، اس کے دونوں کنارے استادہ دیو قامت درخت ،
ب کے سب چاندنی کے کفن میں لپٹے تھے - ہر طرف خاموشی تھی،
جانب سکوت تھا - معاً خاموشی کی چادر کو چیرتی ہوئی ایک کار ٹرک
زری - جوں ہی اس کے نظروں کے سامنے اس کا نمبر پلیٹ آیا،
سے محسوس ہوا کہ اس کے جسم میں شعلے بھڑک اُٹھے اور کنپٹیاں
نے لگیں - دماغ پر تناؤ کی کیفیت طاری ہو گئی - اُس نے الماری سے
ستول نکالا اور باہر نکل پڑا - چلتے چلتے اُسے محسوس ہوا کہ اس کے
ں کی نسوں میں آگ لگ گئی ہے، کنپٹیاں شعلہ زار بن گئیں اور پھر اس
نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا - اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔
پانک کسی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے گرنے سے سنبھالا
ر سنبھالا :

" آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں صاحب ؟"
اس نے پلٹ کر دیکھا - جابر بوس اسے سنبھالے ہوئے تھا۔
اس نے کہا : " یوں ہی ٹہلنے کی غرض سے نکل پڑا ۔"
" ٹہلنے کی غرض سے ؟ " اُس نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے
ہوئے کہا ۔
" ہاں ٹہلنے کے لیے ۔"
جابر نے اس کی جیب میں پڑے ہوئے پستول کو ٹٹولتے ہوئے
کہا -
" صاحب! آپ مجھ سے بہانہ کر رہے ہیں - میں تو تاڑ گیا میری زندگی تو
اسی میں بیت رہی ہے - یقین کیجیے، آپ خود سے یہ کام انجام نہیں دے
سکتے ہیں - آپ کی خدمت کے لیے میں تیار رہوں - حکم اور ..." جابر
کہتے کہتے رُک گیا اور کمار کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگا۔
اس نے کہا " نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔" اور جابر کے ہاتھوں
کو کمر سے ہٹاتے ہوئے گھر کی طرف مُڑ گیا - پھر چند قدم چلنے کے بعد پلٹا -
جابر اپنی جگہ کھڑا ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا - وہ جابر کے پاس
آیا اور کہا " آؤ " جابر اس کے ساتھ چل پڑا۔
اپنے کمرے میں پہنچ کر کمار نے جابر کو صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا
اور خود الماری کی طرف بڑھا - الماری سے اپنا البم نکالا اور چند لمحوں تک
ورق گردانی کرنے کے بعد ایک تصویر پر انگلی رکھ کر کہا " یہی ہے ۔"
جابر نے البم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا " ٹھیک ہے
صاحب مگر میرا محنتانہ ... "
وہ بغل کے کمرے میں گیا اور چند لمحوں میں سو سو کے چند نوٹ
لے کر واپس آیا اور اس نے جابر کے حوالہ کر دیا - جابر نوٹ گنتے ہوئے

کھڑا ہو گیا اور فوجی سلام کرتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیے، کام ہو جائے گا میں وعدہ کرتا ہوں، آپ مجھے ایسا ہی پائیں گے" اور وہ چلا گیا۔

جابر کے چلے جانے کے بعد وہ پلنگ پر دراز ہو گیا۔ اس کے دماغ کا تناؤ اب کم ہو گیا اور وہ ایسا سکون محسوس کر رہا تھا، جو طوفان کے آثار ختم ہو جانے کے بعد سمندر پر چھا جاتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور شیلا آ دھمکی، کتابی چہرہ، غلافی آنکھیں، گداز بازو، درمیانہ قد اور ساون کی گھٹا کی طرح کالی زلفیں . . . اور اس کی پیاسی روح چیخ اٹھی "شیلا! تم کتنی حسین ہو، کتنی دلفریب . . . پیاری! میری پیاری!"

"مگر؟" شیلا کے نیم وا ہونٹوں کے درمیان یہ لفظ اپنے سوالیہ اُتار چڑھاؤ کے ساتھ حسبِ معمول معلق تھا۔ وہ مسکرایا، یہ "مگر" جو ہمارے درمیان دیوار کی مانند حائل ہے، اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جائے گا اور شیلا! تم میری ہو جاؤ گی، صرف میری . . . شیلا میری پیاری شیلا! آہ تمھاری زلفیں . . . جب میرے بازو پر پریشان ہوں گی تو نیند میری ہو گی، رات میری ہو گی . . . اور آہستہ آہستہ نیند کی رانی اُسے تھپتھپانے لگی۔

صبح میں جوں ہی وہ شیو کر کے اُٹھا، پریم کا ٹیلی فون آیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا "کمار؟ کمار؟؟"

"ہاں میں کمار بول رہا ہوں"

"جانتے ہو؟ کیا ہو گیا ہے؟"

"بولو دوست، جلد بولو" کمار نے اپنے لہجے میں گھبراہٹ اور پریشانی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"غضب ہو گیا دوست، غضب ہو گیا" اور اس کی آواز تھرانے لگی "آشیم کا قتل ہو گیا . . . بہت دردناک منظر ہے اس کے گھر کا، بیچاری شیلا کا حال نہ پوچھو . . ." اور اُس نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ شاید اس کی قوتِ گویائی اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔

ریسیور کو رکھتے ہوئے کمار مسکرایا۔ مگر پھر خود سے کہا۔ ابھی مسکرانے کا وقت نہیں ہے۔ زمانہ کو بتانا پڑے گا، دکھانا پڑے گا کہ یہ دکھ کی بات ہے۔ پریم کہہ رہا تھا: "بہت دردناک منظر ہے۔ بیچاری شیلا کا حال نہ پوچھو . . . پیاری شیلا، میری شیلا . . . اب تم میری ہو، صرف میری . . . مگر یہ وقت نازک ہے کمار! تمھیں اپنی خوشیوں کو چھپانا پڑے گا اور چہرے پر غم کا غازہ چڑھانا پڑے گا اس لیے کہ زمانہ کو ذرا بھی شبہ ہوا تو . . ." اس خیال کے آتے ہی اس کے چہرے پر گھمبیرتا چھا گئی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور شیلا کے گھر کی جانب چل پڑا۔

کمار جب شیلا کے یہاں پہنچا تو دیکھا کہ اس کے کمرے میں پلنگ پر آشیم کی لاش ہے اور لوگوں کا ہجوم لگا ہے۔ لاش ایک سفید چادر سے ڈھکی ہے۔ شیلا اس پر بے سُدھ اوندھی پڑی ہے۔ وہ ہجوم کو چیرتا ہوا شیلا کے پاس پہنچا۔ اس نے شیلا کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "شیلا! جو ہونا تھا سو ہوا۔ اب صبر کرو" کمار کی آواز جیوں ہی اس کے پردۂ سماعت سے ٹکرائی تو وہ چونک پڑی اور سر اٹھاتے ہوئے زخمی شیرنی کی طرح اُسے گھورا۔ شیلا کی نظروں سے نفرت اور غصہ کی پھوٹتی ہوئی چنگاری کی تاب وہ نہ لاسکا اور آہستہ آہستہ لوگوں کے ہجوم سے سرکنے لگا۔

راستے میں چلتے چلتے اس نے محسوس کیا کہ قتل آشیم کا نہیں بلکہ اس کا ہوا ہے اور وہ بھرے شہر میں اپنی لاش اپنے کندھوں پر لادے پھر رہا ہے۔

OO

(بقیہ: غالب کا ایک شعر)

حیثیت سے دیکھوں۔

(۳) خدا کرے علی بہادر افتخار محل کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔

(۴) خدا کرے علی بہادر کا خاندانی وقار دوبارہ بحال ہو جائے

ل۔ افتخار محل کے لیے علی بہادر نے باندہ میں ایک علیحدہ محل بنوایا تھا جس کی تعمیر میں دریائے کین کے سنگی کنکروں سے نقش بنائے گئے تھے۔ اس مناسبت سے افتخار محل کنکر محل کے نام سے مشہور ہوئی۔ آج کل اس محل میں سرکاری [illegible] ہے۔ افتخار محل کے بطن سے ایک لڑکا سرفراز بہادر [illegible] میں پیدا ہوا۔

اعضا کا المیہ

عتیق الرحمٰن قاسمی

جب گھر سے چلا تھا تو گھڑی ساتھ تھی، راستے میں
گم ہو گئی ہے شاید ——— ہاں راستے میں بھی تو دو کا تھا جہاں
ایسا شخص انبوہ میں تھا جس کی آنکھیں بہت بڑی اور کان تناسب
زیادہ ہی لیے تھے، ناک بھی اوسط سے زیادہ ہی اونچی تھی اور
لیے لیوری فرماں برداری کے ساتھ پٹ رہا تھا کہ وہ عمداً کیوں ایسے
ملک کے بیچ آگیا ہے جہاں اس سے مختلف شکل، ہئیت، وضع اور اعتبار
کے لوگ رہتے ہیں، جن کی آنکھوں کی جگہ دو سوراخ اور کان کی سطح مرتفع
اور ناک کی جگہ گڑھا بنا ہوا تھا ——— مگر اعضا تو قدرت
بنائے ہیں۔ اگر ان کو تراش کر دوسروں جیسا کیا گیا تو تکلیف ہوگی
معنوی پن بھی در آئے گا۔

غیر معنوی پن سے کیا ڈرنا۔

لیکن کیا اور لوگوں کو اپنے جیسا نہیں کیا جا سکتا؟

یہ بھی ناممکن ہے میرا اکیلے کا بدلنا تو آسان ہے نسبتاً اتنے لوگوں
پھر میں ہی کیوں نہ ان کا کہا مان لوں اور ان جیسا ہو جاؤں۔

سوچنے کے بعد وہ دیر تک سوچتا رہا، اس کی سوچ کا سلسلہ
ٹوٹ گیا، وہ اسی فکر میں غلطاں تھا کہ جب میں اس کے نزدیک
پا تو وہ یا امی! کہہ کر لپٹ گیا، میں حیران اور وہ میرے انجام سے
بے خبر سے لپٹتا رہا، مگر میں اسے پہچان نہ سکا، اس نے ماں باپ
کے نام بتایا، گاؤں اور خاندان کا حوالہ دیا اور ظاہری اعضاء
کا تعلق کا اشارہ بھی۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا، اور حیرانی میں
دیکھتا رہا، پریشانی بڑھتی رہی، مجھے شک ہوا ضرور یہ کوئی چال
رہا ہے ٹھگی یا بہروپیا ہے۔ آج کے دور میں اعضاء ظاہری
ال تو مصنوعی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور وہ میری حیرانی کو پہلو تہی
گردانتے ہوئے سوچ رہا تھا آدمی بڑا ہو کر خونی رشتوں کو کس ڈھٹائی
سے بھلا دیتا ہے۔

ایک بار اس نے پھر کوشش کی اور اس آنگن کا حوالہ دیا جہاں
بقول اس کے ہم کھیلتے رہے تھے، ان درختوں کے نام اور جگہ بتائی
جن میں ہم جھولے تھے، مگر یہ سب میری سمجھ سے باہر تھا، ذہن پر بہت
زور ڈالا مگر بے سود، اور بار بار یہی خیال آتا کہ میں نے تو ایک ایسے
مکان میں ہوش سنبھالا تھا، جہاں درخت کیا پودا بھی نہ تھا،
مکان بھی زیادہ کشادہ نہ تھا ——— مگر یہ جھوٹ کیوں بول
رہا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟

میں نے تشکیک کی اس فضا کو ختم کرنے کے لیے کہا، برادرم تم کو
دھوکا ہوا ہے، شاید تمھیں التباس ہو رہا ہے، بچپن میں انسان کسی
بچہ کو دیکھتا ہے جو بڑا ہو کر بہت بدل جاتا ہے تم نے بھی بچپن میں کسی
اور کو دیکھا ہوگا۔ اور یہ کہہ کر میں نے اپنی دانست میں یہ سلسلہ ختم کرکے
آگے بڑھنا چاہا، مگر بات کرنے لگی تھی اور پاؤں منجمد ہو چکے تھے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے دیر تک بیٹھا رہا، پھر سر اٹھایا اور یہ
کہتے ہوئے اپنا اسباب سمیٹنے لگا، کتنا عجیب وقت آگیا ہے! لوگوں کا
حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے، کسی کو یاد نہیں رہتا ہمارا باپ کون تھا
کہاں پیدا ہوئے تھے؟ اور کس نے ہمیں جنا تھا؟

اور جب یہ شخص مجھے اس وقت صادق نظر آیا جب مجھے یہ خیال
آیا کہ کل میں نے اپنی بڑی بچی کا نام بھی پوچھا تھا اور سفر میں علی الصباح
حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرتے وقت دیر تک سوچتا رہا تھا۔

پھر میری بے کلی کم ہوئی تو اس سے ہمدردی ہونے لگی [illegible] سے
سوچنے لگا، یہ شخص سچا بھی ہو سکتا ہے ——— ایک ناقص

میری یادداشت از کار رفتہ ہو گئی ہے ——— یہ کوئی انوکھی بات بھی تو نہیں رہ گئی اب ——— پھر میں نے اپنے اور بہت سے گناہوں کی طرح اس کا بھی حیلہ تلاش کر لیا۔ کہ آدم بھی تو اپنا وعدہ بھول گئے تھے ——— آدم کا نام آتے ہی میرے ذہن میں کچھ کنکھجورے سے رینگنے لگے، پھر یہ بتدریج انسانوں سے ملتی جلتی ایک ایسی شے بننے لگے جس کے سر تھا نہ پاؤں، اور منہ پر ڈھانکے لگے ہوئے تھے' البتہ شکم بڑھتے ہوئے اور گردنیں بنچی تھیں ——— پھر بھی زندہ تھے۔

جب اس واہمہ سے نکلا تو میں نے اس اجنبی نا معروف شخص سے کہا، چلو ہو سکتا ہے تم ہی حق پر ہو، مگر یہ تو بتاؤ دوست!

دوست نہیں بھائی کہو! صرف بھائی ——— ہاں بھائی یہ بتاؤ، یہ تمھیں کیسی سزا مل رہی تھی؟

کیا تم نے کوئی جرم کیا تھا۔

جرم! جرم! میرا جرم کیا ہو سکتا ہے، تھوڑی دیر ساکت رہنے کے بعد یوں گویا ہوا۔ ہاں اتنا جرم ضرور ہے کہ میرے اعضا ان جیسے نہیں ہیں اسی لیے یہ مجھے اجنبی سمجھ رہے تھے' اور اس بستی میں کسی اجنبی شخص کے داخلہ پر سخت پابندی ہے، چاروں طرف کڑا پہرہ رہتا ہے، حالانکہ میں اجنبی نہیں ہوں، برسوں یہاں اسی خرابہ میں رہا ہوں، بس فرق یہ ہے کہ یہ نئی نسل مجھے پہچانتی نہیں ——— یا الٰہی تو ان کو سمجھ دے یہ لوگ مجھے پہچانتے نہیں۔

پھر اسے معاً اپنی غلط دعا طلبی کا احساس ہوا۔

یہ میں نے غلط دعا مانگی۔ سمجھ آ جانا تو بڑی کربناک سزا ہے، اچھے ہیں وہ لوگ جو سمجھ نہیں رکھتے اگر سمجھ نہ ہو تو انسان ہمیشہ ہر حال میں خوش رہ سکتا ہے۔ اور کرب سے نجات بھی پا سکتا ہے۔ اور

تب میں نے فہم و ادراک کی گم شدگی کی دعا مانگی، کیونکہ مُکتی کی امکانی صورت، بس یہی ہے۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے بشارت ہو گئی ہو ——— حالانکہ یہ صرف خود فریبی تھی اور کسی حد تک دیگر فریبی بھی ———

تو پھر اصلیت کیا ہے؟ اصلیت تو برہنہ ہوتی ہے اور برہنگی ایک بُری اور منافی شے ہے اور عادت بھی۔

لیکن میں تو ہمیشہ خود کو ننگا رکھتا ہوں، خاص طور سے تنہائی کے ان لمحات میں جب بہت بھیڑ ہوتی ہے میں خود کو پہلے تو نیم عریاں کرتا ہوں اور جب اس سے آسودگی نہیں ملتی تو مادر زاد ننگا ہو جاتا ہوں۔ اور اپنے جسم کے نشیب و فراز اور شخصیت کی پیچیدگیوں کو ٹٹولتا ہوں، کہیں لذت، کہیں تکلیف اور اکثر جگہ تو فالج زدگی کا سا احساس ہوتا ہے، اور میرا یہ سارا عمل ذاتی تسکین کے لیے ہوتا ہے، اور یوں بھی فطرتاً مجھے ننگی چیزیں پسند ہیں۔ جس سے اور لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، مگر میں صرف تنہائی ہی میں نہیں کچھ دوستوں کے سامنے بھی ننگا ہو جاتا ہوں، بلکہ ننگا ہونے کے لیے غیر کی موجودگی کو لازمی تصور کرتا ہوں اپنے سامنے تو سب ہی بے لباس ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی قابلِ اعتماد دوست نہیں ملتا تو اپنے سایہ ہی کو رفیق بنا لیتا ہوں۔ لیکن سایہ بھی تو بڑی مشکل سے ملتا ہے، اس کا وجود بھی غیر کا تابع ہوتا ہے اور جو غیر کا تابع ہو اس پر کیسے بھروسا کیا جا سکتا ہے، یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اندھیرا بڑھنے لگا اور سایہ معدوم ہوتا گیا۔

لیکن اس ظلمت کدہ میں ایک باریش بزرگ آوارد ہوئے جن کی شخصیت شکستہ تر تھی، میں نے بلا تمہید ان سے کہا ذرا آپ ننگے ہو جائیے پہلے تو وہ مسکرائے لیکن جب میں نے سخت لہجہ میں کہا تو سٹپٹا گئے۔ اور لاحول پڑھنے لگے۔

یہاں کیسی باتیں کرتے ہو، دیوانے ہوئے ہو، بزرگوں سے مذاق کرتے ہو اور پھر میں تو تمھارے والد بزرگوار کی عمر کا ہوں۔ یہ بھی خیال کیا ہے تم نے۔

جی ہاں اسی لیے تو کہتا ہوں، کل والد بزرگوار کو بھی ننگا دیکھا تھا میرے اس عجیب و غریب لیکن عام سے انکشاف پر کہنے لگے۔

صاحبزادے ضرور تمھارا دماغ خراب ہوا ہے۔

اور پھر وہ اپنے جسم کو ڈھانکنے لگے جو زمانہ کی دست برد سے کھل گیا تھا مگر لباس اتنا بوسیدہ تھا اور مکروہ تھا کہ جتنا وہ کھینچ تان کر ڈھانکنے کی کوشش کرتے، مسک جاتا، بالآخر انھوں نے فطرتِ انسانی کی گستاخ نظروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

پھر میرا ہمزاد گر پڑا، شاید زیادہ نڈھال تھا اور بیمار کا جویا بھی ——— تھوڑی دیر کے بعد اس کے قبیلہ کے لوگ آئے اور اُسے اٹھا کر لے گئے کہ وہ ان کا سردار تھا، ان کی وضع اور اعضا کی

ساخت بھی اس جیسی ہی تھی، وہ اس کی موت پر تبصرہ کر رہے تھے، جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی کہتا اس ننگے شخص کو دیکھ کر ہارٹ فیل ہو گیا، کسی نے کہا ضربِ شدید تھی، اور وہ اس کا سر ٹٹولنے لگے، لیکن جب پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا گیا تو ثابت ہوا کہ اس کے سر سے کوئی خاص چیز غائب ہے۔ اس کے بعد اس مرض نے پھر وبائی شکل اختیار کر لی۔ ہر شخص اُلٹا ہونے لگا، سر شق ہوتا، اس میں سے کچھ نکلتا جیسے چیل کوّے ایک دم جھپٹ لیتے۔ اور جب سر سے یہ نکلی ہوئی شے ختم ہو جاتی تو یہ گوشت خور پرندے مُردہ جسموں پہ ٹوٹ پڑتے، ہڈیاں بچ رہتیں تو کتے جھگڑنے لگتے۔

لیکن تعجب ہے، کہ اس وبائی مرض نے صرف ایک مخصوص قبیلہ ہی کو اپنی لپیٹ میں لیا، باقی لوگ محفوظ تھے، بلکہ تنومند بھی، اور پھر بستی میں ایک بھی شخص ایسا نہ بچا، جس کی آنکھیں یا کان ہوں یا پیٹ سب لوگ موت کی زد میں تھے اور آہستہ آہستہ مرتے جا رہے تھے۔ اور جن کو موت نہیں آتی تھی وہ خود ہی اپنی خالی ہڈیوں کو مجتمع کر کے زیرِ زمین دفن کر دیتے تھے۔

اب پوری بستی پر "سر بریدہ" لوگوں کا راج تھا جن کی زبانیں بہت لمبی تھیں، عینک پوش آنکھیں زیرِ ناف آگئی تھیں، کان غائب تھے، مبادا وہ کچھ سُن سکیں، نچلا دھڑ زیادہ کارآمد اور متحرک تھا اور ان کے جسموں پر بے شمار مخصوص اعضاء اُگ آئے تھے، لہٰذا خود لذتی کے آگے موسم کی تخصیص یا رشتوں کی تقدیس اور امتیاز ختم ہو چکا تھا، یہ عجیب انقلاب اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنے لوگوں کا مر جانا اور جو باقی بچے تھے ان کا اس طرح سے اپنے وجود میں کھو جانا، عجیب سا لگ رہا تھا۔

میں اب بالکل یکہ و تنہا رہ گیا تھا، جو کہ خدائی صفت ہے، آج کل مالکِ حقیقی نے یہ صفت اپنے مقرب بندوں میں تقسیم کر دی ہے، اب میرا نہ کوئی رفیق تھا، نہ ہم زباں، جو کچھ تھا بس خود تھا۔ اگر بات کرنے کو جی چاہتا تو خود ہی سے کر لیتا ——

اور ایک دن یہ خود بھی مر گیا —— ہوا یوں کہ ایک روز صبح کو جب میں اپنے تنگ و تاریک کمرہ میں سو کر اُٹھا اور میں نے اپنے اعضا ٹٹولے تو داہنا ہاتھ غائب تھا، اِدھر اُدھر دیکھا، شاید کہیں پڑا ہو، مگر ندارد، دوسرے ہاتھ سے کانوں کو ڈھونڈا تو دو بڑے سوراخوں میں انگلی چلی گئی، آنکھیں پھیل کر لمبی ہو گئی تھیں، سر پہ ہاتھ پھیرا تو ایک طرف کو ڈھلکا ہوا کتوں کے جھگڑنے کی آواز قریب تر ہوتی گئی۔ اور میری گھڑی وہیں پڑی تھی۔

OO

ورق ورق چہرے

چودھری محمد ارشد

اس نے دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور کرسی پر جمی ہوئی گرد کی ہلکی سی تہ کو صاف کر کے دراز ہو گیا۔ کچھ لمحوں تک دھند کے سینے میں اُترنے کی کوشش کرتا رہا ——— ایک تصویر جو اندر نیچے، عمیق گہرائی میں ہے۔ جب گرفت میں نہ آسکی تو بجھے ہوئے سگار کو سلگا کر غائر نظروں سے کمرے کا مطالعہ کرنے لگا۔

کمرے کے وسط میں ایک کینوس پڑا ہے۔ فرش پر جا بجا کٹے پھٹے، ردی، کاغذوں اور دفتیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ چھت اور چاروں طرف کی دیواریں بکثرت تصاویر سے اپنی اصلیت کو راہن کھو چکی ہیں۔ چھوٹی، بڑی، موٹی، باریک، لکیروں کی صورت پلاسٹر جھانکتے نظر آتے ہیں۔

دیواروں پر گرد کی باریک تہہ اور چھت کے کونوں میں مکڑیوں کے جالے بوسیدگی کا احساس دلاتے ہیں۔

الماری کے تین خانوں میں اُوپر کا خانہ رنگوں کے پیک ڈبوں سے بھرا ہے۔ نیچے کے خانے میں مختلف رنگوں سے آلودہ برش پڑے ہیں۔ بیچ کے خانے میں استعمال شدہ رنگوں کے ڈبے ہیں جو کہ کھلے، ادھ کھلے، اور بند ڈھکنوں پر، لال، پیلے، نیلے، فیروزی سُرمئی رنگ لگے ہیں۔

وہ ان رنگوں میں ڈوب جاتا ہے اور برش سے کھیلتا رہتا ہے۔ چھوٹی بڑی تصویریں اُبھرتی رہتی ہیں۔ دل خراش چیخیں ذہن کی وسعتوں میں مسلسل احتجاج پیدا کیے رہتی ہیں۔ کھلی اور خاموش آنکھوں سے وہ ان ٹھٹھرے ہوئے، اذیت زدہ جسموں کو دیکھتا رہتا ہے جو توی اور توانا جسموں کے بید دستکنجوں میں آ و بکا کرتے رہتے ہیں۔

جب ذہن ان مختلف اور متضاد آوازوں سے بھر جاتا ہے تب وہ چپ چاپ پھر اسی کمرے میں آ کے قید ہو جاتا ہے۔ سگار اور کافی پر ہی وقت گزاری کرتا ہے۔ دھوئیں کی مانند پھیلے ہوئے کہرے میں چھلانگ لگا دیتا ہے۔ سُرمئی رنگ میں کیسے کیسے نقوش اُبھرتے ہیں۔ کتنے ہی رنگوں کے اختلاط و ارتباط سے گزرتا ہے۔ اکثر جھنجھلا کے اُن رنگوں سے لتھڑے ہوئے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سطح پر بکھیر دیتا ہے۔ کبھی کوئی عنوان دے کر دیوار کی زینت بنا دیتا ہے۔

اس نے ایک عرصہ بعد آج پھر تصویروں کو گننے کی کوشش کی۔۔

ایک تصویر میں ——— چند لوگ پہاڑ پر کھڑے سیکڑوں فٹ نیچے چلتے ہوئے بے شمار چھوٹے چھوٹے آدمیوں پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ ان کے سروں پہ تاج سجے ہیں۔

کچھ لوگ دلدل میں پھنسے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔

غراتے ہوئے بھیڑیوں کے درمیان ایک مرد کانوں پر ہاتھ دھرے چیخ رہا ہے۔

کچھ لوگ ایک لاش کا احاطہ کیے قہقہے لگا رہے ہیں۔

چند لاشوں کے درمیان ایک عورت کھڑی رو رہی ہے۔

ایک عورت کے ہاتھ پیر کٹے دُور دُور پڑے ہیں اور ان ٹکڑوں کو چند لوگ اُٹھا رہے ہیں۔ چند لوگ دانتوں سے چبا رہے ہیں۔

ایک مریل سا آدمی ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے۔

دوسرا چھجے سے ایک انگارا پکڑے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ رہا ہے۔

ایک بوڑھا ایک دراز عمر عورت کے سر پر مالش کر رہا ہے۔
میں وہی عورت ایک نوجوان کا پیر داب رہی ہے۔
ایک بچہ بھیڑ میں کھو گیا ہے۔ رو رہا ہے۔
ایک بچہ بے تکان دوڑ رہا ہے۔ جس کے تعاقب میں
پورا شہر ہے۔
ایک بچہ مجرم کے کٹہرے میں زار و قطار رو رہا ہے۔
نے مجسٹریٹ مسکرا رہا ہے۔
ایسی ہی بے شمار تصویریں ہیں۔
ایک تصویر اور ہے! —— وہ اسے بھی دیکھتا ہے۔
دم شکیس میں ایک عورت ہے۔ جو اپنی گود میں ننھے سے ایک
کو لیے ممتا بھری مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیرے ہے۔
عورت کی وہ مسکراہٹ، آنکھوں کا وہ نور، چہرے کا وہ تقدس
نکس دھند میں کھو گیا ہے۔ اور بچہ اس کی گود سے نکل کر
لگتے ہوئے قدموں تلے کچلا جا چکا ہے۔
وہ بچہ کچل کر، مسخ ہو کر ایک جسم، ایک نیا چہرہ پا گیا تھا۔

اس کے باوجود جب وہ اپنے گرد و نواح پر نظر ڈالتا ہے تو
ہر شے بے سود نظر آتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جو پہلے تھا۔ وہی
اب بھی ہے۔ کوئی فرق نہیں کوئی تبدیلی نہیں۔ خلا کا خلا۔ وہی
کچھ —— شاید کچھ بھی نہیں —— متلاشی آنکھوں اور
متجسس دماغ کا ہر نقش بے نقش ہو کر مفقود ہوتا ہے۔ ہاں،
اسی لیے تو اب اسے ہنسنا نہیں آتا۔ رونا بھی نہیں آتا۔ ہنسنا
چاہتا ہے تو صرف ہونٹ پھیل کر رہ جاتے ہیں۔ رونا چاہتا ہے تو
سنگریزے چبھنے لگتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی اتنا ضرور محسوس ہوتا
ہے۔ جیسے اندر کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔ اور سراپا سے کچھ لہروں کا
استغراق ہوا ہو۔
جب سوا خلا کے کچھ نہیں نظر آتا تب یہی تصویریں رخصت
ہو کر گزر ہوتی ہیں۔ جذبات و احساسات کنوارے اور ایک دم
ترو تازہ ہو جاتے ہیں جیسے کوئی جسم مل گیا ہو۔ ایک نیا چہرہ
ہاتھ آ گیا ہو ——!

OO

بقیہ: بزمِ احباب

○ تازہ شمارہ میں مہدی پرتاپ گڑھی کی جو غزل شایع
ہوئی ہے وہ ماہنامہ "روشنی" کے شمارہ نمبر ۳ مارچ ۱۹۷۸ء کو شایع
ہو چکی ہے۔ "تحریک" والی غزل کا مطلع اور مقطع وہی ہے غزل کا تیسرا
مصرع بھی پہچانا ہوا ہے۔ پانچواں شعر کچھ ترمیم کے ساتھ شایع ہوا ہے۔

آئینۂ حیات مکدر ہے ان دنوں
اے وقت اب مزید نہ گردِ ملال دے

(روشنی)

پہچان اپنی کھو چکے چہروں کے آئینے
اے وقت اب مزید نہ گردِ ملال دے

(تحریک)

کیا یہ سب جائز ہے؟

—— ساگر کرناٹکی، وانی بجور

○ تحریک کا تازہ شمارہ ملا۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی صاحب
کا مضمون "اَنّہم یقولونَ مالا یفعلون" اس سے پہلے شب خون میں بھی
شایع ہو چکا ہے مگر دوبارہ پڑھنے میں بھی بہت لطف آیا۔[1]
آپ نے فن کاروں کے پتے شایع کرنے کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔
میرا خیال ہے اسے جاری رہنا چاہیے تھا۔
اس بار تحریک کا اداریہ پڑھ کر عبرت ہوئی۔ انجمن ترقی اردو
جیسا ادارہ بھی اگر ایسی بدعنوانیوں میں ملوث ہو جائے تو اس ملک
میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا ہ ۱۳ر جولائی ۷۹ء کو میں نے ایک غزل:
"رنگ و آہنگ زمانے سے جدا ہے اپنا" بھیجی ہے۔ یقیناً آپ کو مل گئی ہوگی۔
اور جلد ہی شایع ہو جائے گی اس کی بھی مجھے توقع ہے۔ اس بار ادارۂ تحریر
میں محمود صاحب کا نام نہیں ہے۔ رسالہ "کہکشاں" کی ادارت میں ان کا
نام دیکھا۔ امید ہے "گلفشاں" کو آپ کی سرپرستی حاصل ہوگی۔

[1] مولانا کا مضمون اس قابل تھا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ ہو۔ "شب خون"
کا حوالہ دیا جا سکا۔ ت۔ ہم ان کی کامیابی کا خلوصِ دل سے شکر گزار ہیں۔

بزمِ احباب

○ جون/جولائی ۷۹ء کے تحریک میں گوپال متّل صاحب نے سیکولرازم پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے "سیکولرازم سے مُراد ایک ایسا نظامِ حکومت ہے جس میں کسی فرقے کے ساتھ نہ تو بربنائے مذہب کوئی تعصب برتا جائے اور نہ مذہب کی بنا پر اس کی برتری کو تسلیم کیا جائے" اور یہ کہ "مختلف مذاہب ماننے والے ایک دوسرے سے رواداری برتیں اور حکومت مذہبی تعصب سے بالا ہو۔" اُوپر کے جملوں کی رُوح سیکولرازم کو ماننے والی حکومت سے مذہبی معاملات میں رواداری کی توقع کرتی ہے۔ وہ نظامِ حکومت کو اس ضابطے کی پابندی پر مجبور نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اگر سیکولرازم کے لغوی معنی پر بھروسہ کیا جائے تو صورت یہ اُبھرتی ہے کہ سیکولرازم حکومت کے تمام امور میں مذہبی تعصب یا مذہبی پاسداری سے قطعی آزادانہ رویّہ اختیار کرنے پر زور دیتا ہے اور حکومت کے لیے اس سے فرار کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔

سیکولر کا لفظ ہندوستانی آئین میں شامل کیا جانا شاید اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک جہاں زندگی کے ہر شعبے پر مذہب کی اجارہ داری ہے اور جہاں بہت ہی معمولی باتوں پر مذہبی جذبات مشتعل ہو کر کشت و خون کا باعث بنتے ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ٹھیک اسی لمحے، مذہبی بنیادوں پر اس ملک کے کچھ حصّے کٹ کر ایک الگ وحدت کی صورت میں نمودار ہوئے اور تقسیم شدہ حصّہ اپنے لیے پہلے ہی سے مذہبی ریاست کے قیام کی تشکیل کا تہیہ کر چکا تھا۔

اس صورتِ حال میں آزاد ہندوستان میں بھی ردِعمل کے طور پر مذہبی ریاست کے قیام کی ضد پیدا ہو سکتی تھی۔ اور شاید اسی کے سدِّباب کے لیے یہ لازمی سمجھا گیا کہ ملک کے آئین میں سیکولرازم کو ایک بنیادی مرتبہ دے دیا جائے جس خطرے کے پیشِ نظر سیکولرازم کو اپنایا گیا وہ خطرہ آج بھی موجود ہے اور ملک میں ایسی بااثر جماعتیں اور افراد موجود ہیں جو اس قسم کی ریاست کے قیام کی باتیں سوچتے ہیں اور جس کی طرف متّل صاحب نے واضح اشارہ کیا ہے:

"ہندوستان میں مختلف عقائد رکھنے والے
فرقے موجود ہیں انھیں ہم آہنگی اور ہم وجودیت
پر تو آمادہ کیا جا سکتا ہے لیکن یک عقیدگی پر نہیں۔"

مسلمانوں یا انگریزوں کے دورِ اقتدار میں سیکولرازم کا دعویٰ کیے بغیر سیکولرازم سے ملتی جلتی چیز اگر موجود رہی تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمان یا انگریز جس مذہب کے پیروکار تھے اس مذہب کے ماننے والے اس ملک میں ایک بہت ہی چھوٹی اقلیت کا درجہ رکھتے تھے (آج بھی وہ اقلیت ہی میں ہیں) یہ اقلیت اگر اپنے تمام وسیلے بروئے کار لاتی تب بھی اس ملک کی اکثریت پر اپنے مذہب کی بالادستی قائم نہیں کر سکتی تھی اس لیے ان دو طاقتوں نے اپنی بقا کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ دوسرے مذاہب میں عدمِ مداخلت کی راہ اپنائی جائے۔ دراصل مداخلت کی کوشش میں ناکامی ہی نے انہیں عدمِ مداخلت پر قناعت کرنا سکھایا۔ اس کے باوجود ایسا نہیں کہ ان کے دامن بے داغ ہیں۔

اس معاملے میں اگر وہ بالکل بے گناہ ہوتے تو آج ہندوستان میں سیکولرازم کی قبولیت کے لیے ذہنی تحفظ کا سہارا دینا پڑتا

سیکولرازم کی مخالفت یا موافقت میں یہ رٹ کتنی ہوتی۔
ان کی بھی کارگزاریاں ہیں جو آج تین دہائیوں کے بعد بھی سیکولرازم
فروغ میں رکاوٹ کا سبب بن رہی ہیں۔

جہاں تک سیکولرازم سے منافقت برتنے یا سیکولرازم کے
غرضانہ مقاصد کے لیے استعمال کی بات ہے تو یہ ہماری بدنصیبی
ہے کہ ہم مجموعی طور پر دو رُخے ہیں۔ ہندوستانی معاشرہ
عقیدے اور عمل کے تضاد سے ہمیشہ دو چار رہا ہے اس لیے
نے وہ دور کب آئے گا جو صحت مند اقدارِ حیات اور روشن
اندازِ فکر کو قومی خمیر کا حصہ بنا دے۔ اور ملک کو اس تضاد کے
چنگل سے نجات ملے۔

——— پرکاش فکری، رانچی

○ جون/جولائی کا مشترک شمارہ ملا۔ جو ہر اعتبار سے
خوب ہے۔

اس شمارے میں محترم سکندر علی وجد صاحب کی نظم "ایک
تبصرہ نگار سے" نظر سے گزری۔ اُن کی یہ نظم چار پانچ ماہ پہلے
ہندو بلٹز میں چھپ چکی ہے۔ بلٹز میں عنوان کے ساتھ ساتھ
بریکٹ میں (بائیں ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم) بھی تحریر تھا۔
یہ نقاد ظ۔ انصاری ہیں۔ جنھوں نے وجد صاحب کے
نئے مجموعۂ کلام پر بلٹز میں تبصرہ کیا تھا۔ تبصرہ دیکھ کر وجد صاحب
جھنجھلا گئے اور جواب میں بائیں ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ نظم شایع
کروائی تھی۔ تیسرے شمارے میں ظ۔ انصاری نے اس نظم کا
جواب بھی دیا تھا جو اور زیادہ سخت تھا۔ اب اگر وجد صاحب
اپنی اس نظم کو جگہ جگہ شایع کروا رہے ہیں تو وہ ظ۔ انصاری کا
نام لکھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں؟ جبکہ بلٹز میں اسی مضمون
کے تحت ظ صاحب اور وجد صاحب کی تصویریں بھی ساتھ
ساتھ چھپ چکی ہیں۔

——— خلش بڑودوی

○ جون/جولائی کا شمارہ ملا۔ جناب سکندر علی وجد کا
"ایک تبصرہ نگار سے" پڑھ کر بے ساختہ جناب ظ۔ انصاری
ذہن میں آگئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہی اس کے مخاطب ہیں۔
تمام احباب میں شامل جناب ادم پرکاش ماہری اس

تحریر سے کہ "اس ملک سے فرقہ پرستی کی وبا تبھی ختم ہو سکتی ہے
جب لوگ اپنی زندگیوں کو اپنے اپنے مذہب کے سانچوں میں ڈھال
لیں۔ ہندو سچا ہندو بنے اور مسلمان حقیقی مسلمان بنے۔" میں
پوری طرح متفق ہوں۔ کاش ایسا ہو۔

——— صابر محمد شمر الدین یادگیری

○ تحریک کا تازہ شمارہ (اگست ۶۹ء) آج ہی ملا ہے۔
مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مضمون " انہم یقولون مالا یفعلون"
دلچسپ بھی ہے اور توجہ طلب بھی۔ خصوصاً ناقدانِ ادب کو
اس پہلو پر سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔

مذکورہ بالا آیت کے بارے میں مولانا کے اس جملے پر
کہ ڈیڑھ ہزار برس سے یہ الزام موجود ہے، نگاہ رُکتی ہے۔
میرے خیال میں "الزام" میں اس بات کا امکان بھی ہوتا
ہے کہ وہ غلط ثابت ہو جائے۔ واقعات شاہد ہیں کہ یہاں
"صدق اللہ العظیم" کہے بغیر چارہ نہیں۔

اسی موضوع پر میں نے ایک مزاحیہ مضمون بعنوان "مولانا"
ماہنامہ واقعات دہلی کے فروری ۱۹۷۴ء کے شمارے میں لکھا تھا۔

مولانا عرشی نے اپنے مضمون میں صرف ایک پہلو یعنی
شعراء کی بے داغ گھریلو زندگی اور شراب و کباب اور عشق و
شباب سے لبریز کلام سے گفتگو کی ہے۔ حالانکہ نجی زندگی اور
اندازِ کلام میں تضاد تقریباً ہر شاعر کے یہاں اور ہر پہلو سے
موجود ہے۔ مثلاً علامہ اقبالؒ جو "بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر
ملت میں گم ہو جا" کے مبلغ رہے ہیں کے متعلق یہ واقعہ
خالی از دلچسپی نہیں کہ ایک بار کشمیری خاندان کے ایک شخص
کا لڑکا وہ کسی غیر خاندان میں شادی کرنا چاہتے تھے حضرت
علامہ نے انھیں اس شادی سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا
کہ کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کریں۔ ایک نوجوان طالبعلم
نے متعجب ہوتے ہوئے دریافت کیا کہ آپ تو شرمندہ ساحل کو
اچھل کر بے کراں ہو جانے کی تعلیم دیتے ہیں پھر آپ اس شادی
سے کیوں منع کرتے ہیں۔ علامہ نے بات مزاح میں ٹالتے ہوئے
جو جواب دیا وہ بہر حال "بتانِ رنگ و خوں" کو توڑتا نہیں بلکہ
اس کی پرستش پیدا کرتا ہے۔

——— ناوک حمزہ پوری شہزادی باغ

چند بہترین کتابوں کی فہرست

۱- ارمغانِ بہار (شاعری) اے، سی، بہار 10/-
۲- آواز کا جسم (شاعری) محمود سعیدی 10/-
۳- اُڑان (شاعری) شباب للت 6/-
۴- امراؤ (شاعری) بدیع الزماں خاور 10/-
۵- کفرستان (شاعری) کرشن موہن 20/-
۶- اُنیس سو چوراسی (ناول) جارج آرویل 6/-
۷- انتظار کی رات (شاعری) کمار پاشی 8/-
۸- انسانی حقوق کیا ہیں؟ موریس کرانسٹن 4/-
۹- بسمل سعیدی - شخص اور شاعر (تنقید) 18/-
۱۰- تیشۂ نظر (مضامین) ابوالفیض سحر 8/-
۱۱- جملوں کی بنیاد (ڈرامے) کمار پاشی 7/-
۱۲- حبابِ رنگ (شاعری) بانی 15/-
۱۳- حروف (شاعری) بدیع الزماں خاور 1/50
۱۴- خرابہ (شاعری) من موہن تلخ 10/-
۱۵- دیپک راگ (شاعری) مظفر حنفی 6/-
۱۶- رُو بہ رُو (شاعری) کمار پاشی 10/-
۱۷- راکھ (شاعری) احتشام اختر 6/-
۱۸- سخاروف نے کہا: آندری - ڈی - سخاروف 4/-
۱۹- سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ: موریس کرانسٹن 1/-
۲۰- سیہ بر سفید (شاعری) محمود سعیدی 6/-
۲۱- شہپر (شاعری) حرمت الاکرام /-
۲۲- شہرِ خوشبو (شاعری) نند لعل نوُر /-
۲۳- شیرازہ (شاعری) محمود سعیدی، پریم گوپال متل /-
۲۴- صحرا کی پیاس (شاعری) شباب للت /-
۲۵- کلیاتِ شاد عارفی - مرتب: مظفر حنفی /-
۲۶- کوئے ملامت (شاعری) کرشن موہن /-
۲۷- کیلسر وارڈ (ناول) الیگزنڈر سولنسٹین /-
۲۸- گیان مارگ کی نظمیں (شاعری) کرشن موہن /-
۲۹- لاحد کا جوڑ کر کیا: گوپال متل /-
۳۰- میں گواہی دیتا ہوں اناتولی مارچینکو /-
۳۱- نام بہ نام (شاعری) رضا نقوی واہی /-
۳۲- نئے عہد نامے کی سوغات: فیاض رفعت /-
۳۳- نگاہِ شوق (شاعری) دھرم سروپ /-
۳۴- ولاس یاترا (نظم) کمار پاشی /-
۳۵- سبیل (شاعری) بدیع الزماں خاور /-
۳۶- حصارِ آب (شاعری) حیات لکھنوی /-
۳۷- لال قلعہ: ڈاکٹر صفدر آہ /-
۳۸- بھیگا ہوا کاغذ (شاعری) ممتاز راشد /-
۳۹- گوپال متل: ایک مطالعہ: محمد عبدالحکیم /-

نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی-۲

بھارت بھاگیہ ودھاتا
15 اگست 1947 کو ہم بھارت کے لوگ اپنے مقدر کے مالک (بھارت بھاگیہ ودھاتا) خود بنے۔
آیئے آزادی کی 32 ویں سالگرہ پر آج :-
* اپنی کامیابیوں سے قوت اور تحریک حاصل کریں۔
* مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے تازہ دم ہو کر کام کریں۔
آزادی کے 32 برسوں میں.....
* ہم نے سب بیرونی حملوں کو پچھاڑ کر ملک کی سالمیت کی حفاظت کی ہے۔
* ہماری متوقع اوسط عمر 32 سے بڑھ کر 52 سال ہو گئی ہے۔
* ہم نے اناج کی پیداوار دو گنی سے بھی زیادہ بڑھا لی ہے۔
* ہماری صنعتی پیداوار میں چار گنا سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔
* ہمارے بدیشی سکے کے ذخائر 5,000 کروڑ روپے سے زائد ہیں۔
"قوم بجا طور پر ناز کر سکتی ہے کہ ہماری معیشت جو جامد اور دوسروں کی دست نگر تھی جدید اور خود کفیل بن گئی ہے" یہ ہمارے رواں پانچسالہ منصوبے کے ڈرافٹ کا اقتباس ہے۔
آزادی اور خوشحالی کی خاطر اتحاد اور یکجہتی قائم رکھیں۔

گوپال مِتّل کی دو مشہور و مقبول تصانیف
لاہور کا جو ذِکر کیا
ادبی اور سیاسی یادداشتوں کی حکایتِ لذیذ
غیر منقسم پنجاب کی کہانی —— گوپال متّل کی زبانی
ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
دوسرا ایڈیشن —— قیمت دس روپے
صحرا میں اذان
شعری مجموعہ
اُردو شاعری کی مستحکم اور معتبر آواز
آفسیٹ کی خوشنما طباعت
قیمت آٹھ روپے
کرشن موہن کے شعری مجموعے جو خواص و عوام میں یکساں مقبول ہیں
شیرازۂ مژگاں ○ گیان مارگ کی نظمیں ○ کوئے ملامت
قیمت دس روپے
قیمت : دس روپے
قیمت : دس روپے
مخمور سعیدی کے شعری مجموعے، جدید شاعری میں فکری توازن کی ایک روشن مثال
آواز کا جسم
قیمت : دس روپے
سیہ بر سفید
قیمت چھ روپے
سب رنگ
قیمت : پانچ روپے
گفتنی
قیمت : چار روپے
نیشنل اکادمی، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Regd. No. D (D) 118 Phone : 271649 September 1979

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 646/57

TAHREEK

THE
TAHREE

تحریر

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک نئی دہلی

جلد ۲۷ شمارہ: ۸-۷

اکتوبر، نومبر ۱۹۷۹ء

مندرجات

ادارۂ تحریر:

گوپال متل

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے۔ فی کاپی ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے :
سالانہ : تین پونڈ فی کاپی : چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ :
منیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل
مطبع : [illegible] پریس، دہلی
مقام اشاعت : ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

جے پرکاش نارائن

گوپال متل

قرار و ناتری طرز ستم سے بھی نرالا ہے
اسی کو دورہی ہے جس کو خود ہی مار ڈالا ہے

جے پرکاش نارائن کی موت پر آہ و بکا سن کر یہ شعر
بےساختہ یاد آگیا۔ مخاطب مسز اندرا گاندھی نہیں بلکہ ہندو
ہندوستانی قوم ہے۔ ہم لیڈروں کو فوق الفطرت سمجھ کر یہ
تصور کر لیتے ہیں کہ وہ از خود ہمارے مسائل حل کر دیں گے۔
یہ بھول جاتے ہیں کہ مسائل قوم کو خود حل کرنے ہوتے ہیں
لیڈر صرف رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ جے پرکاش
نارائن کی کوشش اکارت نہیں گئی، وہ ہماری سیاست
میں ایک نومی تبدیلی لائے۔ لیکن یہ تبدیلی عارضی ثابت ہوئی
اور ان کا مکمل انقلاب کا خواب ادھورا ہی رہا۔ ان کو
خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ نہیں کہ ان کے
مجسمے نصب کیے جائیں۔ حقیقی خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم
ان کے ادھورے خواب کو پورا کریں۔

ہندوستانی سیاست کو ان کی بہترین دین یہ تھی کہ وہ
نظام حکومت کی اچھائی کو ناپنے کا پیمانہ فرد انسانی کو سمجھتے تھے
مغربی لیڈروں کی روش کے برعکس تھا جو پہلے سماجی سانچہ
بنا لیتے ہیں۔ اور پھر اس میں افراد انسانی کو فٹ کرتے ہیں۔
جے پرکاش نارائن نظریاتی آدمی نہیں تھے۔ وہ نظریات
سے جن میں مارکسزم بھی شامل تھا ایک نہ ایک وقت متاثر
ہوئے لیکن جلوہ سر راہ گزار کی حد تک۔ مارکس کے ادعائی
نظریے کے استرداد کی بنا پر کمیونسٹ ان سے ہمیشہ ناراض
رہے اور جیسا کہ ان کا شیوہ ہے انھوں نے دشنام طرازی
[illegible] کیا۔ دشنام طرازی کا فریضہ ترقی پسند شاعروں

نے زیادہ شدت کے ساتھ انجام دیا۔ مثلاً یہ دو شعر:

اندھی دولت کا تیر جے پرکاش
اہل زر کا فقیر جے پرکاش

موت اور جیون میں سمجھوتہ وادرسے جے پرکاش نارائن
غداروں کی صف میں شامل نام تمہارا ہو کے رہے گا

کمیونسٹوں کی دشنام طرازی سے قطع نظر قابل غور یہ بات
ہے کہ ہم سب لوگ جنھوں نے ان کے خواب کو چکنا چور کیا اور
ملک کو پھر انتشار کی راہ پر کھڑا کر دیا ہے کیا اتنے ہی مجرم نہیں۔ جن
دنوں ان کے خلاف دشنام طرازی کی مہم چل رہی تھی راقم الحروف
نے مندرجہ ذیل نظم لکھی تھی جو تحریک کے جنوری ۱۹۷۵ء کے
شمارے میں شایع ہوئی تھی۔

یہ سچ ہے ہم جسے مصلوب کرنے جا رہے ہیں
وہ رہزن ہے زانی ہے
مگر یہ جرم اس کا کم نہیں ہے، وہ ہمارے بددیانت شہر میں
تلقین کرتا ہے دیانت کی

تمھیں معلوم ہے
ہم سب شریک جرم ہیں
ہم سب کے چہروں پر سیاہی ہے گناہوں کی
تو کیوں نہ سرخ رو ہو جائیں دھو کر اس کے خوں سے
اپنے چہروں کی سیاہی کو

آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جے پرکاش مرے نہیں
بلکہ ہم نے انھیں صلیب پر چڑھا دیا ہے۔ یہ مجرمانہ ضمیر کا یہ احساس اگر عام
ہو جائے تو بہت ممکن ہے کہ اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل سکے۔

ادب اور تحریکیت

گوپال متل

پاکستانی ادیبوں کی انجمن "حلقۂ اربابِ ذوق" کا اجلاس ۲۷ مئی کو راولپنڈی میں منعقد ہوا جس کی صدارت پاکستان کے معروف ادیب شاعر اور ناقد وزیر آغا نے کی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے حلقے کی سابقہ سرگرمیوں اور موجودہ رجحانات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا کہ گزشتہ چالیس برس میں حلقے نے بہت کچھ پایا اور بہت کچھ ضایع کیا۔ یافت کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حلقے نے نئی پود کو حصولِ علم پر اکسایا اور اسے اپنے ذہنی اُفق کو کشادہ کرنے کی ترغیب دی۔ ادب پر اس کے نہایت خوشگوار اور مثبت اثرات مرتسم ہوئے۔ ضیاع کے سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ حلقہ تخلیق کو بہ نظرِ حیرت اور تجسس دیکھنے کے اس رویے سے جو فن کی اساس بھی ہے بتدریج محروم ہوتا چلا گیا۔" ان کے نزدیک "اس کی بڑی وجہ سیاست تھی جس نے ادب پر شب خون مارا اور تجربے میں جذباتی شرکت کے بجائے نظریے میں جذباتی شرکت کے میلان کو تقویت بخشی دی۔"

ادبی انجمن کی حیثیت کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں اس کے بارے میں انھوں نے کہا کہ "ادبی انجمن کی حیثیت ایک عبادت گاہ کی سی ہوتی ہے۔ اگر آپ عبادت گاہ میں اپنے نظریاتی تعصبات کی ہمراہی میں داخل ہوں گے تو مناظرہ جنم لے گا اور اگر آپ تعصبات سے آئینۂ دل کو گدلا کیے بغیر آئیں گے تو مکاشفہ۔ مناظرہ کی صورت یہ ہے کہ ہر قدم پر جہاد کا منظر پیش کرتا ہے اور ہر قدم پر زندگی اور موت کی جنگ برپا ہوتی ہے۔ اس جنگ میں نظریے کا تحفظ مناظرہ کرنے والے کے لیے اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا جان کا تحفظ۔ لہٰذا وہ شاذ و نادر ہی اپنی کسی غلطی کو تسلیم کرنے پر مائل ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ ادب پارے کو بھی اپنے نظریات کی میزان پر تولتا ہے اگر ادب پارہ اس کے اپنے نظریے کی تبلیغ کر رہا ہے تو اچھا ہے مگر اس سے بے نیاز ہے یا کسی اور نظریے کا مبلغ ہے تو برا ہے دوسری طرف مکاشفہ کی صورت یہ ہے کہ نظریاتی آویزش کے منہا ہو جانے کے باعث ادب پارے کی طرف ناقدین کا رویہ "متشدد" یا "مہربان" نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ذوقِ نظر کو میزان قرار دے کر اس کی نہایت کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اس قسم کی فضا میں ادب پارے کا کیمیاوی تجزیہ کرنے کے بجائے اس کی تخلیقی سطح سے لطف اندوز ہونے کا رویہ جنم لیتا ہے جو نئی پود کے ذوق کی تربیت میں بھی ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔"

وزیر آغا صاحب کی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ تحریکیت اور طے شدہ نظریہ ادب کے لیے مہلک ہے۔ ادب پارے کا جائزہ ایک ادب پارے کی حیثیت سے ہی لیا جانا چاہیے۔ ان کی اس بات سے ادب کے کسی سنجیدہ ناقد کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کی ابتدائی نشستوں میں شرکت کا موقع راقم الحروف کو بھی ملا ہے، یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرا جی زندہ تھے۔ اُن دنوں ادب پارے پر ادب پارے کی حیثیت سے ہی بحث ہوتی تھی کبھی کبھی فیض اور ان کے ہمنوا آ دھمکتے تو وہ نظریے کی دہائی ضرور دیتے تھے۔ موصوف کی تقریر سے متاثر ہو کر حلقۂ اربابِ ذوق اپنی گم شدہ روح کو پھر سے پالے تو یہ ادب کے لیے ایک نیک فال ثابت ہوگی۔

ہپی میلہ

کرشن موہن

ننگے اجسام کا میل
ننگے اجسام کا کھیل
بادۂ ناد و شیزۂ امن
چھوڑ کر حسن کا شرمیلا پن
ننگے سینوں میں لیے کام اگن
نشے میں غرق جوانوں کے سنگ
جنس کی پیاس بجھانے میں مگن

اور شو لنگ کی سنگت رنگت
کیک تیار ہوئے
ساتھ اُن کے ہوئی تقسیم حشیش
بے دھڑک جسم ملن شوخ تماشا کر ملن
مست، آزاد اُمنگ
انگ اور رنگ ترنگ
فطرتِ عیش آہنگ
جو ہے تہذیب سے آمادۂ جنگ

گھاس میں سانپ مچلتے ہی رہے
ننگے اجسام کا کھیل
ننگے اجسام کا میل

کمیونزم اور ہندوستانی مسلمان

گوپال متل

ہندوستانی کمیونسٹوں کو اس بنا پر بڑی تشویش ہے کہ مسلمان ان کے دام تزویر میں پھنسنے پر آمادہ نہیں سو چنانچہ وہ مسلمانوں کی "غلط فہمیاں" دور کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ جب بھی کمیونسٹ اس قسم کی کوئی مہم چلاتے ہیں پس پردہ رہ کر ہی چلاتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اگرچہ مسلمہ حیثیت کے مالک ہوتے ہیں لیکن کمیونزم کے بارے میں وہ صرف اُتنا ہی جانتے ہیں جتنا کمیونسٹوں نے خود انھیں بتایا ہے۔ اس کا تازہ ترین ثبوت "عصری آگہی" کے مئی ۱۹۷۹ء کے شمارے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون "ہندوستانی مسلمان اور کمیونزم" ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں :

"اسلام مذہب ہے کمیونزم بنیادی طور پر اقتصادی نظام ہے اس لئے بنیادی حیثیت سے ان دونوں میں کسی تضاد کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن پچھلی نصف صدی سے کمیونزم کو مذہب دشمن فلسفے کے طور پر ایسی معصوم معصوم سے پیش کیا گیا ہے کہ عام مسلمانوں نے کمیونزم کا صرف ایک ہی رُخ دیکھنے پر اکتفا کر لیا ہے یعنی کمیونزم شاید ایک دوسرا مذہب ہے جو یا تو اسلام کا مخالف ہے یا اس کے مقابل کوئی دوسرا عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں دو مختلف شعبوں سے متعلق ہیں، ایک روحانیت سے دوسرا اقتصادیات سے۔

اس مرحلے پر یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ کمیونزم کے بانیوں اور اہم مفکرین نے اگر مذہب کے بارے میں عموماً اور اسلام کے بارے میں خصوصاً بعض خیالات کا اظہار کیا ہو تو بھی ان افکار کی حیثیت کمیونزم کی بنیادی نوعیت میں فرق پیدا نہیں کرتی۔ کمیونزم اصلاً اقتصادی نظام ہے، روحانیت کا کوئی عقیدہ یا فلسفہ نہیں ہے اور اس اعتبار سے کمیونزم میں تبدیلی بھی ممکن ہے اور اس نظام میں افراط و تفریط بھی ہو سکتی ہے، اس پر تنقید بھی کی جا سکتی ہے اور اس کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن نے کوئی نئی بات نہیں کہی کمیونسٹ اور ان کے ہمنوا ایسا ہی حضرات غیر کمیونسٹ ممالک میں ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں مثلاً مصر کے مشہور بیبادی خالد محی الدین نے جنھوں نے ۱۹۵۲ء میں شاہ فاروق کا تختہ اُلٹنے میں سرگرم حصہ لیا تھا، مصر کے سیاسی جریدے "روضۃ الیوسف" میں لکھا تھا کہ "آدمی بیک وقت خدا اور سائنس دونوں میں یقین رکھ سکتا ہے۔ مذہب کی جدید دانش مندانہ تشریح کی جائے گی اس سے اس بات کا ثبوت ملے گا کہ مذہبی آدمی اور مارکسی ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔"

سوویٹ یونین خود بھی ایسے ممالک میں جہاں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے اسی قسم کا پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے سرکاری خرچ پر ایک جریدہ "سوویٹ مشرق کے

مسلمان" نکالا جا رہا ہے۔ اس میگزین میں سوویٹ مسلمانوں کی آزادی کا ذکر بھی ہوتا ہے اور یہ بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ سوویٹ یونین میں اسلام پھل پھول رہا ہے۔ لیکن اندرونِ ملک سوویٹ یونین کا رویہ مختلف ہے۔ سوویٹ دانشوران کے نزدیک وہ تمام کوششیں جن کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مذہبی عقیدہ اور سائنس ہم آہنگ ہیں۔ اور ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں، مذہبی آئڈیالوجی میں کرائسس کا نتیجہ ہیں۔"

ایک اور سوویٹ نظریاتی جریدے "سائنس اور مذہب" نے "اسلام کا رجعت پسندانہ کردار" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب کا موجودہ کردار بھی اور اس کی گزشتہ تاریخ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام کے اخلاقی تصورات اور کمیونسٹ ضابطۂ اخلاق پر مبنی حقیقی انسان دوستی اور اخوت میں کوئی مماثلت نہیں۔ اس پرچے کے اسی شمارے میں ایک نئی سوویٹ فلم "اسلام کی حقیقی شکل" کا ذکر ہے جس کا موضوع اسلام کے سائنس دشمن کردار اور اس کی سماجی اور اخلاقی تعلیمات کی ضرر رسانیوں کو نمایاں کرنا ہے۔ ایک روسی ایس، ایم، گنترلو نے "اسلامی آئڈیالوجی کو شکست دی جائے" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کمیونزم کے اصول اسلامی تعلیمات کی نفی کرتے ہیں اور قرآن کے ادعائی نظریات کے خلاف ہیں۔"

سوویٹ یونین کو صرف اسلامی شریعت سے ہی کد نہیں وہ صوفی مت کے بھی خلاف ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ترکمانیہ کے سرکاری کتاب گھر نے ایک کتاب "ترکمانیہ میں صوفی ازم" کے نام سے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں انقلاب سے پہلے کے روس میں صوفی ازم کے رجعت پسندانہ تاثرات کا ذکر ہی نہیں بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے باقیات کو ختم کرنے کے لیے کس طرح جنگ کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر محمد حسن کے مضمون کے مندرجہ بالا اقتباس میں دو باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ ایک یہ کہ کمیونزم کے بانیوں اور اہم مفکرین نے اگر مذہب کے بارے عموماً اور اسلام کے بارے میں خصوصاً بعض خیالات کا اظہار کیا ہے تو ان افکار کی حیثیت کمیونزم کی بنیادی نوعیت میں فرق پیدا نہیں کرتی، اور دوسری یہ کہ "کمیونزم میں تبدیلی ممکن ہے اور نظام میں افراط و تفریط بھی ہو سکتی ہے اس پر تنقید بھی کی جا سکتی ہے اور اس کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی جا سکتی ہے۔"

ڈاکٹر محمد حسن کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے لیکن جو لوگ خلوصِ دل سے اس قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ تازہ ترین مثال تراکی کی ہے۔

سوویٹ وسط ایشیا سے جو مولوی نما لوگ آتے ہیں وہ مسلمانوں کے نمائندے نہیں بلکہ سوویٹ حکومت کے کارندے ہوتے ہیں۔ یہ خیر و شر سے اتنے بے نیاز ہیں کہ سوویٹ حکومت سرکاری جریدوں میں اسلام کے خلاف جو چاہے لکھتی ہے یہ کبھی احتجاج نہیں کرتے اور بیرونِ روس یہ حکومت کی رواداری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ لیکن ان سرکاری مولویوں کے علاوہ بھی سوویٹ یونین میں مسلمانوں کے ترجمان موجود ہیں یہ زیادہ تر تحت الارض کام کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فی الوقت وہ اتنے مؤثر نہیں کہ سوویٹ حکومت کے لیے کوئی خطرہ پیدا کر سکیں لیکن ان کے اثر و رسوخ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ بیرونِ روس سوویٹ حکومتِ اسلام کے تئیں رواداری کا جو ڈھونگ رچتی ہے وہ ان لوگوں سے خوف کا نتیجہ ہے۔

○○

خود کلامی

(نثری نظم)
(اڑیہ)

رما کانت رتھ

ترجمہ: شیخ مبین اللہ

(۱)

ایک مدت سے دیکھا نہیں ہے اُسے
آج کل کیسے لگ رہا ہوگا وہ؟
کاش گزرتا وہ ایک بار اس راستے سے
میں دور سے فرطِ مسرت سے جھوم کر دیکھتی
میرے بدن کی جھرّیوں کے تلے پھر
گوشت بھر آتا ہے، خون بھر آتا ہے اور
پیڑ پودوں سے شاداب صحراؤں کے اندر
میرے وحشی دل کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
اور آزاد جسم میں ہیجان، بھوک، ہمت بے جا
نیز خود نمائی کا جذبہ پختہ ہو جاتا ہے
پیچھے کی جانب کھینچتی ہوئی
لوٹ آتی ہے پھر خطرناک عمر
دیکھ کر اپنی بے پناہ آرزوؤں کو میں حیرت زدہ ہوں۔
کیا واقعی ان آرزوؤں نے برپا کیا ہے انقلاب
میں نے تو کافی سزا دی تھی اپنے جسم کو
لوگوں کی نظروں سے پرے پھینک دیا تھا اسے
ناپاک خیالوں کو پھینکا تھا بہت دور
لیکن میرا [illegible] ہے

پرندوں کی گونج اور چہچہاہٹ سے
بیچارے چاند کو دیکھ کر دل مایوسیوں سے لبریز ہے
آج ہار کر بھی کس قدر خوش ہوں میں
بے رنگ شام اور خشک شب کا وجود نہیں رہا ہے
کوئی میرے دروازہ پہ دستک دے رہا ہے
کون ہے وہ ؟ آسیب ہی کیوں نہ ہو!
پھر اس کے بعد ؟ دوزخ ؟ آگ میں جلنا ؟
مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرے رگ و ریشہ میں اس قدر شور و غل ہے
کہ ماحول کے بارے میں میرا کچھ جاننا ناممکن ہے
میری بھاگتی ہوئی ہستی کو بھینچ کر آرام دیتی ہے نیم اجنبی ایک پرچھائیں۔

(۲)

میں نے خود سے پوچھا، مجھے کس سے پیار ہے ؟
کوشش کی کہ اس کے وجود کو یاد کروں
کوشش کی کہ اس کا سینہ، اس کا منہ، ہاتھ اور گھنے گیسوؤں کو یاد کروں۔
لیکن مجھے ملے صرف چند الفاظ اور نام چند اعضا کے
میں دل ہی دل میں خوب ہنسی
اپنی ہوس کے سوا کسی ہیولیٰ کا کوئی وجود نہیں ملا۔
اپنی ہوس کے جادو بھرے مندر میں، تمام خواب سچ ہوتے ہیں۔
جب جوانی کا خواب دیکھتی ہوں
تو مری جھریاں کھینچ کر تن جاتی ہیں
جب اسے دیکھتی ہوں تو وہ اچانک نمودار ہوتا ہے مرے سامنے
اسی روپ میں، جس روپ میں اسے دیکھنے کی متمنی ہوں
لیکن خواب سچ ہوتے ہی میں گم صم ہو جاتی ہوں۔
ان خوابوں کی عظیم سچائی مجھے گونگا بنا دیتی ہے۔
میں اپنی ذات کی تخلیق کا ریناہ گزیں ہوتی ہوں۔
جہاں موت اور زندگی دونوں ایک ہو جاتی ہیں۔
اور ایک ماضی نا مستقبل معرض وجود میں آتا ہے۔

(۳)

اپنے آپ سے ڈرنا شاید ایسا ہے جیسے

اپنے آکاش پر بادل کا گھن گرج اور بجلیوں کے کوندے
گھٹا ٹوپ تاریکی چاروں طرف اور مہیب ریت کا طوفان
چاند نہیں، تارے نہیں، تمام راستے مسدود ہیں
بغل میں جس شخص کی سانس چل رہی ہے وہ چاہے محض
خیالی پیکر کیوں نہ ہو۔
لیکن وہی میرا سہارا اور میرے جسم اور دل کا مالک ہے
میں اسے سونپتی ہوں سب کچھ : اپنے جسم کا بے پناہ سیلاب۔
نیز تمام ممکنات، تمام آنسو، تمام خاموشیاں، تمام سرگوشیاں
اس کے عوض میں مجھے کچھ نہیں چاہیے
یہاں تک کہ اس کا محض وجود مجھے بے حد نشاط عطا کرتا ہے
بجلی کی روشنی سے منور دور کسی پہاڑ کی سرحد کی طرح
میرے سڈول پستان اور زانو
اس کے لیے بے کل آکاش اور جنوب سے آئی ہوئی
بادِ صبا کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عرش ملسیانی

اُردو کے مشہور شاعر اور راقم الحروف کے قریبی دوست جناب بالمکند عرش ملسیانی کا ۲۵ ستمبر کو انتقال ہو گیا۔ عرش صاحب مشہور شاعر اور شاعر گر جناب جوش ملسیانی کے صاحبزادے تھے اور خود بھی نامور شاعر تھے۔ تقسیم کے بعد ماہنامہ "آجکل" کے پہلے نائب مدیر اور مدیر اعلیٰ رہے۔ ۱۹۶۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے اپنا پورا وقت تصنیفی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غالب اور مولانا آزاد پر بھی انھوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ سرمد کی رباعیات کا ترجمان کا اہم تالیف ہے اور غالب پر دو کتابیں انھوں نے اُردو میں لکھی ہیں۔

راقم سے ان کے مراسم ۱۹۳۳ء سے ہیں۔ مرحوم مرنجاں مرنج تھے اور وضعدار بھی۔ اُردو کے شاعروں میں جو لاابالی پن بالعموم ہوتا ہے وہ ان میں نہیں تھا لیکن ان کی طبیعت میں شگفتگی بلا کی تھی۔ وہ اُردو کے غالباً واحد شاعر تھے جن کا دشمن کوئی نہیں تھا سب دوست ہی دوست تھے۔ وہ ہم میں نہیں رہے لیکن اُن کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی۔

——— گوپال متل

دوسری موذیل

(پہلی موذیل کے نام)

انیس اشفاق

وہ بالکل منٹو کی موذیل جیسی تھی۔ جب بھی راجو اسے دیکھتا، موذیل یاد آجاتی۔ وہی تیزی، طرّاری، بانکپن اور سیمابیت۔ اس محلے میں وہ کہاں سے آئی تھی یہ کسی کو نہیں معلوم۔ لوگ بس اتنا جانتے تھے کہ وہ کسی دفتر میں اسٹینو ہے اور گزشتہ تین برس سے اس محلے کے ایک کمرے میں تنہا رہ رہی ہے۔ بلا تفریقِ جنس وہ محلے کے ہر شخص سے ایسی گھلی ملی رہتی کہ ہر ایک اسے دوسرے کے مقابلے میں خود سے زیادہ قریب سمجھتا۔ کوئی بات پڑتی تو جھپاتی ٹھونک کر مردوں کے درمیان کھڑی ہوجاتی اور یہ بھول جاتی کہ وہ کسی دفتر میں اسٹینو ہے۔ اکثر اس نے محلے کے بہت سے اہم قضیے منٹوں میں چکا دیے۔ محلے کے دادا اور بانکے اس کا ابھرا ابھرا جسم گھورتے ہی رہ جاتے اور وہ مستانہ وار چلتی ہوئی ان کے بیچ سے گزر جاتی۔ اس کا صحیح نام تو کسی کو معلوم نہ تھا لیکن لوگ اسے رانی کہتے۔ گلی سے آتے جاتے راجو اسے دیکھتا اور کبھی کبھار بات چیت بھی کرلیتا۔ رانی اس سے بڑے لگاؤ سے ملتی۔ رفتہ رفتہ راجو کا اس کے دروازے پر ٹھہرنا اور کوئی نہ کوئی بات کرنا روز کا معمول بن گیا۔ ایک دن بات چیت کے دوران راجو نے اس سے اس کا نام پوچھ ہی لیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"رانی"

"نہیں اصل نام"

"راحلہ" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اور راجو ہنس پڑا۔

"کیوں؟ ہنسے کیوں؟" وہ غرّائی۔

"اس لفظ کے معنی جانتی ہو؟"

"ہاں جانتی ہوں۔ سواری کا جانور" اور راجو کو پھر ہنسی آگئی۔

"مگر مجھے تم بالکل موذیل جیسی لگتی ہو۔"

"یہ تم موذیل موذیل کیا بکا کرتے ہو"

"موذیل ——— منٹو کی موذیل۔ ایک یادگار اور لافانی کردار۔"

"میں تمھیں افسانہ پڑھ کر سناؤں گا" منٹو اور موذیل کی شان میں راجو نہ جانے کیا کیا کہتا رہا اور راحلہ اس کی باتوں سے بے نیاز دفتر جانے کی تیاری کرتی رہی۔ راجو کو اس کی بے توجہی اچھی نہیں لگی۔

شام کو راجو موذیل سمیت اس کے کمرے میں موجود تھا

"پھر دماغ چاٹنے آگئے"

"نہیں ——— موذیل سنانے"

"راجو ڈارلنگ میں اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں۔ دفتر میں آج بہت کام تھا۔ پلیز کسی اور وقت"

"تم آرام سے لیٹو۔ بس تھوڑی سی یکسوئی کی ضرورت ہے۔"

"اچھا بابا ——— سناؤ"

اور راجو نے کہانی پڑھنا شروع کردی۔ کمرے میں مکمل

خاموشی تھی۔ موذیل کی باتوں، بیباکیوں اور جگہ جگہ ترلوچن سے اس کی چھیڑ چھاڑ کا ذکر کرتا ہوا نصف سے زائد کہانی ختم کرنے پر بھی راجو پورے زور اور دلچسپی سے کہانی پڑھ رہا تھا۔

" . . . ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں کچھ نے کاٹا تھا، انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟

" ابھی کچھ پتہ نہیں۔" یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہوگیا۔ کہانی کے اس حصے پر راجو نے ایک لمحے کے لیے رُک کر راحلہ کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ جماہیاں لے رہی تھی۔ راجو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ غصّے سے وہ زبان کاٹنے لگا۔ اس نے دل میں سوچا کہ سواری کا جانور سواری ہی کے لیے ہے صرف سواری کے لیے۔ اس نے کہانی جیب میں رکھی اور کمرے سے باہر آگیا۔ دروازہ بند ہونے پر اسے اپنی توہین محسوس ہوئی۔

راجو کا گھر اس محلے کے دوسرے کنارے پر تھا۔ فاصلہ طے کرتے وقت اس نے سوچا کہ ممکن ہو راحلہ اس کہانی کو دوبارہ سننے کے لیے کہے۔ لیکن بہت سے دن گزر جانے پر بھی جب راحلہ نے کہانی کو دوبارہ سننے کے لیے نہیں کہا تو راجو نے طے کر لیا کہ اب کی یہ کہانی وہ راحلہ کو ایک لازوال تجزیے کے ساتھ سنائے گا اور یوں وہ اسے موذیل کا قاتل کر کے ہی چھوڑے گا۔

لوگوں میں کھلے ملے رہنے کے باوجود راحلہ کی شخصیت اس محلے میں بہت پُراسرار تھی۔ ہر دوسرے تیسرے کچھ اجنبی اس کے کمرے پر آئے اور رات گئے تک بیٹھے رہتے وہ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہتی۔ چھٹیوں میں وہ دن دن بھر غائب رہتی اور راجو گلی کے چکر ہی لگاتا رہ جاتا۔ نوکری، جوانی اور تنہائی نے محلے والوں کو بہت سی چہ میگوئیوں کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ لیکن بر ملا کوئی کچھ نہ کہتا سب اس کے غصّے سے ڈرتے تھے۔ یہ سعادت صرف راجو کو حاصل تھی کہ وہ اس پر جب تب فقرے کستا اور جواب میں گالیاں سنتا رہتا۔ اس وقت بھی وہ کچھ ایسے ہی موڈ میں تھا۔

" ارے او موذیل . . . "

" دیکھو تم مجھے 'موذیل' مت کہا کرو۔ یہ نام مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ عجیب لجلجا نام ہے۔"

" پھر . . . ؟"

" رانی یا راحلہ۔"

" نہیں۔ برتری مجھے اچھی نہیں لگتی اور یہ "سواری کا جانور" اس پر بھی بس ہنسنے کو جی چاہتا ہے اور . . . ہاں محلے والے کہتے ہیں کہ تمہارے دفتر میں بہت سے افسر بہت اچھی شہسواری کرتے ہیں۔"

" ہاں بہت سے اپنے گھٹنے تڑوا چکے ہیں۔" وہ مسکرائی

" مگر میں نے ہمیشہ ہوا سے باتیں کی ہیں۔ دراصل شہسواری کا فن گھوڑے سے نہیں سوار سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے تو ٹٹوؤں کو بھی صبا رفتار کر دیا ہے۔" راجو اسے بے وجہ غصہ دلانا چاہتا تھا۔

" محلے والے اور کیا کہتے ہیں۔ ؟"

" اور ——— اور یہ کہ دفتر کے بہت سے کلرک بھی راسیں کستے دیکھے گئے ہیں۔"

" ہاں۔ اس کوشش میں بہت سے منہ کے بل گر چکے ہیں۔" وہ پھر ہنسی۔

" لیکن میں . . . "

" ہاں تم بہت بہادر ہو اور شہسواری کے بہت سے مظاہرے کر چکے ہو۔ لیکن یہ کمرہ کوئی رائڈنگ کلب نہیں سمجھے ——— باقی محلے والوں کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی ہمت مجھ میں بہت ہے۔"

" بس اسی لیے تو میں تمہیں موذ . . . "

" دفع ہو جاؤ یہاں سے . . . "

" لیکن منٹو . . . "

" بھاڑ میں جائے۔ اس کمرے میں تم صرف چائے پی سکتے ہو اور اس کے ساتھ کچھ بسکٹ . . . کبھی کبھی کے دن میں تمہاری فرمائش پر کوئی اچھی سی ڈش بھی بنا سکتی ہوں اور تمہارے ساتھ کوئی اچھی سی فلم بھی دیکھ سکتی ہوں۔"

مجھے ملی ڈیر راجو ڈارلنگ ۔"

راحلہ نے اس کے دونوں گالوں کو پیار سے تھپ تھپائے اور اس کی ناک سے ناک رگڑتے ہوئے اسے کمرے سے باہر کر دیا۔

گھر پہنچتے پہنچتے راجو کے بدن میں بجلی سی دوڑنے لگی اور وہ راحلہ کی تنہائی اور جوانی کو معنی پہناتا ہوا بستر پر دراز ہو گیا۔

دوسری صبح جب راجو بیدار ہوا تو دہشت اور سراسیمگی کے ماحول میں اس نے لوگوں سے سنا کہ چوک کی بازار میں دو دھیوں کے ایک معمولی سی جھگڑے نے شہر گیر فساد کی صورت اختیار کر لی ہے اور حالات بہت سنگین ہیں۔ راجو پر اس خبر کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اس شہر میں ایسے فساد پہلے بھی ہو چکے تھے اور وہ ان کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ گھر سے باہر نکلا تو لوگ اسلحہ سے لیس ٹولیوں کی شکل میں منظم ہو رہے تھے۔ سب پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہوا وہ راحلہ کے کمرے تک پہنچ گیا۔ حسب معمول وہ اپنے کاموں میں مصروف تھی۔

"کچھ سنا تم نے ——؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی راجو نے پوچھا۔

"ہاں —— فساد ہو گیا ہے اور سارے شہر میں کرفیو لگا ہے اور خوف سے راجو ڈارلنگ کی حالت پتلی ہے۔"
راحلہ نے مطمئن اور متبسم لہجے میں جواب دیا۔

"میری حالت تو پتلی نہیں لیکن ——"

"لیکن کیا —— جی چاہے تو یہاں بیٹھو۔ چائے پیو، گپ کرو اور جی چاہے تو باہر لوگوں میں جا کر شریک ہو جاؤ۔"

"تم گدھی ہو۔"

"اور تم الو۔ ارے ہاں تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"راجو۔"

"نہیں اصل نام۔"

"راجو —— اصلی اور نقلی دونوں۔"

"میں نے سنا ہے کہ تم پیدائشی ہندو ہو اور یہاں کے [illegible]ن میں گھل مل کر انہیں کے جیسے ہو گئے ہو؟"

"تم نے صحیح سنا ہے۔ ویسے تو میں نہ ان کے جیسا ہوں [illegible] پتا جیسا۔ لیکن تمہاری جیسی ایک لڑکی کے چکر میں اپنے بچپن سے ہی مجھے ان کا جیسا ہونا پڑا۔ اور یوں میرے گھر والے میرے خون کے پیاسے ہیں اور یہ محلے والے ان کے شدید دشمن . . ."

"تمہارے گھر والے . . .؟"

"ہاں —— اس محلے کی سرحد سے ذرا آگے سڑک کے کنارے ایک پکی عمارت ہے۔ اسی میں میرے والدین ہیں۔ کچھ عزیز، ایک معذور بہن اور اس کا شوہر۔ لیکن بہن میری دشمن نہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو برسوں سے نہیں دیکھا۔ میں اس عمارت کی طرف سے کبھی نہیں گزرا۔"

"ہوں —— تو راجو ڈارلنگ یہ کرفیو تو ہمیں مار ڈالے گا۔ مجھے گھر میں قید رہنا بالکل پسند نہیں . . ." راحلہ نے بات کا رخ اچانک بدل دیا۔

"کیوں —— ؟ افسروں سے وعدے ہیں کیا؟"
راجو ایک بار پھر غصے سے کانپ گیا۔

"ہیں بھی تو فضول۔ یہ کرفیو تو کہیں جانے ہی نہیں دے گا۔"

"تو جہنم میں جاؤ۔" راجو کا غصہ اور تیز ہو گیا۔

"تم اتنی جلدی ابنارمل کیوں ہو جاتے ہو ڈارلنگ؟"
راحلہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور راجو پھر اسے موڈیل سنانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس نے تو تجزیے کے ساتھ سنانے کا تہیہ کیا ہوا ہے اور تجزیے کا خیال آتے ہی وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"ارے! کہاں . . .؟"

"گھر۔"

"بیٹھو —— ہم لوگ ابھی چائے پئیں گے اور پھر میں تمہارے لیے کٹ لس بناؤں گی۔"

"نہیں مجھے جانے دو۔"

"نہیں —— میں تمہیں کٹ لیس کھلائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔" وہ ہنستی ہوئی راجو کی گردن میں بانہیں ڈال کر آگے کی طرف جھکی تو راجو کا ہاتھ [illegible]

ابد ہوگیا۔ عاطلہ چائے بنانے چلی گئی۔

جب وہ چائے لے کر آئی تو راجو نے اس سے کہہ ہی دیا۔

" یہ تم اتنی نچلی تراش کا بلاؤز کیوں پہنتی ہو۔؟"

" تم یہ بتاؤ کہ چائے کیسی ہے اور شکر کم یا زیادہ تو نہیں؟"

راجو کھسیا کر رہ گیا۔ چائے پی کر وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سر پہ موڈیل کا تجزیہ سوار تھا۔

" ارے بیٹھو۔"

" نہیں اب جانے دو۔"

" لیکن کرفیو۔"

" ارے گلیوں میں کیا کرفیو۔ سب آزاد گھوم رہے ہیں۔"

وہ باہر نکلا تو لوگ آگیں لگانے اور جانیں لینے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ چاروں طرف سے نعروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ [illegible] گھٹتے تو پولیس کی سیٹیاں بجنے لگتیں۔ سب کچھ دیکھتا ہوا وہ گھر پہنچا اور موڈیل کا تجزیہ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

دو دن بعد وہ تجزیہ مکمل کر کے گھر سے نکلا تو راستے سنسان تھے۔ باہر سے لوگوں سے معلوم ہوا کہ صورتِ حال اور بھی سنگین ہو گئی ہے اور اب تک سینکڑوں عمارتیں پھونکی جا چکی ہیں اور بہت سی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ کرفیو بدستور نافذ تھا۔ صرف دن میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے کھلتا۔ ڈرا سہما وہ عاطلہ کے کمرے تک پہونچا تو وہ مقفل تھا۔ وہ چکرا گیا۔ اس کرفیو میں رات کے وقت وہ کہاں جا سکتی ہے۔ موڈیل کا تجزیہ اس کے ہاتھوں میں تھا اور غصے سے اس کا برا حال تھا۔

" سالی ——— دن ہی میں کسی وقت نکل گئی ہوگی اپنے افسروں کا دل بہلانے۔"

وہ اپنے ہونٹ چباتا اور اس کا انتظار کرتا رہا۔ بہت دیر گزر جانے پر بھی جب وہ نہیں آئی تو وہ واپس اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے لوگوں کا ایک غول سڑک سے گلی میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ٹھٹھکا۔ چہرے جانے پہچانے تھے۔ ہمت کر کے وہ گلی کے نکڑ تک پہنچا تو کچھ اور لوگ بھاگتے ہوئے گلی میں داخل ہوئے۔ راجو نے سڑک پر ایک نظر ڈالی تو سیٹیوں کے شور میں سامنے والی عمارت جل رہی تھی جس میں اس کے والدین، اس کی معذور بہن اور اس کا بہنوئی تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور تبھی کچھ لوگوں نے سرگوشی کی۔

" سالے ——— بچ نکلے۔" اور تب راجو کی جان میں جان آئی۔ وہ گلی میں لوٹا تو دیکھا کہ دوسری طرف سے لوگ کوئی چیز کھینچتے ہوئے لائے اور ایک مکان میں داخل ہو گئے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے لوگوں میں سے ایک پہلوان نما آدمی کا بازو پکڑ لیا۔

" اے پہلوان یہ ماجرا کیا ہے؟"

" کچھ نہیں یار ——— سالی نے سارا پلان خاک میں ملا دیا۔ ہم نے آج شام کو طے کیا تھا کہ اپنی دو جانوں کا بدلہ سڑک والی عمارت کے لوگوں کا قتل کر کے چکائیں گے مگر سالی نے وقت سے پہلے پہنچ کر ان کو سب کچھ بتا دیا اور سالی کی ہمت تو دیکھو کہ ایک لنگڑی عورت جو اس جلتی ہوئی بلڈنگ میں رہ گئی تھی اس سالی کو کاندھوں پہ لاد کر سڑک پار کر کے ہندو محلے میں جا کر چھوڑ آئی۔ وہ تو کہیے کہ ہم نے سالی کو پہچان لیا اور راستے میں صاف کر دیا۔ ورنہ پتہ نہیں سالی کیا گل کھلاتی۔"

پہلوان نما آدمی بھی اس مکان میں داخل ہو گیا جہاں بورے کی سی شکل کی کوئی چیز لے جائی گئی تھی اور اس کے پیچھے راجو بھی۔ پہلوان نے فوراً ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اندر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی کسی چیز کے چاروں طرف لوگ خوفزدہ کھڑے تھے۔

" یہ بہت موذی عورت تھی۔ ہم نے اسے ختم کر دیا۔" ایک آدمی نے راجو کو دیکھتے ہی سفید چادر الٹ دی۔

" م ... و ... ڈ ... ی ... ل!!" چاقوؤں سے چھلنی جسم دیکھ کر راجو کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں اور تجزیے کے اوراق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر عاطلہ کی لاش کے چاروں طرف بکھر گئے۔

OO

جابرانہ حکومت اور کمیونزم

گوپال متّل

یہ بات خاص دلچسپ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں جو جابرانہ حکومت کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں وہ اس سلسلے میں کمیونسٹوں کے ساتھ ہاتھ ملانے پر بھی آمادہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ جرمنی میں نازی ازم اور اٹلی میں فاشزم کے خاتمہ بالخیر کے بعد دُنیا بھر میں صرف کمیونسٹ پارٹیاں ہی ایسی پارٹیاں ہیں جنھیں جابرانہ حکومت اور کلّیت کیشی کا حامی قرار دیا جاسکتا ہے۔

سادہ لوح سیاستین کو فریب دینے کے لیے کمیونسٹ ترقی پسندی کے مدّعی بن جاتے ہیں حالانکہ مسلّمہ معیار کے مطابق وہ بدترین رجعت پسند ہیں۔ تاریخ کی گھڑی کو پیچھے کی طرف گھمانے کی ذمّہ داری کلیتہً انھیں پر عائد ہوتی ہے۔

پروفیسر جے بی بری نے اپنی کتاب "حریتِ فکر کی تاریخ" میں جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی تھی لکھا تھا "استبداد کے خلاف استدلال کی جدوجہد خوش انجام رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کو فیصلہ کن اور پائدار فتح حاصل ہوگئی ہے۔ بیشتر مہذب اور ترقی پسند ملکوں میں بحث کی آزادی کو ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔"

اس دل افروز قول کے بعد جس کی اس وقت کے حالات یقیناً اجازت دیتے تھے، انھوں نے وجدانی طور پر یہ بھی محسوس کرلیا کہ تاریخ ایک بار ا مذہبی ستم ظریفی کا ثبوت دے سکتی اور ایسی صورتِ حال پیدا کرسکتی ہے جو ان کی اُمید پرستی کو باطل کردے۔ پروفیسر بری انسانی ترقی کے کسی طے شدہ نظریے کے پرستار نہیں تھے بلکہ تجسس اور تحقیق کے شیدا لہٰذا یہ بات اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی تھی کہ انسانی ترقی کی رفتار ہمیشہ یقینی اور ہموار نہیں ہوتی اور کئی بار اس میں شدید رکاوٹیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔

بہرحال ان کے اقوال کی حقیقی اہمیت یہ نہیں کہ انھوں نے رکاوٹوں کے اس امکان کا قیاس کرلیا بلکہ یہ کہ انھوں نے تقریباً پیغمبرانہ انداز میں یہ بھی بتادیا کہ دلیل اور آزادی کو آئندہ خطرہ کس سمت سے پیش آسکتا ہے۔ آئندہ جبر کی اس سمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

"یہ بات ناقابلِ قیاس ہرگز نہیں کہ جن ملکوں میں اب اظہارِ خیال کی آزادی ہے وہاں پھر جبر کا دور شروع ہوجائے۔ اگر سماجی انقلاب کی کوئی تحریک کامیاب ہوگئی اور اس تحریک کی راہ نمائی ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی جن کا (انقلاب فرانس کے لیڈروں کی طرح) مفروضوں پر ایمان ہو اور انھوں نے اپنے عقیدے کو زبردستی ٹھونسنے کا فیصلہ بھی کیا تو جیسا کہ تجربے سے ظاہر ہوتا ہے نظامِ جبر کی بحالی ناگزیر ہوجائے گی۔"

پروفیسر بری کی پیش گوئی جس کتاب میں موجود تھی اس کی اشاعت کے چار سال بعد یہ پیش گوئی پوری ہوگئی اور زیادہ بدنصیبی کی بات یہ ہوئی کہ یہ اس مُلک میں پوری ہوئی جہاں "استبداد کے خلاف دلیل کی جدوجہد" اتنی خوش انجام نہیں تھی کہ اسے "آزادی کی فیصلہ کن اور پائدار فتح" قرار دیا جاسکے۔

سماجی انقلاب کی یہ تحریک جس کی رہنمائی " مفروضوں پر ایمان رکھنے " والے سرشار لوگ کر رہے تھے۔ کسی ایسے ملک میں کامیاب نہ ہوئی تھی جسے انیسویں صدی کی طوفانی بیداری اور اس کی روشنی مابعد کا تجربہ ہوا بلکہ وہ ایک ایسے ملک میں فتح یاب ہوئی جو دورِ وسطیٰ کے جبر سے پوری طرح ابھرا بھی نہیں تھا۔ روس میں سماجی انقلاب کی تحریک کی کامیابی کے فوراً بعد اس کی عنانِ اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو صرف یہی نہیں کہ " فارمولوں پر ایمان رکھنے کی وجہ سے مدہوش تھے" بلکہ جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا وہ خوفناک حد تک نیکی کے منکر بھی تھے۔

دلیل کی اس نئی پسپائی کی آماجگاہ سوویٹ روس میں، جو کچھ ہوا وہ دائرۂ قیاس سے باہر ہے۔ وہاں اصول جبر کو اتنا مکمل کیا گیا اور اس کا استعمال اتنے وسیع پیمانے پر ہوا کہ بعض اوقات لوگ اس کے تصور کی تاب نہ لا کر اسے باور کرنے سے ہی انکار کرنے لگتے ہیں۔ یقین نہ کرنے کا یہ رجحان لاشعوری طور پر اس ڈر کا نتیجہ ہے کہ اس سے کہیں انسانی سرشت کی بنیادی شرافت پر سے ہی ہمارا ایمان نہ اٹھ جائے جو انسانی تاریخ کے خطرناک ادوار میں نوعِ بشر کو قوت عطا کرتا رہا ہے۔ اگر انسانی سرشت واقعی اتنی بد ہے کہ اگر انسان دوسرے انسان کے ساتھ واقعی اس بے رحمی اور شقاوتِ قلبی کا ثبوت دے سکتا ہے تو پھر یہ سوال بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ ان کی نجات کا امکان کیا ہے؟ اگر آدرش وادا اتنی گراوٹ اور ذلت میں تبدیل ہو سکتا ہے تو پھر اس خوش عقیدگی کا کیا بنے گا جسے پر اُونِنگ نے " امورِ عالم کی آخری خوش سلیقگی پر ایمان " کا نام دیا ہے۔ یہ سوال لاشعوری طور پر پیدا ہوتے ہیں اور شعوری سطح پر اس رجحان کو جنم دیتے ہیں کہ حقیقت کے ان تمام پہلوؤں سے انکار کر دیا جائے جو آدمی کے دلکش خوابوں کو برہم کرتے ہوں۔

اگر کسی خواب کو اس طرح زندہ رکھا جا سکتا تو دنیا واقعی جنت بن سکتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ایسا ہوتا نہیں کسی خواب کو بچانا حقیقت سے مکمل طور پر مغلوب ہونے سے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ نہیں کہ آخر الذکر کو نظر انداز ہی کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اسے تسلیم کر کے اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسے شکست دی جائے۔

کمیونسٹوں کی متحدہ محاذ کی پالیسی ڈھکی چھپی نہیں جو کچھ مشرقی یورپ کے ممالک میں ہوا اسے کون نہیں جانتا۔ چیکوسلواکیہ پر حملہ تو ایک ایسی بات تھی جس سے اندھوں کی بھی آنکھیں کھل سکتی تھیں لیکن اقتدار کی کرسی کی کشش ایسی ہے کہ ایسے سیاست دان بھی جو مجموعی طور پر نیک نیت ہوتے ہیں، کمیونسٹوں کے متحدہ محاذ کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ ہماری بات سنیں یا نہ سنیں مگر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انھیں برطانوی کمیونسٹ لیڈر گلی، اے جیکسن کی وہ بات یاد دلا دیں جو اس نے غیر کمیونسٹ پارٹیوں کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے متحدہ محاذ اور بالآخر اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے والی غیر کمیونسٹ پارٹیوں کی بدانجامی کے بارے میں کہی تھیں۔ جیکسن نے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا " ان کی گردن دبوچنے سے پہلے ابتداً میں ان کا ہاتھ پکڑوں گا"۔ جیکسن کا یہ بیان برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے سرکاری جریدے "کمیونسٹ"، پارٹی کے سرکاری جریدے " کمیونسٹ " کی ۲۵ مارچ ۱۹۲۲ء کی اشاعت میں درج ہے۔

اَندیشہ

ڈاکٹر زرینہ ثانی

وہ ماضی کی سنہری دُنیا
جس میں حق اور صداقت کی حفاظت کے لیے
کبھی مصلوب ہوئے،
تختۂ دار کبھی
زہر کا جام کبھی
کبھی کوڑوں کی سزا پائی ہے
تنِ نازک کبھی سنگسار ہوا
کبھی کانٹوں پہ گھسیٹا ہم کو
آبِ شمشیر سے بھی پیاس بجھائی ہم نے
آج ماضی کا تسلسل ٹوٹا
آج ہے ذوقِ شہادت کی کمی،
بلکہ فقدان ہو
آج اقتدار کی خاطر ہم نے
اپنا مسلک بھی بدل ڈالا ہے
رُوحِ انساں کو کچل ڈالا ہے
کوئی بتائے ہمیں
اس کی سزا کیا ہوگی۔

نظمیں

کرشن موھن

ـے، ھوا اور دھواں

ـم پتّے ہے، پھیلی رگیں خواہشیں
ـتیں، کاہشیں
ـں اک بھوت ہے
ـی میگھدوت
ـں ہے اک دھواں
ـں ہے اک دُھواں، اک ہوا
ـں دھوئیں میں یہ پتّے اُڑے جابجا
ـں دُھوئیں میں یہ پہنچے نہ جانے کہاں؟

خندۂ زرتشت

جنم سمے ہر بچّہ روئے
لیکن اک، زرتشت ہنسا تھا
اب تک یہ طے ہو نہیں پایا
اُس کی ہنسی کا کارن کیا تھا
میں کہتا ہوں
وہ تو اپنے اُن رشتہ داروں پہ ہنسا تھا
جو زرتشت کی پیدائش پر شاد ہوئے تھے

سانپ ہے یہ سنسار جسے رسّی سمجھے ہیں ہم سنساری
جنم سمے زرتشت یقیناً
اس رسّی سے لپٹے ہوئے لوگوں کی نادانی پہ ہنسا تھا
(آچاریہ رجنیش سے ماخوذ)

پناہ گاہ کی تلاش

(زکی انور مرحوم کے نام)

بیگ احساس

وہ کریہہ منظر کینوس پر پھر اُبھر رہا تھا۔

گدھوں سے ڈھکا آسمان، خون کی بارش، سُرخ پانی کے دریا، جلتی لاشیں، عبادت گاہوں پر خون کے چھینٹے، مقدس کتابوں کی ادھ جلی جلدیں، بکھرے صفحات، جوان عورتوں کی لاشیں، برہنہ داغدار جسم ——— کتنا خطرناک منظر ہے۔

گذشتہ تیس برسوں سے اس نے یہ منظر بار بار دیکھا تھا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے وہ مسلسل یہی کوشش کرتا رہا کہ اس منظر پر خوبصورت رنگوں کے برش پھیر دے۔ لیکن کچھ عرصہ بھی گزرنے نہیں پاتا کہ وہ سارے رنگ دھل جاتے اور وہی خطرناک منظر کینوس پر اُبھر آتا۔ آرٹسٹ بدلتے جا رہے تھے لیکن ہر آرٹسٹ سفیدی کا برش لیے کینوس تک آتا اور پھر نئے رنگ اور نئے برش کے ساتھ وہی بربریت کی تصویر پینٹ کرنے لگتا۔

اس منظر کو مٹانے کے لیے وہ اپنی لائبریری میں برش اور سفیدی تلاش کرنے لگا۔ یہ اس کی اپنی بسائی ہوئی دنیا تھی۔ ریکوں میں سجے کتابوں کے گھروں میں اس کے کردار تھے۔ کچھ بیچارے دوسری کتابیں بھی تھیں۔

"آج پھر تم اس منظر سے گھبرا کر ہماری دُنیا میں آ گئے"، قریب ہی سرگوشی ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کا اپنا تخلیق کردہ کردار تھا۔

"تم ——— تم کیوں اُبھر آئے ——— کتاب سے باہر ———"

"میں ان سینکڑوں کرداروں کی نمائندگی کرنا چاہتا ہوں"۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تمھارے چہرے سے لگتا ہے جیسے تم آج پھر کوئی کردار تخلیق کرو گے۔

اور ہم نہیں چاہتے کہ ہم میں اضافہ ہو۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ تم میں سچ بولنے کی طاقت نہیں، سچ کی عریانی سے تم آنکھیں بچاتے ہو اور اسے جھوٹ کا لباس پہنا کر ہمیں تخلیق کرتے ہو۔"

"نہیں میں جھوٹ نہیں کہتا۔"

"تمھاری جھوٹ کا زندہ نشان ہم ہیں۔ تمھارے جنم کردہ کردار، "تم بھی جھوٹ نہیں ہو۔ میں جھوٹی کہانیاں نہیں لکھتا۔"

"اچھا۔" کردار نے طنزیہ کہا "تم ہمیں کہاں سے تراشتے ہو۔ میرا مطلب ہے ہمیں جنم دینے کے لیے تخلیقی عناصر کہاں سے یکجا کرتے ہو۔"

"اسی دُنیا سے جہاں میں رہتا ہوں۔ میں انسان کو اس کی شخصیت کا وہ زاویہ دکھاتا ہوں جہاں اس کی نظر نہیں جا سکتی۔ یہی روپ تم ہو۔"

"تو ہم تمھاری دُنیا کے انسانوں کا روپ ہیں۔"

"ہاں۔"

"ہاہا ——— ہاہا ——— ہم جیسا تمھاری دُنیا میں ایک انسان بھی نہیں۔ ہم تمھاری خیالی دُنیا کی نیکیوں

روپ ہیں۔ تم نے ہمیں جھوٹ کی صلیب پر لٹکا رکھا ہے۔ ہم کتنی اذیتوں سے جی رہے ہیں۔ تم نہیں جانتے۔ ایسا جیون کیا جس کی کوئی پہچان نہ ہو۔"

"کیا۔ ؟ میں نے تمھیں پہچان دی ہے۔ میں نے تمھیں زندگی دی ہے یہ دیکھو۔ خطوط کا ڈھیر۔ کتنے لوگ تمھیں جانتے ہیں، تمھاری تعریفیں کرتے ہیں۔ میں نے تمھیں امر بنا دیا ہے۔ میں بے ربط تحریر کے ٹکڑے اور بے معنی لفظوں کے جال تو نہیں بُنتا۔ تمھیں محنت سے پینٹ کرتا ہوں۔"

" ہاں یہی تو مصیبت ہے کہ تم ہمیں مکمّل صورت دیتے ہو۔ ہمیں زندگی دیتے ہو، ادھورا نہیں چھوڑتے۔ اور ہم جیون کے زہر کا قطرہ قطرہ پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان بے ربطے لفظوں سے یہ تو ہوتا ہے کہ ہم جنم نہیں لے سکتے۔ شکلیں بنتی بھی ہیں تو ایسی جیسے ناجائز بچّہ تکمیل سے پہلے ہی کوکھ سے باہر پھینک دیا گیا ہو۔"

" تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ میں نے نہ صرف تمھیں مکمّل شکل دی بلکہ کتابوں کے محفوظ گھر بھی دیے۔"

" لیکن ہمیں تم نے بدی کے خلاف لڑنے والے بے جان ہتھیار بنا دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم جیسے کمزور کردار اس منظر کو نہیں بدل سکتے تم ہمیں تخلیق کیوں کرتے ہو؟"

" میں نے ہمیشہ قلم کے ذریعے جنگ کی ہے۔ تم نہیں جانتے ہم میں کتنی طاقت ہے۔ ہم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

" کہیں بھی نہیں۔" انسان وہیں ہے جہاں سے نکلا تھا، جہالت اور طاقت جیسی منفی قوتوں کی متوازی حکمرانی آج بھی ہے۔ تب بھی تھی۔ تمھارے قلم نے ہم جیسے مجہول کرداروں کی دُنیا بسائی ہے۔ اور تم جیسے انسانوں کو مصلحت پسند بنا دیا ہے۔ تم وحشیوں کے ہاتھوں سے تلوار نہیں کھینچ سکتے، ان سانپوں کو نہیں کچلتے۔ ایک طرف ان سانپوں کو دودھ پلا کر پالتے ہو۔ دوسری طرف سانپوں کے خوف سے چیخنے والوں کو تسلیاں دیتے ہو کہ یہ سانپ بے ضرر ہیں۔ ان کے مُنہ میں دانت نہیں۔ پھر جب سانپ ڈس لیتے ہیں تو لکیریں پیٹی جاتی ہیں۔ تمھارا علم انھیں لفظوں کا جھوٹا مرہم دیتا ہے۔ نفرت کا ڈھونگ کیا جاتا ہے۔ کیا تم سب مر گئے ہو؟"

" نہیں ہم زندہ ہیں۔"

پھر عمل کہاں ہے ؟ عمل کے بغیر علم کی کیا حیثیت ہے ؟ کردار نے قہقہہ لگایا۔ اور کتاب میں چھپ گیا۔

عمل ——— !!"

اور پھر یہ ہوا کہ شہر میں چھپی ہوئی بارود کے سرنگوں کو آگ لگ گئی۔ شہر جلنے لگا، گدھیں لاشوں پر جھپٹنے لگیں۔ ننگے جوان جسموں کو داغدار کیا جانے لگا۔ گھروں کی چھتوں سے شعلے اُٹھنے لگے۔ وردی اور معمولی لباس کے فرق مٹ گئے۔ وہ منظر کینوس پر پوری آب و تاب کے ساتھ اُبھر آیا جو برسوں سے مسلسل پینٹ ہوتا رہا ہے۔

اُس کی بیوی نے کہا آؤ ہم بھی چوہوں کی طرح محفوظ بلوں میں چھپ جائیں۔ لیکن وہ پتھر بن گیا۔ اس کی بیوی اور بچوں نے اس پتھر میں خود کو غیر محفوظ محسوس کیا اور چوہوں کی طرح محفوظ بلوں میں پناہ لے لی۔ وہ تنہا اس آگ اور خون کے حصار میں کھڑا اس منظر پر سفیدی کا برش پھیرنے لگا۔ لوگوں نے دیکھا وہ کئی دن کا بھوکا ہاتھ میں برش لیے اسی طرح سفیدی پھیر رہا ہے۔ اس کے اطراف کالے ناگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ کسی نے کہا یہ بھی جلے جاؤ سانپوں کی پیاس بجھنے کے بعد لاٹھی لیے آتا اور لکیر پیٹ کر جلی حرفوں میں نام چھپواتا۔ لیکن اس کے کرداروں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ تم کیسے خدا ہو، جھوٹے، مجبور اور بے بس!!

پھر اس ایوان سے بھی شعلے بلند ہونے لگے جہاں اس نے تاریخ، فلسفہ، مذہب، کلاسیکی و جدید علوم کا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ آگ نے سارے لفظوں کو چاٹ لیا تھا اب وہاں راکھ کا ڈھیر تھا۔ یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ اس میں قیمتی لفظوں کی راکھ کون سی ہے اور عریاں تصویروں کی کون سی! اس کے کردار جلتے گھروں سے باہر آ گئے۔

پیاس کے مارے کرداروں نے اپنے خدا کی تلاش شروع کر دی لیکن اب وہ کینوس کے پاس بھی نہ تھا۔ وہ کوبہ کو تربت

مسخ ہوگیا تھا۔ اس کی چھوٹری ہوئی سفیدی اور بشش سُرخ ہوگئے تھے۔ کالے ناگ بھی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ زمین پر سُرخ کیڑوں کا جال تھا۔

" خدا کہاں ہے؟" بے گھر کرداروں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ " آؤ تلاش کریں"

" ہم کہاں جائیں ——— ہم کہاں جائیں؟"

پیاسے کردار کنویں تک پہنچے۔ ایک کردار نے کنویں میں جھانکا۔

" وہ دیکھو خدا" وہ سب جُھک پڑے۔ ان کے خدا کی مسخ شدہ لاش پانی پر تیر رہی تھی۔

" خدا مر گیا ———"

" ہاں خدا مر گیا ———"

" ہمارا خدا مر گیا ———"

" آؤ چلو شاید قیامت آگئی۔ ہمیں اُٹھایا نہیں گیا۔ ہم شاید بہرے ہوگئے ہیں جو صُور کی آواز نہیں سُنی۔ چلو ہم خود ہی اوپر اُٹھ جائیں۔ اور محاسبہ دیں" کرداروں نے کہا۔

" ٹھہرو" خدا کی لاش سے آواز آئی۔

" تمھارا خدا مر گیا۔ لیکن میں "تم" ہوگیا ہوں۔ اے کردارو!! مجھے اپنے ساتھ لے چلو اور کسی کتاب میں چھپا دو"

" آؤ ہمارے ساتھ۔ ہم خدا کے بغیر ہی جی لیں گے" کرداروں نے یک زبان ہو کر کہا۔

" چلو کسی کتاب میں پناہ ڈھونڈیں۔!!"

اب تک لال ہے یہ مٹی

بال سیتارام مرڈھیکر

اب تک لال ہے مٹی، اب تک
پھولوں سے خوشبو آتی ہے
چڑھ کے تنے پہ اب تک پتے
(آوارہ) بکری کھاتی ہے

آسمان کا رنگ کیسری
اور سامنے ننگا بچہ
ناپتا ہے دونوں کی دوری
اونگھ کے اب تک، اک چوپایہ

اِس جانب بھونچال کے جھٹکے
اور اُدھر جنگی نقارے
چاروں طرف اک شور پرانی
لاشوں پہ تازہ انگارے

پتھر کے اندر بھگوان کو
اپنی فتح کی فکر پڑی ہے
اور انسان کو ناز: "امرتا
میرے دِل میں نقش ہوئی ہے"

ٹیڑھے میڑھے رشتے ناتے
فالِ بیکرا، اوچھے نخرے
اونچا بھرا ہو کر کوئی
پکے گوشت میں جنت سونگھے

وہی ارتھ ہے، مانوتا کو
دیکھ لیا ہے دوبارہ پڑھ کر
دھڑکن پار گگن کے، لیکن
بازگشت مٹی کے گھڑے پہ

یوں مر جانا، زندہ رہ کر
جیسے کوئی آنکھیں جھپکائے
ظلمت میں راڈار کا شعلہ
آگے آگے بڑھتا جائے

دل میں کاتک کے سورج کی
گیہوں جیسی دُھوپ اُتر کر
دیکھ رہی ہے زخم پرانے
خوف سے، ڈھیلی جلد کے اندر

پھر بھی لال ہے مٹی، پھر بھی
پھولوں سے خوشبو آتی ہے
چڑھ کے تنے پہ پھر بھی پتے
(آوارہ) بکری کھاتی ہے

آسمان کا رنگ کیسری
اور سامنے ننگا بچہ
ناپتا ہے دونوں کی دُوری
اُونگھ کے پھر بھی اک چوپایہ

(ترجمہ: بدیع الزّماں خاور)

مسیحا کی تلاش

ادیب اختر

اندھیرے میں وہ آگے بڑھ رہا تھا، اُس کے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے میں ایک کتاب تھی جو اُس نے اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔ روشنی کے باوجود اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، راستہ بے حد دشوار تھا، سنبھل کر چلنے کے باوجود بھی کئی بار وہ گر پڑا تھا اور اُس کا سارا جسم زخمی ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہوا زور سے چلتی تو اُسے اس خیال سے کپکپی لگتی کہ، مشعل کے بجھ جانے سے وہ آگے بڑھ سکے گا نہ ہی مسیحا کو ڈھونڈ سکے گا۔

سفید کپڑوں میں جانے وہ کون تھے، ایک رات اُس کے خواب میں آئے تھے، انھوں نے اُس کے حوالے اس کتاب کو کرتے ہوئے اسے مسیحا تک پہونچانے کو کہا تھا۔ اُس کو مشعل دے کر جاتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ مسیحا کی جستجو جان لیوا ہوگی، جب تم اس کام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آگے بڑھوگے تو تمھارے آگے روشنی نہیں ہوگی۔

عرصہ ہو گیا، لیکن مسیحا کو ڈھونڈنے میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

اندھیرے میں آگے بڑھتے بڑھتے چند لمحوں کے لیے وہ رُک گیا، دُور سے چیخ و پکار کی آوازیں سُنائی دیں، وہ آگے بڑھا، کئی آدمیوں سے اُس کی ٹکر ہوئی، ٹکر کو تو اُس نے محسوس کیا، لیکن کسی کو دیکھ نہیں سکا۔ ایک جگہ وہ رُک گیا، چند لمحے بعد اُس نے محسوس کیا، کوئی اُس کے ہاتھ سے مشعل چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"نہیں... نہیں اسے مت چھینو، یہ میری رہنمائی کے لیے ہے... ارے یہ تو بتاؤ تم کون ہو...؟" جواب
ملا، نہ ہی اُسے کوئی دکھائی دیا، وہ اور آگے بڑھ گیا۔ بچے، بوڑ
عورتیں رو رہے تھے، وہ صرف رونے کی آواز ہی سُن سکتا تھ
"جلاؤ... جلاؤ... ایک بھی باقی نہ رہے" کو
دے رہا تھا، کوئی اور کہہ رہا تھا

"مگر جلانے کے لیے آگ کہاں؟"

"وہ دیکھو کوئی مشعل لیے کھڑا ہے۔"

وہ گھبرا گیا "نہیں... نہیں دوستو یہ اس
کے لیے نہیں ہے۔" وہ لوگ رُکے نہیں آگے بڑھنے
کئی قدموں کی آہٹ سُنائی دی، وہ نہایت تیزی سے
لگا۔ بہت دُور تک اُسے اپنے تعاقب کرتے ہوئے قد
کی آہٹ سُنائی دی، آہٹ دھیمی ہوئی۔ بالکل ختم ہ
تو اُس نے اطمینان کی سانس لی۔

"تم یہاں اُجالے میں مشعل لیے کیا کر رہے ہو؟"

اُجالا...؟ اس کے ذہن پر ایک نئے سوال نے ڈ
مارا، اُجالے کے متعلق سوچنے کے بجائے وہ فوراً پیچھے مُڑ
جاننے کے لیے کہ اُس کا مخاطب کون ہے، لیکن اُسے اندھی
میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔

"ارے تم مُڑ کر کسے دیکھ رہے ہو... میں تمھارے
کھڑا ہوں، تم جلدی آگے جاؤ، وہاں بہت اندھیرا ہے، ا
اندھیرا ہو گیا ہے کہ انسان کو انسان کا پہچاننا مشکل ہو گیا

وہ نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔ راستہ ختم ہو
ہی کہیں زندگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ دوڑنے

وہ نڈھال ہوگیا، اُس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ اگلے چند لمحوں بعد وہ گر پڑا لیکن اُس کے ہاتھ سے تب بھی وہی مشعل نہ چھوٹی۔

بہت وقت سُستانے کے بعد وہ آگے چل پڑا۔ وہ جلد سے جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا، اور اُسے راستے کے متعلق کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ کہیں وہ غلط سمت تو نہیں بڑھ رہا ہے سوچا کہ کسی کو آواز دے کر راستے کے متعلق پوچھے۔

"کوئی ہے . . . ؟ کوئی ہے . . . ؟"

جواب نہیں آیا، البتہ اُسی کی آواز فضا میں گونج اُٹھی، تب اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اطراف دیواریں ہیں۔ یہ تو بڑی ہی افسوسناک بات تھی کہ اُس کی راہ میں دیواریں حائل ہیں اُسے سخت افسوس ہوا۔ معاً زور سے ہوا چلنے لگی اور مشعل کی لَو کانپنے لگی۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہوگئیں۔ "اگر یہ بُجھ گئی تو میں آگے بڑھ نہیں سکوں گا۔"

پھر بھی اُس نے ہمت نہیں ہاری، مشعل کو لیے آگے بڑھ گیا . . . بڑھتا گیا . . . !

(اس کے متعلق نہیں سوچا کہ دیواریں کیا ہوئیں ؟)

"تم اب آئے ہو، دیکھو یہاں کی حالت کس قدر بگڑ چکی ہے . . . میں نے اپنے بھائی . . . سگے بھائی کا خون پی لیا ہے . . . میں اکیلا نہیں سب کے سب خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔"

وہ کانپ اُٹھا اور اُس کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا، یہاں بھی اُسے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا، اپنے آس پاس لوگوں کی گہما گہمی کو محسوس کیا اور اُس کے ساتھ ساتھ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ انسان کی لاشوں پر پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔

"یہ پیاس بجھتی نہیں . . . خون بہت نایاب ہوگیا ہے . . . میں نے اپنی ماں کا بھی خون پی لیا . . . "

اُس نے یہ سرگوشی سُنی اور اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اُس کے ذہن میں یہ خوف سر اُٹھا رہا تھا کہ کوئی اُس کا خون پی لے گا۔ تو وہ مر جائے گا . . . اور اُسے اس کتاب کو مسیحا تک پہنچانے میں کامیابی نہیں ہوگی۔ اسی لمحے اُسے کسی کی آہٹ سُنائی دی، وہ دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے وہ نڈھال ہوگیا اور اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا مشعل اُس کے ہاتھ میں جل رہی تھی، لیکن اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتا رہا یہ جانے بنا کہ راستہ کہاں جاتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے۔

اُس کی آنکھوں کے آگے گہرا ہوتے اندھیرے سے اُس کے دل میں یہ وسوسہ اُٹھ رہا تھا کہ آپ مشعل کی روشنی میں کمی آگئی ہے۔ یا وہ اندھا ہوگیا ہے ؟

"بجھاؤ . . . بجھاؤ . . . ہماری آنکھیں اس مشعل کی روشنی کی تاب لانے کے قابل نہیں۔"

"دوستو تم کیا کہہ رہے ہو . . . مشعل کی روشنی میں کمی آگئی ہے اور مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

"بجھاؤ . . . اسے جلدی بجھاؤ . . . میں اندھا ہوگیا!"

کوئی چیخ اُٹھا۔

"بجھاؤ . . . !" کئی آوازیں گونج اُٹھیں، "اگر تم خود نہیں بجھاؤ گے تو ہم بجھا دیں گے۔"

کئی ہاتھ بیک وقت اُس کے ہاتھ سے مشعل چھین لینے کے لیے اُٹھے، یہاں بھی اُسے ہاتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اُسے ڈر محسوس ہوا، اگر وہ وہاں چند لمحوں کے لیے بھی رُکا تو اُس سے مشعل چھین کر بجھا دی جائے گی۔

وہاں سے بھی وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

راستے میں جگہ جگہ کانٹے بکھرے ہوئے تھے، دھواں اُٹھ رہا تھا اور ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا خاموشی چھائی ہوئی تھی، اس لیے وہ سب کچھ سن سکتا تھا، اگلے لمحے اُسے کئی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے کی آواز سُنائی دی۔ کئی قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔

"تمھارے شہر میں کوئی مسیحا ہے ؟"

"تھا!" کئی آوازیں گونج اُٹھیں۔

"تھا ؟ . . . اب کہاں ہے ؟" اُس نے پوچھا۔

"ہم نے اُسے پھانسی دے دی اور اُسے دفن کر کے ہم جشن خوشی منا رہے ہیں، ہماری خوشی میں تم بھی شامل

ہو جاؤ۔۔۔!

" دوستو تم نے اُس مسیحا کو پھانسی دے کر بہت برا کیا۔۔" آگے وہ کچھ بھی کہہ نہیں سکا۔ کئی ترشول اُس کے سینے میں پیوست ہو گئے وہ گر پڑا۔ اور موت کے قدموں کی آہٹ سُننے لگا۔ یہ تو اچھی بات ہوئی کہ نہ اُس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹی نہ مشعل بجھی۔

" آؤ۔۔ آؤ یہ مر جائے گا " کئی آوازیں سُنائی دیں، قدموں کی آہٹ آگے بڑھ گئی۔

افسوسناک بات یہ تھی کہ، اُس کی صدیوں کی محنت اکارت گئی، منزلِ مقصود پر پہونچنے سے پہلے ہی وہ یونہی مر جائے گا۔ اور اس کتاب کا کیا ہوگا؟

اُس کے ذہن پر سوالوں کی یلغار ہونے لگی۔

اگلے لمحے کسی نے ہاتھ بڑھا کر اس سے مشعل لے لی۔

اور کتاب بھی، اُس کے ہاتھوں میں طاقت بالکل نہیں تھی۔

" بھائی اسے مت بجھاؤ۔۔۔ اس کتاب کو مسیحا کے حوالے کر دو۔۔" پھر وہ کچھ سوچ کر کہا " کیا تم مسیحا ہو؟"

" نہیں۔۔۔ لیکن میں اسے مسیحا تک پہونچا دوں گا۔۔ اسے یہ بتاؤ یہ کتاب ہے یا آگ کا شعلہ میرے ہاتھ جلنے لگے ہیں۔۔۔"

" یہ کتاب ہی ہے اسے شیشے میں مت رکھو۔۔۔"

وہ کتاب سینے سے لگائے ہاتھ میں مشعل لیے آگے بڑھ رہا تھا ——— وہ مر رہا تھا، مگر اُسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ خوش دلی سے موت کا انتظار کر رہا تھا، موت کے سائے اندھیروں میں دکھائی دے رہے تھے۔

○○

غزلیں

عروج زیدی

روح کو زندانِ بے در بن گیا
کیا قیامت میرا پیکر بن گیا

یہ بھی ہے تدبیرِ حسنِ اتفاق
آپ کا ملنا مقدر بن گیا

جوہرِ ذاتی صدف اندر تھا
قطرۂ نیساں سے گوہر بن گیا

ہر عمل پہ احتساب و جائزہ
آدمی تصویرِ محشر بن گیا

یادِ ماضی کی کرشمہ کاریاں
زخمِ دل ہر ایک منظر بن گیا

دل کی اک گردش میں آیا انقلاب
جامِ صہبا جامِ کوثر بن گیا

ہر نفس ہے رات دن گرمِ سفر
یہ سفر میرا مقدر بن گیا

اس طرح اب ملتے ہیں لوگ
جیسے ہر انساں بے گھر بن گیا

ہائے [illegible]
میں [illegible] بن گیا

[illegible] عروج
آدمی کیا [illegible] بن گیا

کرشن مراری

آس پھر ٹوٹ گئی ہو جیسے
زندگی خود سے دکھی ہو جیسے

فکر سے سوچ جڑی ہو جیسے
وہ نظر یوں اٹھی ہو جیسے

کاٹے کٹ نہ سکی ہو جیسے
ذات کی رات پڑی ہو جیسے

نہ تمنا ہے نہ حسرت کوئی
زندگی روٹھ گئی ہو جیسے

گفتگو سرد ہوئی جاتی ہے
برف ہونٹوں پہ جمی ہو جیسے

عمر یوں کٹ تو رہی ہے لیکن
صرف اک تیری کمی ہو جیسے

پھر وفا لوٹ کے آئی نہ کبھی
راستہ بھول گئی ہو جیسے

دور ہی نور ہے پھیلا ہر سو
دفعتاً صبح ہوئی ہو جیسے

آرزو روپ بدلتی ہی رہی
زندگی تشنہ لبی ہو جیسے

غزلیں

سحر سعیدی

جب اس کے راستے سے گزرنا پڑا مجھے
مجبور ہو کے دل سے ٹھہرنا پڑا مجھے

مجھ میں کہاں کا وصف تھا، حالات دیکھ کر
سمجھوتہ خود ہی وقت سے کرنا پڑا مجھے

جب دل کو خواہشات نے محصور کر لیا
ہر لمحہ اپنے آپ سے ڈرنا پڑا مجھے

مجھ کو خبر نہیں کہ صداؤں کی کھوج میں
کس بحرِ بے صدا سے گزرنا پڑا مجھے

بڑھتے گئے جو حد سے مری خواہشوں کے پر
مقراض صبر لے کے کترنا پڑا مجھے

تنہائیوں کا ذائقہ چکھنے کے واسطے
گہرائیوں میں دل کی اترنا پڑا مجھے

حالانکہ میرے حوصلے سارے چٹان تھے
ڈرنے کی بات آئی تو ڈرنا پڑا مجھے

کچھ دل ہی جانتا ہے رہِ عشق میں سحر
کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا مجھے

شہپر رسول

کوئی عذاب نہ ہو جائے جان میں پیدا
عداوتیں نہ کرو درمیان میں پیدا

ہمارے تیر ہمیں کو ہلاک کرتے ہیں
بلا کا نقص ہوا ہے کمان میں پیدا

کس کا نام کہانی میں ہو گیا شامل
مٹھاس ہو گئی کتنی بیان میں پیدا

ہر ایک سمت ہیں گرتی ہوئی صدائیں کیا
کھنڈر کی شکل ہوئی ہے مکان میں پیدا

دھوئیں کی آگ میں [illegible]
یقین ہو گیا کیسے گمان [illegible] پیدا

تلاش نئے افق کی

ناوک حمزہ پوری

پورے ماحول کو سناٹے کے مہیب دیو نے جیسے نگل لیا تھا۔ محبوب صاحب کی بیٹھک یوں تو عزیز و اقارب، دوست و احباب سے بھری ہوئی تھی لیکن جو جہاں تھا وہیں بت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ جب تب کسی کی گہری سانس یا پھر خود محبوب صاحب کی "اف" یا "آہ" بیٹھک میں زندگی کے وجود کا احساس کرا دیتی تھی۔ اور پھر خاموشی کا راج مسلط ہو جاتا تھا۔

مسئلہ ہی کچھ ایسا پیچیدہ تھا کہ اس پر ہر کس و ناکس کو رائے زنی کا یارا نہ تھا۔ ویسے جہاں تک ایسی صلاح و مشورے کا تعلق ہے لوگ پہلے ہی کافی ماتھا پچی کر چکے تھے۔ لیکن معاملہ چونکہ خالص مذہبی نوعیت کا تھا اس لیے ہما و شما کی رائے کی کیا قیمت؟ اس معاملے میں بات تو کسی مفتیٔ دین ہی کی قابل قبول ہوگی۔ فیصلہ تو کسی قاضی شریعت ہی کا روبہ عمل لایا جا سکے گا۔

حسنِ اتفاق سے مقامی جامع مسجد کے پیش امام امارت شرعیہ کی طرف سے اس علاقے کے لیے قاضیٔ شریعت مقرر تھے۔ استغاثے کی درخواست اُن کی خدمت میں پیش کی جا چکی تھی۔ اپنے طور پر معاملے کی ضروری تحقیق وہ کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں اپنا فیصلہ صادر کرنے سے پہلے وہ مستغیث کا بیان بہ نفسِ نفیس سُن لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ قاضی صاحب کو لانے کے لیے سواری بھیجی جا چکی تھی۔ حاضرین انھیں کی آمد کے منتظر تھے۔

محبوب صاحب بظاہر پُرسکون معلوم ہوتے تھے لیکن یہ سکون اُس خوابیدہ آتش فشاں جیسا تھا جو اوپر سے تو شانت دکھائی دیتا ہے لیکن اندر ہی اندر لاوے کا طوفان سطح زمین توڑ کر باہر نکل پڑنے کو جوش مارتا ہوتا ہے۔ چنانچہ محبوب صاحب کا دماغ بھی سوچ کی صلیب پر لٹکا ہوا کتاب ماضی کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ واقعات کی تصویر ایک کے بعد ایک ذہن کے پردے پر اُجاگر ہوتی جا رہی تھی اور وہ شاید اسی میں غرق تھے۔ پندرہ برس پہلے کے واقعات کی تصویریں جو بظاہر دھندلی پڑ گئی جان پڑتی تھیں اس وقت بڑے واضح، تیکھے نقوش کے ساتھ سامنے گردش کر رہی تھیں۔

ہوا یوں کہ محبوب صاحب سخت بیمار پڑ گئے۔ ابتداءً دوا دارو سے کوئی افاقہ نظر نہ آیا۔ انگریزی دواؤں نے فائدہ نہ کیا تو حکیم صاحب کے نسخے پر بھروسا کیا گیا۔ نسخے ناکام رہے تو وید کی جڑی بوٹیوں سے اُمیدِ شفا باندھی گئی لیکن سب بے کار۔ معالج آتے گئے اور جاتے گئے طرفہ تماشا یہ کہ ہر معالج کی تشخیص جدا۔ جو آیا اس نے ایک نیا مرض بتایا اور جوں جوں دوا ہوتی رہی مرض بڑھتا گیا۔ دوا کو کارگر نہ ہوتا دیکھ کر دعا کا سہارا لیا گیا۔ جھاڑ پھونک کرائی گئی۔ یہاں تک کہ چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہونے کی اُمید بھی دھندلا گئی۔ موت کے قدموں کی چاپ بہت قریب سے سنائی دینے لگی۔ انسان کا جب تک بس چلتا رہتا ہے وہ اپنے آپ ہی کو صاحبِ قدرت سمجھتا رہتا ہے۔ ساری کامیابیاں اور کامرانیاں اُسے صرف اپنی کوششوں اور اپنے حسنِ تدبیر کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ اپنی ہستی کا احساس جیسے جیسے ختم ہوتا جاتا ہے [illegible]

جود کا عکس نمایاں ہوتا جاتا ہے اور جب یہ اشرف المخلوقات
چاروں طرف سے ہاتھ پیر مار کر تھک جاتا ہے تب خدا کی بارگاہ
میں پناہ کا طالب ہوتا ہے "اے اللہ ہم تجھی سے مدد چاہتے
ہیں" تو مشکل میں ہمیں سب کسے مشکل میں کرے نہ کوئی سو تو کار
محبوب صاحب بھی راضی برضائے مولا ہو گئے۔ اپنی موت و حیات
کا فیصلہ خدا کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔

خدا رسیدہ بزرگوں سے قطع نظر عام انسان جب تک
دُنیا میں رہتا ہے دُنیاوی تعلقات سے یکسر دامن چھڑانا اس
کے لیے محال ہوتا ہے۔ سو محبوب صاحب بھی بستر پر پڑے پڑے
اپنی اکلوتی بیٹی سلمیٰ کی فکر میں گھلے جا رہے تھے۔ اگر خدانخواستہ
انہیں کچھ ہو گیا تو سلمیٰ کے مستقبل کا کیا ہوگا۔ اللہ کا دیا ہوا تو
گھر میں سب کچھ ہے۔ بفضلِ خدا بھرا پُرا گھر ہے خوش قسمتی سے
تعلیم و تعلم کی حد تک تو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔
سلمیٰ کی ماں ویسے تو ہوشیار بھی ہے اور خدا بھی اپنی بساط
بھر ماں کے ساتھ ساتھ باپ کے فرائض کی بجا آوری کی کوشش
ضرور کرے گی۔ لیکن سب ہوتے ہوئے بھی ہے تو آخر عورت ہی۔
سلمیٰ کی شادی بیاہ کے معاملے میں پتا نہیں کیا کر سکے کیا نہ
کر سکے۔ یتیم لڑکی کے لیے مناسب رشتہ مل بھی سکے گا یا نہیں۔
اگر جائداد کے لالچ میں کوئی اسے اپنانے کو تیار بھی ہو گیا تو معلوم
نہیں لڑکا کیسا ہو؟ اور دشمنوں کے منہ میں خاک اگر لڑکا
نیک چلن نہ ہوا تو معصوم لڑکی کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے گی۔
سوچتے سوچتے یکایک اس مسئلے کے نمٹارے کی ایک تدبیر
انہیں سوجھی۔ یہ سوچ کر چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی
کہ سانس رہتے اگر یہ مسئلہ حل ہو گیا تو پھر وہ آرام سے سکون
سے مر سکیں گے۔

اُسی وقت محبوب صاحب نے اپنی بیوی سے اس موضوع
پر گفتگو کی۔ صحت کی نزاکت اور معاملے کی اونچ نیچ بتاتے
ہوئے انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ خدا جانے کل کلاں کو کیا
ہو جائے اس لیے چاہتے ہیں وہ سلمیٰ کا نکاح اپنے بھتیجے
جاوید کے ساتھ کر دینا چاہتے ہیں۔ ماں سات برس کی
بچی تھی سلمیٰ کے نکاح کی تجویز سن کر متعجب ہوئی۔

شوہر کی طویل علالت سے وہ فکر مند تو تھی لیکن اس سے
اُس پہلو پر اس نے نہیں سوچا تھا۔ اب شوہر نے جو خدشہ
کیا اور سیاہ مستقبل کی جو بھیانک تصویر پیش کی تو اس
کانپ اٹھی۔ پھر بھی اطمینان کی بات یہ تھی کہ محبوب صا
سلمیٰ کا نکاح اپنے بھتیجے ہی سے کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے
عبدالحمید نیک سیرت اور اخلاق مند آدمی تھے۔ بھا
احترام کرتے تھے۔ ہر چند ان کی بیوی جھگڑالو طبیعت
حریص عورت تھیں۔ اکثر حمید صاحب کے کان بھرتی
تھیں اور جائداد کے بٹوارے کے لیے اکساتی رہتی تھیں
وہ ایک کان سے اُن کی بات سن کر دوسرے سے اُڑ
کرتے تھے۔ دونوں بھائی ہمیشہ ایک دوسرے کے جذ
حقوق اور حدود کا احترام کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ
تک موروثی جائداد کی تقسیم کا جھگڑا نہ ہوا تھا۔ د
بھائی، گاہے بگاہے عورتوں کے درمیان ہو جانے والی
کے باوجود، اب تک مشترکہ خاندان کی صورت میں رہنا
پسند کرتے تھے۔

خدا کا کرنا ایسا کہ عبدالحمید کے بھی ایک ہی اولاد تھی،
اس طرح یہ نیا رشتہ قائم ہو جانے میں خیر ہی خیر کا پہلو
تھا۔ ایک فائدہ تو یہ بھی تھا کہ اس طرح جائداد کے بٹوا
کی راہ ہی مسدود ہو جائے گی۔ آپس میں جُدائی اور
کے بکھراؤ کا اندیشہ بھی ختم ہو جائے گا۔ عبدالحمید کی
کا رویہ بھی تبدیل ہوگا۔ اور ماں کے اطمینان کے
سب سے زیادہ دل جمعی کی بات یہ تھی کہ سلمیٰ ہمیشہ نگ
کے سامنے رہے گی۔ سارا آگا پیچھا سوچ کر سلمیٰ کی ما
بھی حامی بھر لی۔

عبدالحمید کو بڑے بھائی کی تجویز کے خلاف دم مار
یارا نہ تھا۔ بیوی کی طرف سے کچھ اندیشہ البتہ تھا سو ا
خدا کی بندی نے بھی جب یہ دیکھا کہ اس طرح مال ملکیت
اُس کی جھولی میں خود بخود چلی آ رہی ہے تو خوشی سے ا
بھی باچھیں کھل اٹھیں۔ اس طرح
دیکھ کر ایک دن

کو سجا سنوار کر اُن کے بزرگوں نے نکاح کے بندھن میں باندھ دیا۔

اللہ تعالیٰ شافیِ مطلق ہے ہوا یہ کہ محبوب صاحب دھیرے دھیرے رُو بہ صحت ہو گئے۔ اللہ کی حکمت اللہ ہی جانے۔ ویسے لگتا یوں کہ بیٹی کے نکاح سے فارغ ہونے کے لیے ہی بیمار پڑے تھے۔ عورتوں نے اُن کی صحت یابی کو اس نیک کام کی برکت کا نتیجہ مانا۔ جو بھی ہو وہ خدا کے فضل سے بھلے چنگے ہو گئے۔ دُنیوی کاروبار حسبِ سابق چلنے لگا۔

ایک جُگ سے بھی زیادہ کی مدت دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کیسے سرک گئی۔ پتا ہی نہ چلا کہ سلمیٰ نے بچپن کی حدود کب پار کر لیں اور جوانی کے زینے پر کب قدم رکھا۔ کب مکتب سے چھُٹی لی اور کب ہائی اسکول پاس کر لیا۔ محبوب صاحب نے تو کالج میں بھی اُس کا داخلہ کرا دیا تھا لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا کہ پھر وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکی۔ سلمیٰ فطرتاً ذرا شرمیلی اور الگ تھلگ رہنے والی لڑکی تھی۔ لڑکوں کی بات تو دُور رہی کلاس کی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ بھی ایک حد سے زیادہ گھُل مل جانے سے کتراتی رہتی تھی۔ ہم جماعت لڑکوں نے "کانی گُڑیا"، "نک چڑھی"، "چھوئی موئی" جیسے فقرے اُچھالنے اور آوازے کسنے سے بھی جب راہ ہموار ہوتی نہ دیکھی تو ایک دن کلاس روم ہی میں کسی نے سلمیٰ کی طرف گندہ انڈا اچھال دیا۔ شکایت لیکچرر سے ہوتی ہوئی پرنسپل تک گئی۔ چھان بین بھی ہوئی لیکن لڑکوں کے ایکا کر لینے کی وجہ سے پتہ لگانا مشکل ہو گیا کہ انڈا پھینکا کس نے تھا۔ اس طرح مجرم بے داغ نکل گیا۔ بس اُس دن کے بعد سے محبوب صاحب نے بیٹی کو کالج جانے سے روک دیا۔ اب تو اس واقعے کو بھی پانچ سال بیت گئے۔

ویسے یہ درست ہے کہ سلمیٰ کے میکے اور سسرال کے مابین کوئی واضح خط تفریق نہ تھا لیکن سماجی اصول بھی اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔ بہو اسی وقت سے رخصتی کی منتظر ہی بیاہی تھی۔ وقتاً فوقتاً عبدالحمید نے رخصتی کا ذکر بھی کیا لیکن محبوب عالم چاہتے تھے کہ جاوید میاں کسی کام سے لگ کر خود کفیل ہو جائیں تو رخصتی کی رسم ادا ہو۔ نکاح بھی جس حال اور جس عجلت میں ہوا تھا اس سے بھی دل کی تمنا پوری نہ ہوئی تھی۔ رخصتی ذرا دھوم دھام سے کرنے کے متمنی تھے۔ اس طرح رخصتی کی بات کبھی یا ٹھی اور ٹلی۔

جاوید میاں ماں باپ کے دُلارے تھے ہی سہرا دکش ہو جانے سے چچا چچی کی آنکھوں کے بھی تارے ہو گئے۔ زیادہ لاڈ پیار اور ناز برداری کی وجہ سے بچپن ہی سے کچھ بگڑنے لگے تھے۔ میٹرک تک جب تک باپ چچا کے دباؤ میں رہے کسی حد تک سنبھلے رہے۔ کالج کی ہوا لگتے ہی برخوردار مطلق العنان ہو گئے۔ پہلے انھیں "عقل چھٹ" کی عادت لگی۔ کھینی (تمباکو) کو وہ اور اُن کے احباب عقل چورن ہی کہتے تھے۔ پھر سگریٹ کا سُٹا لگانے لگے۔ چار مینار انھیں زیادہ پسند تھی۔ کبھی کبھار "دم مارو دم" کی تان کے ساتھ گانجے کا دم لگانے سے بھی پرہیز نہ تھا۔ پارٹی، پکنک میں جاتے آتے تھوڑی بہت پینے کی لت بھی پڑ گئی۔ اس ماحول میں کسی نہ کسی طرح نقل وغیرہ کے اثر سے انھوں نے پاس کر لیا۔ کر پوری ڈویژن میں۔ انگریزی کے بغیر تھرڈ ڈویژن کا نام یاروں نے کر پوری ڈویژن رکھ لیا ہے۔ ویسے بی اے میں وہ بفضلِ خدا تین سال سے فیل ہو رہے تھے اور اب تو پاس کرنا غیر ضروری سمجھ کر تعلیم کا سلسلہ ہی منقطع کر دیا تھا۔ گو سفتہ دو سال سے گھر کھانے پینے کے لیے تو آتے ورنہ دوستوں کے ساتھ کھیل تماشے اور سیر سپاٹے میں ہی وقت گزار رہے تھے۔ گزشتہ دنوں جب اس کی بھنک حمید صاحب کے کان میں پڑی تو وہ بہت گھبرائے۔ ایسی حالت میں سلمیٰ کے ذریعہ ہی جاوید میاں کے سدھار کی اُمید انھیں نظر آئی۔ اس لیے رخصتی کے لیے ایک بار انھوں نے بھائی پر دباؤ ڈالا۔

پچھلے کئی برسوں سے ہوا کا رُخ بھانپ کر سلمیٰ فکر مند رہنے لگی تھی لیکن معاملے کی نزاکت اور مشرقی روایت نے اس کے منہ پر تالا ڈال رکھا تھا۔ پھر بات جب سر سے اونچی ہو گئی تو ضبطِ نفس کے [illegible]

سلمٰی نے جھکی ہوئی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ درخواست دیکھی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

قاضی صاحب نے سوال کیا "آخر جاوید میاں میں ایسی کیا برائی ہے جو تم یہ سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہوئیں؟" سلمٰی کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ سوال کی نامناسبت پر رنج بھی ہوا۔ ذرا تیز آواز میں بولی "گستاخی معاف! میرے ناقص خیال میں یہ سوال غیر ضروری ہے اور اسی لیے اس کا جواب دینا ضروری نہیں۔ کسی شخص کے بارے میں بھلے بُرے خیالات کے اظہار کا مجھے کیا حق؟ میں نے یہ درخواست کی ہے کہ میرے والد نے جس وقت بولایتاً خود میرا نکاح کیا تھا اُس وقت میں ناسمجھ اور نابالغ لڑکی تھی۔ اب میں نے مصمم ارادہ کیا ہے کہ اس نکاح کو نامنظور کردوں۔ آپ صرف یہ بتانے کی گوارہ فرمائیں کہ بصورتِ موجودہ مجھے اپنی طرف سے اس کا فسخ کردینے کا شرعی حق حاصل ہے یا نہیں۔"

قاضی صاحب نے سلمٰی کی بات سننے کے بعد اور پوچھنا غیر ضروری سمجھا اور واپس باہری بیٹھک خانے چلے گئے۔ عرضی پر جو فیصلہ انھوں نے تحریر کیا وہ سلمٰی کے حق میں تھا۔

غزل

اقبال ساجد

موند کر آنکھیں تلاشِ بحر و بر کرنے لگے
لوگ اپنی ذات کے اندر سفر کرنے لگے

بڑھ گیا ہے اس قدر اب سرخرو ہونے کا شوق
لوگ اپنے خون سے جسموں کو تر کرنے لگے

جیسے ہر چہرے کی آنکھیں سر کے پیچھے آ گئیں
سب کے سب اُلٹے ہی قدموں سے سفر کرنے لگے

باندھ دے شاخوں سے تو مٹی کے پھل کاغذ کے پھول
یہ تقاضہ راہ کے اُجڑے شجر کرنے لگے

مانجھیوں کے گیت سُن کر آ گیا دریا کو جوش
ساحلوں پر رقص تیزی سے بھنور کرنے لگے

دیکھتے ہی دیکھتے بازار ویراں ہو گئے
جاگتی گلیوں میں سناٹے سفر کرنے لگے

گاؤں میں کچے گھروں کی قیمتیں بڑھنے لگیں
شہر سے نقلِ مکانی اہلِ زر کرنے لگے

اب پڑھے لکھے بھی ساجد آ کے بیکاری سے تنگ
شب کو دیواروں پہ چسپاں پوسٹر کرنے لگے

شکست

سعدی ٹونکی

پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی دور سے آتی ہوئی دو جیپوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک نظر بہت دور تک پھیلے ہوئے اپنے جسم کو دیکھا، پھر مڑ کر دوبارہ ان آتی ہوئی جیپوں کو دیکھنے لگی۔ جلد ہی دونوں جیپیں پہاڑ کے دامن میں چوٹی کے ٹھیک نیچے رک گئیں۔ کئی مرد اترے۔ کچھ کے ہاتھوں میں دوربینیں تھیں، خوردبینیں تھیں، کچھ کے ہاتھوں میں نقشے اور کچھ کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے آلات۔ نقشے والوں نے نقشے پھیلائے، آلات والوں نے آلات کو جوڑنا ٹھیک کرنا شروع کیا اور دوربین والوں نے آنکھوں پر دوربین لگا کر اوپر چوٹی کی طرف دیکھا۔ پہاڑ کی چوٹی نے اپنا جسم کسمسایا۔

پہاڑ کی نیچے کی تہہ نے چوٹی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ یہ بے چینی کیسی؟"

"اب ہمارا خاتمہ قریب آ رہا ہے" چوٹی کا لہجہ اداس تھا۔

"کیوں؟ کیسے؟" بیچ کی تہہ نے جلدی سے پوچھا۔

"آج انسان نے اپنے پہاڑ کے جسم پر بامقصد نظریے کے تحت قدم رکھے ہیں۔"

"انسان آیا ہے تو آنے دو۔ اس میں فکر کی کیا بات ہے؟ اس سے پہلے بھی تو وہ آ چکا ہے۔"

"خاموش رہ کے دیکھو کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں، کیا کہہ رہے ہیں۔" چوٹی نے دوبارہ آدمیوں کی نقل و حرکت پر دھیان دیا۔ نیچے کی تہہ نے جو زمین کے پیٹ میں تھی، اپنے سے اوپر والی بیچ کی تہہ سے پوچھا۔

"تم [illegible] ہو؟"

"کچھ انسان ہمارے جسم پر آ کھڑے ہوئے ہیں، ان سے ہماری مکھیا پریشان ہے۔" بیچ کی تہہ نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"یہ انسان کیا ہے؟" نیچے کی تہہ نے پوچھا۔

"انسان ایک جاندار مخلوق ہے۔"

"لیکن بے شمار جانداروں کو تو ہم نے اپنے جسم میں پناہ دے رکھی ہے پھر ان سے کیسا خوف؟ ہم جب چاہیں ان حقیر جانداروں کو پیس کر رکھ دیں۔" نیچے کی تہہ بولی۔

"تم نے اس مخلوق کو نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ دو پیروں کا جاندار، اپنے جسم میں سینکڑوں رینگنے، چلنے پھرنے والے جانداروں سے مختلف ہے۔"

"کیا یہ بہت زہریلا ہے؟"

"نہیں۔"

نیچے کی تہہ زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور دیر تک ہنستی رہی پھر اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہنے لگی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ ہمارے جسم میں رہنے والے جاندار دو ٹانگوں سے لے کر کئی ٹانگوں والے ہیں۔ کچھ اتنے زہریلے ہیں کہ جب ہمارے جسم کو کاٹتے ہیں تو ایک بار تو ہمارے جسم کا حصہ تکلیف کی وجہ سے چیخ اٹھتا ہے، یہاں تک کہ وہ حصہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ پھر بھلا یہ دو ٹانگوں والا انسان بنا زہر کا کیسے اپنے لیے [illegible] ہو سکتا ہے؟"

[illegible] بیچ کی تہہ [illegible] نیچے کی تہہ سے پوچھ رہی ہیں۔

لیکن چونٹی دو ٹانگوں والے جاندار کی نقل و حرکت کو فکرمندی کے ساتھ دیکھنے میں محو تھی۔ کچھ لوگ آلات سے پہاڑ کا پہاڑ کے دامن کا مطالعہ کر رہے تھے، جانچ کر رہے تھے۔ بار بار ایک دوسرے سے کچھ کہتے نقشے دیکھتے، نظری نقشہ بناتے، کچھ لکھتے شام تک یہی کام چلتا رہا۔

پھر دونوں جیپیں ہچکولے کھاتی ہوئی مغرب کی سمت میں کھو گئیں۔ پہاڑ کی چوٹی فکر میں ڈوبی آفتاب کو غروب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"کس فکر میں ڈوبی ہوئی ہو؟" نیچے کی تہہ نے ٹوکا۔

"ہوں؟" گمبھیر حالت ٹوٹی۔

"یہ تو بتاؤ اپنے جسم میں جو سینکڑوں جاندار رہتے ہیں اُن میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟"

"بہت بڑا فرق!" چونٹی نے کہا "پہلے یہ بات سمجھ لو کہ ہمارے جسم پر ہر ایک رینگنے والا، چلنے پھرنے والا جاندار خوراک کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ جہاں اس کو خوراک ملی پیٹ بھرا اور وہ سُست ہوا اس طرح اُس کی زندگی کا مقصد اپنے جسم کو پالنا ہی ہے۔ انسان بھی جاندار ہے لیکن خوراک حاصل کرنا ہی اُس نے اپنا نصب العین نہیں بنا رکھا ہے بلکہ اپنی زندگی کو با مقصد طریقہ سے گزارنا اپنا فریضہ سمجھ رکھا ہے اسی لیے اُس میں دو خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ دوسرے جانداروں سے مختلف ہو گیا ہے۔ اور وہ دو خصوصیات ہیں سوچ سمجھ کر کام کرنا اور بہتر زندگی کے لیے لگاتار کوشش یعنی عقل اور جستجو۔"

"تو کیا ان خصوصیات کی وجہ سے انسان بہت خطرناک ہو گیا ہے؟ زہریلا ہو گیا ہے؟"

"نہیں زہر نام کی کوئی چیز اُس میں نہیں ہے بلکہ دوسروں کے زہر اُس کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ تو بہت کمزور ہے۔ پیٹ بھرائی کے علاوہ انسانوں کے جھنڈ میں بلا خوف و خطر، سہولتوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہے اسی لیے وہ ہر ایک شے کو [illegible] کار آمد بنانے کی کوشش کرتا ہے [illegible] نئی چیزوں کی کھوج میں لگا رہتا ہے اور اُن کو اپنے استعمال میں لانے کے لیے عقل کا استعمال کرتا ہے۔ جو اس کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے اُسے وہ ختم کر دیتا ہے" چونٹی پھر گمبھیر ہو گئی۔

"تم فکرمند کیوں ہو؟" نیچے کی تہہ نے چوٹی کو پھر گمبھیر ہوتا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

"میرا اندیشہ صحیح نکلا۔ اب ہم تم تھوڑے سے وقت کے مہمان ہیں۔"

"تمھاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"سویرے جو انسان آلات سے لیس آئے تھے انھوں نے ہمارے جسم کا بہت باریکی سے مطالعہ کیا ہے آس پاس کی اندرونی زمین کی جانچ کی ہے۔"

"کیوں جانچ کی ہے؟"

"اپنے آس پاس کی زمین میں اُس کے استعمال کے لیے معدنیات ہیں وہ کھود کر نکالیں گے۔"

"ہاں ہے تو سہی" نیچے کی تہہ نے سوچ کر کہا۔ "لیکن وہ تو زمین کو کھودیں گے۔ ہمارا تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔"

"پگلی، وہ ہمارا بھی سروے کر کے گئے ہیں۔ وہ ہمیں توڑ کر بہت دُور لے جائیں گے۔ عمارتی کاموں میں استعمال کریں گے۔"

"تو کیا ہم اپنے آپ کو ان کمزور انسانوں کے ہاتھوں اپنے جسم کو لُٹتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔" نیچے کی تہہ جو پوری بات چیت سُن رہی تھی، فکر سے بولی۔

"بالکل! وہ ہمارے جسموں کو توڑے گا پھر یہاں سے لے جا کر بھاری مشینوں کے ذریعہ ہمیں توڑ لے گا۔"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" نیچے کی تہہ نے چیخ کر کہا۔

جلد ہی یہ بات کئی کلو میٹر لمبے و کئی سو میٹر اونچے پہاڑ کے سب حصوں میں پہنچ گئی۔ سب بھڑک اُٹھے۔ باغیانہ لہجے میں چلانے لگے۔

"ہم نہیں مریں گے، نہیں مریں گے، نہیں مریں گے۔"

"انسان کو مار ڈالو، مار ڈالو، مار ڈالو۔"

تھوڑی دیر بعد جب جوش کم ہوا تو چوٹی نے کہا

"تم ابھی نادان ہو، کم سن ہو۔ تمھارے میں ابھی سمجھ
ہے تمھارا رنگ لال ہے۔ میں نے ہزاروں سال تک ہر طرح
ے حالات کو برداشت کیا ہے میرا رنگ اسی وجہ سے کالا ہے میں
ے باہر کی ہر ایک شے کو دیکھا ہے، سمجھا ہے، تجربہ حاصل کیا
ہے۔"

"لیکن اس سے پہلے بھی تو انسان آچکے ہیں۔ اب پریشانی
کیا بات ہو گئی؟"

"ہاں اس سے پہلے انسان ہمارے پاس آچکا ہے، ہمارے
سم کو روند چکا ہے . . . پہلی بار جب جب انسان نے ہمارے
سم پر پگ دھرے تھے، اس وقت وہ جنگلی تھا۔ موسموں
ے بچاؤ اور درندوں سے حفاظت پانے کے لیے اس نے
نے جسم میں پناہ لی تھی اس وقت انسان نے ہمارے جسم
گھر سمجھا تھا۔ وقت بیتا۔ انسان نے جانوروں کو اپنے
ہ کارآمد بنایا، دوست بنایا اپنی سواری بنایا۔ جانداروں
ی ایک فطرت یہ بھی ہے کہ جب وہ کسی کو اپنے لیے بے ضرر
مجھتے ہیں تو خود بھی بے ضرر ہو جاتے ہیں، رحم کی صفت پیدا
جاتی ہے اور جب وہ کسی کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔
سے مدافعت کرتے ہیں جس سے بے واسطہ طور پر ان میں
ی دوسروں کو نقصان پہنچانے کی برائی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان
ندوں سے مدافعت اور حفاظت کرتے کرتے خود بھی
دہ بن گیا۔ سانپ کسی کے بھی پھن مارے چاہے پتھر پر چاہے
ندار پر، ہمیشہ زہر ہی اگلے گا۔ اسی لیے انسان بھی اپنے ہم جنسوں
نقصان پہنچانے کے درپے ہو گیا۔ مال اسباب کی ہوس سے
سان نے ایک دوسرے کے جھنڈوں پر حملہ کرنا اور قبضہ کرنا
روع کر دیا۔ اس حالت میں انسان نے ہم کو ڈھال کے
پ میں کام میں لیا۔ ہتھیار کی طرح سے استعمال بھی کیا
سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا اور جب امن امان کے بیج انسان
ی بھولے تو کھلے میدانوں میں بستیاں بسیں، ایک دوسرے
ی امداد باہمی کا سلسلہ پیدا ہوا اور تب اس نے اپنے آرام
لیے اپنی سہولتوں کے لیے ہر ایک شے کو جانچا اور پرکھنا
رع کیا اور اپنی عقل سے بہتر فوائد حاصل کیے، اب وہ ہمارا
دشمن ہے ہمیں توڑے گا، کاٹے گا اور کام میں لے گا۔"

"تو کیا ہم اپنے آپ کو لٹتے ہوئے دیکھتے رہیں گے؟ ہم تعداد
میں بہت زیادہ ہیں جسمانی طور پر ہم بہت مضبوط ہیں بہت بھاری
ہیں کیا ہم اس دبلے پتلے ناتواں انسانوں کے جھنڈوں کو ختم
نہیں کر سکتے؟"

"ضرور کر سکتے ہیں۔ ایک جھنڈ کو نہیں بہت سے جھنڈوں
کو ختم کر سکتے ہیں لیکن ہر ایک جھنڈ کے ختم ہو جانے کے بعد
دوسرا جھنڈ ہمیں پھر توڑنے آئے گا کیونکہ انسان کی یہ فطرت ہے
کہ اس کے کام میں جو دخل انداز ہوتا ہے اسے وہ ختم کر دیتا ہے۔
اگر ایک نسل کسی کام میں ناکامیاب رہتی ہے تو اس کی دوسری
نسل اس کام کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرتی ہے اس کی
ہمت میں ضعف نہیں آتا بلکہ ہر ناکامیابی پر دوگنی ہمت اور جوش
سے کام میں جٹ جاتی ہے اس طرح سے وہ کام پورا ہو کر رہتا
ہے اسی لیے یہ انسان سب سے زیادہ خطرناک ہے۔"

پہاڑ کا ہر ایک حصہ گمبھیر ہو گیا فکر مند ہو گیا۔

پھر انسان کئی دنوں تک آتا رہا۔ پہاڑ اور آس پاس کی
زمین کا سروے کرتا رہا۔ چوٹی اداسی سے سب کچھ دیکھتی رہی۔

آخر ایک دن آلات اور اوزاروں کو ٹرکوں میں بھر کر انسان
اس پہاڑ کے دامن میں آپہنچا۔ چوٹی نے ٹھنڈی سانس بھری
اور کہا "یگ یگ سے ساتھ رہنے والو، خدا حافظ! اب
ہمارا خاتمہ قریب آچکا ہے۔"

پہاڑ کی سطح اداس تھی، بیچ کی تہ خاموش تھی لیکن
نیچے کی تہ نے مخالفت کی "تم چھوٹے سے انسان سے ڈر
گئیں۔ تم اسے پیس کیوں نہیں ڈالتیں؟ جیسے جانداروں
نے انسان کی مخالفت نہ کر کے اسے اتنا بے جھجک اور نڈر
بنا دیا ہے۔ ہم اس سے بہت زیادہ طاقتور ہیں، ہمیں اسے ختم
کر دینا چاہیے۔ وہ ہمارا کب تک مقابلہ کرے گا؟"

"تم نادان ہو" چوٹی نے کہا "تمھاری شریانوں میں [illegible]
لالی ہے اس لیے باغی ہو رہی ہو۔ سورج کی روشنی میں انسان
کے [illegible] نہیں سکے۔ وہ [illegible]
اپنے قبضے میں کرنے چلا ہے۔ اس کی نظر [illegible]

ہم کتنے ہی طاقت ور کیوں نہیں ہوں عقل سے نہیں جیت سکتے۔ جانداروں میں بہت سے طاقت ور حیوان ہیں جو انسان سے پہلے زمین پر تھے لیکن وہ کبھی انسان کو غلام نہیں بنا سکے بلکہ انسان نے ان میں سے کئی کو اپنے قبضے میں کر کے غلام بنا رکھا ہے۔ جب تک عقل سوچ سمجھ کر کام کرنا نہیں سیکھ جاتی تب تک طاقت کی ہی حکومت رہتی ہے اور جب عقل ترقی کر جاتی ہے تو ہر طرح کی طاقت اُس کی ماتحتی میں آجاتی ہے۔ یہ قدرت کا اصول ہے ہم انسان سے لڑ سکتے ہیں اُس کی عقل سے نہیں۔"

لیکن نچلی تہہ سمجھنے سے مجبور تھی کیونکہ اُس کے دل و دماغ میں بغاوت تھی، جسم میں آگ تھی۔

'چاہے کچھ بھی ہو میں تو ضرور ہی اس انسان کو ختم کر کے رہوں گی۔" نچلی تہہ نے عزم کیا اور احتجاجاً آنکھیں موند لیں۔

جلد ہی پتھر ٹوٹنے کی آواز سنائی دینے لگی پھر بارود کے دھماکوں سے پتھروں کی کراہٹیں، چیخیں اُس کے کانوں سے ٹکرانے لگیں لیکن اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ 'اچھا ہے مرنے دو۔ مخالفت کرنے کا پھل تو لے؟'

دھیرے دھیرے پہاڑ کی سطح اور بیچ کی تہہ کو انسان نے سمیٹ لیا۔ بیچ کی تہہ کا کچھ حصہ نچلی تہہ پر رہ گیا جس نے ڈھال کا کام کیا۔

انسان نے پھر ہتھوڑا چلایا۔ نچلی تہہ نے اپنے جسم میں سوراخ ہونے کی چبھن محسوس کی۔ آنکھیں موندے ہی وہ دل میں ہنسی۔ 'اوپر کی تہیں تو اسے انسان بنا احتجاج کیے تیرے قدموں پر گر پڑیں لیکن میں اُن جیسی بزدل نہیں ہوں میں تجھے ختم کر کے رہوں گی۔'

انسان نے پہاڑ کے کچھ اندر تک چھید کیا۔ بارود رکھی [illegible] جلا کر آس پاس کے لوگوں کو ہوشیار کیا۔ "اے انسان دیکھ [illegible] خاتمہ" یہ کہہ کر نچلی تہہ نے اپنے جسم کو سکیڑا۔ بارود والی [illegible] پر بہت زور کا دھماکہ ہوا۔ ایسا دھماکہ ہوا جو اب تک نہیں [illegible] تھا۔ نچلی تہہ نے تین آدمیوں کی جان آخر لے ہی لی۔ کچھ گھا[illegible] بھی ہوئے۔ نچلی تہہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔ انسان کا [illegible] کچھ دیر رکنے کے بعد پھر شروع ہوا۔ نچلی تہہ جھنجھلا گئی۔ انس[illegible] اُس کے جسم پر پہنچ چکا تھا۔ بارود رکھ کر انسان نے پھر لوگو[illegible] ہوشیار کیا۔ نچلی تہہ نے اپنے جسم کو اور زیادہ سکیڑا اور [illegible] سے اُچھال ماری بہت بھیانک آواز ہوئی پوری دھرتی گونج [illegible] نچلی تہہ نے کان لگائے۔ انسان کے چیخنے چلانے کی کوئی آ[illegible] آئے مگر ایسی کوئی آواز نہیں آئی۔ کوئی انسان نہیں مرا [illegible] زخمی نہیں ہوا۔

نچلی تہہ نے جھنجھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی چیخ [illegible] بجی۔ کچھ پتھر گر گئے۔ اُس نے دیکھا سینکڑوں [illegible] اس سے اوپر کی تہہ اور خول جو اس سے بہت زیادہ طاقت [illegible] تھیں اُن کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ اُس پر اور اُس [illegible] آس پاس انسان کھڑے تھے۔ دُبلے پتلے، دو ٹانگوں [illegible] کھڑے انسان۔ اُس نے پہلی بار انسان کو دیکھا تھا۔ [illegible] انسان کو وہ پہلے بہت حقیر سمجھتی تھی اب وہ اُس سے خوف زدہ ہو گئی کہ انھیں پھر تو نظر سے بھی نہیں دیکھ[illegible] اُس نے جھرجھری لی، چوٹی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ انسان [illegible] عقل سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔"

کچھ لوگ پھر ہتھوڑے، کھنتے لیے آگے بڑھے۔

"آہ انسان تو کتنا عظیم ہے!" یہ کہہ کر نچلی تہہ نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں کبھی نہ کھلنے کے لیے۔ وہ اپنے آپ کو انسان کے حوالے کر چکی تھی۔

OO

اندھیرے کی آواز

احمد عثمانی

بہت دنوں بعد میں اپنی زمین پر لوٹا تھا۔

رات کا وقت تھا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے کتوں کے بھونکنے اور رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گاؤں میں کسی قسم کی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ نکڑ، نکڑ پر اس بڑھیا کا جھونپڑا تھا اور اُس میں ٹمٹماتا ہوا چراغ ویسے ہی جل رہا تھا۔ اس ٹمٹماتے چراغ کو میں کسی لمحہ بھی بھول نہیں سکا تھا۔ کیونکہ میرے دوست کے گھر جانے کا راستہ اسی نکڑ سے جاتا تھا۔ جن دنوں میں گاؤں میں تھا تو روز رات میں میں اور وہ اسی نکڑ تک بات کرتے ہوئے آتے تھے۔ یا یوں کہ وہ روز مجھے چھوڑنے آتا تھا۔ جب وہ ٹمٹماتا چراغ ہمیں نظر آتا تھا تو ہم رُک جاتے تھے یعنی اُس جھونپڑے میں ٹمٹماتا ہوا چراغ ہماری جدائی کا نشان تھا۔

میں اس نکڑ پر تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا سب کچھ وہی تھا۔ ویسے ہی تھا۔ میں سوچتا تھا کہ گاؤں بدل گیا ہوگا۔ وہ نکڑ اور وہ جھونپڑا ہوں گے کہ نہیں لیکن سب کچھ ویسے ہی تھا۔ مجھے اس زمین سے جدا ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ اس لیے میں ہر جگہ کو رات ہونے کے باوجود دیکھ رہا تھا۔ نظر بھر کر دیکھ لینا چاہتا تھا۔ پہلے میری نظر ٹمٹماتے چراغ پر پڑی۔ پھر اُس راستے پر جو تک چلی گئی۔ لیکن آگے اندھیرا تھا۔ بہت دنوں بعد لوٹنے کی خوشی تھی اس لیے تھکاوٹ اور نیند دونوں غائب تھے۔

بہت دنوں بعد اپنی زمین پر قدم رکھو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اِن بہت دنوں میں، میں نے اپنا سارا ملک دیکھ لیا۔ سب جگہ ایک سی دھرتی، سب جگہ ایک سا آسمان تھا۔ اور وہی مسئلے مسائل جو مجھے اپنی دھرتی پر درپیش تھے، ان بہت دنوں میں میں نے اپنے آپ کو بہت دُکھ دیے سُکھ کی تلاش میں ہر جگہ سُکھ کے لینے میں دُکھ کی مٹی کھودتا رہا لیکن آخر ہاتھ دُکھ ہی آتا۔ ان دنوں میں ہر گروہ کے ساتھ یہ سمجھ کر چلتا کہ یہ گروہ میرے مُلک کے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والے انسان نما جانداروں کی گردنیں اونچی اُٹھا کر انھیں انسانوں کی طرح، انسانوں کی صف میں کھڑا کر لے گا۔ لیکن ہر گروہ کے چند افراد اپنی انا کی تسکین کر لیتے اور اپنی تجوریوں میں بڑے بڑے تالے لگا لیتے کہ ان میں ان کا مستقبل محفوظ ہو جاتا۔

کبھی کبھی میرے اوپر وحشت سی طاری ہو جاتی۔

میں سوچتا کہ میں اپنے لیے کیوں نہیں جیتا۔ دوسروں کا روگ کیوں پالتا ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ روتے ہوئے انسان کو خوشی اور مرتے ہوئے انسان کو چند سانسیں مل جائیں تو میری بھوک پیاس ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایسی خوشی مجھے نصیب ہوتی ہے جس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ایک بار میں اسی طرح سوچ رہا تھا کہ اب مُلک تبدیل ہو گیا ہے۔ پُل، سڑکیں، بجلی کے تاروں کا جال سا بکھر گیا ہے۔ اب زمین پر واپس چلنا چاہیے کہ میرے ساتھ کام کرنے والا میرا ساتھی آ گیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ وہ بھی کچھ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کیا کرنا چاہیے اُس کی سمجھ میں

یا آرہا تھا۔ اُس نے چند مُڑے تڑے کاغذات مجھے
یے اور کہا کہ میں پڑھ لوں اور بتا دوں کہ یہ گروہ کیسا ہے؟
، میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں؟ میں نے وہ مختصر
ریریں پڑھیں اور فیصلہ کیا کہ اس گروہ میں شامل ہونا
ہیے۔

اُس دن ہم دونوں کو ایک تیسرا آدمی ایک اندھیری
ٹھری میں لے گیا جہاں بہت سارے لوگ تھے ہمیں
یکھ کر وہ چپ ہو گئے۔ پہلے انھوں نے ہمارے ساتھ
ت کی۔ پھر ہماری وفاداریاں کا غذپر اپنے نام منتقل
والیں تب آگے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ایک نوجوان
نے لگا۔ "ہم نے گروہ کے لیڈر کو کاندھوں پر بٹھایا لیکن
ں نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟ تھوڑی دور ہمارے
اتھ چلنے کے بعد وہ لوٹ گیا اُس طرف جس طرف اُسے
لچ بلاتی ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ہماری
ھرتی سے ایسے لالچی اور خود کے لیے جینے والوں
ے پاک کر دیں گے۔" لفظ پاک اُس نے اتنی سفاکی سے
یا تھا کہ میں لفظ کے معنی میں بڑی گہرائی تک اتر تا چلا
یا۔ اور اُس کی سفاکی ٹھنڈی لہر کی طرح میرے اندر
رتی چلی گئی۔ پھر ان لوگوں نے ایک پلان بنایا کسی
اہو کار کو لوٹنے کا۔ سب لوگوں کے ہاتھ اس پلان کی
ایت میں اُٹھے لیکن میرا ہاتھ اُٹھ نہیں سکا۔ میرے
زو سمیٹے ہوئے لوگوں نے مجھے گھور کے دیکھا تب بھی
ں خاموش بیٹھا رہا۔ میرے ساتھی نے کہا "یہ بڑا
رشیلا ہے۔ نیا نیا ہے سیکھ جائے گا۔"

لیکن مجھے ان لوگوں سے کچھ بھی نہیں سیکھنا تھا۔
ونکہ میں اپنے آپ دُکھ جھیل سکتا ہوں کسی کو دُکھ
ے نہیں سکتا۔ دوسرے ہی دن میں کسی اور شہر منتقل
وگیا۔ کیونکہ اس شہر میں اپنی جان بچانے کا مسئلہ پیدا
وگیا تھا۔ اور جس گروہ سے میں واپس آیا تھا وہاں جان
ا قیمت ایک لمحہ، ایک گولی، ایک تیز دھار والے خنجر سے
یادہ نہیں تھی۔ گو کہ وہ یہ سب اپنی ذات کے لیے نہیں

کر رہے تھے۔ لیکن اُن کا راستہ بڑا خطرناک تھا۔ اُن کا
راستہ ہر موڑ پہ کٹتا تھا۔ جبکہ میں چاہتا تھا کہ ایک راستے
سے دوسرا راستہ جڑ جائے تاکہ آنے جانے والوں کو تکلیف
نہ ہو۔ میں جس بستی میں رہتا وہاں کے لوگوں کو جمع کرتا انھیں
اونچا اُٹھنے اور ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شرکت کرتے
خوشیاں آپس میں بانٹنے کی تلقین کرتا اُن کے ساتھ جیتا
اُن کے ساتھ رہتا۔

اسی شہر میں میرے ساتھ ایسا واقعہ بھی ہوا کہ اُس
کی یاد مجھے آج تک ہے۔ ویسے میری زندگی واقعات اور
حادثات کی ایک پوری کتاب ہے۔ لیکن یہ واقعہ اور لوگوں
سے جڑا ہوا ہے۔ اس شہر کی ایک بڑی سی مِل میں ہم لوگ
کام کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی نا اتفاقیاں ہوتی تھیں تو میں
انھیں ختم کرنے کی کوشش کرتا رہتا۔ مالکوں سے افسروں
سے لڑتا تھا۔ چھوٹی موٹی باتیں ہوتی تھیں۔ وہ لوگ بھی
مان لیا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے لوگوں کا ساتھ ملتا چلا گیا۔
مزدوروں کی نظروں میں میرے لیے احترام کا جذبہ اُبھر رہا
تھا۔ انھیں دنوں مِل مالکوں نے مِل بند کرنے کا نوٹس لگایا۔
مزدوروں میں بڑی ہلچل مچ گئی۔ انھوں نے اس بند کے خلاف
جلوس نکالا۔ شام میں ایک جلسہ بھی ہوا۔ جلسے اور جلوس
میں میرے جوش کی کیا حالت تھی میں بتا نہیں سکتا۔ جلسے
کے بعد کچھ مزدور ایک آدمی کو میرے پاس لائے وہ بڑے
خلوص اور گرم جوشی سے ملا اُس نے کہا: "آپ اِن مِل مالکوں
اور افسروں سے اکیلے لڑ نہیں سکتے اس لیے کہ بہت طاقتور
ہیں۔ ہم آپ کو اپنی خدمات پیش کرنے آئے ہیں۔" میں
نے حامی بھرلی اور دوسرے دن مِل کے سامنے ایک جھنڈا
لہرانے لگا۔ ہمارا نشان، مزدوروں کی نجات اسی میں ہے
ایسا اُس آدمی نے بتایا تھا۔

ایک دن صبح سویرے مجھے پولس پکڑ لے گئی باہر
میں کٹ گیا۔ کئی ہفتوں بعد مجھے عدالت میں پیش کیے بغیر
چھوڑ دیا گیا تو معلوم ہوا کہ مِل بند ہو گئی ہے وہ شخص جو مجھ سے
ملنے آیا تھا وہ اب بڑی سی بلڈنگ میں رہتا ہے اور پولس

کے بیچ میں اپنی ذاتی کار میں باہر نکلتا ہے۔ وہ اب کسی مزدور
کی پہونچ سے دُور چلا گیا ہے۔ مِل مالکوں نے مجھے اسی لیے ہٹایا
تھا کہ مجھے بلڈنگ اور کار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور نہ
میرے ہاتھ میں کوئی جھنڈا تھا کہ اُسے تار تار کیا جا سکے۔ میرے
ساتھ مزدور گوشت پوست کے انسان تھے اور میں اُنھیں صرف
انسان کہلوانا چاہتا تھا جو مِل مالکوں کو منظور نہ تھا۔

میں اس شہر سے پھر دوسرے شہر منتقل ہو گیا۔

اس دوران میرے بچپن کے دوست کے کئی خطوط
آئے۔ لیکن وہ اپنے لیے جیتا تھا۔ اس لیے میں اُس کے خط
پڑھ لیا کرتا تھا اور اپنی خیریت لکھ دیتا تھا۔ وہ صرف اتنا
معلوم کرتے رہنا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں۔ لیکن اُس
دوران جو خط اُس نے لکھے اُن میں اُس نے مجھے لوٹ آنے
کے لیے لکھا۔ اُس کی تحریر میں کچھ دعوت لیے اصرار تھا جسے
میں نے محسوس کر لیا۔

اب میری طبیعت بھی شہر شہر گھومنے سے اُچاٹ ہو گئی
تھی۔ میں نے بہت دُکھ جھیلے تھے۔ کبھی سُکھ کی نیند نہیں
سویا تھا۔ میرے پانو شل سے ہوتے جا رہے تھے۔ اس
لیے میں نے سوچا اب اپنی زمین پہ واپس جانا چاہیے۔ سو
میں بہت دنوں بعد اپنی زمین پہ لوٹا۔ معمولی سی تبدیلی یہاں
بھی آ گئی تھی۔ ایک پختہ اسکول بن گیا تھا۔ ندی کے پاٹ کو
بند کر کے جلدھو بنایا گیا تھا۔ بجلی آ گئی تھی۔ کچھ بلڈنگوں نے
سر اُبھارا تھا۔ جو لوگ کبھی گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں
میں رہتے تھے وہ اب گاؤں سے باہر چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں
میں رہنے لگے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اُن کی دانست میں
بہت اچھے داموں اپنے گھر فروخت کیے تھے۔ یہ تو اُنھیں
بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بہت اچھے دام اُن کا ساتھ چند ہفتے
بھی نہیں دے سکے۔ لیکن وہ لوگ سختی جھیلنے کے عادی
تھے۔ زیادہ سوچ بچار کے عادی نہیں تھے۔ اس لیے دن بھر
کھیتوں میں کام کرنے کے بعد یہ شام کو پانو پسار کے سو جاتے
تھے۔

کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی تھی تو وہ ایک ہی
جگہ تھی۔ وہ نکڑ اور وہ پرانا جھونپڑا ویسے ہی تھے۔ اس نکڑ
سے میرے بچپن کے دوست کے گھر کی طرف راستہ جاتا تھا
اور جب ہم دونوں جدا ہوتے تھے تو یہی نکڑ والا جھونپڑا ہماری
جدائی کی منزل تھا۔ وہ روز مجھے یہاں تک چھوڑنے آتا۔

اُس کے اور میرے درمیان بہت ساری باتیں ہوتیں
وہ خود میں گم رہنے والا آدمی تھا۔ میں دوسروں میں گم ہو کر
اپنے آپ کو بھول جانے کا عادی۔ وہ میری دوسروں میں
گم ہونے والی عادت سے چڑتا تھا۔ لیکن یہ بھی سمجھتا تھا کہ
میرے خمیر میں یہ جذبہ ملا ہوا ہے۔ وہ مجھ سے کبھی کبھی
اُلجھ جاتا تھا۔

ایک دن اُس نے کہا "اتنے دنوں تک تم مارے مارے
پھرتے رہے بتاؤ تم نے کیا پایا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو پایا ہوگا؟"

"صرف تجربات مشاہدات۔"

"ان باتوں کا زندگی میں کیا مصرف۔ جینے کے لیے ان کا
سہارا لیا جا سکتا ہے؟" اُس نے ذرا تیز ہوتے ہوئے کہا۔
وہ دو جمع دو برابر چار قسم کا ٹھوس آدمی تھا۔ اس لیے
مشاہدہ اور تجربہ اُس کے نزدیک فضول سی باتیں تھیں۔

میں نے کہا "نہیں جینے کے لیے ان کا سہارا تو نہیں
لیا جا سکتا ہے۔ لیکن جینے کے لیے اپنے کو تھپکیاں دینے
کے لیے کافی باتیں ہیں۔"

"تو پھر دے ڈالو اپنے من کو تھپکیاں اور لوٹ آؤ اپنے
اُس خود ساختہ جال سے جو دوسروں کے لیے تم نے اپنے
گرد بُن رکھا ہے۔" اُس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیکن تم سوچو کیا انسان صرف اپنے لیے جیتا ہے؟
کیا کسان اپنے لیے اناج بوتا ہے۔ کیا مالی پھل دار درخت
اپنے لیے اُگاتا ہے؟" میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بہت پرانی باتیں ہیں یہ۔ ان میں دیمک لگ چکی ہے
جب تم یہ الفاظ ادا کرتے ہو تو ان سے بھر بھر سی جھڑتی ہے
کیونکہ آج ہر کوئی اپنے لیے جیتا ہے۔"

" بھئی تم نہیں مانوگے، میں نے بحث کو ختم کرنے کے لیے کہا۔
" کیوں مانیں جی ہم آپ کے غلط آدرشوں کو جو آپ کے کاندھوں
پی برابر لٹکے ہوئے نہیں ہیں۔" اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ
ہا۔

اب رات کافی ہو چکی تھی۔ میں اُٹھا تو وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔
م دونوں باتیں کرتے ہوئے نکڑ تک آئے۔ نکڑ کے اُس
ہونپڑے میں ہمیشہ کی طرح ایک کمزور دیا ٹمٹما رہا تھا جو کہ میرے
یالات کی طرح ہی تھا۔ اس کی روشنی دیکھ کر ہم رُک گئے۔
پھر اور باتیں کر کے کل ملنے کا وعدہ کر کے ہم جدا ہو گئے۔

دوسرے دن ایک کسان کے کسی کام سے مجھے قریبی
تحصیل جانا پڑا۔ اور رات وہیں رکنا پڑا کیونکہ اُس کسان کا
ام ادھورا تھا۔ دوسرے دن کام پورا ہونے والا تھا۔

دوسرے دن میں گاؤں لوٹ آیا۔ رات میں اپنے
وست کے گھر گیا۔ وہ میرا انتظار ہی کر رہا تھا اس نے میرا
ستقبال کرتے ہوئے کہا۔" کیوں مسٹر آدرشی کل کہاں اپنا
درشن بانٹ رہے تھے۔" میں نے اُسے اُس کسان کے
ارے میں بتایا تو اُس نے کہا۔" یہاں بھی تمھارے اندر وہی
سب کچھ ہے جو دوسرے شہروں میں تھا۔ یعنی وہی دوسروں
کے لیے گم ہو جانا۔"

میں خاموش رہا تو اُس نے کہا۔" کل میں بیٹھا تمھارا
نتظار کرتا رہا۔ تم نہیں آئے تب مجھے تشویش ہوئی کہ پتا نہیں
تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ میں نکڑ تک گیا۔ وہاں مجھے ایسا لگا کہ یہ وہ
نکڑ نہیں ہے . . ." میں نے بیچ ہی میں اُس کے طنز کا جواب
دیا۔" اچھا تم بھی محسوس کر سکتے ہو۔" اُس نے صرف تیز نظروں
سے دیکھا اور پھر کہنے لگا۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مجھے
روز ٹمٹماتا ہوا دکھائی دیا نہیں تو میں اُس کٹیا کی سمت بڑھتا
چلا گیا۔ کٹیا کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک بڑھیا آڑی ترچھی
سوئی ہوئی تھی۔ بے حسی میں کٹیا کے اندر گیا اور تیلی
سُلگا کر چراغ جلا دیا۔ پھر باہر نکل کر تھوڑی دیر تک تمھارا
انتظار کرتا رہا۔ لیکن تم تھے نہیں کہاں سے آتے۔"

مجھے حیرت کے ساتھ مسرت بھی ہوئی کہ میرا دوست
انجانے میں ایک لمحہ بھر سہی دوسرے کے لیے جی گیا ہے۔ لیکن
میں اُس پر یہ بات واضح نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی دوسروں
کے لیے گم ہونے کا جذبہ رکھتا ہے۔

مجھے گم سم دیکھ کر اُس نے خود ہی کہا۔" تم سوچ رہے ہو
کہ میں نے اُس بڑھیا کے لیے دیا جلایا یا دوسروں کے لیے۔ یہ
بات نہیں ہے بلکہ میں نے اپنی منزل کا نشان پانے کے لیے
چراغ جلایا۔"

" لیکن منزل کا نشان پانے کی ضرورت تو نہیں تھی
تم کو۔"

" ہاں یہ صحیح ہے۔"

" پھر کیوں جلایا تم نے وہ چراغ۔"

" میں نے کیوں جلایا یہ میں بتا نہیں سکتا۔ لیکن وہ چراغ
جلانے کے لیے میں اپنے آپ مجبور پاتا تھا۔ اُس جگہ ٹمٹماتا
چراغ دیکھ کر ہی مجھے اطمینان ہوا تو کیوں؟ یہ میں واضح نہیں
کر سکتا۔"

" پھر ہم دونوں کی خاموشی طویل ہوتی گئی اور وہ اپنے آپ
میں گم ہو گیا تھا اور میں اُس میں گم ہو چکا تھا۔ لیکن ہم دونوں
میں وقفے وقفے سے مکالمے ہوتے رہے۔ اُس کے بعد ہم
دونوں اُٹھ گئے۔ دھیرے دھیرے باتیں کرتے ہوئے نکڑ تک
آگئے۔ میں رُک گیا۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ مجھے بے حد مسرت
ہوئی کہ یہ آدمی بغیر کسی جھنڈے اور کسی توڑے اور پھاڑے
جانے والے اصول کے میری صف میں آگیا ہے۔ یہی راستہ
سیدھا ہے۔ راستہ چلتے جاؤ اور دوسروں کے لیے نشان
چھوڑتے جاؤ۔

OO

نظمیں

کنہیا لال سیٹھیا

نظم

اندھیرے میں
تک رکش کو
آنکھیں —— نہیں
پہچانتے ہیں
پاؤں!

خدا

کس نے دیکھا ہے ——
خدا؟
اس سوال کا جواب ہے
تالاب
جس نے نہیں دیکھا سمندر

نظم

گاؤں —— کتاب
جھونپڑے ——
گلیاں اور راستے —— چھند
کویتا —— بچے

نظم

بھوک ——
پہلے رسوئی میں رہتی تھی
اب —— ہوٹلوں میں بھٹکنے لگی ہے

پیاس ——
پہلے مٹکوں میں رہتی تھی
اب —— بوتلوں میں گھومنے لگی ہے

شرم ——
پہلے پلکوں میں رہتی تھی
اب —— بازاروں میں بکنے لگی ہے

بات ——
پہلے انسانوں میں رہتی تھی
اب —— دیواریں بھی سننے لگی ہیں

ترجمہ : ش، ک، نظام۔

لوری

سُریندر رنگل

میرے لال، تجھے میں چاند دکھانا چاہوں
میٹھی لوری دے کر گہری نیند سلانا چاہوں
چھت پر چڑھ کر جب میں آسمان کی طرف
ہاتھ بڑھاتی ہوں،
تب بمباروں کی گرج سن کر شہر کا
سائرن بجتا ہے
میرا کلیجہ ڈولنے لگتا ہے
اگر وہ خود گھر پر ہوتا تو ہمارا حوصلہ بندھاتا،
نہیں جانتی کس چوٹی پر،
یا پھر کس کھنڈ میں بیٹھا،
وہ موت کے ساتھ لڑ رہا ہے
میرے بازوؤں میں تو ہے
اس کے ہاتھوں میں چند سکے ہیں
تو سو جا
میری چھاتی پر سر رکھ کر

دن چڑھتے ہی بُری بُری چیزیں سننے کو ملیں گی
حملے،
دشمن دیس
جنم بھومی کی رکھشا
میرے لال تجھے میں کیسے سمجھاؤں
ہمارا تو روزگار ہی ہمارا دشمن بن گیا ہے
یا پھر یہ حد بندی ہماری دشمن ہے
یا پھر وہ لوگ جو صرف نعرے لگاتے ہیں
اور بیگانے بیٹوں کو جنگوں میں
مروا ڈالتے ہیں۔
تو سو جا۔
میری چھاتی پر سر رکھ کر

ترجمہ: تاج شما

تبصرے

مجموعۂ کلام : لوحِ بدن۔
شاعر: پریم کمار نظر
ناشر: مکتبۂ منیر ۲۳، ماڈل ٹاؤن، ہوشیار پور (پنجاب)

پریم کمار نظر کا پہلا مجموعۂ کلام "لوحِ بدن" نئی اُردو غزل کے لیے کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ غزلوں کی بنیادی جہت یہ ہے کہ اُنھوں نے بدن کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ اُردو غزل میں جسم اور جسمانی تقاضوں کا ذکر یا تو شجرِ ممنوعہ رہا ہے یا محض جسمانی لذت کوشی کے لیے اس کا اظہار تکلف اور تصنع کے پردوں میں ہوا ہے گو کہیں کہیں یہ پردے اتنے مہین ہیں کہ ان میں سے جسم اپنی تمام تر عریانی سے جھلکنے لگتا ہے۔ نفسانی خواہشوں اور جنس کے جبلی تقاضوں کی نا آسودگی میں چھپتے جسم کا جنسی احساس کی بالیدگی اور بلوغت سے نفسیاتی سیاق و سباق میں آنا خوشگوار اظہار شاید پہلی بار نئی غزل کے کسی پورے مجموعے میں ہوا ہے۔

پریم کمار نظر کا عشقیہ رویّہ نہ تو صوفیانہ نوعیت کا ہے نہ کھلنڈرانہ نوعیت کا۔ وہ اس جذبے کو پورے خلوص اور صداقت سے شعری لوازمات اور فنی تقاضات کی حدوں میں رہتے ہوئے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ یہ حقیقت افسانہ نہیں بننے پاتی۔ چونکہ نظر نے خود کو عشق کے تخیلی مفروضات کا شکار نہیں ہونے دیا اس لیے ان کی غزلیں خود اذیت اور سادیت سے بھی پاک ہیں۔ اُن کے اِن جنسی جذبہ کی "توانائی اور وقار" بھی ہے، بدن کے جادوئی لمس کے احساس سے پیدا کیفیات کا رومانی حسن بھی اور وجدانی سرشاری بھی، لیکن اس جذبے کا سفلی روپ کہیں بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ نظر نے نہ تو بدن اور اس کے چہکتے بولتے لہو سے خود کو محروم کیا ہے اور نہ ہی خود کو اس کا مطیع ہونے کی اجازت دی ہے۔ اس کے سامنے بدن ایک لوح کی طرح ہے جس پر وہ اپنے مخصوص انداز سے عبارت کے حروف ابھار کرتا ہے اور یہ حروف اس کے لطیف احساسات سے ہم آہنگ ہو کر ایک انوکھے ملکوتی نغمے میں ڈھل جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظر نے اُردو غزل کی سمفنی میں ایک انوکھے لہجے کے سُر کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً :

بدن کی اوٹ سے تکنے لگا ہے
وہ اپنا ذائقہ چکھنے لگا ہے

اگرچہ شور بہت کوچۂ ہوس میں ہے
وہ کیا کرے کہ جو چالیسویں برس میں ہے

عجب دشتِ ہوس کا سلسلہ ہے
بدن آواز جن کر گونجتا ہے

رکھ دی ہے اس نے کھول کر اب جسم کی کتاب
سادہ ورق پہ لے کوئی منظر اتار دے

نیلے گرم سمندر سے تو ڈر کر کوسوں بھاگو ہو
ریت میں چت پڑ کے خوش ہو جیف تمہارے جینے پر

نظر نے جنسی تشنگی میں تپتے بدن کے تقاضوں کو غزل کی زبان عطا کی ہے لیکن انھوں نے خود کو اسی دائرہ میں محدود نہیں رکھا، بلکہ جسم کی لذت اور کسک کے وسیلے سے زندگی کی

دوسری الجھنوں کا تجزیہ بھی کیا ہے اور اس طرح جذبہ کو محض احساسی سطح سے اوپر اُبھرنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ ان کے ہاں عشق کی مجبوریاں اور معذوریاں، محرومیاں اور محزونیاں بھی انوکھے ڈھنگ سے ادا ہوئی ہیں۔ مثلاً:

چاروں طرف بچھائے گا پانی کی چادریں
ایسا کہاں کا وہ کہ فریبِ سراب دے

دیکھ آئے اس کو اور دیکھا نہیں
میری آنکھیں اب مرا حصہ نہیں

بچھڑ گیا نہ وہ آخر ادھوری بات لیے
میں اس سے کہتا رہا روز بات ٹال

نظر نے عصری حسیت کے ان عوامل کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا جنھوں نے آج کی زندگی کو ایک مستقل عذاب بنا رکھا ہے۔ انھیں اس بات کا احساس ہے کہ آج کے دور میں کوئی کسی کا نہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد کا فقدان، تہذیبی اور انسانی اقدار کا انحطاط اور اس احساس سے پیدا شدہ ان گنت جہتیں بھی ان کی غزلوں میں کہیں نہ کہیں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔

نظر کا لب و لہجہ بھی بالکل تازہ اور انوکھا ہے۔ عشق اور جنس کے اظہار کے لیے طے شدہ زبان شاید اُن کے کام نہیں آسکی۔ انھوں نے علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے لیے انسان کے تہذیبی و ثقافتی ورثہ کو بھی کھنگالا ہے۔ اس طرح اُن کے ہاں تجربے کی انفرادیت انفرادی استعاروں اور پیکروں کے توسط سے کچھ ایسے اُبھرتی ہے کہ ہر شعر بالکل اچھوتا اور کنوارا لگتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا پیش لفظ، اور شمس الرحمٰن فاروقی کا دیباچہ نظر کے فن کا خوبصورت تعارف کرواتے ہیں شیونگھ کے بنائے ہوئے اسکیچ نظر کے اشعار کی روح اور روح بدن ہونے کے توسط سے لکھی عبارت کے تاثرات کو بہت عمدگی سے اُبھارتے ہیں۔ سلیقہ اور اہتمام سے شایع کی ہوئی یہ کتاب ظاہری اور باطنی خوبیوں کا ایک ایسا مرقع ہے جس سے جنسی احساس کی تفسیر بھی ہوتی ہے، جذبات کی تطہیر بھی اور نظر کی تسکین بھی۔

(آزاد گلاٹی)

کتاب کا نام: ابیات (شعری مجموعہ)
شاعر: مشفق خواجہ
ناشر: مکتبہ نیا دور، کراچی
صفحات: ۱۵۱
قیمت: پندرہ روپے
سنِ اشاعت: ۱۹۷۸ء

ابیات، برصغیر پاک و ہند کے ممتاز محقق، ادیب اور دانشور جناب مشفق خواجہ کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کی شعری تخلیقات جمع کر دی گئی ہیں۔ تحقیق و تنقید کی دُنیا میں مشفق خواجہ کا نام استناد کا درجہ رکھتا ہے مگر بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ برصغیر پاک و ہند کا یہ گوشہ نشیں محقق اپنے پہلو میں شاعری کی ایک دلکش و حسین دُنیا بھی لیے ہوئے ہے۔ ان کے نہاں خانۂ دل میں عشق کی ایک آتشِ خاموش رقصاں ہے جو درد سے مضطرب ہو کر شعر کا قالب دھار لیتی ہے۔ ان کے ابیات میں ایک شاعر دردمند کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کی شاعری، شاعروں کی شاعری نہیں ہے۔ شاعری ان کے لیے ایک اضافی اور ہنستی چیز ہے۔ مگر جو درد و اثر اور گھلاوٹ، مشفق خواجہ کے اشعار میں ہے یہ بات کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک بہت بڑی ریاضت سے گزرے ہیں۔ جس طرح آگ میں جل کر سونا کندن بنتا ہے اس طرح غم کی دھوپ میں جل کر خواجہ صاحب کی غزل میں نکھار آیا ہے۔ ان کی غزل نکھری ہوئی غزل ہے۔ اور نکھرا ہوا ان کا لب و لہجہ ہے۔

مشفق خواجہ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے جس قدر شگفتہ اور محفلوں میں جس قدر باغ و بہار ہیں، اس سے اندازہ

نہیں ہوتا کہ ان کے دل کی دنیا اس قدر مغموم ہوگی جیسا کہ ان کی شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے اگر میں یہ بات کہوں تو شاید بے جا نہ ہوگی کہ ان کی بذلہ سنجی میں کسی گہرے غم کی تلخی بھی شامل ہے جسے وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور جس کا اظہار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔

دراصل ان کے احساس سے ان کا شعور زیادہ طاقتور ہے۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے آگہی حاصل کر کے اس پر مسکراتے ہیں اور یہی ان کی شوخی و ظرافت کا اصل راز ہے۔ اس باب میں ان کی بذلہ سنجی، غالب سے ٹکر لیتی نظر آتی ہے۔

مشفق خواجہ کا دل ایک جہانِ آرزو ہے۔ جہاں ہر زخمِ تمنا، عشرتِ بادۂ دل ہے اور لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونے سے عبارت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ جو جذب و اثر مشفق خواجہ کے اشعار میں ہے ایسے دل گداز آب دار شعر، دوسرے شعرا کے یہاں کم ملتے ہیں۔ اور یہی وہ خوبی ہے جو ان کو ان کے معاصر شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔

ارسطو نے شعر کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ شعر وہ ہے جسے سننے کے بعد دل پر اثر ہو۔ اگر یہ تعریف صحیح ہے۔ تو مشفق خواجہ کی شاعری اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری کو اسی پیمانے سے ناپنا چاہیے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "ابیات" میں سے اب آپ مشفق خواجہ کے وہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ جن میں درد و اثر ہے اور جو سننے والے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ اور وہ ہیں:

ملا تو ایسے ملا جیسے جسم جاں سے ملے
بچھڑ کے یہ بھی نہ پوچھا کہ حال کیسا ہے

اداس راتوں میں بہم سلگتی صبحوں میں
جو غم گسار تھا کوئی تو دیدۂ تر تھا
تمام عمر کی تنہائیاں سمیٹی ہیں
یہی مرے در و دیوار کا مقدر تھا

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے

دل شفق رنگ ہوا ڈوبتے سورج کی طرح
رات آئے گی تو ہر خواب بکھر جائے گا

اس دشتِ بلا میں کہ جہاں ہے گزر اپنا
جز سایۂ غم کوئی نہیں ہم سفر اپنا

تم اپنے گھر کے اندھیرے میں کیا دیکھتے ہو دیواروں کو
یہ شمع کی صورت جلنا کیا، آئے گی ہوا، بجھ جاؤ گے

ایسی سنسان کبھی پہلے نہ تھی ہجر کی رات
دور تک قافلۂ صبح کے آثار نہیں

ان اشعار میں درد و اثر ہے۔ سوز و گداز اور ایک متاثر کن کیفیت ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا فن ان کی شخصیت سے جدا نہیں ہے۔ جو ان کی شخصیت ہے وہی ان کی شاعری ہے۔ فن اور شخصیت کے حسنِ امتزاج سے ان کی شاعری کا تانا بانا بنا ہے۔ قدرت نے انہیں جو صلاحیت دی اور انھوں نے اپنے فن کو اظہار کی زبان دینے کے لیے جو ریاضت اور محنت کی اس کو انھوں نے ضایع نہیں کیا۔ بلکہ جوں کا توں ہم تک پہنچا دیا ہے۔ یہی ان کی شاعرانہ عظمت ہے۔ اس اعتبار سے وہ سچے شاعر ہیں۔ ان کا غم، شعر کے پیرہن میں ڈھل کر سامنے آگیا ہے۔ ان کی شاعری جذبہ و احساس کی شاعری ہے اور ان کے جذبہ و احساس میں وہ درد و سوز ہے جو غزل کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

امید ہے مشفق خواجہ کا یہ مجموعۂ شعری دنیائے علم و ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ کتاب خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ نفیس کتابت و طباعت اور اعلیٰ کاغذ پر چھپی ہے۔ ہر طرح سے دیدہ زیب اور جاذبِ نظر ہے۔ [illegible]
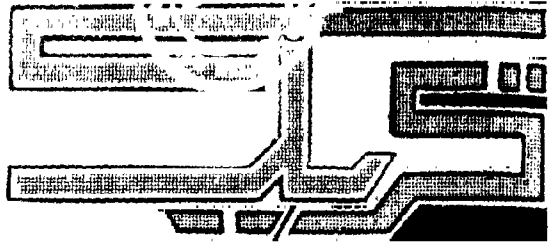
پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

شمارہ ۹ جلد ۲۷

دسمبر ۱۹۷۹

ادارۂ تحریر:

گوپال متل

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:

منیجر ماہنامہ تحریک، ۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت

۹، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات

گوپال مِتّل | چینی کمیونسٹ، ازالۂ سحر کے بعد

ہندوستانی کمیونسٹ اور وہ سوشلسٹ جو اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ یساری سمجھتے ہیں، بدستور ایسے نعرے بلند کر رہے ہیں جن کا ملک کے موجودہ سماجی اور سیاسی مسائل سے کوئی تعلق نہیں اس قسم کے نعرے اکثر روس میں ایجاد کیے جاتے ہیں لیکن یہ نعرے بلند کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ روس جب اس قسم کے نعرے کی تجویز کرتا ہے تو اس کا مقصد ترقی پذیر ممالک کے سماجی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنا نہیں ہوتا بلکہ ان میں افراتفری پھیلانا ہوتا ہے۔

یہ لوگ اگر صرف سستی شہرت کے خواہاں نہیں اور انہیں ملک کی بہبود سے دلچسپی ہے تو وہ چینی کمیونسٹوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ چینی کمیونسٹ کسی وقت روس سے بھی زیادہ انتہاپسند تھے لیکن جب انہیں اپنے ملک کے تعمیری مسائل کا سامنا ہوا تو انہیں محسوس ہو گیا کہ کمیونسٹ نظریہ صرف یہی نہیں کہ اس معاملے میں ان کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا بلکہ وہ اس میں مزاحم بھی ہو رہا ہے۔

پانچویں قومی عوامی کانگریس کے اجلاس کے بعد، جو جون کے مہینے میں ہوا، حقیقت کا یہ اعتراف کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اب طبقاتی جنگ کا ذکر یا تو ہوتا ہی نہیں یا اگر ہوتا ہے تو بہت مدھم سُروں میں۔ اب زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ سیاسی اور اقتصادی دونوں معاملوں میں غیر ادّعائی اور تجرباتی اندازِ نظر کو اپنانا ضروری ہے۔ اب نعرہ یہ ہے کہ "صداقت کی واحد کسوٹی تجربہ ہے"۔ ماؤ کا یہ نظریہ کہ پارٹی میں نئی توانائی پیدا کرنے کے لیے مسلسل سیاسی اتھل پتھل ضروری ہے، اب بہت غیر مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ روزنامہ "گوانگ منہہ" کی ۲۲ اگست ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں فوجی اکاڈمی کے لیڈروں کے ایک مضمون کو نمایاں طور پر شایع کیا گیا ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پانچویں دہے کے بعد طبقاتی جنگ کی پالیسی کی وجہ سے جو غلطیاں سرزد ہوئیں ان سے نا اتفاقی بھی پھیلی ہے اور انتشار بھی۔ اس سلسلے میں بالواسطہ طور پر اسٹالن کو بھی معتوب کیا جا رہا ہے کیونکہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ طبقاتی جنگ سے مجنونانہ وابستگی اور سرمایہ دارانہ نظام کی واپسی کے خطرے پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے چین کو اسی قسم کے مضر اثرات کا سامنا کرنا پڑا ہے جو اسٹالن کی کوتاہیوں سے روس کو پیش آئے تھے۔ طبقاتی جنگ پر بے جا زور دینے سے "ہمارا ملک اور ہماری پارٹی، دونوں ہی افراتفری میں مبتلا رہے اور اقتصادی تعمیر کو بہت نقصان پہنچا۔"

طبقاتی جنگ کے حامی کافی مشکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ ۷ ستمبر کو ہنان ریڈیو نے ایک مہم کا ذکر کیا جو چار افراد کی ٹولی اور ان کے پیروؤں کے خلاف اس صوبے میں جاری ہے۔ یاد رہے اس ٹولی میں ماؤ کی بیوہ بھی شامل ہے۔ نشریہ میں کہا گیا تھا کہ پارٹی کو اس قسم کے لوگوں سے پاک کیا جائے گا اور ان کی جگہ ایسے کارکن بھرتی کیے جائیں گے جو تجرباتی طریقِ کار کو عملی جامہ پہنا سکتے ہوں۔ اسی قسم کی اطلاعات اور صوبوں سے بھی ملی ہیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ۹ ستمبر کو ماؤ کی تیسری برسی کو کسی خاص سرکاری توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا۔

حال ہی میں مالی اور اقتصادی امور پر جو سرکاری

کمیٹی قائم ہوئی ہے۔ اس کی میٹنگوں اور اس کے ساتھ ہی ریاستی زرعی کمیشن کی کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں بنیادی اقتصادی اصطلاحات کے لیے تیار ہیں ان دونوں کمیٹیوں کا رتبہ وزارتی سطح سے اونچا ہے۔

ان سب سے کہیں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کم از کم دو صوبوں نے حال ہی میں چھوٹے پیمانے پر نجی کاروبار کو بحال کر دیا ہے۔ ان انفرادی صنعتی اور تجارتی یونٹوں کی بحالی کا انکشاف پہلی بار ۱۷ر اگست ۱۹۷۹ء کو روزنامہ "نان فانگ" نے کیا، جس نے ایک خبر میں بتایا کہ کینٹن میں پندرہ ہزار اشخاص کو ریاستی انقلابی کمیٹی کے نئے ضابطوں کے مطابق کاروبار کی اجازت دے دی گئی ہے۔ چو چاؤ صوبے کے انشون شہر میں چھوٹے تاجروں کو ۲۷ لائسنس دیئے گئے ہیں۔

نئے ضابطوں کے مطابق زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار نجی تاجروں کو لائسنس دیئے جائیں گے۔ حکام یہ فیصلہ خود کریں گے کہ تاجر کاروبار کہاں کریں اور اس کے ساتھ ہی وہ ان کے کام کرنے کے ڈھنگ کی نگرانی بھی کریں گے۔ بہرحال یہ بات کہ نجی کاروبار کو پھر سے بڑھاوا دیا جا رہا ہے، کافی اہم ہے اور آگے چل کر بڑے کاروباری اداروں کے قیام پر منتج ہو سکتی ہے۔

ہندوستانی پارٹیوں کو چاہیئے کہ وہ روس کی اندھا دھند نقالی کرنے کی بجائے چینی کمیونسٹوں سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں، جنہیں تلخ حقائق اور ذمہ داری کے احساس نے واہموں سے نجات دلا کر حقیقت پسندانہ طور پر سوچنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

اپنے کنبے کی منصوبہ بندی کریں

ماں، بچے اور کنبے کی صحت و مسرت کے لیئے

پہلا جلدی نہیں
دوسرا ابھی نہیں
تیسرا کبھی نہیں

اگلا بچہ تبھی جب آپ چاہیں

آبادی کو بے تحاشا بڑھنے سے روکیے

مفت مشورے اور خدمات کے لیے

نزدیکی ہیلتھ سینٹر میں جائیے

DAVP 79/277

غزل

کرشن موہن

بے سکوں ہوں، ہجر کے موسم میں ہوں
جاں گسل سوچوں کے پیچ و خم میں ہوں

چھائی ہے کیفیتِ رنگ و سرور
نغمہ ہائے دل کے زیر و بم میں ہوں

پہلے ترکِ آرزو کا تھا غرور
آج ترکِ ترک کے عالم میں ہوں

ہے اسی سے زندگی تابندگی
سعیِ پیہم، فکرِ بیش و کم میں ہوں

گرچہ ہوں میں ایک تصویرِ خموش
کافرِ ہرجائی کے البم میں ہوں

میں کہ ہوں احساس (ذوق) کا الماسِ شوخ
جلوہ گر کیفِ سرور و غم میں ہوں

اوس بن کر روئے گل پر ہوں نثار
اشک بن کر دیدۂ پرنم میں ہوں

وہ گیا تو میں ادھورا رہ گیا!
درحقیقت اپنے ہی ماتم میں ہوں

کرشن موہن ہر سمے ہے من مگن
سیلِ کیف و مستیِ پیہم میں ہوں

مجھے کسی سے گلہ نہیں ہے

بل کرشن اشک

کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے
ہر ایک لمحے کو تجربہ کی طرح جیا ہے
بدن کتابوں کی طرح الٹے ہیں اور کتابوں کو جسم کی طرح سر سے پیروں تلک بڑھا ہے
بدن سے منسوب ہر تصور کو استعاروں کی شکل دی ہے
بدن کی ترتیب کے مطابق شریر شعروں کو ماہ پاروں کی شکل دی ہے
بدن کو سلفہ کی لوسے تشبیہ دے کے سگرٹ کو منہ تلک لطف سے بھرا ہے
سحر تلک گھنگروؤں کی بجتی صدا سنی ہے
سحر تلک رات کی لبوں سے کھنچی ہوئی گھونٹ گھونٹ پی ہے
سحر تلک شہر کی سڑک پر مجاز کی طرح وحشت دل سے بات کی ہے
سحر تلک کوٹھیوں کی خاطر بڑی بڑی گالیاں گھڑی ہیں
بدن اگرچہ بہ ضد ہے پرہیز کاریوں پہ
مگر جو یہ سامنے پیالہ ہے نے ہے سگرٹ ہے آئینہ ہے، سپید چادر کی سلوٹیں ہیں
میں کیسے کہہ دوں کہ ان سے میرا کسی طرح واسطہ نہیں ہے

میں خوش ہوں مجھ کو کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے
اگر کوئی مجھ کو میرے بچپن برس دوبارہ دلا سکے تو میں
ان کو پھر اس طرح جیوں گا کہ جس طرح ان کو جی چکا ہوں
کہ مجھ کو خود سے گلہ نہیں ہے
میں خوش ہوں مجھ کو کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے

غزلیں

مخمور سعیدی

یاد کرتے ہیں جنہیں آج کے حالات میں ہم
جی رہے ہیں انھیں گزرے ہوئے دن رات میں ہم

تیری باتوں کی طرف دھیان ہمارا نہ گیا
کھوئے کھوئے سے رہے اپنے خیالات میں ہم

یاد آیا کوئی بھولا ہوا رشتہ جیسے
کھل گئے تجھ سے تو پہلی ہی ملاقات میں ہم

مل رہا ہے کسی کھوئے ہوئے عالم کا سراغ
پا رہے ہیں اک اشارہ تری ہر بات میں ہم

اب وہ نہ آشفتہ خیالی نہ پریشان نظری
دور ہیں خود سے، ترے قرب کے لمحات میں ہم

اس تماشے میں یہ کردار ملا ہے ہم کو
مختلف آئیں نظر مختلف اوقات میں ہم

تیری رونق میں کمی پائی تو لوٹ آئیں گے
شہرِ غم! زندہ ہیں تیرے ہی مضافات میں ہم

کھل کے برسا تھا ترے پیار کا بادل ہم پر
ہاں نہائے تھے کبھی رنگ کی برسات میں ہم

کیا ہمیں بھی کبھی مخمور بدلنا ہوگا!
سوچتے ہیں یہ بدلتے ہوئے حالات میں ہم

مصوّر سبزواری

یہ خرابہ نہیں دوبارہ بگڑنے والا!
بھر گیا اس میں کوئی رنگ ابھرنے والا

آگ پت جھڑ کی چھپائے ہوئے سب رقص کریں
راکھ بن بن کے ہر اک جسم ہے جھڑنے والا

لشکرِ ریگ بسیط بڑھتا چلا آتا ہے
جیسے اس دشت میں ہو رن کوئی پڑنے والا

سونگھیں جب اپنا بدن اس کی ہی خوشبو آئے
ایسا اک شخص بھی تھا ہم سے بچھڑنے والا

ایک اک کرکے بجھے سارے ہی مومی پیکر
کوئی اب معرکۂ شب نہیں لڑنے والا

جانے موسم کی مہک کس سے ہوئی تھی ہمدم
کون ہے تو مجھے باہوں میں جکڑنے والا

غزلیں

عروج زیدی

چمن چمن تری رعنائیوں سے واقف ہے
نظر نظر تری پرچھائیوں سے واقف ہے
پرائے غم پہ کبھی مسکرا نہیں سکتا
وہ دل جو درد کی انگڑائیوں سے واقف ہے
تمہارے لہجۂ گفتار پر ہے جس کی نظر
وہ بات بات کی گہرائیوں سے واقف ہے
سمجھ کے، سوچ کے ہنستی ہے سایۂ گل پر
خزاں بہار کی رعنائیوں سے واقف ہے
ہمارے عشق کو حیرت کا آئینہ کہیے..!
یہ آہٹوں سے، نہ پرچھائیوں سے واقف ہے
اسی کی یاد نے تکلیفِ غم گساری کی
جو مجھ کو دی ہوئی تنہائیوں سے واقف ہے
سکوتِ خاص میں آنکھیں کلام کرتی ہیں
وہ شخص تو سخن آرائیوں سے واقف ہے
ہزار شہرت و ناموس دل نثار اُس پر
جو تیرے عشق میں رسوائیوں سے واقف ہے
فریبِ شرکتِ غم کا طلسم ٹوٹ گیا..!
الم نصیب تماشائیوں سے واقف ہے
وہی نظر جسے تصویرِ التفات کہیں..!
وہی نظر ستم آرائیوں سے واقف ہے
ہزاروں آسماں رفعت ہیں زیرِ خاک، عروج!
فلک زمین کی پہنائیوں سے واقف ہے

حکیم منظور

نفس در نفس اک اذیت سی تھی
کہ ہر بات الجھی ملامت سی تھی
معلّم قبا سبز، گویا منظّر
بدن بھر رقم اک عبارت سی تھی
کوئی خوف سا زاویہ زاویہ!
ہر اک سمت کوئی بشارت سی تھی
کھلے آسماں پر بھروسہ غلط
بھری دھوپ خود اک ہدایت سی تھی
ندا؟ صرف کچھ بہرے کانوں کا سوگ
صدا؟ صرف ذہنوں پہ تہمت سی تھی
وہ انکار کیا تھا کہ تھا لب رقم
وہ الزام جس میں صداقت سی تھی
وہ کیا تازگی جس کا چہرہ نہ تھا
وہ کیا خستگی جس کی صورت سی تھی
وہ کیا رنگ دیکھا نہ جس کو کبھی
یہ کیا بات کیوں اُس کی چاہت سی تھی
ہُوا ہے وہ منظور لے لفظ: اُسے
معانی سمجھنے کی عادت سی تھی!

کشور سین

کھلاوی

بات کل کی نہیں پرانی ہے۔
برسوں پہلے میں نے اسے کافی ہاؤس میں دیکھا تھا۔
ہمارے ساتھ بیٹھا ہونے پر بھی ہمیں نظر نہ آنے والا۔
اس دن وہ برداشت نہ کر سکا۔
اس دن وہ سوال بن بیٹھا اور جواب بھی۔
کافی کی آخری چسکی لے کر اس نے ہمارے چہروں پر نظریں گھمائیں۔ آخر میں اس نے کالے کلوٹے موٹے چشمے اور درمیانہ قد والے ہمارے ساتھی کو گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔
"کب تک مجھے نظر انداز کرتے رہو گے؟" وہ رکا نہیں۔ "تم سب سے زیادہ جانتے ہو اور تمہیں ہی معلوم نہیں۔"
موسم پہلے ہی بے کیف تھا۔ اب گھٹن اور بڑھ گئی۔ ہم چاہتے تھے لیکن اٹھ نہ سکے۔ وہ چاہتا تھا اور بولتا چلا گیا۔
ہمیں پتہ نہ چلا کب پنکھا بند ہو گیا۔ ہم تو بس اسے سننے میں لگے تھے۔

آج بھی ہوا بند ہے۔ سانس لینا مشکل ہو گیا۔
آج بھی وہ بول رہا تھا۔ پہلے کی طرح۔ آج وہ نظر نہیں آرہا۔ نہ میں کافی ٹیبل پر ہوں۔ نہ میرے ساتھ کالا کلوٹا درمیانے قد والا میرا دوست ہے۔ میں اکیلا ہی اس کی آواز سن رہا ہوں۔ کان بند کرنے سے فائدہ؟ وہ کہیں آس پاس سے نہیں بول رہا۔ وہ تو موسم کی طرح بے قابو ہے۔ اپنی رو میں بہنے والا۔ اپنی سنانے پر تلا ہوا۔ اندر باہر کہیں سے بھی۔

گلی کے نکڑ پر بستی ختم ہو جاتی ہے۔
نکڑ پر پہنچ کر منیرا کبھی روک لیتی ہے۔
نکڑ کے آگے کھیت۔ جوتا جاتا ہوا، بویا بوایا۔ کیاریوں میں بٹا کھاد سے بھرا ہوا لیکن ہریالی سے خالی۔

مجھے بے زار دیکھ کر وہ آگے بولنے لگا۔
منیرا کھیت کی منڈیر پہ بیٹھے سوکھی ٹانگوں، مرجھائے بازوؤں اور چھدری داڑھی والے مریل کسان کو دیکھنے لگی۔
بوڑھا کھیت کی بنجر کوکھ میں پڑے بیجوں کو گھورتا رہتا۔ پہلو میں پڑی تازہ ترکاریوں پہ ہاتھ پھیرتا رہتا۔ آہیں بھرتا رہتا۔
ترکاریاں وہ دوسروں کے کھیت سے لاتا۔
کسان اور کھیت کو دیکھ کر منیرا کے دل میں ہوک اٹھتی۔ وہ بستی کی طرف پلٹتی اور .....

منیرا! پانچ بھائیوں کی اکیلی بہن۔ جمنا کی لنگ

مراد۔

بڑے بیٹے کے بعد جمنا مینرا کا ہی جنم مناتی۔ کیرتن کراتی۔ پرساد بانٹتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے مینرا کی کوکھ ہری ہو جاتی ہے۔ جمنا چونک پڑتی۔ اس کے کان کھڑے ہو جاتے — نانی ماں! نانی ماں! — وہ مینرا کا منہ ہاتھوں میں لے کر چوم لیتی۔ ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالتی۔ اسے نانی بننے کا شوق تھا۔

کوئی وقت تھا میں مینرا کی کہانی سن کر اوب جاتا۔ اسے جیب ہو جانے کو کہتا۔ وہ نہ مانتا تو اٹھ کر ٹہلنے لگتا یا کہیں چلنے کی تیاری کرنا شروع کر دیتا۔ اب یہ بات نہیں۔ اب وہ سناتا ہے۔ میں سنتا ہوں۔ وہ نہ بھی سنائے تو بھی سنتا ہوں۔ اپنے کو جاننے اور اور کالے کلوٹے بے لگام دوست کو پہچاننے کیلئے۔

جمنا کا ماتھا اس وقت ٹھنکا جب مینرا کی سہیلیوں پر بہار آنی شروع ہوئی۔ دلاری کے سینے پر نارنگیاں پھوٹنے لگیں۔ رکمنی کا شریر جوبن کی گندھ دینے لگا۔ تارو بھی جسم چرانے لگی۔ شیلو کی آنکھوں میں حیا اور توشی کی آنکھوں میں نسائیت کی کچی چھایا جھلکنے لگی۔ ادھر مینرا! سپاٹ چھاتی۔ خالی چہرہ۔ بے رنگ آنکھیں۔ کچھ بھی کام کا نہیں۔ جمنا بھنّا اٹھی۔

"یہ لڑکی جوان کب ہو گی؟"

پندرہ کا سن پار کرتے ہی مینرا ماں پر بھوت کی طرح سوار ہو گئی۔ اسی سال رکمنی کی شادی ہوئی تو جمنا سے رہا نہ گیا۔ اڑوس پڑوس کی نظروں کو دیکھتی پڑھتی ہوئی وہ بیٹی کو گوکل وید کے پاس لے گئی۔ گوکل نے مینرا کی نبض دیکھی اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پاس پڑی شیشی اٹھائی اس میں پڑے سفوف کی پڑیا باندھنے لگا۔

"ایشور نے چاہا تو لڑکی جلد ہی ہاتھ پاؤں نکالنے لگے گی۔"

تین مہینے دوائی کھانے پر بھی مینرا نے اپنا آپ دکھانا شروع نہ کیا تو جمنا پھر گوکل کے پاس پہنچی۔ وید نے دوائی نہ بدلی۔ معیاد ضرور بڑھا دی۔

"ہر بات ہونے کے لیے وقت مانگتی ہے۔ نراش ہونے کی بجائے انتظار کرنا سیکھو۔"

گوکل نے جھوٹ نہ کہا تھا۔ پانچویں مہینے مینرا کا جسم زاویے بنانے لگا۔ گولائیاں بھی ابھرنے لگیں۔ آنکھوں میں بھی کچھ عجیب سا جھلکنے لگا۔ چھٹا مہینہ پورا ہونے کو تھا کہ اس کے پیٹ میں درد اٹھا۔ جمنا رات بھر پیار رکھنا کرتی رہی۔ صبح ہوتے ہی اس نے بیٹی کی شلوار کا آسن دیکھا اور خوشی سے چلا اٹھی۔ آسن لال ہو گیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس نے خون میں سنی دو چھوٹی چھوٹی گدیاں محلے کے چبوترے پر بیٹھی عورتوں کے بیچ پھینک دیں اور مسکرانے لگی۔

رات بھر پڑوسنیں جمنا کو بدھائی دیتی رہیں۔ گیت گاتی رہیں۔ موج اڑاتی رہیں۔

چوتھے دن سے مینرا بجرنگ بلی کے مندر جانے لگی ہنومان چالیسہ کا پاٹھ کرنے لگی۔ منگلوار کا برت اس کا اصول بن گیا۔ وہ گھر گھر جا کر پرساد بانٹتا بھی نہ بھولی۔

جمنا نے بیٹی کا رنگ روپ نکھرتے دیکھا تو اسے داماد ڈھونڈنے کی فکر ہوئی۔ اس کی مراد پوری ہونے میں دیر نہ لگی۔ ساتھ والے محلے کا رگھو سہرا باندھ کر آیا اور مینرا کو ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔

بیٹی کو سسرال بھیج کر جمنا نواسے کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ پوتے پوتیوں کے جھنڈ میں نواسے کی کمی اسے بری طرح کھلتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے رگھو اور مینرا کی جوڑی گھومتی رہتی۔ کئی بار اسے لگتا اس

نواسا رگھو کی انگلی پکڑے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سے ملنے آرہا ہے۔ جب بھی منیرا مائیکے آتی جمنا اس کے پیٹ پر نظریں جما دیتی اور اس کی آنکھوں میں کچھ کھوجتی رہتی۔

دو سال بیتنے پر بھی منیرا کی گود ہری ہونے کی کوئی نشانی نظر نہ آئی تو جمنا کی جان پہ بن گئی۔ اسے کیے کرائے پر پانی پھرتا دکھائی دینے لگا۔ ایک بار پھر وہ اسے گوکل دیدکے پاس لے گئی۔ اس بار گوکل چونکا۔ اس نے منیرا کو چت لٹاکر اپنی انگلیوں سے اس کا پیٹ ٹٹولا۔ دیر تک اپنے میں ڈوبا رہنے کے بعد وہ بولا۔

"بی بی! میں لڑکی کو عورت بنا سکتا ہوں عورت کو ماں نہیں بنا سکتا۔ دودھ پوت ایشور کی دین یا کرموں کا پھل ہے۔ دوا دارو کا آسرا لینے کی بجائے کسی سادھو سنت کے چرن پکڑ۔ اس کے آشیرواد سے......"

جمنا نے گوکل کی بات پلے باندھ لی۔ اسی شام وہ منیرا کو لے کر شہر کے باہر برگد کے نیچے آسن جمائے، دھونی رمائے سادھو کے پاس جا پہنچی۔ سادھو نے اس کی پکار سن کر آنکھیں کھولیں۔ جے بھولے ناتھ جے شو شنکر کی ہانک لگائی۔ چٹکی بھر راکھ منیرا کے ہاتھ میں تھمائی۔ اسے شو مندر کی راہ بتائی۔ انت میں ایک بات اسے کان میں سمجھائی اور اپنے میں ڈوب گیا۔

منیرا رات دن شو جی کی اپاسنا کرنے لگی۔ صبح شام مندر جاتی۔ بل پترا اور پانی کا گھڑا چڑھاتی۔ مندر کی صفائی کرتی۔ اس کا چبوترہ اور سیڑھیاں دھوتی۔ کبھی کبھار چوری چھپے رات کے اندھیرے میں اپنے کو شولنگ کے ارپن بھی کر آتی۔ لیکن اس کی مراد نہ بر آئی۔

جمنا کی اداسی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ گوکل نے جواب دیدیا سادھو کا آشیرواد بے کار۔ بوکھلا کر وہ منیرا کی ساس پر چڑھ دوڑی۔ سمدھن نے الٹ کر جواب دیا تو داماد میں عیب ڈھونڈنے لگی۔ ہوتے کرتے وہ اس کا ڈاکٹری معائنہ کرانے پر تل گئی۔ اس نے سوچا ڈاکٹر داماد میں نقص نکال دے اور وہ بیٹی کی شادی کہیں اور کر دے۔ اس جوڑی سے نواسہ ملنے سے رہا۔

داماد ڈاکٹری معائنے میں پورا اترا۔ آخری امید کے ساتھ جمنا نے بھی دم توڑ دیا۔ لیکن بیٹی سے کہہ گئی کہ بچہ ضرور جنے۔ بچہ جنے بغیر عورت ماں نہیں کہلاتی۔ سیدھی نرک میں جاتی ہے۔ نگوڑی چڑیل بنی بھٹکتی ہے....

ماں کے جانے کے بعد جلد ہی منیرا کے ساس سسر اپنے اکلوتے بیٹے کو بہو کے رحم پر چھوڑ کر پرلوک سدھار گئے۔ اب منیرا آزاد تھی۔ رگھو کو ایک طرف کر کے وہ محلے کے گبرووں کی طرف لپکی۔ ایک ایک کر کے انہیں آزمانے لگی۔ مہینہ بیتنے کا انتظار کرنے لگی۔ شلوار کا آسن لال ہونا بند نہ ہوا۔ بچہ حاصل کرنے کی تمنا میں اس نے بھولو کہار کو چھوڑا نہ رلدو چمار کو۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر منیرا نے اپنی جھینپ مٹانے کی سوچی۔ رگھو کو یاترا پر جانے کا سجھاؤ دیا۔ بے چارہ مان گیا۔ اسی دن سے منیرا کا پیٹ پھولنے لگا۔ وہ اکثر بالکونی میں کھڑی دکھائی دیتی۔ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکراتی رہتی۔ پڑوسنیں کبھی اسے دیکھتیں کبھی ایک دوسرے کو۔ بڑی بوڑھیوں کی آنکھوں میں امڈتی جگیاسا کو دیکھ کر منیرا نے کیرتن کا پربندھ کیا اور بھوج دینے کے لیے حلوائی بٹھایا۔

کیرتن ہوتا رہا بھوج چلتا رہا۔ منیرا مسکراتی رہی پڑوسنوں کی دعائیں بٹورتی رہی۔ سارا وقت وہ رگھو کے پاس بیٹھی رہی۔ رگھو کے سامنے کسی کو حوصلہ نہ ہو کہ وہ منیرا کے پیٹ کو چھوئے یا اسے دھیان سے دیکھے منیرا ایک ہی رٹ لگاتی رہی۔ پہلا بچہ تیرتھ استھان پر جنوں گی۔ دیوتا کے چرنوں میں۔

کئی مہینے شہر سے باہر رہنے کے بعد منیرا لوٹی تو اس کی گود خالی تھی۔ تانگے سے اترتے وقت وہ بہت اداس

تھی۔ عورتیں اسے گھیرنے لگیں تو رگھو اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت پارو چاچی کے پاؤں چھو کر مینرا زور زور سے رونے لگی۔ دوسرے ہی پل خبر پھیل گئی کہ ہری دوار میں مینرا کے لڑکا ہوا تھا جو پیدا ہوتے ہی چل بسا

چار دن لڑکے کا سوگ منانے کے بعد مینرا نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس نے محلے کے بچوں کو اپنے گھر بلانا شروع کر دیا۔ وہ ان سے لاڈ جتاتی۔ انہیں کھلاتی پلاتی اور ان کو کھیل کھلاتی۔ پڑوسنیں خوش۔ انہیں بچوں کی ہر وقت کی دیکھ ریکھ سے چھٹی ملی اور مینرا سے ہمدردی جتانے کا بہانہ ہاتھ لگا۔

یہ بھی زیادہ دن نہ چلا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر میں بندو کا ننھا مینرا کے گھر سے غائب ہو گیا۔ مینرا کو پتہ نہ چلا بچہ کب دالان پھلانگ کر گلی میں جا پہنچا۔ وہ اسے دور تک ڈھونڈ آئی۔ وہ نہ ملا۔ پتہ نہیں اسے زمین کھا گئی کہ آسمان نگل گیا۔ بدحواس مینرا کو شہر میں پچھلے دنوں ہوئی گھٹنا یاد آئی۔ ایک بانجھ عورت نے اپنی دیورانی کے کمسن بیٹے کو قتل کر کے اس کے خون سے اشنان کیا تھا وہ کانپ اٹھی۔

بندو کو بیٹے کے گم ہونے کی خبر ملی۔ روتی، پیٹتی، دہائی دیتی وہ مینرا پر جھپٹی۔ اسے بالوں سے پکڑ کر نوچنے کھسوٹنے لگی۔

"ڈائن! میرا بچہ کھا کر کیا تو ماں بن جائے گی.... ہائے میرا لال .... ہائے میرا منّا......!"

پولیس آئی۔ مینرا کو پکڑ کر لے گئی۔ کئی دن کی پوچھ تاچھ اور مار پیٹ کے بعد بھاگی کی ضمانت ہوئی تو اسے پتہ چلا رگھو صدمے کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ رگھو کو یقین تھا مینرا نے بچے کو مار ڈالا۔

"یہ عورت ماں بننے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔" وہ آخری دم تک بڑبڑاتا رہا۔

دو سال تک مینرا عدالتوں میں دھکے کھاتی رہی آخر ثبوت نہ ملنے کی بنا پر بری ہو گئی۔

قانون کی نظروں میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی سماج کی نظروں میں قاتل بنی رہی۔ ہر کوئی اسے نفرت سے دیکھ اور منہ پھیر لیتا۔

محلہ میں اس سے کوئی بات تک نہ کرتا۔ سونا مکان کھانے کو دوڑتا۔ بندو کا بچہ پتہ نہیں کہاں سے پکارتا رہتا جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو اور وہ آنٹی کو آواز دے رہا ہو۔ مینرا دن کو روتی رہتی رات کو ڈرتی رہتی۔ تنگ آ کر مینرا نے بچے کو کھوجنے کے لیے دنیا جہان ایک کرنے کی ٹھانی۔ مکان میں تالا ڈال کر وہ جس سمت پاؤں اٹھے چل دی۔

آج کا بے رنگ موسم اپنے کو کوستا ہوا۔ اپنے پر آنسو بہاتا ہوا۔ مجھے پتہ ہے ایسے میں کافی ہاؤس والا دانشور اجنبی آ جاتا ہے۔ بے شک میرے پاس میرا کالا کلوٹا باتونی دوست نہیں بیٹھا پھر بھی اجنبی اپنی کہنے سے نہیں رکے گا وہ بھی جتانا چاہتا ہے۔ آئینہ دکھانا چاہتا ہے۔ کالے کالے بے کار کی باتیں بکنے والے جیسا ثابت کرنا چاہتا ہے کسی طرح بھی مینرا کی کہانی بھولنے نہیں دیتا۔ موقعہ ملتے ہی، موسم بگڑتے ہی اسے دہرانے بیٹھ جاتا۔

گاؤں گاؤں گھومتی اور شہر شہر چھانتی رہی مگر بچہ نہ ملا۔ تھک ہار کر اس نے دم لینے کو کلکتہ کے ایک بچہ خانے میں نوکری کر لی۔

بچہ خانہ کی بڑی ڈاکٹر ورجینا مینرا کے کام سے خوش تھی۔ ایسی لگن والی اور مٹھی ہوئی عورت اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دوسری عورتیں روتے یا بیمار بچے سے اکتا جاتیں۔ اس سے کترانے لگتیں۔ اس کی چیخیں سن کر بھی ان سنا کر دیتیں۔ مینرا کسی بھی حالت میں بچوں سے منہ نہ موڑتی۔ اپنے کو بھول کر انہیں سنبھالتی

جیسے وہ صرف ان کے لیے ہو۔

ورجینا کے بہت کہنے پر مُنیرا نے اسے اپنی کہانی سنائی۔

ڈاکٹر نے مُنیرا کا معائنہ کیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ الجھ کر رہ گئی۔ بڑا عجیب معاملہ تھا۔ اس نے مُنیرا کو اگلے برس تک انتظار کرنے کو کہا۔ اگلے برس کلکتہ میں "ماں اور بچہ" پر ڈاکٹروں کی انٹرنیشنل کانفرنس ہونے والی تھی۔ مُنیرا کا کیس اپنی قسم کا تھا۔ دیش دیش سے آنے والے ڈاکٹروں کے لیے کھوج کا موضوع۔ ڈاکٹری کی سائنس کے علم میں اضافہ کرنے والا معجزہ۔

اسی دوران ورجینا نے مُنیرا کو بچہ خانے کے پلاسٹر کے ماڈل بنانے والے کارخانے میں ٹریننگ لینے کے لیے بھیج دیا۔

کارخانے میں سندر اور سڈول بچوں کے ماڈل بنائے جاتے۔ دور دراز پیدا ہونے والے خوبصورت بچوں کے فوٹو منگوا کر ماڈل تیار کیے جاتے۔ ان کو بیچنے سے جو آمدنی ہوتی اسے بے سہارا عورتوں اور لاوارث بچوں پر خرچ کیا جاتا۔

مُنیرا نے دیکھتے ہی دیکھتے ماڈل بنانے میں مہارت حاصل کر لی۔ جلد ہی وہ کارخانے کے ایک یونٹ کی انچارج بن گئی۔

کانفرنس کا دن آ پہنچا۔ مُنیرا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کی کوکھ اب بھی لہو چھڑکتی تھی۔ اس کی عمر ہی کتنی تھی مشکل سے چالیس سال۔ ایک بار ڈاکٹر اسے وشواس دلا دیں۔ وہ ماں بننے کی کوشش پھر سے شروع کر دے گی۔ دوبارہ شادی کرائے گی۔ کسی کے بھی ساتھ رہ لے گی۔ اپنے من کی سادھ پوری کرے گی اور ماں کے من کی آس۔ گھر واپس جائے گی۔ پہلا بچہ بابا کے قدموں میں ڈال کر بیٹھے گی۔

یہ رہا تیرا لال —

کانفرنس میں آئے، جرمنی سے تالیکا، فرانس سے ساموا اور بارنز، انگلینڈ سے جیمس اور امریکہ سے رنگوے اور بیل سالو۔ اور روس سے نکولائی اور چرٹ کولو۔ دوسرے دیشوں کے ڈاکٹر بھی تھے۔ ان سب کے ساتھ آئے تھے ان کے بیوی بچے۔

کانفرنس شروع ہونے سے پہلی رات مُنیرا ڈاکٹر ورجینا کے ساتھ بدیسی ڈاکٹروں کو دیکھنے گئی۔ ان کی بیویوں سے بات کرتی ہوئی وہ ان کے بچوں کو پچکارنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بچے اس کے من میں بس گئے۔ ان کا شرارتی بھولا پن اس کی آنکھوں میں سما گیا۔ وہ اپنے سے کہہ اٹھی — میرے ماڈل! میری منزل! دوسرے ہی لمحہ وہ ڈاکٹروں کو سہارنے لگی — کاش ان میں سے کوئی ایک میری.....

مُنیرا کے کیس کو خاص اہمیت دی گئی۔ کئی گھنٹے اس کا معائنہ ہوتا رہا۔ کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ شام کو پھر کانفرنس ہوئی۔ تمام رپورٹیں اکٹھی کرنے پر بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا — اگر مُنیرا کے کوکھ ہے تو اسے اپجاؤ بنانا مشکل کام نہیں..... مُنیرا کے اندر کوکھ جیسی چیز ضرور ہے ورنہ وہ ہر مہینے وقت پر لہو نہیں چھڑک سکتی.....

تھک ہار کر ڈاکٹروں نے پھر مُنیرا کو بلایا۔

"تم نے لڑکپن میں کوئی دوائی کھائی تھی؟"

"کھائی تھی۔"

"کتنی دیر کھائی؟"

"چھ مہینے۔"

"دوائی دینے والے ڈاکٹر کا نام اور ڈگری؟"

"وہ تو وئید تھا۔ ہمارے شہر کا گوکل وئید۔ ڈگری وگری کوئی نہیں"

"دوائی کا کیا اثر ہوا؟"

جواب دینے کی بجائے منیرا نے دوپٹہ سینے پر کھینچ لیا۔ اس کا ہاتھ شلوار کے آسن پر جا پہنچا۔

ڈاکٹر تابکا مسکرایا۔ بحور نگوے نے پہلو بدلا۔ ساموں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر رپورٹ لکھی گئی۔

منیرا بانجھ تھی۔ اس کے اندر کوکھ نہیں تھی۔ کوکھ کی جگہ ناسور تھا۔ ناسور گوکل وئید کی دوائی کھانے سے پیدا ہوا۔ ٹٹولنے اور دیکھنے میں وہ کوکھ جیسا تھا۔ وہ ہر مہینے پھوٹتا اور منیرا کی شلوار لال ہو جاتی۔ پھر وہ کوکھ کی طرح ہی بند بھی ہو جاتا تھا۔

رپورٹ پڑھ کر منیرا کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک بھرم تھا جو اسے لیے پھرتا تھا۔ اسے گھر یاد آیا۔۔۔ لوگ اب تک سب بھول گئے ہوں گے۔ اس نے اپنے کو تسلی دی۔

گھر پہنچ کر منیرا نے ہاتھ سے دھکیلی جانے والی بچہ بگھی بنوائی۔ اسے رنگ برنگے پھول پتوں سے سجایا۔ بیٹری سیٹ لگا کر ایئر کنڈیشنڈ بنایا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کا سامان لگایا۔

بگھی کا نام رکھا۔ میور بگھی۔۔۔

میور بگھی تیار ہو گئی تو منیرا نے کسی کا بچہ گود لینے کا ارادہ کیا۔ پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا۔۔۔ کوئی مجھے اپنا بچہ کیوں دینے لگا۔۔۔؟

ہمت کر کے اس نے محلے کی عورتوں سے ان کے بچے کھلانے کی آگیا مانگی۔

بندو نے یہ بھی نہ ہونے دیا۔ سب نے اسے ڈائن کہہ کر دھتکار دیا۔

ناراض ہو کر منیرا نے محلے کے بچوں کا خیال چھوڑ دیا۔ کانفرنس میں آئے ڈاکٹروں کے بچوں کو یاد کیا۔ ان کے ماڈل بنانے میں جٹ گئی۔

منیرا دن ڈھلتے ہی شیشے کی رنگین بگھی صاف کرتی ہے۔ اس میں بدیشی ڈاکٹروں کے بچوں کے ماڈل سجاتی ہے۔ انہیں چومتی ہے۔ پچکارتی ہے دلارتی ہے۔

محلے کی عورتیں اپنے گھروں کے دروازوں پر آکھڑی ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے کھڑے ان کے بچے بھی منیرا کو بگھی دھکیلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ منیرا پلاسٹر کے ماڈل سنبھالتی ہوئی ان کے پاس سے گذر جاتی ہے۔ کبھی کبھار وہ اپنی ماؤں کے دامن پکڑے کھڑے بچوں کو اداس نظروں سے دیکھتی ہے۔

گلی کے نکڑ پر بستی ختم ہو جاتی ہے۔ نکڑ پر پہنچ کر منیرا بگھی روک لیتی ہے۔ نکڑ کے آگے بنجر کھیت کے کنارے بیٹھے مریل کسان کو دیکھتے ہی منیرا کے دل میں ہوک اٹھتی ہے۔۔۔ وہ بگھی کی طرف پلٹتی ہے۔ بگھی میں پڑے بے حس ماڈل۔ بدیسا کے کھیت کی ترکاریاں۔

○

خون

گربچن سنگھ بھلّر
ترجمہ: شریف کنجاہی

کرتارے نے تلوار کھونٹی سے اتاری۔ میان میں سے نکالی اور اس کی دھار پر بائیں ہاتھ کا انگوٹھا آزمایا پھر آنگن میں اُگی ہوئی ٹاہلی کے پاس آیا۔ کلائی جتنی موٹی یک ڈال تنے سے پھوٹ کر ذرا دائیں جانب بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے تلوار کا بھرپور وار کیا اور وہ ڈال مولی کی طرح کٹ کر گر پڑی۔ پھر تلوار کو چوم کر میان میں ڈالا اور گھر سے باہر چل دیا۔

چوپال سے گھر کو آتے ہوئے اس نے چوکیدار کو علان کرتے سنا تھا کہ مربع بندی والے پٹواری گاؤں میں آگئے ہیں۔ یہ سناؤنی جیسے وہ پھونک تھی جو عرصہ سے سلگتے گھاس پھوس کے ابھی جلے کہ جلے ڈھیر میں شعلہ پیدا کر دیتی ہے۔ برسوں سے اس کے دل کے ایک گوشہ میں ایک خلش سی پلتی آرہی تھی لیکن اس کو کوئی پھل نہیں لگ رہا تھا۔ اب اس نے سوچا کہ وقت آگیا ہے اور اگر اسے کچھ کرنا ہی ہے تو اب ہی کیوں نہ کرے جب ساتھ ہی زمین والی بات کا ٹانکہ بھی مربع بندی میں لگ جائے۔

گھر سے نکل کر کرتارا دو میل ہٹ کر گزرتی ہوئی پکی سڑک کو جاتی راہ کو نہ گیا۔ وہ اگلے گاؤں کے اڈے کو جاتی ہوئی سنسان سی پگڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ پندرہ گھماؤں کا معاملہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں تھی لیکن وہ تو اپنے ایک آئندہ کے دشمن کا کانٹا نکالنے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے چلتے آتے کوئی واقف نہ ملے۔ اپنے منصوبے کی گمبھیرتا کا خیال کرتے ہوئے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ پہلے اس نے رات کی بس میں سفر کا سوچا تھا لیکن اس طرح وہاں جا کر تڑکا ہو جاتا اور ایسے کاموں پر جانے والوں کو وہاں رات ہی موزوں ہوتی ہے۔

کئی بار کرتارا اپنے ہم مشربوں میں جب پی رہا ہوتا تو لاف بازیاں کرتا کہ "اپنے سامنے تو یارو ایسا وقت بھی آتا ہے کہ دریا رک جاتا ہے"۔ کبھی کبھی منڈلی میں سے کوئی پھبتی بھی لگا دیتا ہے کہ "جس کی ماں کو گھر سے نکالا ہے وہ ہی تجھے پوچھے گا کہ دریاؤں کے پانی کیسے رک جایا کرتے ہیں۔ وہ بھی ابھی تو دہی کے ساتھ روٹی کھا رہا ہوگا"۔ اور کرتارا خفیف سا ہو جاتا اور کہتا — "وہ تو کیڑے پتنگے جتنا چھوکرا ہے میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ پھر سالو اس کی ماں کو میں نے گھر سے بے گھر کر دیا ہے۔"

جب کبھی ایسی بات چھڑتی اکثر آئی گئی ہو جاتی لیکن کرتارے پر ایک اثر ضرور چھوڑ جاتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ ٹھیک ہی اس کا کل کا دشمن دور بیٹھا دہی کے ساتھ روٹی کھا رہا ہے۔ اور لاکھ وہ آج کیڑا پتنگا سہی وہ بڑا ہو کر سانپ بھی بن سکتا ہے۔

نرم سی دوپہر ہونے لگی تھی۔ بس آئی۔ کرتارے نے شکر کیا کہ بس میں اس کے گاؤں کا کوئی آدمی نہیں تھا وہ درمیان میں جا کر کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور سوچ رہا تھا کہ مجگر کے قتل والے معاملے میں وہ لوگوں کی نگاہوں میں بالکل صاف نہیں تھا۔ گاؤں میں اس وقت لوگ اس کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں

بولتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ اس کا اس معاملہ میں سیدھا ہاتھ ہے۔ کوئی کہتا کہ اسے پتہ ضرور تھا۔ عام چرچا یہی تھا کہ پولیس پہلے اسے بھی شامل کر رہی تھی لیکن راتوں رات اس نے تھانے دار کو رقم جھونک دی تھی اور کلونت آپ بھی شک کرتی تھی کہ قتل میں کرتارے کا ہاتھ ہے

بھاگی جا رہی بس میں سے دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر پھیلتی ہوئی نگاہ ڈالتے اس نے سوچا کہ اسی لئے تو اس کے گھر آباد ہونا۔ اس نے قبول نہیں کیا تھا۔

جب گاؤں کے دو اور آدمیوں پر جگر کے قتل کا مقدمہ بن گیا تو کرتارے نے کلونت کو گھر آباد کرنے کی بات چلائی تھی کہ جگر کے قتل کے بعد وہ بالکل بے آسرا ہو گئی تھی۔ ساس سسر پہلے ہی مر چکے تھے اور بس دو سال کا ایک بیٹا ہی اس کا سہارا تھا۔ کرتارا سمجھتا تھا کہ ایک تو کلونت بے سہارا ہونے کے باعث شاید اس کی بات کو نہ ٹالے۔ دوسرے رشتہ داری کے لحاظ سے بھی وہ اپنا حق سمجھتا تھا کہ جگر دادا پوتے ناتے کا وہ ایک ہی تو بھائی تھا اور اگر کلونت اس کے گھر نہ بسے گی تو کیا کرے گی۔

پہلے کرتارے نے شاموں نائن کے ذریعہ پیغام بھیجا۔ پھر اس نے آپ سیدھے سیدھے کلونت کیساتھ بات کی۔ کلونت کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"کرتارے تو نے یہ بات کرنے کی جرأت کیسے کی! ابھی تو مرنے والے کی راکھ بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اور میرے لئے تو وہ عمر بھر گرم رہے گی۔"

کرتارے نے لکڑی کے ایک ٹکڑے سے زمین کریدتے ہوئے کہا "کلونت کور شاموں نائن نے بھی یہی جا کر کہا تھا۔ پر مجھے گلے والی قسم ہے کہ جگر سنگھ کے قتل کا مجھے ذرا بھی پتہ نہیں تھا۔ لوگ سالے یونہی بے پرکی اڑاتے رہتے ہیں۔"

"لوگ تو بے پرکی اڑاتے ہیں۔ لیکن بنئے سے پیسے بیاج پر لے کر تھانے دار کی جیب بھرنے کی تجھے کیا مجبوری تھی؟" کلونت نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی سالے سے پیسے لے کر نہیں دیئے تھے۔ اور پھر اب تو مارنے والے بھی پکڑے گئے ہیں دودھ پانی الگ ہو گئے ہیں۔"

"کرتار دودھ پانی تو خدا نتارتا ہے۔ لیکن تو اس قسم کی بات کو پھر نہ چھیڑنا۔ خدا کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ مجھے یہ بال پال لینے دے۔ جو ہونا تھا ہو گیا" کلونت نے سماجی انداز میں کہا۔

"کلونت کور ـــ بھائی کا مجھے کیا دکھ نہیں ہے۔ بھائی تو دایاں بازو ہوتے ہیں۔ ...." کرتار مسکین بنا کھڑا تھا۔

"اگر اب بھی تو سمجھے .... اس میں بھی تیرا ہی خون ہے ...... بڑا ہو گا تو تیرا مان بنے گا"

"میں اسی لیے تو تجھے کہتا ہوں۔ لیکن تو کان ہی نہ دھرتی۔"

"نہیں کرتارے۔ تو اپنے گھر رس بس۔ مجھے اپنے دکھ بھوگنے دے۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ خدا کے لیے مجھے اس بال کو پالنے دے۔ میں اس پر ان باتوں کا سایہ نہیں پڑنے دینا چاہتی۔"

کرتارے کا خیال تھا کہ لالٹین جیسی کلونت گھر کا اجالا بن جائے گی۔ بالک اس کا کل کا دشمن بننے کی جگہ اسے باپ سمجھنے لگے گا۔ اور پندرہ گھماؤں زمین مزید اس کے قبضہ میں آ جائے گی۔ لیکن وہ عورت بڑی چالاک نکلی۔

بس پھر کسی اڈے پر رکی۔ کرتارے کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ باہر ایک آٹھ نو سال کا لڑکا میٹھی گولیاں بیچ رہا تھا۔ کرتار نے سوچا کہ اب تو وہ بھی اتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔ اور اگر کلونت اسے آب دینے لگی ہو تو پانچ سات سال بعد وہ اس کی گردن کاٹ سکے گا۔ کرتارے کے ساتھ والے گاؤں میں ایک چودہ سال کے لڑکے نے اکیلے ہی چالیس سال کے ایک آدمی کو قتل

رہ دیا تھا

باہر قدرے اندھیرا سا ہونے لگا تھا۔ کرتار نے دیکھا ہ ایک بادل کا ٹکڑا سورج پر چھا گیا ہے۔ اس نے لگام پھر بس کے اندر کر لی۔ اس کے جی میں آیا کہ لوگ جگر کے متعلق پہلے ہی اس کو ابھی تک مشکوک سمجھتے یں اور یہ بات تو دیر سویر کھل ہی جاتی ہے۔ لیکن اس کا ندیشہ پھر جاگا کہ اگر اس نے سستی سے کام لیا تو لڑکا جوان ہو کر پہل کر جائے گا۔ جاٹوں کی خصومت تو پشتوں تک جاتی ہے۔

پھر اگر اس کا اپنا منصوبہ ٹھیک رہے تو دس س کی اپنی اور پندرہ جگر والی مل کر پچیس گھماؤں ا پورا مربع بن سکتا ہے۔ اور وہ سردار کہلوا سکتا ہے۔ ب جن کے پاس وہ زمین حصے یا ٹھیکے پر ہوتی ہے وہ موجیں کر رہے ہیں۔ کلونت جب سے اپنے باپ کے ساتھ چلی گئی ہے بس دو تین بار خاموشی سے شہر آئی ور بنئے کے ذریعہ زمین حصے یا ٹھیکہ پر دے گئی۔

کرتار کو کلونت کا گاؤں میں نہ آنا چبھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ کلونت کے دل میں کھوٹ ہے۔ کلونت کے ساتھ کی کہائی باتوں میں سے اسے صرف اسی قدر یاد تھا کہ وہ بھی لوگوں کی طرح جگر کے قتل میں اسے ملوث سمجھتی تھی۔ اور اس کی باقی باتوں کو وہ چکنی چپڑی سمجھتا تھا۔

لیکن کرتار کے ہونٹوں پر ایک دم پھر خشکی سی آگئی۔ اگر کوئی الجھاؤ پڑ گیا تو؟ جگر کے قتل میں اس کا براہ راست کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پھر بھی تھانے دار نے اسے بلوا کر کھونٹی پر لٹکی ہوئی ہتھکڑی دکھائی تھی۔ کرتارے نے سوچا کہ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ چاہتا تو جگر کو گزرنے والے حادثے کے متعلق پہلے بتا سکتا تھا۔ لیکن اسے تو یہی خیال تھا کہ وہ جگر کی صرف ٹانگ ہی کاٹیں گے۔ اور شریک کی ٹانگ کٹ جائے تو اس میں ایک داخلی سکون ملتا ہے۔

گیلے اور دیپے نے ایک زمین رہن لینے کا سودا کرنا چاہا تھا۔ جگر نے بھاؤ بڑھا کر وہ زمین خود لے لی۔ انہوں نے جگر سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ وقوعہ کے روز جگر اگلے کھیت گیا ہوا تھا اور گیلا اور دیپا اپنے کھیت میں بھٹی لگائے بیٹھے تھے کرتارا اپنے کھیت میں سے سانڈ بھگاتا ہوا اچانک ان کے پاس آنکلا۔ گرم گرم دارو کے نشہ میں انہوں نے اسے بتایا کہ وہ آج جگر کی ٹانگ کاٹ دینے کے لئے بیٹھے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ کرتارے کے ساتھ بھی جگر کی گاڑھی نہیں چھنتی۔

کرتارا تو وہاں سے چلا آیا۔ دن ڈھلے جب جگر اگلے کھیت سے لوٹا تو گیلے اور دیپے دونوں نے اسے گھیر لیا۔ گیلے نے گنڈاسہ اس کی ٹانگ کی طرف چلایا لیکن وار خالی گیا۔ جگر بھاگ کر نکلنے لگا تو گیلے نے للکارا کہ دیپے جاٹ ہاتھ سے گیا۔ مار میرے سالے کو" اور دیپے نے برچھا اس کے پہلو کی طرف پھینکا۔ ضرب سے جگر لڑکھڑا کر لوٹ گرا کہ اس کا اپنا بوجھ ہی برچھے کو اور گہرا گرد گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پولیس کو پتہ چل گیا تھا کہ کرتارا اس دن گیلے اور دیپے کے پاس گیا تھا۔ اور بڑی مشکل سے اس نے سودی پیسوں سے تھانے دار کو کانا کر کے اپنی گلو خلاصی کروائی تھی۔ اور اب جب وہ اپنے ہاتھوں سے ایسا کام کرنے جا رہا تھا تو کیا بنے گا۔ بات تو چھپی نہیں رہ سکتی۔ بھتیجے ہی کا خون کرنے والی بات سے اسے کراہیت سی آئی۔ اور اس کا جی چاہا کہ اگلے اڈے پر اتر کر واپس چلا جائے۔

لیکن وہ اس کا بھتیجہ کہاں تھا؟ وہ تو اس کا کال کا دشمن تھا۔ پھر اسے اس گاؤں میں کون جانتا ہے جب وہ وہاں پہنچے گا اندھیرا ہو گیا ہو گا۔ رب خیر کرے تو سویرے واپس اپنے گاؤں میں ہو گی۔ اگر کوئی اڑچن پیدا ہو گئی تو دو گھماؤں رہن رکھ دوں گا۔ جگر والی پندرہ گھماؤں تو مل ہی جائے گی۔ اور قتل میں تو آج کل کون سزا پاتا ہے۔ اس نے سوچا کہ کسی

ہاتھ پاؤں توڑ دو تو چار سال جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے لیکن قتل کر دو تو بری کہ کبھی موقعہ کا گواہ نہیں ملتا کبھی کوئی قانونی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ....

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ وہ نیچے اترا تو سورج بالکل نیچے جا چکا تھا۔ اور ابھی اسے تین کوس کی مسافت کرنی تھی۔ اس وقت تک تو خاصی تاریکی چھا چکی ہوگی۔ وہ من میں تدبیریں کرتا ہوا جا رہا تھا کہ معاملہ ڈھب سے کیسے نبیڑے۔

تھوڑا تھوڑا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں میں کتے بھونک رہے تھے۔ وہ پگڈنڈی کے قریب ہی ایک کنوئیں کے پاس بیٹھ گیا۔

بیگانی بستی تھی۔ نہ کسی سے جان تھی نہ پہچان۔ اور ایسے منصوبے پر آئے وہ کسی سے کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا کرتارا کے من میں پھر خوف جاگا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ چلے سے لڑکے کا اور اگر داؤ چل جائے تو کلونت کا بھی ٹنٹا چکا کر اپنے گاؤں لوٹ جائے اور کسی کو بھنک تک نہ پڑے۔

وہ پھر دلیر ہو گیا۔ کس سے سراغ نشانی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جگر کی شادی سمے برات کا اتارا جس دھرم شالہ میں ہوا تھا اس کے قریب ہی تو جگر کے سسرال والوں کا بیرونی گھر تھا اور اندر والا گھر روٹی کھاتے وقت اس نے اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔ کیا عجب رب مہر کرے اور دونوں ماں بیٹا اکیلے باہر والے مکان کسی کام کاج کو آئے ہوئے مل جائیں.....

کھیت میں سے کوئی پگڈنڈی کی طرف آ رہا تھا کرتار نے اپنے من میں کہا ــــ "چلو جیسے موقعہ بنے گا دیکھا جائے گا پہلے منصوبہ بنانے کی کیا ضرورت۔" تلوار اس نے کنوئیں کی منڈیر پر رکھ دی اور کھڑا ہو گیا۔ آنے والا کوئی لڑکا سا تھا جس کے پاس خالی برتن تھے۔ شاید کھیت پر روٹی دے کر آیا تھا۔

"کاکا ـ یہ گاؤں سون پورا ہی ہے نا؟" کرتارے نے لڑکے کے ساتھ بات چلائی۔ "مربع بندی نے راستے بھی بدل دیئے ہیں۔"

"ہاں سون پورا ہی ہے۔ پہلے راستہ ادھر سے ہوتا تھا۔" لڑکے نے دور کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"تیرے باپ کا نام کیا ہے؟"

"سُچا سنگھ۔"

کرتارے نے ذہن پر زور ڈالا۔ جگر کے سسر کا نام بھی سُچا سنگھ تھا۔ لیکن اس کی گھر والی کو مرے برسوں ہو گئے تھے۔ یہ کسی اور سُچا سنگھ کا بیٹا ہوگا۔ اس نے سوچا کہ اگر بالک کو باتوں میں لگا لے تو شاید کوئی بھید مل جائے۔ چنانچہ مذاق کے طور پر اس نے لڑکے سے کہا۔

"تجھے اس وقت اکیلے آتے ڈر نہیں لگتا۔ ہم تو تیری عمر میں شام سمے گھر سے باہر نکلتے ڈرتے تھے۔"

"ڈر کس کا ــ؟" لڑکے نے بے جھجک جواب دیا۔

"ہمارے گاؤں میں تو چور تیری عمر کے لڑکوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں ــ" کرتارے نے ہنس کر کہا۔

"مجھے کون ہاتھ لگا سکتا ہے۔ مالوے میں میرا شیر جیسا چاچا ہے کرتارا۔ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ....."

لڑکے نے بے ارادہ ہی کنوئیں پر پڑی تلوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کرتار کو زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے دوڑ کر اسے آغوش میں لے لیا۔ اور خوب بھینچا۔

تلوار کنوئیں کی منڈیر پر ہی پڑی رہ گئی۔ سون پورے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اس کی دونوں آنکھیں ٹپ ٹپ برس رہی تھیں۔

○○

نظمیں

سید فضل المتین

یہ دھرتی

یہ دھرتی
کوکھ سے جس کی جنم لیتی رہیں، کمیاب تر، نایاب تر اشیاء
یہ دھرتی
جس کو 'ماں' کہتے ہیں، ہم اور تم
یہ دھرتی
بے زبان، مظلوم بے بس۔ غمزدہ۔ دھرتی
نہ جانے ؟
کتنے یگ سے۔ بس، یونہی
خاموش سہتی ہے
ہر اک وہ ظلم ——
جو اس پر
بدلتی رت نے ڈھایا ہے
یہ دھرتی
بے زبان، مظلوم، بے بس۔ غمزدہ
کیوں ہے ؟
یہ دھرتی
کیا، یونہی، ظلم و ستم سہتے
وجود اپنا گنوا دیگی
خموشی سے —— !!!

فیاض رفعت

ایک نظم

جنھیں چاہتے ہو پسند کرتے ہو
ان کی روحوں کو ٹٹولو
سچائیوں کی گرہوں کو کھولو
وہاں بھی اندھیرے کھنڈر ہیں
وہاں بھی ویران منظر ہیں
وہاں بھی زخموں کے بسیرے ہیں
وہاں بھی تنہائیوں کے ڈیرے ہیں
وہ بس ہنستے ہیں نمائش کے لیے
ان کی زہر خند ہنسی کو سمجھو
گوشۂ عافیت انہیں ملے
نہ تمہیں ملے گا
کہ وہ بھی عادی خواہشوں کے
کہ تم بھی عادی آرزوؤں کے
جنہیں چاہتے ہو پسند کرتے ہو
ان کی روحوں کو ٹٹولو
سچائیوں کی گرہوں کو کھولو

غزل

کرشن مراری

مہکی مہکی شام البیلی مادکتا کا رُوپ بنے
کھوئی دل کی بات کہے ہے کوئی دل کی بات سنے
بیکل بیکل کورے آنچل۔ اِس بستی کے بھیگ گئے
پنگھٹ پنگھٹ سہ پاروں کی چنچل سی اک بھیڑ لگے
قحط پڑا ہے لفظوں کا اب، کیسے کوئی بات کہے
پت جھڑ کے موسم میں یارو برگ و گل نایاب ہوئے
بیکل جھونکا شوخ پون کا۔ ایک کہانی کہتا ہے
بہکی بہکی سی سرمستی۔ پلکوں پر جب آن گرے
بھولی بھالی سی نظروں سے۔ تکے ہے وہ اِدھر اُدھر
آج فقیر کی جھولی بھر دے۔ آیا ہے اک آس لیے
سرسوں کا پیلا پن نلپے۔ موسم کی ہریالی کو
بات چھڑی جب مٹیاروں کی پیپل کے پتے کھڑکے
سورج کی پہلی کرنوں نے اس کا ماتھا چوما تھا
شبنم کا اک بے کل موتی۔ برگِ گل پر رقص کرے
من میں جوت جگا کر جوگی "الکھ نرنجن" گاتا تھا
پھیل گیا اک گیت گگن میں گھنگھرالے کُنڈل چھنکے
رسوائی سے بچنا شاید۔ اب اتنا آسان نہیں
ستھرے ستھرے سے دامن پہ اک میلا سا داغ لگے
اونہ موہنی سا جن میرے، یاد مجھے اب آئے ہے
جھوٹا جھوٹا تیرا وعدہ۔ برگد کے اس پیڑ تلے
ویرانہ سا ویرانہ تھا۔ آبادی سی آباد ہے
ہم کچھ اپنے اندر شاید۔ کچھ اپنے سے باہر تھے

غزلیں

مظفر حنفی

کوئی شاخ پھولوں سے خالی نہ تھی
مگر ایک پودے پہ بالی نہ تھی

سسکنے لگیں کھوکھلی سیپیاں
ابھی ہم نے حسرت نکالی نہ تھی

کئی پھول کھلنے سے کیوں رہ گئے
ہوا فطرتاً لاابالی نہ تھی

کماں دار کا حکم ہی آگیا
سپر اب تلک ہم نے ڈالی نہ تھی

لٹاتا رہا نقدِ جاں چار سو
مرے در پہ دنیا سوالی نہ تھی

بلا وجہ تم کیوں خفا ہو گئے
محبت، مرے یار، گالی نہ تھی

مظفرؔ گہن کھا گیا اس لیے
کہ سورج پہ کیچڑ اچھالی نہ تھی

احتشام اخترؔ

دلِ تباہ میں رنگینئ خیال کہاں
لدی ہوئی تھی جو پھولوں سے اب وہ ڈال کہاں

مجھے مٹانے کی کوشش فضول ہے یارو
میں مثلِ موجِ صدا ہوں مجھے زوال کہاں

تمام عمر مہکتے رہیں گے دل میں مرے
تمہارے پیار کے زخموں کی ہے مثال کہاں

ضیائے شمس بلاتی ہے اپنے پاس مجھے
میں اس سے آنکھ ملاؤں مری مجال کہاں

اجاڑ دشت کی مانند روز و شب ہیں مرے
بکھیریں سانس میں خوشبو وہ ماہ و سال کہاں

خود اپنے ہاتھ سے میں نے اڑائی ہے گردن
کہ ہوگا دوش پہ اب سر مرا وبال کہاں

متاعِ دردِ گراں ہے دیارِ عشق میں اب
اسے خرید لوں اتنا گرہ میں مال کہاں

غزلیں

سلیمان خمار

جب سمندر کے سفر سے لوٹ کر آتا ہے وہ
مچھلیوں کو ریت پر پھیلا کے تڑپاتا ہے وہ

یوں نہ ہو جھونکا ہوا کا دے مجھے خیراتِ عمر
ہر نئی کھڑکی پہ اک پردہ لگا جاتا ہے وہ

جب ابھرتا ہے وہ سورج بن کے شہرِ ذلیت پر
کتنے راحت بانٹتے سایوں کو کھا جاتا ہے وہ

یاد آجاتا ہے جب بھی پی کے اک چبھتا سوال
نیند کی دہلیز پر کانٹے بچھا جاتا ہے وہ

اپنے پیچھے مجھکو دوڑاتا ہے وہ بن کر سراب
پیاس کی شدت کو میری اور بڑھاتا ہے وہ

راج کھیتی (ساؤتھ آل۔ انگلستان)

جو شخص اپنے ذہن کے نشے میں چُور رہتا
وہ منزلِ حیات کی سرحد سے دور تھا

ملنے کو یوں تو ملتے تھے کچھ لوگ روز ہی
لیکن دلوں کے بیچ میں پردہ ضرور تھا

جب روشنی کی آنکھ اندھیرے میں کھل گئی
پھولوں میں تھی مہک تو ہوا میں سرور تھا

آخر دبک گیا وہ اندھیرے کی گود میں
سورج کو اپنے نور کا بے حد غرور تھا

آخر ہمیں کو ہار ہوئی جیت کے بھی راجؔ
بازی کا کچھ خیال نہ کوئی شعور تھا

غزلیں

عابدؔ مناوری

لشکر فصیلِ شہر تک آکر پلٹ گیا
بے جنگ کیسے آج سکندر پلٹ گیا

موتی وہ کیوں بکھیرتا اندھوں کے سامنے
دریا سے خالی ہاتھ شناور پلٹ گیا

دل کی گلی بھی بھول بھلیوں سے کم نہ تھی
حیران ہیں سبھی کہ میں کیوں کر پلٹ گیا

شاید مرے لہو کے نمک میں کشش نہ تھی
سینے تک آکر آج بھی خنجر پلٹ گیا

دریا کے بدلے سامنے تھا ایک ریگ زار
سورج غروب ہوتے ہی منظر پلٹ گیا

غرقاب کر کے آیا تھا کتنی ہی بستیاں!
صحرا کو دیکھتے ہی سمندر پلٹ گیا

اس بے حسوں کے شہر میں عابدؔ وفا نہ ڈھونڈ
مجھ تک وہ آیا اور یہ کہہ کر پلٹ گیا

خلش بڑودوی

کچھ گداز ہو پیدا کاش ان کے سینوں میں
شمع اک جلا دی ہے میں نے بے یقینوں میں

ایک میں تنِ تنہا کتنے بت گراؤں گا
ہیں خدا ہزاروں اس شہر کے مکینوں میں

اب کہاں وہ پہلا سا شوقِ خامہ آرائی
چار حرف لکھتا ہوں وہ بھی اب مہینوں میں

دھیرے دھیرے گھٹتی ہے اس کے جسم کی طاقت
رفتہ رفتہ پستا ہے آدمی مشینوں میں

گھر کے رہ گیا ہے یوں خواہشوں میں دل میرا
جس طرح حسین ابنِ مرتضیٰ لعینوں میں

یہ خلوص یہ چاہت صرف ایک دھوکہ ہے
ہم سبھی تو رکھتے ہیں خنجر آستینوں میں

عیب بھی خلشؔ میرا اب ہنر کی صورت ہے
وہ ہوا جما دی ہے میں نے نکتہ چینوں میں

غزلیں

شاہ حسین نہری

میں فوت ہوا تو کیا ہوگا
موجود رہا تو کیا ہوگا

ہر سمت لپکتی امیدیں
کچھ بھی نہ ملا تو کیا ہوگا

تھک ہار کے شب کے جنگل میں
جی چھوٹ گیا تو کیا ہوگا

گونگا سا ہے یوں تو سناٹا
یہ بول اٹھا تو کیا ہوگا

یہ جھوٹ ہے، لیکن تیرے سر
یہ جھوٹ گیا تو کیا ہوگا

آہٹ سی کوئی آتی جائے
وہ آ ہی گیا تو کیا ہوگا

اللہ تو پالن ہارا ہے
اک شاہ مرا تو کیا ہوگا

شکیل مظہری

فریب اوروں کو دیں، خود فریب کھائیں کیوں
وہی ہوا ہے تو پھر ہم دیے جلائیں کیوں

ہر ایک آنکھ سے غائب ہے آشنائی یہاں
اب ایسے شہر میں زخمِ وفا دکھائیں کیوں

نہیں ہے کوئی بھی پچھلے غموں پہ رونے کو
نظر کے سامنے بیتے دنوں کو لائیں کیوں

گذرتے لمحوں کی اب چاپ بھی نہیں آتی
چراغِ اشک سے ہم رہگذر سجائیں کیوں

وفا شناس کوئی بھی نہیں یہاں تو شکیلؔ
بھٹک رہی ہیں مگر ہر طرف وفائیں کیوں

نور تقی نورؔ

مطمئن شہر میں کہاں ہیں سب
اب گھروں میں بھی بے اماں ہیں سب

کارِ حرف و ہنر، خدا حافظ
انگلیاں آج خونچکاں ہیں سب

کیا تعصب کا کہر ہے ہر سو
بستیاں دور تک دھواں ہیں سب

ایک بوسہ ہے زندگی لیکن
اس کی لذت کے سرگراں ہیں سب

برف آلود یہ ضعیف چراغ
آخرِ شب کی داستاں ہیں سب

عزتیں، دولتیں، کراماتیں
اڑ نہ جائیں، یہ تتلیاں ہیں سب

میں ہوں اُس دور کی غزل اے نورؔ
جس کے نقاد بے زباں ہیں سب

غزلیں

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

لہلہاتے ہوئے ہرے پتے
سوکھ کر زرد پڑ گئے پتے
ہر طرف ہیں سیاہ پوش درخت
جانے کس نے جلا دیے پتے
آندھیوں نے مزاج پوچھا تھا
تھرتھرا کر بکھر گئے پتے
زخم خوردہ پرند بیٹھے ہیں
سرخ ہو جائینگے ہرے پتے
غالباً خشک ہو گئیں شاخیں
اڑ کے پانی میں آ گئے پتے
جب بھی پھولوں کی سمت بڑھتا ہوں
روک لیتے ہیں راستے پتے
باغبانوں کی عقل حیران ہے
اتنی شاخوں میں بٹ گئے پتے
رازؔ ہمراہ لے گئی ہے خزاں
یادگار بہار تھے پتے

اظہرؔ عنایتی

کچھ عارضی اجالے بچائے ہوئے ہیں لوگ
مٹھی میں جگنوؤں کو چھپائے ہوئے ہیں لوگ
اس شخص کو تو قتل ہوئے دیر ہو گئی
اب کس لیے یہ بھیڑ لگائے ہوئے ہیں لوگ
برسوں بہ لینے درد نہ اٹھکھیلیاں کریں
اب تو نئے غموں کے ستائے ہوئے ہیں لوگ
آنکھیں اجڑ چکی ہیں مگر رنگ رنگ کے
خوابوں کی اب بھی فصل لگائے ہوئے ہیں لوگ
کیا رہ گیا ہے شہر میں کھنڈرات کے سوا
کیا دیکھنے کو اب یہاں آئے ہوئے ہیں لوگ
کچھ دن سے بے دماغی اظہرؔ ہے رنگ پر
بستی میں اسکو سر پہ بنائے ہوئے ہیں لوگ

پروین کمار اشکؔ

آ ہمارے درد سے تم اپنا سلسلہ رکھ
جو بن پڑے تو غریبوں سے رابطہ رکھ
بڑا قریب بھی آنا ہے باعث غم دل
دلوں کے بیچ میں تھوڑا سا فاصلہ رکھ
کہ ایک خوشبو ہوں کیا جانے کب ہوا
تم اپنے گھر کا دریچہ ذرا کھلا رکھ
بھٹک نہ جاؤں کہیں تیرگی کے جنگل م
دیا دعا کا مرے واسطے جلا رکھنا
چلے ہو اسکی عدالت میں فیصلہ سنـ
تو اشک دل کسی چٹان سا کڑا رکھ

واپسی

مرزا حامد بیگ (پاکستان)

پسندیدگی کی وجہ میں نہیں جانتا، لیکن یہ تصویر
ے سب سے زیادہ پسند ہے۔

بغیر عنوان کی اس تصویر کے پس منظر کا رنگ دیگر
م رنگوں پر چھایا ہوا ہے۔ کالے رنگ سے ابھرتی
یلی لکیریں آگے آکر بہت واضح ہو جاتی ہیں۔ نیلے رنگ
ا جال دھیرے دھیرے پوری تصویر کو اپنی لپیٹ میں
تا ہے۔

اس کے بیچوں بیچ صرف ایک، خستہ بھورے
گ کی اینٹوں کی سیڑھی ہے جو اوپر کو جاتی ہے۔ ساتویں
سیڑھی سے اوپر کا حصہ نظر نہیں آرہا۔ لیکن یہاں
بھی کچھ رہا ضرور ہے، جو اب موجود نہیں۔

یہ اندازہ میں نے دونوں جانب سے اینٹوں کی
نشان سے لگایا ہے۔

پہلے یہی روز ______

یہ بہت پہلے کی بات ہے، جب میری بیوی دو
یوں کو چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی
تھی۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی کالے پس منظر میں نیلے
نگ کے جال نے مجھے سب سے اوپری سیڑھی پر لا
بٹھایا تھا۔ جب سے اب تک میں بے حس و حرکت اکڑوں
بیٹھا ہوں۔

میری آنکھ کی پتلیاں ساکت ہیں۔ میں جانتا ہوں
میری ذرا سی جنبش سے تمام سیڑھی دھڑام سے نیچے
رہے گی۔

میں سامنے تکتا ہوا، ہر لحظہ توازن قائم رہنے کی
دعا مانگتا ہوں۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں بڑی مشکل
سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ تب میں بہت زور سے ہانپتا
ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ سیڑھی جس پر میں بیٹھا
ہوں اس کی بنیاد ہل گئی ہے۔

میں تاریک سناٹے میں بھورے رنگ کے مسالے
کے تڑخنے کی آواز سنتا ہوں، جس سے اینٹیں ایک
ہیں۔

آخر یہ ٹوٹ پھوٹ کب تک چلے گی۔ ایک وقت
آئے گا جب ______

میں اس سے آگے سوچتا ہوں۔ ایسے لمحات میں میری
بے نور پتلیوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

میرے سامنے میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔

بڑی اور چھوٹی ______ بڑی بہت دنوں
سے بجھی بجھی نظر آتی ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے اس نے فیصلہ
کیا ہے کہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چھوٹی اس کا تو
لڑکپن ہے۔

جب میں انہیں دیکھ پاتا ہوں تو ہانپتا ہوں اور
ٹوٹ پھوٹ ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہے، جس سے
بچنے کے لئے میں پھر ساکت ہوتا ہوں۔

مجھے یوں ہانپتے دیکھ کر پہلے پہل چھوٹی کھلکھلا کر
ہنس دیتی تھی۔ یہ اس کا بچپن تھا۔ لڑکپن میں وہ
پریشان دکھائی دیتی، لیکن کچھ دنوں سے وہ پھر
ہنسنے لگی ہے۔

ہنسی ہنسی میں وہ بڑی ہو جاتی ہے بالکل بڑی کا
اک نقشہ ـــــــــــ پھر اس کے دھندلاتے ہوئے
چہرے سے میری بیوی کا چہرہ ابھرتا ہے۔
تب میرا سانس اکھڑتا ہے۔
دونوں منہ سے کچھ کہتی ہیں اور سوچتی کچھ ہیں۔
"پاپا، اب بہت ہو گئی" وہ کہتی ہیں۔
میں گم سم بیٹھا رہتا ہوں۔
چھوٹی کو یہ تصویر بالکل اچھی نہیں لگتی۔ کئی بار
مجھ سے بحث کر چکی ہے کہ کلینڈر میں سب سے بری
تصویر یہی ہے۔ میں اس تصویر کے حق میں دلائل
دیتا ہوں، لیکن میرے پاس دلائل کی کمی ہے۔
میں اس سے بحث نہایت دھیمے لہجہ میں کرتا ہوں
مجھے ڈر ہے کہیں وہ اسے چپکے سے اکھاڑ نہ پھینکے۔ وہ
نہیں جانتی کہ اس کی سب سے اوپر کی سیڑھی پر تو
میں بیٹھا ہوں۔
اگلے ماہ کی تصویر میں جوگیا رنگ نمایاں ہے۔
یہ تصویر بغیر عنوان کے تھی، لیکن اب اس
پر کونے میں موٹے قلم سے قدرے خوش خط
SEPARATION لکھا ہے۔ بڑی نے بہت
سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اس کا عنوان
یہی ہو سکتا ہے۔
تصویر میں گہرے برش سے جوگیا رنگ نیچے
سے اوپر کی طرف کر دیا گیا ہے۔ یہ تصویر دیکھ کر یوں
لگتا ہے جیسے اناڑی مصور نے اپنا برش صاف کرتے ہوئے
سب کو بے وقوف بنایا ہے، تصویر میں بہت سے بے
چہرہ لوگوں کو چلتے پھرتے دکھایا گیا ہے۔ سب کے سب
جوگیا لباس پہنے ایک دوسرے سے بے نیاز گھوم رہے
ہیں۔ سب کے رنگ زرد اور نیچے سے اوپر کی طرف جوگیا
رنگ بڑھ رہا ہے۔
بڑی کو یہ تصویر ہمیشہ اداس کر دیتی ہے۔
چھوٹی تمام تصویروں کو جلدی جلدی پلٹتی ہے،
بعض اوقات اس کی آنکھیں بھی بند رہتی ہیں۔
غالباً اس کی پسندیدہ تصویر اس کلنڈر میں موجود
نہیں ہے۔
آج وہ کالج سے واپسی پر مارچ کے مہینے والی
تصویر کے سامنے دیر تک کھڑی رہی تھی۔ شاید وہ
بھی کوئی عنوان سوچ رہی ہو۔
اس تصویر میں پختہ اینٹوں کے بنے چھجے کے نیچے
ایک بچہ ہاتھوں میں گلدستہ لیے اوپر دیکھ رہا ہے، جہاں
ایک گڑیا سی لڑکی، اس کی موجودگی سے پوری طرح
باخبر، بازو پھیلائے ناچ رہی ہے۔
مجھے اس گنجل سے نکل کر اس دریچے تک جانا
چاہیئے۔ جہاں چھوٹی، اپنی بڑی بہن کے سر کے سفید
بال چنتی ہے، اور وہ، کرسی کے ایک ہی رخ پر
بیٹھے بیٹھے سوکھ گئی ہے۔
میں ارادہ کرتا ہوں، تب سانس اکھڑنے
لگتی ہے۔

○○

اوم پرکاش لاغر

ایک یوگی کی خود نوشتہ سرگزشت

جب میں نے اپنا ارادہ گھر والوں پر منکشف کیا تو کہرام بپا ہو گیا۔ ماں نے سر پیٹ لیا۔ باپ نے میری پیدائش کو ایک افسوسناک سانحہ قرار دے دیا۔ بیوی چھاتی پر دوہتڑ چلانے لگی۔ صرف بھائیوں کو خوشی ہوئی کہ میرے حصہ کی جائیداد انہیں ملنے والی تھی۔

میں اس دن اوپری منزل پر اپنے کمرے کی سلاخوں دار کھڑکی سے ڈھلتے سورج کی احمریں شعاؤں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سورج کی لحظہ بہ لحظہ ڈوبتی شعائیں اپنے کرب یا لذت، کو کسی غیر مرئی طریقے سے میرے وجود میں منتقل کر رہی تھیں اور میں اپنے پیدائش کے کرب یا لذت کو ناپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن نیچے سڑک پر رینگتے ہوئے لاتعداد اجسام کا بے ہنگم شور اور لایعنی آوازوں کے ریلے میری سماعت پر تھپیڑے چلا چلا کر مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اب میرے لئے انہیں نظر انداز کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

اچھا.... اچھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اب ان کی بات بھی سننا ہوگی۔

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

لیکن وہ آوازیں اس حد تک آپس میں خلط ملط ہو الجھی ہوئی تھیں کہ میرے لئے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہو گیا تھا اور میں خود بھی ان کی گرفت میں آنے لگا تھا۔ آوازوں کا وہ آکٹوپس میرے وجود کو جکڑ کر اپنے لمبے بازوؤں کے ذریعہ میرے جسم کا خون پی چکنے کے بعد جب میری روح پر کچوکے لگانے لگا تو میں شکست ریختہ اعصاب کو مجتمع کر کے بلا اختیار چیخ پڑا اور پھر میں نے اعلان کر دیا۔

مکان کی چمنی میں سے آوازوں اور شور کا دھواں نکل نکل کر جب کسی ہنگامے کا پیغام آس پاس کے لوگوں کو دینے لگا تو لوگ جوق در جوق گھر کی طرف آنے لگے۔ یہ دھواں آگ بھی بن سکتا تھا اور آگ پھیل کر بہت کچھ چاٹ سکتی تھی، اس لئے لوگوں کا مشوش ہو جانا فطری تھا۔

اب نیچے کا ہجوم میرے اس اعلان کے بعد اپنے منفی پن کو چھوڑ کر واضح اور مثبت شکل اختیار کر رہا تھا اور میرے گھر کا محاصرہ کر رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ حیرتناک بات تو یہ تھی کہ میرے گھر والے سب سے آگے تھے۔ پتہ نہیں کب وہ لوگ زینے پھلانگ کر کمرے میں گھس آئے اور سب کچھ تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے میری آنکھوں میں سے ڈوبتے سورج کی احمریں شعاؤں کا انعکاس نکال باہر پھینکا اور میرے آس پاس کی ہر چیز سے میری نظروں کو نکال نکال کر واپس میری آنکھوں میں ڈال دیا۔ میں صرف ہاتھ ملتا رہ گیا۔

میں نہیں جانتا کہ یہ کب ہوا مگر اچانک میں نے اپنے آپ کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا پایا۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھ سے ایک جرم سرزد ہو چکا ہے۔ ایک ناقابل معافی جرم، اور کہ میں عوامی عدالت کے سامنے جوابدہ ہوں۔ میں عوام کی اس چابکدستی پر متحیر رہ گیا۔ جب انہوں نے فوری طور پر ایک عدالت کی تشکیل کر کے اپنے فرض میں ذرہ برابر بھی کوتاہی نہیں کی تھی۔

" تم کیا چاہتے ہو؟" مجھ سے سوال کیا گیا۔
میں کیا چاہتا ہوں ؟" میں نے حیرت سے سوچا۔ بڑا
عجیب سوال تھا۔ یہی ایک سوال مجھے نہ جانے کب سے
پریشان کر رہا تھا۔ ایک قطرے کو سمندر کے بہاؤ کی
سمت سے کیا سروکار؟ وہ تو بس بہے جاتا ہے۔ اور جب
میں اسی بھیڑ کا حصہ تھا۔ میں ان سے الگ کب تھا؟ وہ
پاس روز، جیب میں سلاخوں دار کھڑکی میں سے جھانک
رہا تھا۔ میرا وہ احتجاجی اعلان ایک ایسے تغیر و تبدل کا غماز
تھا جو مجھ میں نہ جانے کب سے ہو رہا تھا۔ ورنہ اس سے
پہلے بھی تو کبھی بارہا اپنے آپ سے پوچھنے پر مجھے پتہ چلا کہ
تھا کہ میں اندرونی ہیجان میں مبتلا ہوں اور کرکشش ثقل
کی گرفت سے آزاد ہو کر خلا میں آوارہ بے مقصد بھٹک
رہا ہوں ___ اور اب یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں
کیا چاہتا ہوں۔
" میں گیان مارگ پر جانا چاہتا ہوں ___ سکون کی
تلاش میں " میں نے بالآخر کہا
" کیوں ___ ؟"
" میرے اندر سے آواز آتی ہے کہ مجھے جانا چاہیئے "
" اور یہ جو باہر سے اتنی آوازیں آ رہی ہیں۔ تمہارے
ماں باپ کی، بیوی کی، ہماری، کہ نہ جاؤ ___ ؟" انہوں
نے کہا۔
یہی تو روکتی رہی ہیں آج تک ___ میں نے سوچا
ان تمام زنجیروں کو توڑ کر پھینک چکا ہوں۔ مگر
میں ان سے آنکھیں ملا کر اس حقیقت کا اظہار نہیں کر سکتا
تھا۔ میں خاموشی اور بے چارگی سے ان کی طرف دیکھنے لگا
اب میرا انفرادی مسئلہ ایک عوامی موضوع بن چکا تھا
سب لوگ حیرت و استعجاب سے میری طرف دیکھ رہے
تھے۔
" گیان کو کہاں تلاش کرو گے؟ سوال کیا گیا۔
" میں نہیں جانتا " میں نے نظریں جھکا کر کہا
انہوں نے فاتحانہ نظروں سے ایک دوسرے
کی طرف دیکھا۔
" یہی تو پریشانی ہے۔ !" انہوں نے کہا " یہی تو
پریشانی ہے کہ تم جانتے ہی نہیں تو سکون کہاں تلاش
کرو گے۔ لیکن فکر نہ کرو، ہم تمہیں بتائیں گے کہ سکون
کہاں مل سکتا ہے۔"
" کہاں مل سکتا ہے ؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا
" ہمارے ساتھ چلو " انہوں نے کہا اور مجھے ایک
سنسان مقام پر لے جا کر تفصیلات سمجھانے لگے۔

تارکول کی پکی سڑک پر بس یکساں رفتار سے
دوڑی جا رہی تھی۔ میں کھڑکی پر کہنی ٹکائے پیچھے بھاگتے
ہوئے لمحات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پرانی اور
شکستہ ہونے کے باوجود یہ بس آرام دہ تھی۔ گیان
مارگ پر جانے والے افراد نے بار بار راستے کی دشوار
گذاری کا رونا رویا تھا اور میں بھی اندر ہی اندر
ڈر تا رہا تھا۔ لیکن ___ اوہ ! یہ تو اتنا پر آسائش
سفر تھا۔ شانتی نگر ___ انہوں نے کہا تھا۔ شانتی
نگر ہی ایک ایسی بستی تھی جہاں گیان اور سکون
بکثرت دستیاب ہو سکتے تھے، اور کہ اس کے لیے جنگل
جنگل پربت پربت بھٹکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔
میری آنکھوں کے سامنے وداع کا وہ منظر گھوم
گیا۔
وہ سب مجھے الوداع کہنے بس اسٹینڈ پر جمع
ہوئے تھے۔ سیٹزنز فورم کے صدر نے میرے گلے میں
پھولوں کا ہار پہناتے ہوئے کہا تھا کہ یہ امر باعث مسرت
تھی کہ میں اس راستے پر جا رہا تھا اور کہ سماج مجھ جیسوں
کی وجہ سے زندہ تھا۔ پھر مجھے پھولوں سے لاد دیا گیا۔ اتنا
خلوص اور اتنا پیار ___ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ
سوچا تھا کہ میں ان لوگوں کے لئے کبھی اتنا اہم بن
جاؤں گا۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے
اور گلا رندھ گیا تھا۔

جب بس رک گئی تو کنڈکٹر نے میرے پاس آکر بڑی حلیمی اور انکساری سے کہا۔

"جناب شانتی نگر آگیا ہے۔ نیچے تشریف لایئے۔"

میں نے چونک کر بس کے اندر نظر دوڑائی لیکن بس میں نظر رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ میری طرح گیان اور سکون کے بہت سے متلاشی بس میں سوار تھے اور اب وہ سبھی آہستہ آہستہ بس سے اتر رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے اعضار سمیٹے اور اترنے لگا۔ لیکن جونہی میں نے زمین پر پاؤں رکھا مجھ پر گائیڈوں نے یورش کر دی۔ وہ سبھی مجھے اپنی اپنی دکانوں پر لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے ایک سلجھا ہوا دکھائی دینے والے گائیڈ کا انتخاب کیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن اس کے چلنے سے پہلے میں اس کا تصدیق شدہ اجازت نامہ دیکھنا نہیں بھولا تھا۔ مجھے خاص طور سے اس کے متعلق تنبیہ کی گئی تھی کہ کچھ غیر ذمہ دار افراد سے بھی میرا سابقہ پڑ سکتا ہے۔

"اور اب جناب" گائیڈ نے مجھ سے کہا "میں آپکو گیان اور سکون کی مختلف دکانوں پر لے چلوں گا۔ شانتی نگر میں شانتی ہی شانتی ہے۔"

وہ بڑی بڑی عمارتیں تھیں جن میں دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ گنبدوں اور محرابوں والی فلک بوس عمارتیں تھیں جن کے اندر عجیب الخلقت دیو قامت بت ایستادہ تھے۔ ان عمارتوں کے کچھ حصے بالکل خالی تھے جہاں کچھ لوگ، میرے گائیڈ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی گیان کے متلاشی تھے، اپنے جسموں کو مختلف انداز میں توڑ مروڑ رہے تھے۔ سلگتی ہوئی خوشبوؤں نے ماحول کو مافوق الفطرت کیفیت کا حامل بنا دیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اگرچہ ساری عمارتوں کے خط و خال تقریباً ایک سے تھے پھر بھی ساری عمارتوں کے صدر دروازوں پر مختلف ناموں کی تختیاں آویزاں تھیں۔

"گیان مارگ اور راہِ سکون تو بہت آسان ہے"

عمارتوں کے منتظمین نے مجھ سے کہا۔ "لیکن یہ سودا بہت مہنگا ہے۔"

"اخراجات کی پرواہ مت کرو"۔ میں نے کہا "یہ بتاؤ کہ اس کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا ــــ؟"

میرے گائیڈ نے مجھے ان گنبدوں اور محرابوں والی عمارتوں کے منتظمین کے حوالے کر دیا اور چلا گیا۔ اور اب میرے وہ قائد مجھے ایک بہت بڑے احاطے میں لے گئے جہاں بہت سے لوگ وحشیانہ انداز میں ناچ رہے تھے۔ اور کسی نا قابلِ فہم زبان میں کچھ گا رہے تھے۔ گا کیا رہے تھے بلکہ چلا رہے تھے۔

"خاموش ــــ" میرے قائد چلائے۔ ان کی آواز سب پر بھاری تھی۔ ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ اور پھر مجھے مختلف النوع صوتی تجرباتی دور سے گذرنا پڑا۔

انہوں نے کہا آسمان کی طرف منہ کرو۔ میں نے کہا آسمان کہاں ہے۔ تو انہوں نے میرے سر کو پیٹھ کی طرف اس طرح جھکایا کہ دھڑ کے ساتھ زاویہ قائمہ بن گیا۔

"آسمان وہاں ہے۔ اوپر" انہوں نے کہا۔

"مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے حیرت ظاہر کی "وہاں تو خلا ہے، صرف خلا ــــ آسمان کہاں ہے۔؟"

"آسمان اوپر ہے۔ خلا سے بھی آگے" انہوں نے سمجھایا "بہت بہت اوپر ہے آسمان ــــ اور گیان، سکون اور جو کچھ بھی جاننے کے قابل ہے وہیں ہے۔ یہاں کیا ہے یہاں تو کچھ نہیں ہے۔ ایک اور دنیا آباد ہے وہاں۔ ایک دفتر ہے وہاں اور اس دفتر میں ہمارے اعمالناموں کی فائلیں رکھی رہتی ہیں جو فرشتوں کی تحویل میں ہوتی ہیں۔ بہت بڑا عملہ ہے فرشتوں کا۔ ہماری ہر نقل و حمل پر نگاہ رکھی جاتی ہے اور ہماری حرکات و سکنات اور منہ سے نکلنے والے الفاظ کا بھی من و عن اندراج ہوتا ہے۔ اس لیے ہم ناچتے ہیں اور گاتے ہیں تاکہ وہ جو وہاں ہیں انہیں متوجہ کر سکیں۔

میں ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے سن رہا تھا۔

اوہ — اچھا.... اچھا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا — تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے اپنی کم عقلی پر شدید غصہ آنے لگا۔ سب کچھ وہیں ہے اور میں سب کچھ یہیں سمجھتا رہا آج تک۔ بھلا اس دھرتی پر کیا ہو سکتا تھا؟ — ان نئی حقیقتوں کے انکشاف پر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

پھر میں ان کے کہنے کے مطابق خلا سے بھی پرے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر مختلف نام لے لے کر چیختا رہا اور بقیہ لوگوں کے ساتھ ناچتا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر۔ یہاں تک کہ میرے حلق میں خراشیں پڑ گئیں اور میری آواز بھرا گئی۔ اور میں ہانپنے لگا۔

"رک کیوں گئے؟" انہوں نے پوچھا

"تھک گیا ہوں۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا

"تھک گئے ہو؟" وہ مسرت سے اچھل پڑے "تھوڑی دیر کوشش تو کرو۔"

میں پھر چیخنے لگا اور ناچنے لگا۔ پھر میں نیچے گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آنے پر میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔

"مبارک ہو۔" انہوں نے کہا "تمہیں سکون مل گیا ہے۔"

"لیکن مجھے تو محسوس ہی نہیں ہو رہا کہ سکون مل گیا ہے۔" میں نے نحیف سی آواز میں کہا۔

"تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟" انہوں نے طیش میں آکر کہا۔ "تمہیں ابھی کیسے محسوس ہو سکتا ہے سکون۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ تمہیں سکون مل گیا ہے۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ ابھی گیان مارگ پر چلنا ہے"

ان کے چہروں کے جلال اور تحکمانہ لہجہ سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ لوگ غلط نہیں ہو سکتے۔ اور مجھے واقعی سکون مل گیا ہے۔

"آؤ — آؤ — ابھی بہت لمبا سفر باقی ہے۔ گیان مارگ کا" انہوں نے کہا۔

میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور میرا ہاتھ پکڑ لیا گیا اور پھر میں اگلے سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں میری آنکھوں پر سے پٹی اتار دی گئی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور —

بہت گھنا جنگل تھا ضخیم جسامتوں والی کتابوں کا بہت گھنا جنگل تھا۔ دیو قامت آسمانی کتابوں کے دیو قامت درخت تھے جن سے گھنی گھنی شاخیں پھوٹتی تھیں۔

"بنی نوع انسان کے لیے یہ جنگل آسمان سے اتارا گیا ہے۔ گیان مارگ یہیں کہیں ہے — تلاش کرو" انہوں نے کہا۔

بہت گھنا جنگل تھا۔ اتنا گھنا کہ سورج کی کرنیں اوپر اوپر ہی سے واپس لوٹ جاتی تھیں۔ ضخیم جسامتوں والی کتابوں کے بڑے بڑے پہاڑ تھے۔ میں کئی برسوں تک ٹھوکریں کھاتا رہا اور سطروں کی کڑیاں ملاتا رہا لیکن لفظوں کے بیچ کی خلا مسلسل بڑھتی گئی اور لفظ ایک دوسرے سے قطعی لاتعلق ہوتے گئے حتیٰ کہ ایک ایک لفظ اپنی بے چارگی اور ادھورے پن کا نوحہ سنانے لگا۔ اور تب میں نے محسوس کیا کہ لفظوں کے بیچ کی خلا میں کششی لہریں ناپید ہیں اور کہ ایٹم کے الیکٹرون ابدی رقص ختم کر کے ماہیت کو مسخ کرنے کے درپے ہو گئے ہیں۔

میں نے ان کے آگے پھر اپنا مسئلہ رکھ دیا اور کہا کہ میں شاخوں میں ہی الجھ گیا ہوں، جڑوں تک نہیں پہنچ رہا ہوں۔

"یہ بات ہم جانتے ہیں۔" انہوں نے انکشاف کیا "مگر جڑوں تک تم پہنچ ہی نہیں سکتے۔ بہت گہرے میں جانے کا تمہارے پاس نہ تو وقت ہی ہے اور نہ زادِ راہ — لیکن شاخوں کی شگفتگی سے کیا تم جڑوں کے

مضبوطی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ "تمہیں الفاظ کو ان کی خارجی ہیئت میں قبول کرنا ہوگا۔ بیچ کی خلا میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش نہ کرو۔ الفاظ کی سرحدوں سے پرے کچھ بھی نہیں ہے۔ الفاظ ہی فکر کا سرچشمہ اور ماحصل ہیں۔

یہ لوگ کتنا کچھ جانتے ہیں۔ میں نے حیرت سے سوچا اور پھر گڑگڑا کر کہا۔ "میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے راستہ دکھاؤ کہ میں اب دیکھنا بند کر دوں گا۔"

میری اس خود سپردگی پر وہ آبدیدہ ہو گئے اور ملا سے پرے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کسی ناقابلِ فہم زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے۔

اس کے بعد انہوں نے میرا منہ کھولا اور ضخیم صفحاتوں والی وہ ساری کتابیں میرے منہ میں ڈال دیں۔ اور پھر وہ لمبی لمبی لاٹھیوں سے ضخیم صفحاتوں والی ساری کتابیں میرے حلق سے نیچے اتارنے لگے۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے جس کی دیواروں پر سیاہ رنگ تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی سیاہ رنگ کر دیا گیا تھا کہ روشنی کی کرن اندر نہ آسکے کیونکہ خود سپردگی کے بعد سے میں نے دیکھنا بند کر دیا تھا۔ انہوں نے دروازوں، کھڑکیوں اور روشندانوں کی درزوں میں پگھلا ہوا موم بھر دیا کہ تازہ ہوا کے جھونکے نہ در آئیں اور میری عقل کو بانسوں پر نہ چڑھا دیں۔

"یہاں تم تجزیۂ نفس کر سکو گے" انہوں نے کہا اور چلے گئے۔

بڑا عجیب ماحول تھا۔ ابتدا میں مجھے گھٹن محسوس ہوئی تھی۔ سانس رکنے لگی تھی۔ یہ شاید ازمنۂ قدیم کے رشیوں کی کوئی اقامت گاہوں کا جدید ترجمہ تھا۔

تو میں سمادھی میں ہوں۔ میں نے سوچا اور مجھے یاد آیا کہ صدہا برس پہلے گیان مارگ پر جانے والے پہاڑوں اور جنگلوں میں غاروں میں بسیرا کرتے تھے۔

میں تن بہ تقدیر ہو گیا۔

انہوں نے کہا تھا کہ میں یہاں تجزیۂ نفس کر سکوں گا۔ لیکن بہت جلد اندھیرے اور گھٹن کے ذرات نے میرے جسم کے مسامات میں سے گزر کر میرے حواس پر یلغار کر دی اور میرے احساسات کو ماؤف کر دیا۔ اب میں شاید اسی مرحلے پر پہنچا جا رہا تھا جہاں محسوسات کی اہمیت ختم ہو جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے وقت کا احساس فنا ہوتا گیا۔ میرے جسم اور میرے ذہن نے ماحول کی مطابقت سے ارتقاء کے کئی مدارج طے کر لئے۔ اندھیرے کمرے کی بودوباش نے آنکھوں کی ضرورت ہی ختم کر دی۔ ضخیم صفحاتوں والی وہ ساری کتابیں جنہیں میرے حلق میں اتارا گیا تھا، میرے خون میں سرایت کر گئیں اور سارے الفاظ میرے خون میں رچ بس گئے۔ لفظوں کے بیچ کی خلا میں کشتی لہریں تلاش کرنے کی محرک وہ رجحاناتی کیفیت معدوم ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں وجود اور پہچان کے انضمام نے اپنی بازیافت کے کرب سے نجات دلوا کر زندگی کی ہمہ گیر مقصدیت کے تخیلاتی پرندے کی ریڑھ کی ہڈیاں توڑ دیں اور انہیں قبروں میں دفن کر کے مجھے مفقود الخبر کر دیا۔

اور پھر میں پتھر کی طرح بے حس اور پر سکون ہو گیا۔

میں محرکات کی حدوں کو پھلانگ چکا تھا۔

اور اب بصارت کی افادیت کے بے معنی ہو جانے کی وجہ سے میں روشنی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ ایک بار صرف ایک بار کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا تھا کہ باہر روشنی ہو رہی ہے اور کہ میں اپنے آپ کو روشنی میں دیکھوں لیکن اب میں کیسے دیکھ سکتا ہوں! اب تو میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اور دیکھ کر بھی اپنے آپ کو پہچاننے سے انکار کر دوں گا۔ میں نے روشنی میں دیکھنے کی یہ پیشکش ٹھکرا دی اور میں نے روشنی کے پیغامبر کو صاف کہہ دیا کہ میں دیکھنا نہیں چاہتا، لیکن اگر مجھے مجبور کیا گیا تو میں منتشر ہو جاؤں گا!

باقی صفحہ نمبر ۴۸ پر

مانگے کا اجالا

ایٹم بم خریدنے گئے

اخبار الاہرام (قاہرہ) کے سابق ایڈیٹر محمد ہیکل
) ایک ۲۸۵ صفحات کی کتاب ہے۔ اصل کتاب
نگریزی میں دی روڈ ٹو رمضان کے نام سے چھپی ہے
وراس کا عربی ترجمہ الطریق الی رمضان کے نام سے شائع
وا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں اکتوبر ۱۹۷۳ء کی
صر۔ اسرائیل جنگ اور اس سے چھ سال پہلے کے حالات
ر اپنی معلومات پیش کی ہیں۔ پوری کتاب دلچسپ واقعات
ے بھری ہوئی ہے۔

مثلاً دلیبیا کے فوجی انقلاب ستمبر ۱۹۶۹ کے بعد صدر
معمر قذافی قاہرہ آئے) ایک موقعہ پر جب کہ صدر ناصر ان
و بتا رہے تھے کہ اسرائیل اور عربوں کے درمیان ٹینک،
ہوائی جہاز وغیرہ میں طاقت کی نسبت کیا ہے۔ قذافی
نے بھڑک کر کہا: نہیں، نہیں۔ ہمیں سیدھے ایک
بھرپور جنگ کرنا چاہئے اور اسرائیل کا خاتمہ کر دینا چاہئے
ناصر نے ضبط کرتے ہوئے کہا یہ ناممکن ہے۔ بین اقوامی
صورت حال ہم کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دے گی
نہ روس اور نہ امریکہ ایسی صورت حال پیدا ہونے
کی اجازت دیں گے جس سے ایٹمی جنگ چھڑ سکتی ہو۔
قذافی نے پوچھا: "کیا اسرائیل کے پاس ایٹم بم ہیں؟"
ناصر نے کہا: ہاں اس کا غالب امکان ہے۔ قذافی نے
دوبارہ پوچھا: کیا ہمارے پاس بھی ایٹم بم ہیں۔ ناصر نے
کہا: نہیں۔ ہمارے پاس نہیں ہیں۔

دو یا تین ماہ بعد لیبیا کی دوسرے درجہ کی بڑی شخصیت
میجر جالود اچانک مصر آئے اور ناصر سے ملے۔ انہوں نے
کہا کہ ان کا یہ سفر بہت خفیہ ہے اور ان کا واحد مقصد صدر ناصر
سے ملنا ہے۔ صدر ناصر نے ملاقات کے وقت پوچھا کہ ان
کو کیا مشورہ درکار ہے۔ جالود نے کہا: ہم ایک ایٹم بم
خریدنے جا رہے ہیں۔ ناصر نے پوچھا وہ کہاں سے اس
کو خریدنے جا رہے ہیں۔ جالود نے کہا کہ ان کو معلوم ہے
کہ امریکی اور روسی ہمارے ہاتھ ایٹم بم بیچنے کے لیے
تیار نہ ہوں گے۔ مگر امید ہے کہ چینی اس کے لئے تیار
ہو جائیں گے۔ ناصر نے کہا جہاں تک وہ جانتے ہیں ایٹم بم
خرید کر کبھی حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ جالود نے کہا: ہم
کوئی بڑا ایٹم بم نہیں چاہتے۔ بس جنگی تدبیر کے طور
پر ایک (اوسط درجہ کا) بم کافی ہوگا۔ ہم نے چینیوں
سے رابطہ قائم کیا اور ان سے کہا کہ ہم اپنا ایک آدمی
وہاں ملاقات اور گفتگو کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں۔ انہوں
نے کہا کہ ہم خیر مقدم کے لئے تیار ہیں۔ اب میں چین
جا رہا ہوں۔

جالود بھیس بدل کر روانہ ہوئے۔ انہوں نے لیبی
پاسپورٹ کے بجائے مصری پاسپورٹ لیا اور پاکستان
اور ہندوستان کے راستے سے سفر کر کے پیکنگ پہنچے
چینیوں کو خبر نہ تھی کہ اس سفر کا مقصد کیا ہے۔ مگر چاؤ
این لائی کے ساتھ ملاقات کا ایک وقت مقرر ہو گیا۔
اس ملاقات میں لیبیا کی انقلابی کونسل کے نائب صدر
نے بتایا کہ وہ ایک بہت ضروری معاملے کے لیے پیکنگ

آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ چین تمام ایشیائی ملکوں کے لیے باعث فخر ہے۔ آپ لوگوں نے پس ماندہ ملکوں کی مدد کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دیا ہے کہ آپ لوگ اتنے ہی طاقت ور ہیں جتنا کہ مغرب۔ اس لیے ہم لیبیا سے آپ کی مدد حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ہم آپ کے اوپر بوجھ بننا نہیں چاہتے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ چیزیں بہت زیادہ داموں میں تیار ہوتی ہیں۔ ہم ایک ایٹم بم خریدنا چاہتے ہیں۔"

چاؤ این لائی نے اس کے جواب میں نہایت نرم لہجہ اختیار کیا۔ انہوں نے معیاری چینی اخلاق کے ساتھ کہا کہ ایٹم بم فروخت نہیں کیے جاتے۔ چین کو یقیناً اس سے خوشی ہوگی کہ وہ ریسرچ کے کام میں لیبیا کی مدد کرے جس طرح چند سال پہلے چین نے مصر کو تحقیقاتی مدد دینے کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی۔ ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری لیبیا کو خود اپنے آپ کرنی ہوگی۔ ہر قوم کو خود کفیل بننے کی کوشش کرنا چاہیے۔ وغیرہ چنانچہ میجر جالود چین سے خالی ہاتھ واپس آگئے۔

کہا جاتا ہے کہ صدر ناصر جب مصر میں برسر اقتدار آئے تو انہوں نے بھی ایٹم بم کی خریداری کے لیے ایک وفد روس بھیجا تھا اور وہاں ان کو وہی جواب دیا گیا جو لیبی وفد کو چین میں جواب دیا گیا۔

(الرسالہ)

جاہلی شاعری کی خصوصیات

جاہلی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت سچائی اور سادگی ہے۔ جاہلی شعراء کا کلام تصنع اور تکلف سے خالی ہوتا ہے جو جذبہ اور جو خیال ان کے ذہن میں جس طرح آتا ہے اس کو وہ اسی طرح اپنے اشعار میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں جو سادگی اور آزادی تھی وہی ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ زندگی میں جن امور سے ان کا واسطہ پڑتا تھا اور جو واقعات و مناظر ان کی نظر کے سامنے ہوتے تھے انہیں کو وہ بے کم و کاست اپنی شاعری میں بیان کر دیتے تھے۔ فطری جوش جذبۂ انتقام جرأت، شجاعت، محبت، نفرت اور آزادی کے عجیب و غریب تصورات، میزبانی کے بلند تخیلات، عاجزی و بے کسی سے نفرت، کسی کا احسان لینے سے انکار، ہمسایے کی حفاظت، بے کسوں کی امداد، وعدے کی پابندی اور فخر و مباہات کے تذکرے، یہی ساری باتیں ان کی زندگی کے معمولات میں داخل تھیں اور یہی سب ان کے اشعار کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں ان کی معاشرت تمدن، رسم و رواج، اخلاق و عادات، غرض ان کی زندگی کا ہر پہلو نمایاں طور پر ملتا ہے۔

معانی کے علاوہ جو تشبیہات و استعارات انہوں نے استعمال کیے ہیں ان میں صداقت اور اصلیت کی روح پائی جاتی ہے۔ جو عام طور پر ان کے مشاہدات میں آتی تھیں انہی کو وہ تشبیہ و استعارے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اسی طرح جو واقعات بیان کرتے تھے وہ بھی بڑی حد تک صداقت پر مبنی ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ جو باتیں فحش اور معیوب سمجھی جاتی تھیں انہیں بھی جوں کا توں بیان کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے بہت سے اشعار بڑے ہی فحش اور گندے ہیں۔ اسی طرح مدح اور ہجو میں بھی سچائی کا لحاظ رکھتے تھے۔ صرف چند ہی شعراء ایسے ملتے ہیں جنہوں نے شاعری کو پیشہ بنالیا تھا اور وہ حیرہ اور غسان کے بادشاہوں کی تعریف صلہ اور انعام حاصل کرنے کے لیے کیا کرتے تھے، ورنہ باقی تمام شعراء صرف اس شخص کی تعریف کرتے تھے جو صحیح معنوں میں تعریف کا مستحق ہوتا تھا اور اس کی تعریف میں صرف وہی باتیں کہتے تھے جو اس کے اندر پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ کسی نے ایک شاعر سے کہا کہ تم میری تعریف کیوں

نہیں کرتے تو اس نے جواب دیا "افعل حق اُقول"
یعنی تم کچھ کرکے دکھاؤ تو میں کہوں۔ اسی طرح جب وہ
کسی کی ہجو یا برائی کرتے تھے تو اس میں بھی صحیح بات
بیان کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی ہجو سمّ قاتل سے
بڑھ کر ہوتی تھی اور جب کوئی شاعر کسی کی ہجو کر دیتا
تھا تو ہمیشہ کے لیئے اس کا سر نیچا ہو جاتا تھا۔
(غلام مرسلین) (جامعہ)

ایرانی فارسی اور ہماری فارسی

ایرانی کسٹم میں غالباً حاتم طائی کی اولاد ہی بھرتی
ہوتی ہے۔ سخی داتے، سیر چشم، وسیع القلب بمحال
کہ آپ کے سامان کو میلی نگاہ سے دیکھیں یا اسے کھول
کر تلاشی لینے کی گھٹیا حرکت کریں۔ ہم نے اپنا سوٹ
کیس پیش کیا تو ابن حاتم نے ایک شان بے نیازی
میں اس پر چاک سے نشان لگا دیا کہ "جا رے جا
جہاں تیرا جی چاہے" اور ہم نے ہزار افسوس کیا کہ
کیوں نہ اسے چرس سے بھر لائے۔۔ جملہ یورپی ہپی
ایران ہی سے گزر کر آتے ہیں ۔۔ یہ دوسری بات
ہے کہ اسی روز پچھلے پہر ایک چرس کے اسمگلر کو سر بازار
گولی سے اڑا دیا گیا۔ ہم نے یہ سنا تو ہزار شکر کیا کہ ہمارے
سوٹ کیس میں پی آئی اے کی سونف سے زیادہ منشی
کوئی چیز نہیں تھی۔

ایر پورٹ سے باہر نکلے تو ٹیکسی ڈرائیو سیا "راننڈہ
تاکسی" سے واسطہ پڑا۔ یہ ذات شریف جس خاندان
سے بھی تھے، حاتم طائی نے ان کی کسی پشت میں،
افزائش نسل کی نیت سے حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ جانتے
ہوئے بھی کہ ہم گولی کے خوف سے اسمگلنگ کا کاروبار
نہیں کرتے ہم سے وہی کرایہ مانگا جو ایک نامور
بین الاقوامی اسمگلر کی شان کے شایان تھا اور ناچار
ہم نے بھی اپنی جھوٹی شان کو بٹہ نہ لگنے دیا اور
کرایہ ادا کر دیا۔

ہوٹل انٹرنیشنل یا "ہتل انترنیشنال" میں پہنچے
تو دیکھا ہر طرف فارسی کا دور دورہ ہے۔ ایسے ماحول
میں ہمیں انگریزی بولنا بے جا نظر آیا۔ چنانچہ ہم نے بھی
فارسی بولنے کا فیصلہ کیا۔ آخر بی۔ اے میں فارسی آنرز
کیا تھا اور پچھلے دنوں اپنی پرانی فارسی کی "فارسی
امروز" سے "جھاڑ پونچھ" بھی کی تھی اور ہمیں معلوم
تھا کہ جدید فارسی میں ہوٹل کا کمرہ کیسے حاصل کیا
جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے منیجر صاحب سے ایک سنگل روم
کی درخواست کی۔

"جناب منتظم۔ من یک کمرہ برائے شخص واحد
ے خواہم۔"

منیجر ہمارا منہ تکنے لگا، گویا ہم کوئی قدیم فارسی
بول رہے ہوں۔ خیر، ہم نے شک کا فائدہ منیجر کو
دیتے ہوئے اپنا جملہ ذرا سلیس لہجہ میں دہرایا۔

"جناب منتظم، (وقفہ) من یک کمرہ (وقفہ) برائے
شخص واحد (وقفہ) ے خواہم (تبسم)"

منیجر زیر لب منمنانے لگا: "منتظم؟ کمرہ؟ یعنی
چہ؟"

اب اگر باہمی افہام و تفہیم میں کہیں خرابی تھی تو
ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری اس کند ذہن منیجر پر
بھی تھی۔ ہمیں ایک ہی فقرہ تیسری بار دہرانے کا
یارا نہ تھا، چنانچہ کسی قدر جھنجھلا کر انگریزی میں
کہا "MR. MANAGER, I WANT A SINGLE ROOM"
منیجر جھٹ بولا۔

"THEN WHY DON'T YOU SAY SO?"

ہماری جھنجھلاہٹ فی الفور زائل ہو گئی کیونکہ یہ
شخص ہم سے انگریزی بھی بہتر جانتا تھا اور اس
خرابی کی ذمہ داری جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے،
بیشتر ہم پر ہی تھی۔ خواہ مخواہ تیزی میں ناپختہ
فارسی بول کر سبکی کرالی تھی لیکن اب پچھتائے کیا

وت ؟ انگریزی کی معرفت کمرہ حاصل کر کے ادیر
یۓ. سامان رکھا. اور ذرا سوچنے کا موقعہ ملا تو دفعتاً ہمیں
ارسی امروز،، کا سنگل کمرہ مانگنے کے لۓ یہ صحیح فقرہ یاد آگیا.
یں کہنا چاہیۓ تھا.

"آقاۓ مدیر، اطاقِ یک نفرے دارید ؟"

ظاہر ہے کہ اس فارسی اور ہماری فارسی میں یک کے
دہ کوئی لفظ مشترک نہیں تھا. بہرحال اب ڈاکٹر عرفانی
کتاب کے چند مزید فقرے یاد آنے لگے تو جی چاہا کہ نیچے جاکر
ے مدیر کے ساتھ از سرِ نو گفتگو کریں اور اپنی شکست
بدلہ لیں لیکن کہیں سے ڈاکٹر عرفانی کی آواز آئی.

"دیکھو میاں، محض تین چار کارتوسوں کے ساتھ حریف
للکارنا عقلمندی نہیں، پھر شکست کھاؤ گے اور اس صورت
اگر گھر لوٹے تو حسب دستور ہم تمہارا استقبال تو بروں
کریں گے. تمہاری فارسی گولیاں کچی ہیں. انہیں ابھی
کھیلو اور "فارسی امروز" کو بھی رسوا نہ کرو. چندے
مشق کرو۔" ہم ڈاکٹر عرفانی کی فہمائش کا تجزیہ کر رہے
کہ اتنے میں ذرا زیادہ شفقت آمیز لہجہ میں حضرت
مہ نے بھی مشورہ دیا.

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

کرنل محمد خاں (شگوفہ)

دیو داسیاں

عہد ما قبل تاریخ سے ہی جنوبی ودکنی ہندوستان میں
ن کے مندروں میں عبادت کا ایک لازمی جزو مانا گیا ہے
اسی بنا پر دیو داسیوں کا رواج اور عروج ہوا. مندروں
لیۓ زمین، جائیداد اور روپے وقف کرنے کے ساتھ ساتھ
یوں کو بھی وقف کرنا کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا. اور یہ
فرقہ (شیو کی پوجا کرنے والے) میں زیادہ مقبول تھی
ملا میں اس رسم کو نہ صرف جائز مانا گیا بلکہ سراہا بھی گیا
ہے اور بھوشیہ پُران کے مطابق سُریہ لوک کی تسخیر کا آسان ذریعہ
یہ ہے کہ سورج دیوتا کے مندر کے لیے حسین دیوداسیوں کا ایک
طائفہ وقف کر دیا جاۓ.

چھٹی صدی عیسوی تک جنوبی ہندوستان کے مندروں
میں دیوداسیوں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی اور مندروں کے
لیۓ رقاصائیں وقف کرنے کا رواج عام ہو چلا تھا. چول عہد
کے آغاز تک اس رواج نے باضابطہ ادارہ کی شکل اختیار کر لی
تھی. دیوداسیاں مندر کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور کوئی
دوسرا شخص ان پر دعویٰ نہیں کر سکتا تھا. ایسا کرنے والا
گنہگار سمجھا جاتا تھا. ۱۰۸۵ء کے ایک کتبہ کے مطابق
کلوٹنگ نام کے ایک راجہ نے حکم جاری کیا تھا کہ کلاہستی
مندر کی کچھ رقاصائیں جو غلطی سے شاہی محل میں داخل کر لی
گئی ہیں مندر کو واپس کر دی جائیں اور ان کے جسم پر جو
شاہی مہر لگا دی گئی ہے اس کو مٹا کر ترشول کا نشان بنا دیا
جاۓ. اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اگر کوئی لڑکی
مندر کے لیے وقف کر دی جاتی تو کوئی دوسرا شخص اس
کو اپنی ملکیت میں نہیں لے سکتا تھا. راجہ بھی مندر کے اس
حق کو تسلیم کرتا تھا اور اس کا تحفظ کرتا تھا.

اکثر دیوداسیوں کا تعلق اونچے گھرانوں سے ہوتا
تھا. کبھی کبھی ان خاندانوں سے شرفا اور امرا اپنی لڑکیوں
کو مندروں کے لیے وقف کر دیتے تھے ۱۰۴۷ء کے ایک
کتبہ کے مطابق کنڈ راجہ نے اپنی چھوٹی بہن کو جگد کملیشور
کے مندر کے لۓ وقف کر دیا تھا. اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
دیوداسی بن جانے سے سماجی مرتبہ میں کوئی کمی نہیں آتی
تھی برخلاف اس کے، برہمنوں اور حکمراں طبقہ کے ساتھ
قریبی تعلقات کے باعث ان عورتوں کے اثر ورسوخ
میں نمایاں اضافہ ہوتا. رقص وموسیقی میں ان کی مہارت
کو تسلیم کرتے ہوۓ راجاؤں کی جانب سے انہیں خطابوں
سے نوازا جاتا. اکثر یہ عورتیں مندروں کو وافر عطیات پیش
کرتیں یا کثیر جائداد وقف کر دیتیں. اس سے ان کی معاشی
خوشحالی کا پتہ چلتا ہے. ان اوقاف کے بدلے ان عورتوں

کو مندر کی جانب سے کچھ مراعات عطا کی جاتیں جن سے وہ تا حیات اور ان کے بعد ان کی اولادیں مستفیض ہوتیں۔

دیوداسیوں کا رواج جنوبی ہند میں زیادہ مقبول تھا لیکن ملک کے شمالی حصہ میں بھی اس کے اثرات پائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر کالی داس نے اجین کے مہاکال مندر میں دیوداسیوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ مشہور چینی سیاح یوان چانگ نے ملتان میں واقع سورج دیوتا کے مندر کے متعلق یہی بات کہی ہے۔ ایک چینی سیاح آئی سنگ نے بودھوں کے درمیان بھی دیوداسیوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے گجرات میں واقع سومناتھ کے مشہور مندر میں ۵۰۰ دیوداسیاں تھیں۔ جبکہ کانچی کے مندر میں ان کی تعداد ۱۰۰ تھی۔ عہد وسطیٰ میں بھی دیوداسیوں کے متعلق بیرونی سیاحوں کے سفرناموں میں تذکرے ملتے ہیں۔ فرانسیسی سیاح تیورنیئے اور برنیئے نے بالترتیب گولکنڈہ میں اور پوری کے جگن ناتھ مندر میں دیوداسیوں کو دیکھا تھا اور ان کے متعلق اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے موجودہ صدی کے آغاز تک جنوبی ہند کے مندروں میں دیوداسیاں موجود تھیں۔ اور سن ۱۹۰۴ء میں سرولیم ہنٹر نے تنجور کے مندر میں ۱۰ دیوداسیوں کا رقص دیکھا تھا۔

جنوبی ہند میں دیوداسیوں کی کثرت تعداد اور اس علاقہ میں اس رسم کے زیادہ دنوں تک جاری رہنے کی کچھ وجہیں ہیں۔ شمالی ہندوستان کا علاقہ برہمن تمدن و ثقافت سے بہت حد تک متاثر تھا اور یہاں معاشرہ کی بنیاد پدری طریقۂ وراثت تھی۔ جنوب میں آریوں کی آمد سے پہلے کے قبائلی اثرات کے سبب مادری طریقۂ وراثت بھی مروج تھا۔ بالخصوص نیچی ذاتوں میں اس طرح اونچی ذاتوں میں دیوداسی بن جانے والی عورتوں کو موروثی جائداد میں ترکہ ملتا تھا۔ اس لیے اونچی ذات کی عورتیں برضا و رغبت مندروں میں اقامت کر لیتی تھیں۔ اس سے انکے سماجی مرتبہ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

تبصرے

آئینہ اور پرچھائیں

آئینہ اور پرچھائیں بسمل کرشن اشک کی غزلوں کا
عہ ہے سہ "نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی"
صداق یہ مجموعہ دیباچہ تقریظ اور اس قسم کی دیگر تمام
شوں سے پاک ہے۔

غزل کے خلاف اردو کے ناقدوں، بلکہ خود شاعروں
ی بہت کچھ کہا ہے۔ اسے نیم وحشی صنفِ سخن بھی قرار
ہے۔ اور فرسودہ بھی۔ لیکن ہر دور میں ایسے کچھ شاعر
ہو جاتے ہیں جو غزل کا اعتبار پھر سے قایم کر دیتے
موجودہ دور میں جن شاعروں نے غزل کے وقار
رسے قایم کیا ان میں بسمل کرشن اشک کے نام کو کافی
ت حاصل ہے۔ ان کے لہجہ میں تازگی ہے اور سوچ اور
مات کے معاملے میں بھی ان کی انفرادیت سے انکار ممکن
ا۔

بسمل کرشن اشک صرف غزل کے شاعر نہیں، وہ بہت
نظم بھی کہتے ہیں۔ ان کی شاعری تفصیلی مضمون چاہتی
یکن فی الحال اس مجموعے کے بارے میں میں نے جو
لکھا ہے اس کی تائید میں ان کے کچھ شعر یہاں نقل
نے پر اکتفا کروں گا۔

جس چہرے پہ آنکھ اٹھے گی اپنا چہرہ ہوگا
اے آئینہ دیکھنے والو کس کا منہ نوچوگے

اس کو کیا معلوم نہیں تھا، جوگی کس کے میت ہوئے
کٹیا میں دو ایک گھڑی کو ہو تو گیا اجیارا سا

مری بھی مان، مرا عکس مت دکھا مجھ کو
میں رو پڑوں گا مرے سامنے نہ لا مجھ کو

اُسے چھت پر کھڑے دیکھا ہے میں نے
کہ جس کے گھر میں دروازہ نہیں ہے

آپ اور اس کے مدعی! ایک کہوں لاکھ کی
آپ ذرا اشک جی آئینہ جا دیکھئے

آؤ اسی شب کہہ لیں سن لیں، جو کچھ کہنا ہو سننا ہو
تم ہو، میں ہوں، تنہائی ہے، کل کی رات بھلا کیا ہو

سچ یوں ہے کہ تیرے ہیں بہر حال، بہر رنگ
آئے نہ یقین تجھ کو تو اپنے بھی سہی ہم

ایک ذرا سی جان کہ جس کو لاکھوں دکھ ان گنت جیسے
اک ٹوٹی پھوٹی کشتی کے چاروں اور بپھرتا دریا

اور اگر میں نے تجھے دیکھنا چاہا ہی نہ ہو
منہ ادھر پھیر کے، اے آنکھ چرانے والے

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد آپ کو کسی ناقد کی رائے
کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہندوستانی فارسی کا یہ محاورہ
آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ
عطار بگوید۔ کتاب کے صفحات ۱۶۰ ہیں اور قیمت دس روپے

—— ارشد علی خاں

بوڑھا درخت

مصنفہ ڈاکٹر زرینہ ثانی

قیمت ۔/۱۵ روپے ۔ ناشر بزم سیماب دہلی ۶

ڈاکٹر زرینہ ثانی اردو کے نئے نقادوں میں شامل ہیں۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں "سیماب کی نظمیہ شاعری" کافی مقبول ہوئی ہے۔ اب ان کی ایک نئی کتاب "بوڑھا درخت" منظرِ عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب جناب ضیا فتح آبادی کی شخصیت اور شاعری کے جائزے پر مشتمل ہے اس کتاب کا مقدمہ اردو کے نقاد، ڈاکٹر عنوان چشتی نے لکھا ہے۔ انہوں نے ضیا کی شاعری کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ ضیا فتح آبادی کا ذہن اپنے دور کے تمام میلانات اور رجحانات نیز معاصر زندگی سے اخذ و استفادہ کرتا رہا ہے۔ نیز یہ کہ ان کے یہاں رومانی اثرات، تہذیبی قدروں اور ہیئت کے تجربوں کی جلوہ گری ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی نے ضیا فتح آبادی کی شاعری کا تدریجی مطالعہ پیش کیا ہے۔ جس سے ان کے عہد کے ادبی ادیوں اور میلانات پر روشنی پڑتی ہے۔ موصوفہ نے ضیا فتح آبادی کی شاعری میں غزلوں، نظموں، گیتوں، رباعیوں وغیرہ پر بحث کی ہے۔ اور ان کی اہم خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔ جہاں تک ضیا فتح آبادی کی شخصیت کا سوال ہے یہ بات ان کا ہر ہم عصر جانتا ہے کہ وہ ایک نیک نفس انسان ہیں۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی نے وقت کے مزاج کے اہم میلانات کو ان کی زندگی کے سفر کی روشنی میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اس طرح اس ضمن میں ان کے بہت سے واقعات کے ساتھ، ان کے معاصروں کا تذکرہ بھی آگیا ہے جس سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ امید کہ اردو دنیا میں اسکو شرفِ قبولیت حاصل ہوگا۔

ڈاکٹر منیر، تنویر چشتی

بزمِ احباب

○ یار گوپال متل! زندہ رہو، میں بھی جی رہا ہوں۔ تمہارا پتہ مجھے کسی دوست سے مل گیا، جی چاہا کہ تمہیں خط لکھوں اور کہوں کہ تحریک بھیج دیا کرو اور اس میں سنا ہے مختلف زبانوں کا ادب شائع ہوتا ہے وہ میرے لیے خاصا کارآمد ہے میں آفتاب کا پرچہ تمہیں بھجوا رہا ہوں۔

یہ فی الحال سہ ماہی ہے، اس کا اگلا شمارہ پریس میں ہے جیسے ہی شائع ہوگا بھیج دوں گا۔

خط کا جواب ضرور دینا۔ پرانے دنوں کی یاد بعض دفعہ بری طرح ستاتی ہے۔

کچھ اپنے متعلق تفصیل سے لکھو اور سناؤ، پھر میں تمہیں تفصیل سے سناؤں گا۔

اچھا یار زندہ صحبت باقی۔

——— عبداللہ ملک (لاہور)

○ ماہنامہ تحریک جون/جولائی ۱۹۷۹ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ مضمون سیکولرازم۔ ایک پل یا ایک خلیج جدید شاعری میں اظہار و بیان کا پہلو افسانہ "ٹرین کا ڈبہ" بہت پسند آئے۔

تحریک ماہنامہ میں مضمون دینا چاہتا ہوں کس طرح کامیاب رہوں گا مہربانی فرماکر تحریر فرمایئے

نیاز کیش

——— عزیز بقائی

○ اکتوبر، نومبر ۱۹۷۹ء کے "تحریک" کے "درشن بھاپت" ہوئے مستقل عنوانات "مانگے کا اجالا" اور "بزم احباب" ندارد تھے؟ "جے پرکاش نارائن" کے تحت جو شعر درج ہے ؎

ترا رونا تری طرزِ ستم سے بھی نرالا ہے
اسی کو رو رہی ہے جس کو خود ہی مار ڈالا ہے

اس میں "رو رہی ہے" کا اشارہ کس کی طرف ہے؟ کیا جنتا پارٹی (موشر پارٹی) مخاطب ہے؟ یا اندرا گاندھی یا پھر؟ "روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ" والا مضمون ہے۔ "غازی" نے اکثر یہ شعر اس طرح پڑھا ہے ؎

ستم کرنے کا قاتل نے نرالا ڈھب نکالا ہے
ہر اک سے پوچھتا پھرتا ہے کس نے مار ڈالا ہے

جے پرکاش" کے سلسلہ میں
"کمیونسٹوں کے" جو اشعار پیش کیے گئے ہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ اشعار کن کمیونسٹ شاعروں کے ہیں وضاحت ضروری ہے؟

"عرش ملسیانی" کے عنوان سے جو مختصر سا شذرہ شائع ہوا ہے خوب ہے لیکن غازی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ "وہ اردو کے واحد شاعر تھے جن کا دشمن کوئی نہ تھا"؟

مشہور ہے کہ جس کا نہیں استاد وہ استاد ہی نہیں اسی طرح "غازی" کے خیال میں جس "اردو شاعر کا کوئی دشمن نہیں" اس کی شاعری استادی کے معیار سے محروم ہے ایسی حالت میں حیرت ہے کہ "متل" کے بیان کے کیا معنی لیے جائیں؟

"دوسری موذیل" (۲) "جابرانہ حکومت" (۳) "پیاہ کا"

مضمون قابل اشاعت ہو تو ضرور شائع ہوگا۔

مع ۲ دو مختلف شعر ہیں۔

کی تلاش (۴) مسیحا کی تلاش (۵) شکست (۶) اندھیرے کی آواز، اور "تبصرے" سب ہی خوب ہیں "تبصرے" کے تحت مشفق خواجہ کا یہ شعر بے حد پسند خاطر غازی ہوا ہے۔

ملا تو ایسے ملا جیسے جسم جاں سے ملے
بچھڑ کے یہ بھی نہ پوچھا کہ حال کیسا ہے

"جسم و جاں" کے سلسلہ میں "غازی" کا بھی ایک شعر سماعت افروز ہو ؎

یوں لپٹنے سے تو اے جاں نہ برآئے گی مراد
جسم کو چھوڑ دو آجاؤ مری جاں کی طرف

_______ خان غازی کابلی

○ میں نے اپنے مضمون "فن اور شخصیت" کو تحریک کے تازہ شمارے میں دیکھا۔ کاتب نے کچھ غلطیاں کتابت میں کر دی ہیں۔ اس کی جانب نشاندہی کرا رہا ہوں۔ کیونکہ یہ بے حد ضروری ہے۔ آپ براہ کرم اس کتابت کی غلطی کی تصحیح فرمادیں۔ یعنی میرا یہ مکتوب شائع کر دیں تاکہ قارئین کے لیے کوئی الجھن نہ ہو۔

صفحہ ۱۶ ۔ "اس میں اس کا نفس ایک حصہ لینے والے جانب دار فافل کی حیثیت سے کام کرتا ہے" فافل نہیں فاعل۔

صفحہ ۱۶ ۔ "خطابت تو جذباتی قوت کا ایک بڑا بدل ہے" بڑا نہیں بُرا۔

صفحہ ۱۷ ۔ "مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا" 'تو' چھوٹ گیا ہے۔

صفحہ ۱۷ ۔ "تو انہوں نے قارئین اور سامعین میں خاصی مقبولیت بھی حاصل کی" 'تو' غلط چھپ گیا ہے جملہ "انہوں نے" سے شروع ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۸ ۔ "کسی دوسرے سماج کے خلاف ایک پروپیگنڈہ کی شکل بنادے گا۔" 'گا' غلط چھپ گیا ہے۔ جملہ "بنادے" پر ختم ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۸ ۔ "گل" غلط چھپا ہے 'کل' ہے ک نہ کہ گ

صفحہ ۱۸ ۔ "کرڑی مُنتی ہوئی نظر آئے" مُنتی نہ بَنتی ۔ ب پر زبر۔

مجھے خود بھی حیرت ہے کہ کاتب نے ایسی غلط[illegible] کیسے کی ہیں؟ یہ خط عجلت میں لکھ رہا ہوں۔ ایک اور آپ نے وہ شمارے بھی نہیں بھیجے ہیں جن م[illegible] مضمون شائع ہوا ہے "فن اور شخصیت" جس میں شائع ہوا یعنی تازہ ترین شمارہ۔ وہ بھی میں[illegible] خرید کر پڑھا ہے۔ یہی معاملہ ان شماروں کا ہ[illegible] جن میں میرے مضامین "علامت نگاری" اور[illegible] اور تنقید" شائع ہوئے تھے۔ یہ، ایک حو[illegible] بات ہے۔

_______ خورشید

اس شمارہ کا آپ کا شذرہ "موزوں ترین" [illegible] ناقابل فراموش ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ تاریخ[illegible] سیاسی جرائت، اور حب الوطنی کا آئینہ دار ہے کہ یہ جملے میرے دل کی آواز ہیں جن میں ہمارا[illegible] مستقبل چھپا ہوا ہے۔

" ممتاز عہدوں کے لیے امیدوار منتخب کر[illegible] صرف ان کی صلاحیت پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ان[illegible] مذہب پر نہیں .... مثلاً میرا ڈرائیور مسلمان[illegible] اپنی جان بھی عزیز ہے اور اپنی کار بھی۔ اگر وہ ا[illegible] نہ ہوتا تو میں اسے ہرگز ملازم نہ رکھتا۔"..... ملک میں کھیل سے لے کر ہر میدان میں جو ہو ر[illegible] وہ ہم سب کے سامنے ہے.....

اس شمارے کا اہم مضمون پروفیسر خ[illegible] سمیع صاحب کا فن اور شخصیت ہے۔

اس میں زبان و بیان کا حسن بھی ہے۔ پروفیسر صاحب نے مغربی اصول نقد و نظر پر میر[illegible] جان اور غریب غالب کو کسنے کی ناکام کوشش کی۔ کچھ مغرب زدہ نقادوں نے یہ طرز اپنائی تھی جو تقریباً متروک ہو چکی ہے ..... مولانا عرشی صا[illegible]

ضمون "یعقولون مالا یفعلون" یعنی مشرق و
فن و فنکار کے عرق کو ظاہر کیا ہے۔
پروفیسر صاحب نے اپنے دعویٰ کے اثبات میں اشعار
غلط لکھے ہیں اور نتائج بھی غلط نکالے ہیں۔ آپ
ہیں۔
مجنوں گورکھپوری سے غلطی ہوئی تھی انہوں نے
شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
اسے میر کی آواز سمجھ بیٹھے اور بھول گئے کہ یہ
لہجہ تو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی مخصوص
کا حامل ہے...... پروفیسر صاحب اور مجنوں
پوری صاحب نے اس شعر کو غلط پڑھا ہے
دراصل
(۱) یہ شعر نہ تو میر کا ہے اور نہ لکھنؤ کے کسی نمائیت
شاعر کا۔
اس شعر کے خالق۔ اردو کے مشہور شاعر۔ بانی حکومت
ہیلکھنڈ نواب علی محمد خاں کے لخت جگر نواب محمد یار خاں
توفی ۱۲۰۴ھ ۱۷۸۸ء ہیں۔ آپ قائم چاندپوری کے شاگرد
اور سینکڑوں شاعروں کے مربی تھے۔
۱۷۷۴ء میں انگریز شجاع الدولہ اور روہیلوں
درمیان ہونے والی جنگ میں آپ شامل رہے اور
ہی آپ کی موت کا سبب بنی۔ سب تذکرہ
اس بات پر متفق نہیں کہ نواب امیر افغان عدہ محب
اور سپاہی تھے۔
مصحفی نے تذکرے ہندی گویاں، قدرت اللہ
کے طبقات الشعراء، اور دیگر تذکروں۔ مجموعہ
، بزم سخن، خمخانۂ جاوید، انتخاب یادگار، مجموعہ
ل شعر و سخن، وغیرہ ہیں۔
نواب محمد یار خاں امیر کا تذکرہ اور اشعار ملتے

اس شعر کی صحیح قرأت اس طرح ہے۔

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا
پروفیسر صاحب فنکار کے لیے "یقین کامل" کو
ضروری قرار دیتے ہیں۔ جب کہ مشرق کے عظیم
فنکار ابوالعلامہ معری اور غالب کی عظمت کا راز
"تشکیک" میں ہے۔ ان دونوں کی لازوال شاعری
استفہامیہ؟ ہے غالب ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
وغیرہ وغیرہ۔

——— حکیم محمد حسین خاں رامپور

○ تحریک کا تازہ شمارہ ملا۔ اس بار کہانیاں سب
ہی اچھی ہیں خصوصیت سے انیس اشفاق، ناوک حمزہ پوری
مندی ٹونکی اور احمد عثمانی کی کہانیاں پسند آئیں۔

——— رفعت مولا اورنگ آباد

○ ابھی ابھی پرچہ ملا شکریہ۔
مشتاق شارق کی غالب کے ایک شعر کی تشریح بہت خوب
ہے۔ پروفیسر خورشید صاحب کا مضمون اور قمر الحسن زیدی
کا انشائیہ پسند آنے والی چیزیں ہیں۔ شعری حصہ ہیں۔
ساحل احمد اور ظفر غوری کی غزلیں دل کو چھوتی ہیں۔

——— منظر شہاب

خبر نامہ

○ ان دنوں پاکستان کے مشہور شاعر جناب قتیل شفائی دہلی آئے ہوئے ہیں ۱۳ر نومبر کو شمع کے دفتر میں ان کے اعزاز میں چائے کی شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ شمع کے مدیر اعلیٰ جناب یونس دہلوی نے نفس نفیس مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ شرکاء کی تعداد سو سے زیادہ تھی ان میں ہزایکسلنسی جناب عبدالستار سفیر پاکستان کے علاوہ جناب کنور مہندر سنگھ بیدی جناب ساغر نظامی، جناب کرشن موہن، جناب شہباز حسین مدیر آجکل، ڈاکٹر قمر رئیس مدیر عصری آگہی، جناب کوثر چاندپوری، جناب سرور تونسوی اور مشہور شاعرہ جمیلہ خاتون کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۱۶ر نومبر کو اردو کے مشہور شاعر جناب کرشن موہن نے ان کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا۔ ڈنر میں فلمی دنیا کے مشہور شاعر جناب راجندر کرشن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جناب ساحر ہوشیار پوری جناب رفعت سروش اور جناب جوگیندر پال شامل تھے۔

کھانے سے پہلے اردو کے مستقبل پر بھی دلچسپ گفتگو رہی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جوگندر پال اور گوپال متل صاحب کا خیال تھا کہ اردو میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت موجود ہے۔ یہ دوسری زبانوں کو کچھ دے گی بھی اور ان سے کچھ لے گی بھی لیکن اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھے گی اور موجودہ رسم الخط کے ساتھ۔

چالیس مسیحی ادیب اور شاعر ۱۳ر اور ۱۴ر اکتوبر ۱۹۷۹ء کو دہلی میں مسیحی مصنفین اردو کانفرنس اور کل ہند مشاعرہ کے لئے جمع ہوئے۔ یہ کانفرنس اور مشاعرہ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز حیدرآباد کی طرف سے ترتیب دیا گیا تھا، اس موقعہ پر مسیحی مصنفین کی اردو کتابوں کی نمائش بھی ہوئی اور جناب گرلیفن جونز شرر (حال مقیم لوٹن، انگلستان) کے مجموعہ کلام "نقوش صلیب" کی رسم اجراء بھی عمل میں آئی۔

اردو کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسیحی مصنفین، مؤلفین اور شعراء کی تمام اردو کتابوں کا جو اردو کے وجود میں آنے کے دنوں سے کر آج تک معرض تحریر میں آئی ہیں ایک کٹلاگ اردو اور انگریزی میں تیار کیا جائے یہ کٹلاگ ۱۹۸۲ء تک شائع ہوگا اور اس کی تدوین کا کام ڈاکٹر طالب شاہ آبادی ڈائرکٹر ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی میں شروع ہو چکا ہے۔

کانفرنس میں بائبل مقدس کے ایک نئے اور بامحاورہ اردو ترجمہ کی ضرورت پر بھی بحث ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ بائبل سوسائٹی سے درخواست کی جائے کہ ایک نیا اردو ترجمہ مسیحی مصنفین اردو کی مدد سے تیار کیا جائے۔ یہ ترجمہ براہ راست یونانی زبان سے کیا جائے گا اور یونانی زبان کے اساتذہ اور ماہرین اس کام میں مسیحی مصنفین اردو کی مدد کریں گے۔

○ ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے تقریباً

○ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے زیر اہتمام۔

"اردو افسانہ پریم چند کے بعد" کے موضوع پر ایک دو روزہ سیمینار ۳ اور ۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو منعقد ہوا یہ سیمینار چار نشستوں پر مشتمل تھا جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف جدید و قدیم نقادوں نے حصہ لیا سیمینار میں بولتے ہوئے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر حامدی کشمیری نے اس سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو میں افسانہ نگاری کے بارے میں جو تنقیدات ملتی ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں۔ جدید افسانے کی ماہیئت اور اس کے تخلیقی کردار کے بارے میں جو سوالات اٹھتے ہیں ان کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا۔ اس لیے پریم چند کے بعد اردو افسانے پر منعقدہ اس سیمینار میں نہ صرف افسانے کے جدید رجحانات پر بحث و تمحیص ہوگی بلکہ انفرادی افسانہ نگاروں کی تعین قدر کی طرف بھی توجہ کی جائے گی

سیمینار کا افتتاح اردو کے ممتاز نقاد جناب آل احمد سرور نے کیا۔

○ گزشتہ روز کلادرپن کے زیر اہتمام مشہور شاعر جناب پریم وار برٹنی کے انتقال پر ملال پر ایک ماتمی اجلاس ریڈ کراس ہال میں زیر صدارت بزرگ دانشور ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ منعقد ہوا۔ اسٹیج سیکریٹری کے فرائض پروفیسر ایچ۔ ایس۔ دیگر نے انجام دیئے۔ اجلاس میں مقامی و بیرونجاتی شعرا۔ ادبا اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے معزز خواتین و حضرات کے علاوہ مرحوم کے عزیزو اقارب اور مداح بھاری تعداد میں شریک ہوئے پروفیسر دلگیر نے مرحوم کی شعری و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

جناب سورج تنویر نے تعزیتی قرارداد پیش کی جسمیں مرحوم کی ناگہانی موت کو دنیائے شعر و ادب کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے مرحوم کی تسکین روح کے لیے دعائے خیر اور پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ حاضرین اجلاس نے دو منٹ خاموش کھڑے ہوکر قرارداد منظور کی۔

○ پنجاب کے جوان سال شاعر جناب راجندر ناتھ رہبر کوان کے تازہ مجموعۂ کلام "اور شام ڈھل گئی" پر بہار اردو اکاڈمی۔ پٹنہ نے پانچ سو روپیہ انعام دیا۔

جناب رہبر بطور ایک خوش فکر شاعر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ تقسیم وطن کے بعد سرزمین پنجاب سے اردو کے جو شاعر آسمان شہرت پر جلوہ گر ہوئے۔ اور اپنی تابانی فکر سے شعری فضاؤں کو منور کر رہے ہیں ان میں ایک نمایاں نام رہبر صاحب کا بھی ہے۔ آپ کی دیگر تصانیف "کلس" (مجموعۂ کلام) اور "آغوش گل" (تذکرۂ شعرائے شملہ) شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ پٹھان کوٹ کے رہنے والے ہیں اور بزرگ شاعر پنڈت رتن پنڈوروی کے شاگرد ہیں۔

○ ۱۹ نومبر کو ماڈرن آرٹ تھیٹر میں دلی ساہتیہ کلا پریشد کی طرف سے دلی کے چیف ایگزیکیٹو کونسلر شری کیدار ناتھ ساہنی نے مختلف زبانوں کے ادیبوں اور رقص و موسیقی کے ماہروں کو انعامات تقسیم کیے ہر انعام میں سرسوتی کی مورتی، شال اور ۲۰۰۱ روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ بنگالی اور سندھی کے ادیبوں کو پہلی بار انعام دیے گئے۔ انعامات تقسیم کرنے سے پہلے شری ساہنی نے بڑی بھرپور اور مدلل تقریر کی۔ اپنی تقریر میں انھوں نے دلی انتظامیہ کی طرف سے فنون لطیفہ کے فروغ کے لیے ہر ممکن مدد کا وعدہ فرمایا۔ انکی تقریر کا یہ حصہ بہت اہم تھا کہ دلی ہندوستان کی صرف سیاسی راجدھانی نہیں بلکہ ثقافتی راجدھانی بھی ہے انعام یافتگان کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) شری دینا ناتھ شرما سارسوت (سنسکرت)، (۲) شری بھیشم ساہنی اور ڈاکٹر سانا تھ ترپاٹھی (ہندی)، (۴) شری پریتم سنگھ سفیر (پنجابی)، (۵) شریمتی صالحہ عابد حسین (اردو)، (۶) شری چانکیہ سین (بنگالی)، (۷) شری تیرتھ بسنت (سندھی)، (۸) شریمتی شیلا بھاٹیہ (ڈرامہ)، (۹) شری بھگوان داس ورما (رقص)، (۱۰) این ظہور الدین اور این فیاض الدین (موسیقی)، اور شری رام کمار (مصوری)

بقیہ صفحہ ۵۳ کا "ایک یوگی کی...."

اور سب سے بڑی اطمینان بخش بات تو یہ ... کہ یہ میں اکیلا میں ہی نہیں ہوں۔ وہ تمام لوگ ... میں چھوڑ آیا تھا، یہاں موجود ہیں۔
اور یہ کمرہ وہی گھر ہے جہاں سے میں ایک ... بھاگ آیا تھا !!!

نئی دہلی میں سفارت خانۂ افغانستان
پر افغان طلبا کی یلغار

قارئین کو نیا سال مبارک ہو

مندرجات

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک
نئی دہلی

شمارہ ۱۰ جلد ۲۸

جنوری ۱۹۸۰

ادارۂ تحریر

گوپال متل

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی چھ شلنگ

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

مینیجر ماہنامہ تحریک، ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر: گوپال متل

مطبع: نعمانی پریس، دہلی

مقام اشاعت: ۹، انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ابتدائیہ

گوپال متل

گزشتہ شمارے میں "ایک یوگی کی سرگزشت" کے نام سے ایک کہانی شایع ہوئی تھی جس میں مصنف کی حیثیت سے اوم پرکاش لاغر کا نام تھا۔ ان کا خط آیا ہے کہ یہ کہانی اُن کی نہیں ہے۔ اسے انھوں نے کتابت کی غلطی پر محمول کیا ہے یہ ان کی رواداری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غلطی کاتب کی نہیں ایڈیٹر سے سرزد ہوئی ہے۔ لاغر صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اپنی کہانی پھر سے بھیج دیں اور جو صاحب مطبوعہ کہانی کے مصنف ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ان کے نام کا اعلان کیا جاسکے۔

افسانے کا ذکر چل نکلا ہے تو قارئین کو ایک خوشخبری بھی سنا دوں، مشہور افسانہ نگار کنور سین نے 'تحریک' کے لیے مسلسل لکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ اس شمارے میں بھی ان کا افسانہ شامل ہے۔ کنور سین صاحب افسانہ نگاری کے رموز سے پوری طرح واقف ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کا تعاون تحریک کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔

نومبر کے "تعمیر ہریانہ" میں جگن ناتھ آزاد کا جو ان دنوں جموں یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں۔ "ہریانہ کا ایک گمنام شاعر، فاخر ہریانوی" کے نام سے ایک مختصر سا تعارفی مضمون شایع ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی فاخر ہریانوی کی ایک نظم "ہریانہ" جس کے بارے میں آزاد صاحب کا کہنا ہے کہ فاخر صاحب نے یہ نظم اپنی جنم بھومی "ہریانہ" کی شان میں لکھی ہے اور اسے وہ "تعمیر ہریانہ" کے ذریعے اہلِ ہریانہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ کل ساحر ہوشیارپوری صاحب تشریف لائے تھے انھوں نے جگن ناتھ آزاد صاحب کی تحریر اور فاخر ہریانوی صاحب کی نظم کا ذکر کیا اور کہا کہ فاخر ہریانوی کی نظم کا جس ہریانہ سے تعلق ہے وہ ہریانہ صوبہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جو ہریانہ فاخر صاحب کی جنم بھومی ہے وہ ہوشیارپور کے قریب کا ایک گاؤں ہے۔ آزاد صاحب ان دنوں شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیق کے میدان میں بھی جھنڈے گاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی کہ تحقیق کے شعبے میں "کاتا اور لے دوڑی" کی گنجایش بہت کم ہوتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی ہم سے رخصت ہوگئے ان پر ہم رضوان احمد صاحب کا مضمون شایع کر رہے ہیں۔ یہ مضمون پڑھنے کے بعد اپنی طرف سے کچھ لکھنا غیر ضروری محسوس ہوا۔

کانگریس آئی کی شاندار کامیابی

گوپال مِتّل

جس وقت یہ سطور لکھی جا رہی ہیں مسز گاندھی کی پارٹی کو ۳۰۰ سیٹیں حاصل ہو چکی ہیں۔ ابھی بہت سے نتائج کا اعلان ہونا باقی ہے۔ خیال یہ ہے کہ انہیں پارلیمنٹ میں دو تہائی یا شاید اس سے بھی زیادہ سیٹیں حاصل ہو جائیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ جس کے لیے وہ سبھی کی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے حق میں ووٹ دیا انہیں کی طرف سے نہیں بلکہ ان کی طرف سے بھی جنہوں نے دوسری پارٹیوں کو ووٹ دیا۔ اسی طرح مسز گاندھی کی پارٹی کا طرزِ عمل بھی گروہی سیاست سے بلند ہونا چاہیئے۔ جمہوری نظام میں جب کوئی امیدوار کامیاب ہوتا ہے تو اس کے لیے اپنے حلقے کے سبھی ووٹروں کی بہبود کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اور بالفعل ایسا ہوتا بھی ہے کیونکہ اگر حکومت غلط پالیسیاں اپنائے گی تو اس سے سبھی کو نقصان ہوگا اور اگر وہ صحیح پالیسیاں اپنائے گی تو سبھی کو فائدہ پہنچے گا۔ مسز گاندھی کو تو وسیع پیمانے پر عوام کا اعتماد حاصل ہوا ہے اس کے بعد تو ان پر اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح معنیٰ میں اپنے والد کی طرح قومی رہنما کی حیثیت سے کام کریں۔

حزبِ مخالف جمہوریت میں ضروری ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسے کسی کیمیاوی عمل سے ظہور میں نہیں لایا جا سکتا۔ ہماری کیفیتِ مزاج یہ ہے کہ جب بھی کسی پارٹی کے حق میں یا خلاف ہوا چلتی ہے تو وہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کا واحد علاج یہ ہے کہ جمہوری نظام میں جو فریضہ حزبِ مخالف انجام دیتا ہے اسے ہندوستان میں خود حکمران پارٹی کو انجام دینا چاہیئے۔ ایسا وہ خود احتسابی کے رویّے کو اپنا کر کر سکتی ہے۔ نہرو کے زمانے میں کانگریس پارٹی کا رویّہ یہی تھا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو اس رویّے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس رویّے کو ڈسپلن کی حدود میں ہی اپنایا جا سکتا ہے ورنہ دَل بدلی کا رجحان شروع ہو سکتا ہے۔ جو ہماری قومی سیاست کا شرمناک پہلو ہے۔

مسز گاندھی کی کامیابی کے سلسلے میں نظریاتی مباحث کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے، بالخصوص یساری اور یمینی کی بحث۔ آر ایس ایس کو یمینیت کا علمبردار سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے سرسنگھ چالک شری دیورس نے انتخابات سے پہلے واضح اعلان کر دیا تھا کہ اس انتخاب میں آر ایس ایس ایک فریق کی حیثیت سے کسی ایک پارٹی کی حمایت نہیں کرے گا۔ کیمونسٹ پارٹیوں کا جو یساریت کی علمبردار ہیں مسز گاندھی کی پارٹی سے انتخابی معاملہ طے نہیں ہوا تھا بلکہ یہ شری چرن سنگھ کے لوک دل سے طے ہوا تھا۔ شری ونوبا بھاوے بھی یساری ہرگز نہیں جن کا مسز گاندھی کو آشیرواد حاصل تھا۔ اور نہ وہ مذہبی رہنما جن کا آشیرواد مسز گاندھی نے حاصل کیا کسی طرح یساریت کے علمبردار تھے۔

اس الیکشن کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ

ایک ہی پارٹی کی حمایت کرتے ہیں لیکن اس مرتبہ ان کا ووٹ تقسیم ہوا ہے۔ اسی طرح ان جاتیوں کا ووٹ بھی جنہیں دلت جاتیاں کہا جاتا ہے تقسیم ہوا ہے۔ جہاں تک طبقہ متوسط کا تعلق ہے میں ایسے کئی گھروں کو جانتا ہوں جن کے سبھی افراد خانہ نے کسی ایک پارٹی کو ووٹ نہیں دیا۔ یہ بات انتخاب کے نتائج سے بھی ظاہر ہوتی ہے یہ خوشگوار رجحان ہے۔

مسز گاندھی کو ہندوستانی اخباروں سے شکایت ہے کہ وہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہے۔ اتفاق سے یہی شکایت جنتا پارٹی کو بھی ہے ویسے یہ ایک ہندوستانی جریدہ ہی تھا جس نے انتخاب سے پہلے ماہرانہ سطح پر جائزہ لے کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ مسز گاندھی کی پارٹی کو ۳۵۰ کے قریب سیٹیں حاصل ہو جائیں گی ہندوستانی اخباروں میں کسی طے شدہ رویے کو تلاش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ انڈین ایکسپریس اور ٹائمز آف انڈیا دونوں ہی ہندوستانی اخبار ہیں اور ان کا ادارتی رویہ ایک دوسرے سے مختلف اور یہ بھی کہ ادارتی کالموں کو چھوڑ کر ایک ہی اخبار میں مختلف نامہ نگاروں کی جو خبریں شائع ہوتی تھیں ان سے کسی طے شدہ پالیسی کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ کچھ نامہ نگاروں کی اطلاعات میں مسز گاندھی کی کامیابی کی پیشگوئی ہوتی تھی اور کچھ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کسی بھی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہوگی وہ بھی نجی صحبتوں میں یہ کہتے تھے کہ صورت حال کا بہترین حل یہی ہے کہ جنتا پارٹی یا مسز گاندھی کی پارٹی اگر واضح اکثریت نہ حاصل کر سکیں تو چھوٹے چھوٹے گروپوں کی تائید حاصل کرنے کے بجائے انہیں آپس میں مل کر ایک مضبوط حکومت قائم کرنی چاہیے۔ گویا ذہین طبقے کے نزدیک اہم ترین ضرورت ایک مضبوط حکومت کا قیام تھا۔ اب یہ فریضہ کولیشن حکومت کی بجائے مسز گاندھی کی پارٹی انجام دیے تو بھی کو خوش ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک کو جن مسائل کا سامنا ہے ان سے ایک پائیدار حکومت ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ گرانی کا ہے۔ اس کے لیے پیداوار بڑھانا ضروری ہے۔ جس کے لیے نہ تو قومیانے کے اصول کو بتر مبہرف نسخہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ تو قومیانے کے مکمل استرداد کو۔ ایک ترقی پذیر ملک میں نجی کاروباری اداروں کی بھی ضرورت ہے اور سرکاری اداروں کی بھی۔ یہ ضروری ہے کہ حکومت کو جہاں تک ہو سکے براہ راست ذمہ داری سے احتراز کرنا چاہیئے۔

یہ اندیشہ صحیح نہیں کہ مسز گاندھی برسر اقتدار آکر ایمرجنسی کے خطوط پر پھر سے سوچیں گی۔ اگر انہیں ایسا کرنا ہوتا تو ایمرجنسی کو ختم کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ ایک زیرک سیاستداں کی حیثیت سے وہ جانتی ہیں کہ ہندوستان جیسے وسیع ملک پر جمہوری طریقے سے ہی حکومت کی جا سکتی ہے۔ مخالفانہ جذبات کا پرامن اخراج اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ وہ دل ہی دل میں کھولتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے پریس کی آزادی ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ لیکن پریس کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ضرور ہونا چاہیئے۔ سنسنی پیدا کرنے والی خبروں اور تحریروں کو شائع کرنے سے احتراز انہیں از خود کرنا چاہیئے۔

امن اور قانون کا احترام بھی بہت ضروری ہے دہشت کے ماحول پر پچھلے دنوں کافی بحث ہوتی رہی ہے لیکن دہشت کا ماحول حکومتی اقدام کا نتیجہ ہی نہیں ہوتا بلکہ حکومت کے عدم اقدام کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ایسا ماحول جس میں خواتین غروب آفتاب کے بعد اس خوف سے باہر نہ نکل سکیں کہ کوئی ان کے زیورات چھین لے گا یقیناً دہشت کا ماحول ہے جس کے خاتمے کے لیے حکومتی اقدام ضروری ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ایک سے زائد بار لکھ چکے ہیں حکومتی اقدام مؤثر تبھی ہو سکتا ہے جب اسے عوام کی تائید حاصل

باقی صفحہ ۹ پر

افغانستان پر روسی قبضے کا واحد جواب : ہند پاکستان دوستی

گوپال متل

روسی کچھ دن سے کمیونزم اور اسلام میں ہم آہنگی یا کم سے کم عدمِ تضاد کا پروپگنڈہ کر رہے تھے یہ پروپگنڈہ وہ روسی سفارت گھر کی مطبوعات مثلاً سوویت دیش میں بھی کر رہے تھے اور طفیلی پرچوں میں بھی۔ پروپگنڈہ اس زور شور سے ہو رہا تھا کہ سوویت پالیسیوں کے طالب علم کی حیثیت سے ہمیں خدشہ تھا کہ روسی کسی مسلم ملک کے خلاف کوئی کارروائی ضرور کرنے والے ہیں۔ ہمارا خیال صحیح نکلا اور سوویت روس نے افغانستان پر دھاوا بول دیا۔ لیکن آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ یہ سودا روس کو بہت مہنگا پڑے گا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ افغانستان روس کے لیے ویت نام ثابت ہوگا۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ تشبیہ صحیح نہیں۔ افغانستان روس کے لیے الجزائر بننے جا رہا ہے۔ روس کا یہ دعویٰ تو نہایت مضحکہ خیز ہے کہ اس نے باہمی دوستی کے معاہدے کی تکمیل میں حکومتِ افغان کی دعوت پر اپنی فوجیں افغانستان بھیجی ہیں۔ کیونکہ جس حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اس کی فوجیں وہاں گئی ہیں وہ بھی سوویت نواز تھی۔ اور ان کا تصادم صرف حکومت کے مخالفوں سے نہیں ہوا بلکہ اس نے باضابطہ فوجوں کے ساتھ بھی ٹکر لی ہے۔ افغانستان سوویت یونین کے مقابلے میں یقیناً کمزور ہے اس لیے اس پر غاصبانہ قبضہ جمانا روس جیسی بڑی طاقت کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ لیکن روس قبضے کو برقرار رکھ سکے گی یہ بات بہت مشکوک ہے۔ یہ سچ ہے کہ ریچھ کی گرفت مضبوط ہوتی ہے لیکن افغانوں کے بارے میں بھی علامہ اقبال نے کہا ہے:

ملتِ آوارۂ کوہ و دمن
در رگِ او خونِ شیراں موجزن

انگریز بے وقوف نہیں تھے کہ انھوں نے آزاد قبائل تک کو فتح نہیں کیا۔ افغانوں میں آزادی کا جذبہ اتنا قوی ہے کہ انھوں نے سکندر تک کو پریشان کر دیا تھا۔ اتنا پریشان کیا تھا کہ پورس کے ساتھ نبرد آزما ہونے کے بعد اسے اسی راستے سے واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی بلکہ اس نے جنوبی بلوچستان میں صحرائے مکران کا راستہ اختیار کیا جو اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔

یہ باور کرنا مشکل نہیں کہ روسیوں کو بھی وہ مسلسل پریشان کرتے رہیں گے۔ روسیوں کو بھی افغانوں نے کافی پریشان کر رکھا تھا روسی فوجیں تو وہاں پہلے ہی موجود تھیں لیکن ان کا یہ حال تھا کہ غروبِ آفتاب کے بعد انھیں باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر ولی خاں کی یہ بات بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ایٹم بم کو چھوڑ کر قبائلی اپنی ضرورت کے سبھی ہتھیار بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بیس مہینے تک افغان روسی ایجنٹوں کا جنھیں روسی فوجیوں کی مدد حاصل تھی جی داری سے مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب جتنی تعداد میں روسی فوجوں نے اس پر حملہ کیا ہے اس کا مقابلہ تن تنہا کرنا ان کے لیے دشوار ہوگا۔ ہر قوم کا جو جارحیت کی مخالف ہے یہ فرض ہے کہ اس نازک دور میں ان کی مدد کرے۔

یہ مدد انھیں حاصل ہوگی یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے۔ دنیا بھر کی مسلمان قوموں نے ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ معاونت کا اعلان بھی کیا ہے۔ ایران کے معاملے میں عالمِ اسلام اتنا متحد نہیں تھا جتنا افغانستان کے معاملے میں۔ سادات نے برملا طور پر خمینی کی مخالفت کی ہے اور یہ بھی کہا کہ اس خطے کے کچھ اگرچہ برملا طور پر خمینی کے رویے کی مخالفت نہیں کرتے لیکن بباطن

وہ اس کے پوری طرح ہمنوا نہیں۔ افغانستان کے معاملے میں اس قسم کی کوئی اختلاف رائے نہیں۔ اور صرف مسلم ممالک کی ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی افغانوں کی پشت پناہی پر آمادہ ہیں۔ چین تو برملا طور پر افغانوں کے حامی تھے ہی امریکہ نے بھی روس کے مقابلے میں چین اور پاکستان کی مدد کا اعلان کر دیا ہے اور اس اعلان میں اسے اپنے مغربی حلیفوں کی پوری پوری تائید حاصل ہے۔

ہندوستان نے بھی روسی حملے کی مخالفت کی ہے لیکن ظاہر ہے کہ فیصلہ کن بات تبھی کہی جائے گی جب انتخابات کے نتائج کے بعد نئی حکومت برسر اقتدار آجائے گی۔ ہندوستان کو فیصلہ کافی سوچ سمجھ کر کرنا پڑے گا۔ افغانستان پر روس کا قبضہ اسے کسی طرح بھی گوارا نہیں ہو سکتا لیکن پاکستان کو مسلح کرنے کی امریکی اسکیم پر بھی اسے تشویش ہو سکتی ہے۔ کیونکہ ایک بار ہتھیار کسی قوم کے ہاتھوں میں آجائیں تو یہ فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ ان ہتھیاروں کا استعمال کہاں ہو۔ صورتِ حال کا بہترین حل وہی ہے جو آر، ایس، ایس کے ترجمان آرگنائزر نے بتایا ہے۔ اس کے نزدیک صورتِ حال کا بہترین ہی نہیں بلکہ واحد حل یہی ہے کہ پاکستان، ایران اور ہندوستان ان سب کو روسی اقدام سے جو خطرہ لاحق ہے اس کا وہ باہمی مشاورت سے مقابلہ کریں۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ یہ بات ایک ایسے جریدے نے کہی ہے جو ایک ایسی جماعت کا ترجمان ہے جسے بعض لوگ بالعموم مسلمانوں اور پاکستان کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

اے ڈی گوروالا کے جریدے OPINION نے یہ بات اور بھی کھل کر کہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو تھوڑی بہت سمجھ بھی ہے تو انھیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ روس کو نیم برِ اعظم سے دور رکھنے میں ان دونوں کا یکساں فائدہ ہے لہٰذا ان کو اپنی دفاع کی پالیسیوں میں تعاون قائم کرنا چاہیے اور اپنے چھوٹے موٹے جھگڑوں کو بھول کر ایک بہت بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو جانا چاہیے۔

یہ رائے بڑی صائب ہے۔ ہم ان لوگوں میں نہیں جو حقائق سے آنکھیں بند کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہند اور پاکستان میں اختلافات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں میں لڑائیاں بھی ہوئی ہیں لیکن عالمی سیاست میں ایسا کہاں نہیں ہوا۔ اگر جرمنی، برطانیہ اور فرانس اپنے ماضی کے اختلافات کو فراموش کر سکتے ہیں تو ہندوستان اور پاکستان جو کبھی ہی [illegible] ایک تھے ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔

بقیہ کانگریس (آئی) کی شاندار کامیابی

ہو سکے۔ اگر آمادۂ شر چند افراد کی ٹولی غنڈہ گردی پر آمادہ ہے تو مزاحمت کرنا پولیس ہی نہیں بلکہ عام شہریوں کا بھی فرض ہے۔ لیکن عام شہریوں کی اس شکایت کا ازالہ ضرور ہونا چاہیے کہ پولیس ان لوگوں کو جو غنڈوں کی مزاحمت کرتے ہیں اپنا حلیف سمجھنے کی بجائے ان کے ساتھ حریف کا سا سلوک کرتی ہے اور انہیں قانونی پیچیدگیوں میں الجھا دیتی ہے۔

حال ہی میں ہندوستان کو کچھ غیر ملکی مسائل کا سامنا ہوا ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک مضبوط حکومت کا قیام ضروری تھا۔ مثلاً افغانستان کا مسئلہ۔ اس پر ہم الگ سے اظہار خیال کر رہے ہیں لیکن اس حقیقت پر زور دینا پھر بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ روس نے افغانستان میں جس انداز میں حملہ کیا ہے اس سے ہند۔ پاک نیم براعظم کو بجا طور پر تشویش ہو سکتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ پاکستان کے ساتھ معاہدہ بھی ہندوستان کی کوئی مضبوط حکومت ہی کر سکتی ہے۔

ہندوستانیوں نے مسز گاندھی کی پارٹی کو تقریباً تمام مکمل اقتدار سونپ کر اس پارٹی کے مطالبے کو پورا کر دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ پارٹی ہندوستانی عوام کی آرزوؤں کی تکمیل میں کس حد تک کامیاب ہوتی ہے۔

ارمانوں کی بھیڑ میں تنہا

کرشن موہن

میں ڈبدھا اور دکھ کا ساگر
میری بیوی جس کی اونچی ناک اُجاگر
شوہر باغت ، بے حس بیٹی، جھوٹی شان ابھیمان کی گاگر
جسکا شوہر اپنے گھر میں بدگوہر بہنوں کا شیدا، کذب کا دفتر، شر کا پیکر
ادنےٰ کاسہ لیسوں میں محصور سراسر
اور نواسی ، پیار کی پیاسی
میری مسرت اور اداسی
جس کو نفرت کی ندی کا پل بننا تھا
خود ندی میں بہتی جائے
باپ سے دوری سہتی جائے
بیٹا، کنچھ کرن ، نیندوں کا رسیا، سپنوں کا سوداگر
چھوٹی بیٹی ، چنچل ، دور نگر کی ناگر
اپنے گھر میں مست و بیخود، کرموں کا پھل بھوگ رہی ہے

اُلجھی سوچ میں لپٹا ہوں میں
جاں افسردہ ۔ دل پژمردہ
پھول نہیں یہ کھلنے والا
کومل ساتھی کوئی شاعر
آئے کوئی ملنے والا
زخم نہیں یہ سلنے والا
میں ڈبدھا اور دکھ کا ساگر
باہر اک معروف سخنور ـــ
اپنے گھر میں ایک صفر ہوں
ارمانوں کی بھیڑ میں تنہا

فرقۂ دانشوراں

گوپال متل

ایک طرف قومی یک جہتی کی باتیں ہو رہی ہیں اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کے اعلان ہو رہے ہیں۔ لیکن، دوسری طرف ایک اور فرقے کو وجود میں لایا جا رہا ہے جو فرقۂ دانشوراں ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دانشور کا کوئی متعین مفہوم موجود نہیں۔ ہر شخص کے ذہن میں اس کا الگ مفہوم ہے۔ یہ لفظ INTELLECTUAL کا ترجمہ ہے INTELLECTUAL۔ ایک ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کی الگ دنیائے خیال ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ اس دنیائے خیال اور عملی دنیا میں مطابقت ہو۔ جب سے سائنس کا عروج ہوا ہے لفظ دانشور کی قدر و قیمت کافی گھٹ گئی ہے کیونکہ سائنس کے میدان میں ہر شخص کسی ایک مخصوص شعبے کا ہی ماہر ہو سکتا ہے بلکہ اس شعبے کے بھی کسی ایک مخصوص پہلو کا۔ وہ دور اب باقی نہیں رہا جب کوئی شخص اٹھ کر یہ کہے کہ وہ جملہ علوم پر حاوی ہے اور ہر شعبے میں اس کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ انقلاب فرانس تک جو لوگ اپنے کو دانشور سمجھتے تھے ان کا اسی قسم کا دعویٰ تھا اور انقلاب فرانس میں اس کے منفی اثرات کھل کر سامنے آگئے۔ برطانیہ میں جہاں دانشور فرانس کے مقابلے میں بہت کم تھے وہاں وہ تمام مقاصد جن کے فرانسیسی دانشور مدعی تھے بغیر کسی کشت و خون کے حاصل ہو گئے اور فرانس میں کشت خون اور اتھل پتھل کے باوجود ان مقاصد کی پوری تکمیل نہیں ہو سکی۔ طبقاتی امتیاز اب بھی فرانس میں برطانیہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔

فرانس کے بعد روس میں لینن نے عقل کل ہونے کا دعویٰ کیا۔ کچھ لوگ تو جن میں جامعہ ملیہ کے قائم مقام وائس چانسلر ضیاء الحسن فاروقی بھی شامل ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ لینن کی شخصیت مارکس کے مقابلہ میں عظیم تر تھی لیکن وہ لوگ جنہوں نے انقلاب روس کی تاریخ پڑھی ہے اور روس کی موجودہ صورت حال سے واقف ہیں ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ لینن کا ذہن سازشی تو تھا لیکن، اصلاح احوال کا کوئی مؤثر نقشہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ آج بھی روس زندگی کے ہر شعبے میں یورپ سے پیچھے ہے۔

ہندوستان میں دانشوروں کی فراوانی بھی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی دین ہے۔ اس نے ہر نیم خواندہ نوجوان کو جس نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی دانشور کا خطاب دے دیا۔ ان میں بہت سے تو ایسے تھے جنہیں دوسرے مصرعے موزوں کرنے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

دانشوری کی پہلی شرط آزادی فکر پر اصرار ہے لیکن بیشتر ہندوستانی دانشوروں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ انہوں نے اس پر اصرار نہیں کیا بلکہ بڑی فراخدلی سے اس سے دست بردار ہو گئے۔

اب جب کوئی خطرہ در پیش نہیں یہ لوگ آزادیٔ فکر پر ضرور مصر ہیں۔ لیکن اس اصرار کا سلسلہ دانشوروں کے جد امجد شیخ چلی سے ملتا ہے۔ ایک بار یہ بزرگوار چاندنی میں سڑک پر کوئی شے ڈھونڈ رہے تھے۔ کسی کے دریافت

ہندوستانی کمیونسٹوں کی غلامانہ ذہنیت

گوپال متل

ہندوستانی کمیونسٹ اور انکے ہمسفر سوویت یونین کے تئیں جس غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ روس کے ہر جبر اور دھاندلی کا خالصتاً پراوداکی لہجے میں جواز پیش کرنے لگتے ہیں اور ضمیر کی خلش انہیں مطلقاً محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی اس غلامانہ ذہنیت کا اگر دوسرے غیر کمیونسٹ ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کے رویئے سے موازنہ کیا جائے تو اس ذہنیت کی غلامانہ نوعیت اور بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس میں بہت کچھ دخل ان ملکوں کے ماحول کو بھی ہے لیکن مغربی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں کے لئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ روس کے جابرانہ نظام کی تعریف کرسکیں بلکہ اب تو وہ برملا طور پر معترض بھی ہونے لگی ہیں مثلاً ۲۲ اور ۲۳ اکتوبر کو جب چیکوسلواکیہ کے چھ ممتاز غیر مقلدوں کو مجموعی طور پر ساڑھے انیس برس قید کی سزا دی گئی اور سماعت کے دوران بھی کافی دھاندلی ہوئی تو بہت سی کمیونسٹ پارٹیوں نے جن میں فرانس، اٹلی، اسپین، نیدرلینڈ اور برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹیاں شامل ہیں اس کی برملا مذمت کی۔ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی بیوریو نے اپنے بیان میں کہا کہ خالصتاً سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر جو مقدمہ چلایا گیا ہے اس سے فرانسیسی کمیونسٹوں کو بہت تکلیف پہنچی۔ اپنے بیان میں بیوریو نے کہا۔

"ہم نے اس مقدمے کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی اور مسلسل یہ مطالبہ کیا کہ جن لوگوں کو سزا دی جارہی ہے انہیں رہا کیا جائے۔ ہم یہ ماننے کے لیئے تیار نہیں ہیں کہ سیاسی اور نظریاتی جدوجہد کی بجائے، مقدمات اور قید کی سزاؤں کا سہارا لیا جائے فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کے سیاسی بیوریو کا خیال ہے کہ انصاف اور سوشلزم کے مفادات دونوں کا تقاضہ ہے کہ ملزموں کو بری کیا جائے۔"

روم میں اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان یونیٹا نے بھی مقدمے کی مذمت کی ہے اور اسے "سوشلزم کے خلاف" قرار دیا ہے۔ اس جریدے نے لکھا ہے۔

چیکوسلواکیہ کے پریس نے اپوزیشن کے چھ ممبروں کے خلاف جس متشدانہ انداز سے حملہ کیا ہے عوام اس سے آنکھیں نہیں موند سکتے۔ انہیں پانچواں کالم تک کہا گیا۔ اور غیر ملکی مفادات سے بھی ان کا تعلق قائم کیا گیا۔ جس انداز سے مقدمے کی کارروائی جاری تھی اس کے پیش نظر ہر اس شخص کا جو نظام میں مفید تبدیلیوں اور بہتر مستقبل کا خواہش مند ہے یہ فرض ہے کہ وہ ان چھ ملزموں کی جنہیں سزا دی گئی برئیت کا مطالبہ کرے۔"

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی یا اس کے رکن نے اس وقت تک اس قسم کا بیان جاری نہیں کیا۔

ملزموں کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے جنوری ۱۹۷۷ء میں ایک ایسی تحریک جاری کی تھی جس کا مقصد حکومت سے یہ مطالبہ کرنا تھا کہ اقوام متحدہ نے شہری، سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق پر جو قرار دادیں منظور کی ہیں اور جنہیں ۱۹۷۸ء میں چیکوسلواکیہ نے بھی منظور کیا ہے ان کا احترام کیا جائے۔ اور چیکوسلواکیہ کے قانون میں جن شہری آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہے ان کا تحفظ کیا جائے۔ ابتداً اس تحریک کے اعلان نامے پر جو چارٹر ۷۷ کی تحریک کہلائی صرف تین سو لوگوں نے دستخط کئے تھے۔ لیکن اب تائید کرنے والوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ چکی ہے۔

ملزموں پر ۱۹۶۱ کے ضابطہ تعزیرات کے آرٹیکل ۹۸ کی پہلی اور دوسری ذیلی دفعات کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا تھا۔ پہلی دفعہ کا اطلاق ان اقدامات پر ہوتا ہے جن کا مقصد ریاست اور اس کے سماجی نظام کا تختہ الٹنا ہو۔ دوسری دفعہ کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس قسم کی کارروائی کسی غیر ملکی طاقت یا غیر ملکی ایجنٹ کی انگیخت پر کریں۔ ملزموں پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے سوشلسٹ ریاست کے خلاف بداعتمادی پھیلانے اور اس کے غیر ملکی وقار کو گزند پہنچانے کی کوشش کی: اس بات کا خاص طور پر ذکر تھا کہ انہوں نے ایمنسٹی انٹرنیشنل کو مواد بہم پہنچایا اور اسطرح " دنیا بھر میں چیکوسلواکیہ کے متعلق رسوا کن خبریں پھیلائیں۔

چھ ملزموں نے بیان دینے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے کچھ کا یہ کہنا تھا کہ وہ عدالت کو قانونی عدالت نہیں سمجھتے اور یہ بھی کہ انہیں اپنے دفاع کے لیے وکیل چننے کی اجازت نہیں ملی جنہوں نے بیان دیا بھی انہوں نے حکومت کے پیش کردہ ہر ثبوت کو جھوٹا ثابت کیا۔ لیکن حکومت نے اس کا اہتمام کر لیا تھا کہ مقدمے کی کارروائی اخباروں تک اسی شکل میں پہنچے جو حکومت کے حسب منشا ہو۔ تمام غیر ملکی اخبار نویسوں کا داخلہ عدالت میں ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اسی طرح غیر ملکی وکیلوں کو جس میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کا آسٹروی شاہد بھی تھا عدالت میں داخلے سے محروم رکھا گیا۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوتے ہی ایک ملزم ہیرا ہل کی بیوی کو زبردستی کمرۂ عدالت سے باہر نکال دیا گیا۔ پہلے اس سے کہا گیا کہ وہ عدالت کی اجازت سے ہی مقدمے کی کارروائی کے نوٹس لے سکتی ہے۔ لیکن جب اس نے اس کا مطالبہ کیا تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا گیا کہ وہ عدالت کی کارروائی میں مداخلت نہ کرے۔ جیسے ہی وہ عدالت سے باہر نکلی اسے گرفتار کر لیا گیا، الزام یہ تھا کہ اس نے ایک سرکاری افسر پر حملہ کیا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی دھاندلی نہیں تھی اور اگر اس نے مغربی کمیونسٹوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا ہے تو یہ قابلِ فہم ہے۔ لیکن ہندوستانی کمیونسٹ اب بھی سوویت یونین یا اسکے کسی محکوم ملک کا دورہ کر کے آتے ہیں تو ہندوستانیوں کو یہی بتاتے ہیں کہ وہاں خیر سلّا ہے اور انسانی حقوق کا تحفظ ان آزاد ملکوں سے بہتر طور پر ہو رہا ہے۔ ——○

شاید والا معاملہ

کنور سین

بدری ناتھ .... بدری ناتھ .... " برف کا پہاڑ پکارتا رہا۔

چٹان پر بیٹھا بدری ناتھ ہاتھ میں پکڑے پتھر کو دبا دبا کر دیکھنے لگا۔

"وقت بیت گیا۔ نہ یہ اسپنج کی طرح لچک دار ہوا نہ اس سے دودھیا رس ٹپکا۔"

بہت پہلے پہاڑ اُسے اپنے سینے پر کھڑا دیکھ کر چیخ اٹھا تھا۔ لیکن وہ چیخ اتنی بھیانک نہ تھی وہ تو اُس یوگی کے شبدوں کی گونج تھی جس کے مکھ پر ملگجی اُجالا تھا اور ہونٹوں پر پھیکی مُسکان۔

"بدری ناتھ ! تمہارے شریر پر کتنے گھاؤ ہیں! ہاتھ لہولہان۔ تلووں کا ماس جھڑ گیا۔ گھاؤ ہڈیوں تک اُتر گئے۔ یہ تو یاترا کا آرمبھ ہے۔" یوگی بدری ناتھ کو اپنے شریر سے رِستے لہو پر نظریں جمائے دیکھ کر کہتا رہا۔

"ہر کوئی جانتا ہے پگڈنڈیوں پر کانٹے ہیں، راستے پر نوکیلے پتھر۔ لیکن ہر کسی کے من میں کبھی نہ کبھی یاترا کی اِچھا جاگ اٹھتی ہے۔"

بدری ناتھ نے اپنے گھاؤ بھرے شریر کا دھیان چھوڑ کر یوگی کو دیکھا تو وہ بولا !

"بیٹا ! تمہارا انوبھو ابھی گہرا نہیں۔ پھر بھی تم یہاں تک چلے آئے۔"

"میں جانتا ہوں کئی بار آدمی کو چھوٹی عمر میں ہی وِشپان کرنا پڑتا ہے۔"

"تمہارے لیے بھی نگر کے کسی جن پتھ کے آنچل میں استھان نہیں رہا ہوگا۔"

"کیا بستی میں سچ مچ ایک بھی گھر ایسا نہ تھا جس میں دیا جل رہا ہو اور جس کی کھڑکی میں کھڑا کوئی کسی کی راہ دیکھ رہا ہو؟"

یوگی نے آکاش کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور کہتا رہا۔

"میں جانتا ہوں ہرا بھرا سنسار کیسے مرو بھومی میں بدل جاتا ہے۔ پربت رائی بن جاتا ہے۔ اور ساگر اوس کی بوند۔ تم پر بھی وہ سمے آیا جب آس پاس سناٹا گونجتا ہے، آکاش میں بادل چیختا ہے، بجلی تلملاتی ہے۔"

"یہ تب ہوتا ہے جب ماتا اپنی کوکھ کو جھٹلاتی ہے بعد اپنی سنتان کو اندھے پلیٹ فارم پر چھوڑ کر واسنا کی گاڑی میں سوار ہو جاتی ہے۔"

"اس سے پہلے وہ اپنے پریمی کا ساتھ نبھانے کے لیے اپنے پتی کو زہر دے ڈالتی ہے۔"

بدری ناتھ کی آنکھوں میں تیرتی نراشا کو دیکھ کر یوگی اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

"میرے بچے ! شاید تمہارا پتا قصائی بن گیا اور اپنے لہو کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھنے لگا۔

کہیں اُس نے بھی اپنی دوسری پتنی کی آنکھوں میں پھیلی گھبرنا کو شانت کرنے کے لیے تمہاری سوگ

باسی ماں کا چتر دیوار سے اتار کر زمین پر تو نہیں دے مارا۔"

"مرتیو کے پشچات آدمی کا سمان بھی مر جاتا ہے"

"میں تمہارے وِلاپ کا ارتھ سمجھتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں سنسار بہرا اور گونگا ہے۔"

"جیون بھیڑیئے سے ادھک بھیانک۔ پھر بھی....."

"پھر بھی کیا، بابا؟" بدری ناتھ ممیایا۔

"پھر بھی تم نے سب کچھ جھیلا اور کوئی نہ کوئی چھوٹا سا استھان اس بڑے سنسار میں اپنے لیے ڈھونڈا۔ لیکن تمہیں کہیں آسرا نہ ملا۔"

"سچ بتاؤ، کہیں تمہارے ساتھ بھی سنسار نے درون آچاریہ کا سا برتاؤ تو نہیں کیا جس نے مٹی کا درون آچاریہ بنا کر دھنش وِدیا سیکھنے والے ایکلو کو اپنے راجکمار شِشیہ ارجن سے پیچھے رکھنے کے وچار سے گورو دکشنا میں اس کا دایاں انگوٹھا کٹوا لیا۔ لیکن....."

"اب، لیکن کی بات نہ کرو بابا۔"

"میں جانتا ہوں تم ایسا کیوں کہتے ہو۔ تمہیں کون سی چنتا ہے۔ جب گورو شِشیہ کی شردھا کو جھٹلاتا ہے تو وا تا ورن لہولہان ہو جاتا ہے۔ تبھی تو بھی..."

یوگی نے بدری ناتھ کے اندر جھانکا۔

"تبھی تو تم بھی میرے سمان اپنے ماس اور رکت کا بلیدان دے کر یہاں تک آ پہنچے۔"

"میں نے بھی بڑے بھائی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے۔"

"اس نے کئی سال مجھ سے پشو کے سمان کام لیا اور مجھے میری پتنی اور بچے کے ساتھ گھر سے نکال دیا۔"

"جس مِتر کے پاس میں نے شرن لی اس نے میری پتنی ہتھیا لی۔"

"میرا اکلوتا منا روگ اور بھوگ سے نڈھال ہو کر سڑک کے کنارے میری گود میں دم توڑ گیا۔"

"میں تمہارے سمان شہر کے مندر میں آئے سادھوؤں کے چرنوں میں جا گرا۔ لیکن....."

"لیکن کیا؟" بدری ناتھ نے پوچھا

"لیکن مجھے پتہ نہ تھا کہ شہر اور سادھو کا میل نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایک کے بعد ایک چنڈال پر بھروسہ کرتا رہا۔

"سیوا کا یہی پھل ملا کہ انت میں بابا نے میری لنگوٹی بھی اتروا لی۔

"جب میں یہاں پہنچا مجھے کوئی گیان نہ تھا کہ سادھنا کسے کہتے ہیں اور شردھا کیا ہوتی ہے۔

"اس بیراگی کی کتھا بھی تو میں سن چکا تھا۔ جو اس چٹان تک پہنچنے کے بعد گھر لوٹ گیا۔

"اس پاپ کا ڈنڈ اسے یہی ملا کہ اس کے بھائی بہنوں نے اسے پاگل کہہ کر نیچی چھت کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔

"جب وہ دروازہ توڑ کر چیختا ہوا باہر بھاگا تو انہوں نے اس پر شکاری کتا چھوڑ دیا کہ لوگ تماشہ دیکھیں اور انہیں اس پاگل سے چھٹکارا ملے۔ جو جائداد میں برابر کا حصہ دار تھا۔ پھر بھی....."

"پھر بھی کیا بابا؟" بدری ناتھ کسمسایا

"تم نہیں جانتے میرے بیٹے! ایک بھول تم نے اس سنسار میں جنم لے کر کی اور دوسری اسے تیاگ کر۔"

یوگی کی آواز دکھ سے بھر گئی!

"اپنے سے چھٹکارا پانا آسان نہیں۔ وستو اور وِشیہ سے مکت ہونا مشکل ہے۔ پھر بھی میں مانتا ہوں کبھی لوگ ایسا بھی کر سکتے ہوں گے۔ اب تو....."

"اب تو کیا، بابا؟"

"اب وہ بات نہیں رہی۔" یوگی سر کے بال نوچنے

لگا۔

"شاید اُدھی شردھا کا یُگ بیت گیا۔" ایک لمحہ رکنے کے بعد یوگی کی اداس آواز سنائی دی۔

"کیا تم نے اس سادھو کی کہانی نہیں سنی جس کا جنم جنم کا تپ اور تیاگ بےکار ہو گیا۔ وہ 'اگر مگر' کے چکر سے نہ چھوٹ سکا۔ جب اسے گیان کا آبھاس ہُوا تو اس نے سو گز اونچی دیوار سے چھلانگ لگا کر دلش کال پر وجے پراپت کرنے کو سچ کر دکھانا چاہا۔ لیکن چھلانگ لگانے سے ایک پل پہلے اس کے من میں سندیہ پیدا ہو گیا اور اس نے اپنے سے کہا —— اگر ایشور ہے تو مجھے اس اونچائی سے کودنے پر بھی کوئی چوٹ نہیں آئے گی۔ اس 'اگر' نے اس کی تپسیا اکارت کر دی اور اس کی ٹانگ کی ہڈی میں دڑار آ گئی۔"

بولتے بولتے یوگی نے اپنے ہاتھ کا پتھر بدری ناتھ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ اس سے بھی برا ہوا۔ جس مہاتما نے مجھے اس چٹان پر بٹھایا وہ بھی سامنے والے مندر کے دوار تک ہی پہنچ سکا۔ کہتے ہیں کبھی کسی نے دنیا میں پھیلے وش کو پی لیا تھا اور امرت نے اسے تمام بندھنوں سے مُکت کر دیا۔ تب سے آج تک کوئی نہ کوئی اس چٹان پر بیٹھ کر تپسیا کرتا رہا۔"

یوگی سسکنے لگا۔

"ہے بھگوان! مجھ سے بھی ایسا ہو سکتا۔"

بدری ناتھ کو کانپتے دیکھ کر یوگی کے منہ سے چیخ نکلی۔

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ کچھ بھی چھپاؤں گا نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہیں شہر میں رہ کر بنیے اور پاپ کا ہر اپائے سے سامنا کرنا چاہیے تھا۔ ایک بھی پگڈنڈی سپھلتا کا وشواس دلاتا بند نہیں کرتی۔ تمہیں واپس بھی نہیں بھیج سکتا۔ شاید فالاِ معاملہ سدا بنا رہتا ہے۔

"اس مہاتما نے پتھر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور اس چٹان پر بیٹھ کر سمے اور استھان پر وجے پانے کا اپائے بتایا۔

"اس کے اپدیش کے انوسار میں نے برف سے اپنے متروں اور شتروؤں کی مورتیاں بنائیں اور انہیں بے چہرہ کرنے میں جُٹا رہا۔"

"لیکن میں اپنے بھائی کی مورتی کو بے چہرہ نہ کر سکا۔"

"اسی لیے میری داڑھی مٹیالی ہے اور مسکان پھیکی۔"

یوگی چٹان سے نیچے اتر آیا اور اس نے پتھر بدری ناتھ کو تھما دیا۔

"اسے اپنے پاس رکھ لو۔ ارے، تم مسکرانے لگے۔ میں جانتا ہوں پتھر ہاتھ میں لیتے ہی تمہارے ہر گھاؤ کی جلن مٹ گئی۔"

"لیکن بات تو اندر کی آگ ہے جس میں ایرشا اور بدلے کا ایندھن پڑتا رہتا ہے۔ اسے شانت کرنے کے لیے تمہیں رتو پر یورتن کا دھیان چھوڑنا ہوگا۔

"آس پاس سے بےخبر ہو کر اپنی پہچان کی منزل تک پہنچنا ہوگا۔

"سنسار یہاں بھی تمہارا پیچھا کرے گا۔ لیکن تمہیں اُدھر دھیان نہ دے کر آگے بڑھنا ہوگا۔ جب تک یہ پتھر اسپنج کے سمان لچکدار نہ ہو جائے اور اس سے دودھیا رس نہ ٹپکنے لگے۔"

"اب تم چٹان پر بیٹھ جاؤ اور برف کی مورتیاں بنا کر انہیں بے چہرہ بنانے میں جُٹ جاؤ۔"

یوگی مندر کی طرف جانے لگا۔

"اب مجھے کبھی یاد نہ کرنا۔ نہیں تو ....."

بدری ناتھ لاکھ چاہتے ہوئے بھی اسے روک نہ سکا۔ نہ پتھر کو ہاتھ سے پھینک سکا۔

"بدری ناتھ! —— بدری ناتھ!" پہاڑ ایک بار پھر چیخا۔

اپنی کہانی کو پڑھنا چھوڑ کر وہ چونکا۔
"اُس کے جی میں آئی پہاڑ سے نیچے اُتر جائے۔
لیکن ابھی تو ساری مورتیاں اپنے کروٹ چہروں کے ساتھ اسے گھور رہی تھیں۔
نہ پتھر ابھی تک اسپنج بنا تھا نہ اس سے دودھیا رس ٹپکا تھا۔ اس کا باپ اور سوتیلی ماں اس کے اندر زندہ تھے۔
وہ جھلّایا اور اس نے ایک بار پھر پہاڑ کے آنچل میں جھانکنے کے لیے نظر جھکائی۔
ایک بار پھر وہ اندر تک کانپ اٹھا۔
ادھر کھڈ بہت گہری تھی اور شہر میں نیچی چھت والی چھوٹی سی کوٹھری۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔
پہاڑ کے تیسری بار چیختے ہی وہ پتھر کو پھر سے دبانے لگا تو......
مٹ میلی داڑھی والا یوگی اسے لال آنکھوں سے گھورنے لگا۔
"کہیں 'شاید' والا معاملہ بھی تو نہیں مر گیا؟"
بدری ناتھ کی آتما شتی ہونے لگی۔
پہاڑ زور سے چیخنے لگا۔

○○

بقیہ پدما کے کنارے

دھارنے لگیں۔ پدما کی اونچی اونچی لہریں بپھرنے لگیں۔ ایسی ہیبت ناک لہریں کہ بڑے بڑے جیالوں کے دل دہل جاتے۔ پھونس، بانس اور ٹین کے مکانات ہوا میں تنکے کی طرح اڑنے لگے۔ بڑے بڑے تناور درخت اکھڑ کر زمین بوس ہو گئے یہ "سائیکلون" اپنے جلو میں تباہ کاریاں اور بربادیاں لے کر آیا تھا۔ سینکڑوں گھر اُجڑ گئے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے۔
اشرف الدین اسی رات شہر پہنچ گیا تھا جب اسے طوفان کی تباہ کاریوں کی خبر ملی تو وہ الٹے پاؤں اپنے گاؤں بھاگا۔ اس کے گاؤں میں سب سے زیادہ تباہی مچی تھی۔ جس اسٹیمر میں وہ آیا تھا اور بھی بہت سارے لوگ امدادی وفد کی شکل میں آئے تھے تاکہ مجبوروں اور محتاجوں اور برباد لوگوں کی مدد کی جا سکے۔
اسٹیمر کے گھاٹ پر لگتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر اپنے چھوٹے سے آشیانہ پر پڑی۔ مگر اب وہاں کیا رکھا تھا۔ جھونپڑی ماچس کی تیلیوں کی طرح اڑ گئی تھی۔ خالی جگہ بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ آم کا درخت سرنگوں ہو کر اپنے مالک کے سامنے شرمندہ تھا۔ اشرف الدین بھاگا بھاگا اپنے قطعہ اراضی پر گیا جہاں اس نے اپنی شریکِ حیات سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد و پیماں کیا تھا۔
اس کا گھر بالکل دریا کے کنارے تھا۔ پدما نے ساحل کی تمام جھونپڑیاں اور درخت توڑ پھوڑ کر اپنا پیٹ بھر لیا تھا۔ طوفان نے تمام چیزوں کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔ اشرف الدین نے نیچے نظر ڈالی۔ کئی لاشیں ساحل کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بڑھا۔ پڑوسیوں کی لاشوں کو پھلانگتا ہوا وہ ایک جگہ ٹھٹھک گیا۔ سرخ ساڑی میں ملبوس سلطانہ ابدی نیند سو رہی تھی، مچھلیوں اور کیکڑوں نے جگہ بہ جگہ سے گوشت نوچ نوچ کر کھا لیا تھا پانی میں پھول کر اسکی شکل بگڑ گئی تھی لہریں سلطانہ کے بے جان جسم پر آ کر سر پٹخ رہی تھیں۔ اس سال بھی ہزاروں انسان اس پاگل دریا کے چنگل سے چھٹکارا نہ پا سکے۔
اشرف الدین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہہ بہہ کر پدما کے پانی میں اضافہ کرنے لگیں۔

○○

غزلیں

عروج زیدی

اثرطلب تھی تجسس میں تھک گئی ہوگی
دعائے نیم شبی عرش تک گئی ہوگی

شعاعِ غم کی جو اُن تک جھلک گئی ہوگی
مذاقِ عشق کی قسمت چمک گئی ہوگی

تمہاری طرزِ تبسم اڑا نہیں سکتی،
کلی کلی ہے ہوا سے چٹک گئی ہوگی

گراں اثر ہے ہوائے چمن یہ کیوں کہیئے
گلوں سے شاخِ نشیمن لچک گئی ہوگی

بنامِ دید ترے عزمِ خود نمائی پہ
نگاہِ شوق کی بجلی بھڑک گئی ہوگی

نفس نفس ہے معطر تمہاری قربت سے
فضائے کون و مکاں بھی مہک گئی ہوگی

شرابِ آرزو آنکھوں کی راہ کیا بہتی
بھرے ہوئے تھے یہ ساغر، چھلک گئی ہوگی

حریمِ ناز جہاں بجلیوں کے پہرے ہیں
وہاں ہماری نظر بے جھجک گئی ہوگی

حجاب و شوق کا وہ معرکہ، خدا کی پناہ
نظر خرابِ یقیں تھی بہک گئی ہوگی

شکستِ شیشۂ دل کا ملال، کیا معنی
ہمیں خوشی ہے کہ اُن تک کھنک گئی ہوگی

نظر نظر کے تصادم کی بات، ارے توبہ
یہ پَر لگا کے بڑی دور تک گئی ہوگی

خیالِ ترکِ وفا کو بھی کھیل سمجھے تھے
زمین پاؤں تلے سے کھسک گئی ہوگی

عروج! شوقِ نمائش مرا مزاج نہیں
فسردہ رخ سے حقیقت جھلک گئی ہوگی

آمر صدیقی

(باقی کی نذر)

دھرتی سے امبر تک چھانے والا میں
دھول بھرے رستے چمکانے والا میں

سر سے پا تک کبھی نہ بجھنے والی پیاس
ننگ دھڑنگ بھی شور مچانے والا میں

گونگے کو بھی خواب دکھانے والا تو
آنکھوں سے روداد سنانے والا میں

موسم کی شادابی پہ قبضہ تیرا
پتھر پر بھی پھول کھلانے والا میں

پیڑوں پر تارے لٹکاتا فن تیرا
اس دھرتی سے شاخ ہلانے والا میں

ساگر میں طوفان اٹھانے والا میں
تہہ سے موتی چن کر لانے والا میں

مرہم اور نمک دونوں سوغات تری
خود سے اپنے زخم چھپانے والا میں

یگ کے ساتھ بدل جانا فطرت تیری
یگ کو اپنے ساتھ چلانے والا میں

رو کر بھیک نہ مانگوں تجھ سے جیون کی
ہنس کر اپنی جان گنوانے والا میں

غزلیں

احسن شفیق

کچھ بھی صحرا نہ سمندر کا پتہ رہ جائے گا
اب کے وہ منظر بھی کوئی دیکھتا رہ جائے گا

اپنے ہونٹوں پر لیے محرومیوں کا رقص وہ
خواہشوں کے درمیاں ہی چیختا رہ جائے گا

شور و ہنگامہ زمیں کا بے زمیں ہو جائے گر
آسماں! پھر تجھکو کس کا آسرا رہ جائے گا

عمر بھر اب طے نہ ہوگا ٹوٹے رشتوں کا سفر
میرے اُس کے بیچ لمبا فاصلہ رہ جائے گا

منزلوں کے اس تعاقب میں یہ لگتا ہے مجھے
نیم خوابیدہ سفر کا راستہ رہ جائے گا

دشتِ محرومی لگا ہوں میں عجب چاروں طرف
جستجو کی خاک ہی روشن ہے اب چاروں طرف

اس تلاشِ رائیگاں شوقِ سفر کا سلسلہ
عمر بھر بکھرا رہے گا بے سبب چاروں طرف

سبز منظر شہر کا آنکھوں میں گم ہو جائیگا
زرد خواہش کا دھواں پھیلے گا جب چاروں طرف

خوبصورت نام رشتوں کی کڑی میں جوڑ کر
پھر رہے ہیں لوگ بے نام و نسب چاروں طرف

کچھ پرندے خواہشوں کے خوف کی دیوار پہ
رات دن بیٹھے ہوئے ہیں بے سبب چاروں طرف

انداز دیکھو

ڈاکٹر زرینہ ثانی

نظامِ میکدہ بگڑا ہوا ہے
نظام خانقاہ اس سے بھی بدتر
اذاں بے سوز ، سجدے غیر مخلص ،
صدا ناقوس کی بے کیف سی ہے
عبادت میں حضوری ہے ، نہ لذت
نجاتِ دیدہ و دل بے یقین ہے
تعین گام و منزل کیا کریں ہم
شبہ ہے ، شک ہے ، لادینی بھری ہے
محبّت ، آدمیّت
مساوات و حضوری
بتانِ رنگ و بو کے قافلے ہیں
فریبِ دہر کے یہ سلسلے ہیں
خلوصِ دل کی نایابی یہاں ہے
خود اپنی ذات سے بیگانگی ہے
نہ شانِ دلرُبائی ہے
نہ عاشق کی ادا باقی
تشدّد کی حمائت ہر طرف ہے
اخوت کا جنازہ پیٹتے ہیں
صغیرانِ حرم ہوں یا نقیبانِ عجم ہوں
وہی بازی گری ہے سامری سی
وہی افسانۂ جادو سرائی
مگر اس پر بھی یہ انداز دیکھو
ترقی یافتہ کہلا رہے ہیں

وکٹوریہ میدان کی ایک شام

اشہر ہاشمی

چمک کر ڈوبتے سورج کی لہراتی ہوئی سرخی نے اپنا عکس
اودے بادلوں کے جسم پر ڈالا
انہیں گلنار کر ڈالا

ابھی کچھ دیر پہلے
بارشوں کا دیوتا گذرا ہے
انسانوں کے اس کالے گھنے جنگل سے
اپنے ساتھ ہی لیتا گیا ہے
چلچلاتی دھوپ کی چادر
مگر بارش کی بو اب بھی بسی ہے ان ہواؤں میں
نکلتے مئی کی بوجھل لڑکھڑاتی شام کا چہرہ
نکھر آیا

کہاں بستی کی جانب جا رہے ہو
زرد آسیبوں میں اپنا سر کھپانے کو
یہاں وکٹوریہ میموریل کے سامنے
پھیلے ہوئے ٹھنڈے ہرے میدان میں کچھ دیر رک جاؤ
کہ یہ ساعت بھٹک کر، بھول کر آتی ہے

دانستہ کبھی اس شہر کی جانب نہیں آتی
ہوائیں گدگداتی ہیں
نہ بارش ہی مہکتی ہے
دھوئیں کے گرم گیلے بادلوں کا رقص رہتا ہے
یہاں انساں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بہتا ہے
نہ سنتا ہے کبھی نغمہ سرائی حسن فطرت کی
نہ اس کو گنگنانے ناچنے اور زندگی میں رنگ بھر دینے کا
کہتا ہے

کہاں بستی کی جانب جا رہے ہو
زرد آسیبوں میں اپنا سر کھپانے کو
یہاں
وکٹوریہ میموریل کے سامنے پھیلے ہوئے
ٹھنڈے ہرے میدان میں کچھ دیر رک جاؤ
ہواؤں کو بدن چھو کر گذرنے دو
نظر کو سرخ نیلے منظروں کی سیر کرنے دو
دل مضطر میں کوئی خوب سا جذبہ ابھرنے دو

غالبؔ کے سفارش نامے

مسلم ضیائی مرحوم

ملنے کو تو حالیؔ بھی غالبؔ سے ملتے تھے اور مجروحؔ بھی۔ غالبؔ کے مرنے پر حالیؔ نے بھی استاد کا مرثیہ کہا اور مجروحؔ نے بھی۔ دونوں نے ایک ہی صنف یعنی ترجیع بند میں اپنے جذبات کا اظہار کیا لیکن دونوں ترجیع بندوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں وہی فرق تھا جو حالیؔ اور مجروحؔ میں

بات یہ ہے کہ فن کار ہمیشہ اپنے فن میں اپنی افتادِ طبع اور رنگ طبیعت کا نادانستہ طور پر اظہار کر دیتا ہے۔ لیکن افتادِ طبع میں فطرت اور تربیت دونوں شریک ہوتے ہیں اس لئے ہر فن پارے سے فنکار کے علم تجربے اور ماحول کے اثرات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

غالبؔ کے خطوط کثیر بھی ہیں اور متنوع بھی۔ وہ اسی قدر پہلو دار ہیں جس قدر غالبؔ کی شاعری یا شخصیت ان کے خطوط میں علمی بحثیں بھی ہیں، خوش طبعی بھی ہے اپنی زندگی کی داستان بھی ہے اور اپنے دور کی سماجی تاریخ بھی۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہزار چشم اور ہزار خیال انسان تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قلمروِ سخن میں لاکھوں نگاہیں ان کی منتظر رہتی تھیں اور ان کی تحریروں کی منتظر رہتی تھیں۔ حیدرآباد دکن کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ غالبؔ کا خط کسی کے پاس آتا تو غالبؔ دوست جمع ہوتے اور وہ خط سب کو سنایا جاتا۔ بعض خطوں کی عبارت سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انوار الدولہ شفق، صاحب عالم مارہروی اور مہدی مجروح کے ہاں بھی کچھ اس قسم کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔

وہ اپنے دور کے ممتاز لوگوں میں تھے مغل دربار کے ملازم ہونے کی حیثیت سے پچاس روپئے تنخواہ ملتی تھی مگر اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ ان کی عزت بھی، پچاس روپے کے برابر تھی۔ ان کا رتبہ آسمان کے برابر نہیں، اس سے بھی بلند تھا۔ شاہی ملازم کی حیثیت سے نہیں، نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ بہادر کہلانے سے نہیں بلکہ ان کے علم، ان کی شاعری، ان کی مکتوب نگاری ان کی شائستگی اور انسان دوستی کے باعث۔

جاگیرداری دور کے معاشرے سے لے کر اس وقت تک انسان محض اپنی قابلیت کی بنا پر ذرا مشکل ہی سے اپنے معاشی مرتبہ پر پہنچا ہے، کیونکہ ہماری معاشی زندگی میں ابھی تک کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی اور انسان سود و زیاں کے چکر میں گرفتار ہے۔ مربی بیار و سر تا بخور والی مثل مدتوں سے چلی آ رہی ہے اور آج بھی اس میں ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی یعنی سفارشیں آج بھی پروانۂ حصول معاش ہیں۔

غالب نے جاگیرداری دور کی بدترین افراتفری کو دیکھا
غل سلطنت کی تباہی نے معاشی زندگی میں سخت ابتری
پھیلا دی تھی۔ بیروزگاری عام تھی۔ ایسے زمانے میں
روزگار حاصل کرنے کے لیے ممتاز آدمیوں کی تحریروں کا
سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ تحریریں عموماً خطوط کی شکل میں
ہوتی ہیں۔

غالب سے پہلے عموماً فارسی میں خط لکھے جاتے تھے
ان میں بہت زیادہ صناعی اور لفظی بازی گری ہوتی
تھی۔ انتہا یہ کہ تعزیت نامے بھی ان سے بری نہ تھے
لب نے ابتدا ہی سے غالباً انگریزی خطوط سن کر اور
ان کی روش دیکھ کر خطوط نگاری کے لیے چند اصول
متعین کر لیے تھے۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں انہوں نے
بخش رنجور کے لیے پنج آہنگ میں لکھا کہ "جب میں
خط لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو
اس کے مرتبے کے لحاظ سے مخاطب کر کے بیان مدعا
کیا جاتا ہوں۔ القاب و آداب اور خیریت کی اطلاع دینا
ضرورت سمجھتا ہوں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ
اس میں کتنی ساحری کی جا سکتی ہے۔ اور سخن گستری کی
گنجائش ہے۔

اس لیے انہوں نے اپنی شاعری کے مانند اپنے
خطوط میں بھی ساحری اور سخن گستری کی ہے۔

آج کی پیچیدہ دنیا میں تعلقات بھی پیچیدہ ہو گئے
اور مسائل بھی۔ چنانچہ بعض اوقات کسی عزیز یا دوست
ایک طرف تو سفارش نامہ ہاتھ سے لکھ کر یا ٹائپ
کر کے دیا جاتا ہے پھر اس کے مرسل الیہ کے پاس پہنچنے
سے پہلے ہی ٹیلیفون بھی کر دیا جاتا ہے کہ اس کو کسی طرح
دو۔ اور اس جگہ میرے بیٹے (داماد یا بھائی بھتیجے)
کو رکھ دو۔ غالب کے زمانے کا معاشرہ نہ اتنا پیچیدہ
تھا اور نہ ایسا کیا جاتا تھا اور اگر کوئی شخص مروتاً
یا اخلاقاً سفارش کر کے اس کے خلاف کہہ بھی دیتا تو
کم از کم غالب کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا

ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ بے غرض ہمدرد اور انسان
دوست لوگ ایسا نہیں کرتے۔ حالی غالب کے کردار
کے گواہ ہیں اور حالی کی شرافت پر ایمان لاکر ان کی
راست گفتاری کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

غالب چونکہ اپنے دور کے ممتاز آدمی تھے اس لیے
لوگ ان کے پاس آتے اور مدد چاہتے تھے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے لیے دوسرے معاملات کے
مانند سفارش کے لئے بھی چند اصول مقرر کر رکھے
تھے اور ہر شخص کی سفارش نہ کرتے تھے۔ سب سے
پہلے ان کے سامنے یہ بات رہتی تھی کہ جس شخص کی
سفارش کر رہے ہیں وہ سفارش کا مستحق بھی ہے
یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی خیال
رہتا تھا کہ جس شخص سے سفارش کی جا رہی ہے وہ
اس سفارش کے مطابق کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر
حاجت مند اور متعلقہ شخص دونوں سے مراسم ہوتے
تو خاموشی اختیار کر لیتے براہ راست نہ لکھتے اور کسی دوسرے
شخص سے مراسلت کے ذریعے حالات معلوم کرتے رہتے۔
لیکن ان کی ہمدردیاں ہمیشہ حاجت مند کے ساتھ رہتی
تھیں براہ راست گفتگو ہوتی تو حاجت مند کی موافقت
کرتے۔

مثال کے طور پر قربان علی بیگ سالک اور شمشاد علی
بیگ رضوان دونوں بھائیوں سے غالب بہت محبت
کرتے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک رہتے اور ان
کی بہتری چاہتے تھے چنانچہ رضوان کو ایک خط میں
"فرزند دلبند" لکھا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان
شرفاء کی حالت نہایت خستہ و خراب ہو گئی تھی۔ سالک
اور رضوان دونوں بے روزگار تھے اور پریشان۔
اس لئے ایک خط میں علائی کو لکھتے ہیں۔ (۱۸۶۳ء)

"کل شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین
کہتے تھے کہ نواب صاحب (نواب امین الدین احمد خاں)
فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول

مروگے ؟ میں نے کہا دال روٹی چاہتا ہوں مگر پیٹ بھر کے۔

غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ، مالک سے سلوک منظور نہیں تنہا ہوائے شمشاد، بسراست۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی، تو حافظا مخروش

دیکھیے اس "مخروش" میں کس قدر خروش بھر دیا ہے۔ آرزو ہے کہ دونوں بھائیوں (سالک و رضوان) روزگار سے لگ جائیں! امین الدین خاں غالب کے برادر نسبتی ہیں اور لوہارو کے نواب لیکن غالب انہیں راست نہیں لکھتے اس خیال سے کہ کہیں بات رد نہ ہو جائے۔ کہیں ان کی ہیٹی نہ ہو جائے، چنانچہ ایک دوسرے خط میں انہی علائی کو لکھا کہ۔

"مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھو گے میری طرف سے وہی جواب ہوگا جو آگے لکھ چکا ہوں۔ یعنی میں تماشائی محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب (امین الدین خاں) مجھ سے ذکر کریں گے تو بھلی کہوں گا۔

اور جب رضوان لوہارو پہنچ گئے تو انہی علائی کو غالب نے لکھا۔ (۱۸۶۲ء)

"جانِ غالب
مگر جسم سے نکلی ہوئی جان۔ قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے۔ خدا کا احسان۔ مرزا قربان علی بیگ تمہاری کشش سے مجذوب کیوں بنتے وہ تو خود سالک ہیں مگر ہاں یہ صاحب زادہ سعادت مند رضوان سوا اس کے آپ مالک ہیں۔

نواب صاحب کا ہم سطیخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوگا۔ کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا مقرر ہوا! اثنا عشری[۲] ایک تم ہو۔ سو تمہیں اختیار نہیں البتہ عشرۂ مبشرہ کی اولیت برملا ہے۔ باپ تمہارا خلاف قاعدہ اہل سنت و جماعت عشرے میں سے ثلثہ[۳] کو کم کرتا تھا۔ رضوان نے نہ مانا وہ کیونکر مانتا! وہ ثلثہ کا دم بھرتا تھا..... رضوان کو دعا پہنچے۔ نواب صاحب کی عنایت اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو۔

یہ بڑا دلچسپ خط ہے۔ میرے دوست قدرت نقوی نے اثنا عشری[۱۲] سے شاید مراد لیا ہے[۱] لیکن یہاں معاملہ صرف تنخواہ کا تھا۔ علائی رضوان کو بارہ روپیہ مہینہ دلوانا چاہتے تھے۔ امین الدین احمد خاں سات روپیہ دینا چاہتے تھے (عشرہ میں سے ثلثہ کم) اور رضوان دس روپے کے طالب تھے۔ اس کی وضاحت علائی کے نام ایک اور خط سے ہو جاتی ہے جس میں لکھتے ہیں۔

"بیچارے مرزا (رضوان) کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا۔ یہاں پندرہ[۱۵] کا سوال۔ وہاں دس میں سے تین[۳] کم کرنے کا خیال۔ مرزا قانع و متوکل ہیں۔ نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس اللہ بس ماسوا ہوس

ایک متوسل کی سفارش

اب ذرا مرزا علی حسین خاں سے متعلق ایک سفارش نامہ ملاحظہ ہو۔ ان کا تعلق دلی کے ایک ذی مرتبت خاندان سے تھا اور نواب امین الدین خاں کے متوسل تھے۔ بیوی کی بیماری کے باعث رخصت لے کر آئے اور جلد واپس نہ جا سکے اس لیے علائی نے غالب کو بار بار خط لکھے جس میں علی حسین خاں کے واپس نہ آنے کی شکایت کی گئی تھی۔

مرزا علی حسین خاں غالب سے جا کر ملے اور حالات بتائے تو غالب نے علائی کو ان کے بارے میں لکھا۔

"مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمہارے یک مشت ان کو دیئے۔

---

[۱] ماہِ نو۔ فروری ۱۹۴۲ء

تہارے پاس بھیجنے کا ان کو اختیار ہے۔ علی حسین کو
،کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت بعد بھیجے گئے۔
ب پایا کہ ایک مہینے اور دس دن کی رخصت لے کر
ہوں۔ بی بی بیمار ہے۔ اس کا استعلاج منظور

-

میری جان بھی علی حسین کے کام آئے تو دریغ نہ
ں۔ بھلا یہ مبالغہ سہی بلکہ بے شک تبلیغ و غلو
یکن قریب اس کے یعنی یہ چیز امکان سے
ہو۔ مگر سوچو کہ آئین غم خواری و اندوہ گساری
گا۔

مرزا، بد وضع و بد روش نہیں کہ پند و بند کا محتاج
اس کا مقدمہ کسی محکمے میں دائر نہیں کہ مصلحت و
رت کی احتیاج ہو۔ اپنے امور خانگی یعنی بی بی
س کے آبا و اخوان کے معاملے۔ ان میں نہ تم
ں نہ مجھ کو مداخلت۔ تم علی حسین کو اس پیوند
چھیڑتے ہو اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا دادا
ڑا آدمی تھا! اور اس کے دادا اور اس کی سسرال
ہے۔ یہ ذریعہ فخر ہے۔ اس کو اور اس کے طفیل
بلکہ تھوڑی سی نازش مجھ تنگ اقربا کے حصہ
ی آجائے تو کچھ بعید نہیں۔

دیکھا آپ نے کہ غالب نے ایک شریف اور پریشان
ں کی جس کے بزرگوں سے ان کے مراسم تھے
رح تائید و سفارش اور ہمدردی کی ہے اور
طرح اس کی پریشان حالی کے زمانے میں علائی
ا ہے کہ اسے اس پریشانی کے وقت نہ چھیڑیں
ں وقت تک انتظار کریں کہ وہ شخص جو بد
ی نہیں ہے اور "بد روش" بھی نہیں
ت سے فراغت پا کر اپنی خدمت پر رجوع
ئے۔

رکاب دار کی سفارش

لائی کے چچیرے بھائی اور ضیاء الدین خان نیر کے
بیٹے شہاب الدین احمد خاں ثاقب تھے۔ گویا غالب کے پوتے
سنہ ۱۸۹۱ء کا زمانہ تھا۔ لوگ روزگار کی تلاش میں مارے
مارے پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سید حسن علی
غالب کے پاس بھی پہنچے اور غالب نے ثاقب کو سفارش
نامہ لکھا۔

"نور چشم شہاب الدین خاں کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ
یہ جو یہ رقعہ لے کر پہنچے ہیں ان کا نام حسن علی ہے اور یہ
سید ہیں۔ دوا سازی میں یگانہ، رکاب داری میں یکتا
جان محمد ان کا باپ ملازم سرکار شاہی تھا۔ اب ان
کا چچا میر فتح علی پندرہ روپیہ کا الور میں نوکر ہے۔ بہرحال
ان سے کہا گیا ہے کہ پانچ روپیہ مہینہ ملے گا اور لوہارو
جانا ہوگا۔

انکار کیا کہ پانچ روپیہ میں کیا کھاؤں گا! یہاں
زن و فرزند کو کیا بھجواؤں گا؟ جواب دیا کہ سرکار بڑی
ہے۔ اگر تمہارا کام پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔
اب وہ کہتا ہے کہ خیر توقع پر یہ قلیل شاہراہ قبول
کرتا ہوں مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں۔
بغیر اس کے کسی طرح جا نہیں سکتا۔

سنو میاں! حق بجانب اس غریب کے ہے۔ روٹی بغیر
بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپورٹ کر دو گے تو اس
امر کی منظوری کا حکم آجائے۔ یہ قصہ فیصل ہوا۔

اب وہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو تاکہ کپڑا لتا
بناؤں اور کچھ گھر دے جاؤں۔ راہ میں روٹی اور سواری
سرکار سے پاؤں۔

تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں مگر کچھ
کہہ نہیں سکتا۔ خیر تم یہ میرا رقعہ اپنے نام کا علائی مقولائی کو
کو بھیج دو۔"

غالب نے یہ سفارشی نامہ شہاب الدین خاں کو حسن
علی رکابدار کے ساتھ اس کی ملازمت کے لیے بھیجا۔ پہلے
اس کا سماجی مرتبہ بتایا کہ یہ سید ہیں۔ پھر اس کی لیاقت
کا حال بتایا کہ دوا سازی میں یگانہ اور رکابداری میں

ں۔ پھر باپ اور چچا کا معاشی درجہ۔ اس کے بعد
، کا تعین اور اس کے بعد تنخواہ کے ساتھ کھاتا
ہ پیشگی رقم گھر کے انتظامات کے سلسلے میں اور آخر
جانے کا کرایہ۔ اور ان سب معاملات میں حق
ب سائل قرار دیتے ہوئے اپنی مجبوری بھی ظاہر
ی کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ یہ ملے گا یا نہیں۔ اور
، خود کوئی فیصلہ نہ کر سکتے تھے اس لیے یہ بھی لکھ
تم یہ رقعہ علائی کو بھیج دو تاکہ مصلحت کے مطابق
ے سفارش اور حسن علی رکابدار کے مسئلہ پر
کر کے فیصلہ کریں۔

چھوٹے بھائی کی سفارش

لالہ چھج مل سے غالب کے دیرینہ تعلقات تھے۔
تھ بیٹھتے اور کھیلتے تھے۔ ممکن ہے ناولوش کا بھی
لہ رہتا ہو۔ ان کے دونوں بیٹوں، جواہر سنگھ جوہر
ہیرا سنگھ کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ اس
نے میں بڑے اور چھوٹے بھائیوں کے بارے
یہ مثل مشہور تھی "سگ باش برادر خورد مباش"
نکہ بڑے بھائی باپ کے برابر تصور کئے جاتے، بات
، پر چھوٹے بھائی کی سرزنش ہوتی۔ جو ان کے احکام
نے پر مجبور تھے کیے جاتے تھے۔ جواہر سنگھ نے ہیرا
ہ سے کچھ قطعے منگوائے اور پندرہ روپئے بھیج
ئے کہ ان میں خرید لو۔ ہیرا سنگھ نے بڑی دوڑ
وپ کی اور پچیس تیس روپے اور صرف کر کے قطعے
یے ہے۔

اس عرصے میں شاید جواہر سنگھ نے غالب کو ہیرا
نگھ کی شکایت لکھ بھیجی کہ وہ مطلوبہ قطعے حاصل
کے بھیجنے میں بے پروائی برت رہا ہے۔ اس پر
ب نے یہ خط لکھا۔

"قطعے جو تم کو مطلوب تھے، ان کے حصول میں
وشش ہیرا سنگھ نے کی ہے، میں تم سے کہہ نہیں
سکتا۔ بہتری کوشش نہیں، روپیہ صرف کیا۔ پندرہ روپے
جو تم نے بھیجے تھے وہ اور پچیس تیس روپے اور
صرف کیے۔ پانچ پانچ اور چار چار اور دو دو روپے کو
قطعے مول لیے۔ اور بنوائے۔ خرید میں روپے جلا دیے
اور بنوانے میں روپے جلا لگائے۔ دوڑتا پھرا۔ حکیم صاحب
کے پاس کئی بار جا کر حضور والا کا قطعہ لایا۔ اب دوڑ
رہا ہے ولی عہد بہادر کے دستخطی قطعے کے واسطے یقین
ہے کہ دو چار دن میں وہ بھی ہاتھ آئے اور بعد اس
قطعے کے ہاتھ آنے کے وہ سب کو یکجا کر کے تمہارے
پاس بھیج دے گا۔ مدد بھی اس کی کر رہا ہوں لیکن
اس نے بڑی مشقت کی۔ آفریں۔ صد آفریں۔ پندرہ
روپے میں سے ایک روپیہ اپنے صرف میں نہیں لایا اور
ماں کو عاجز کر کے اس سے بہت روپئے لیئے۔ جب سب
قطعے تمہارے پاس پہنچیں گے، اس کا حسن خدمت
تم پر ظاہر ہو گا۔"

اس خط میں چھوٹے بھائی کے حسن کارکردگی
کا ذکر کرتے ہوئے اس کی محنت اور دوڑ دھوپ
کی تعریف ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ اس نے
کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور کس طرح بادشاہ
کا اپنا دستخطی قطعہ لایا اور ولی عہد کا دستخطی قطعہ حاصل
کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ان قطعات کی
قیمتیں بھی بتا دیں اور جو زائد صرفہ ہوا ہے وہ بھی بتا دیا
جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ جواہر سنگھ وہ رقم روانہ کر دیں
جو زائد صرف ہوئی ہے۔

ملازمت کے لیے سفارش

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دہلی کے اہل علم تتر بتر
ہو گئے۔ ان میں سے حکیموں کا ایک خاندان پٹیالے پہنچا۔
ان میں حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور ان کے صاحبزادے حکیم
غلام رضا خاں بھی تھے۔ غالب نے "نور چشم اقبال نشاں
حکیم غلام رضا خاں" کو اردوئے معلیٰ کا حق اشاعت

بخش دیا تھا۔ موجودہ سفارش نامہ حکیم غلام مرتضیٰ کے نام اپنے ایک ہندو ملاقاتی کے لیے ۱۸۶۶ء میں لکھا تھا۔

"خاں صاحب جمیل المناقب حکیم غلام مرتضیٰ خاں صاحب کو غالب دردمند کا سلام پہنچے۔ خوب یاد کیجیے کہ میں نے کبھی کسی امر میں آپ کو تکلیف نہیں دی۔ اب ایک عنایت کا سائل ہوں حامل ہذا المکتوب، پنڈت جے نرائن، میرا یہ خط لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ ان کے بزرگ نواب احمد بخش خاں کی سرکار میں مناصب عالیہ اور عہدہ ہائے جلیلہ رکھتے تھے۔ اب موقع یہ آیا ہے کہ جستجوئے نوکری میں پٹیالے آئے ہیں۔

آپ کو میرے سر کی قسم، جہاں تک ہو سکے سعی کر کے ان کو موافق ان کی عزت کے کوئی منصب، کوئی عہدہ دلوا دو گے، تو میں یہ جانوں گا کہ تم نے مجھ کو نوکر رکھوایا ہے، بڑا احسان مند ہوں گا۔"

اس خط سے مرسل اور مرسل الیہ دونوں کے تعلقات کا علم ہوتے ہوئے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے پرانے واقف کاروں کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ نواب احمد بخش کے ہاں ملازمت کے تعلق سے غالب پنڈت جے نرائن سے واقف تھے۔ ان کی پریشانیٔ روزگار دیکھ کر انہوں نے حکیم صاحب کو پہلی بار زحمت دینے کا ذکر کیا۔ مقصد یہ کہ ان کی سفارش کو نظر انداز نہ کیا جائے اور کسی نہ کسی طرح سائل کو روزگار سے لگایا جائے۔ آخر میں معاملہ کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے مرسل الیہ کو اپنے سر کی قسم بھی دلادی اور یہ بھی لکھ دیا کہ ان کو ملازمت دلوانا گویا مجھے ملازمت دلوا کر مجھ پر احسان کرنا ہے۔

طبیب کی سفارش

آگرے میں منشی نبی بخش حقیر غالب کے دوست اور غالب شناس تھے۔ سکندرہ کے رہنے والے صاحب عالم مارہروی کے شاگرد تھے۔ حکیم الٰہی بخش نے ملازمت کے لیے غالب سے سفارش چاہی تو غالب نے حقیر کو لکھا۔

"...... ایک خط حکیم الٰہی بخش صاحب کو دیتا ہوں یہ صاحب شرفائے سکندرہ میں سے ہیں اور دوست اور شاگرد اس کے ہیں جس کا میں بغیر دیکھے عاشق ہوں یعنی جناب صاحب عالم مارہروی سلمہ اللہ تعالیٰ۔

" یہ ان کا خط میرے نام لائے تھے۔ کئی مہینے یہاں رہے اور حکیم امام الدین خاں صاحب سے مفرح القلوب پڑھی۔ بہت خوب اور مہذب آدمی ہیں۔ حسن طبع بھی رکھتے ہیں۔ یہاں ان کی نوکری کا کہیں اسلوب نہ ہوا اور زمانے نے مساعدت نہ کی۔ اب یہ اپنے گھر جاتے ہیں۔ کول میں پہنچ کر آپ سے ملیں گے۔ ان کی توقیر کیجیے گا اور ان کو اپنا دوست دیرینہ تصور فرمائیے گا اور اس کا خیال آپ کو رہے کہ اس ضلع میں ٹھیکیدار اور رئیس بہت ہیں۔ اگر کسو کو خواہش طبیب کی ہو تو ان کو اس سے بخوبی ملوا دیجیے گا۔ اور اس باب میں جلدی نہیں ہے خیال رہے۔"

غالب اپنے خطوط میں غیر ضروری باتیں نہیں لکھتے اور اپنے مطالب کم سے کم الفاظ میں لیکن پوری وضاحت سے لکھ دیتے ہیں۔ ان کے خطوط سے نہ صرف مرسل الیہ سے ان کے حقیقی تعلقات کا پتہ لگتا ہے بلکہ اسی سلسلہ میں دوسرے دوستوں سے بھی تعلقات کا علم ہو جاتا ہے۔ متعلقہ شخص کی لیاقت اور کردار کا بھی حال معلوم ہو جاتا ہے۔ نیز اس کے معاشی حالات کا بھی مثلاً اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کے معاشی حالات ایسے خراب تھے کہ ان کے لیے فوری ملازمت کا انتظام کیا جاتا۔ اس لیے آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ "اس باب میں ایسی جلدی نہیں، تم کو خیال رہے۔" انہی کو ایک اور خط میں یاد دہانی کرتے ہیں کہ "حکیم الٰہی بخش آپ کے پاس پہنچے ہیں۔ بہت نیک بخت اور معقول آدمی ہیں۔ تو ان پر در ملکی کا بھی خیال رہے اور شیخ رحمت اللہ صاحب جو آگے آپ کی بدولت کامیاب رہے، اگر وہاں ہوں تو ان کا بھی خیال رہے اور وہاں نہ ہوں تو ان کا حال مجھ کو لکھیے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو ان لوگوں کا جن کی وہ سفارش کرتے تھے کس قدر خیال رہتا تھا

غالب خدمت گذار خلق

ان کے مقابلے میں شیخ وزیرالدین کے بارے میں لکھا کہ "شفیع وزیرالدین بہت تباہ اور خراب ہے۔ اس کا دادا بہت معزز آدمی تھا اور میرا بڑا دوست تھا۔ یہ تمہارا بھی نیازمند ہے۔ حتیٰ الوسع خیال دوڑاؤ اور گنجائش نکالو۔ اگر کہیں نوکری قرار پا جائے تو گویا مجھ پر احسان ہوگا۔ عرضی شیخ کی پہنچتی ہے۔ اس کا مناسب جواب لکھئے اور کوشش کیجئے"

اس خط میں بعض دوسرے مطالب لکھنے کے بعد پھر لکھا کہ "ایک بار میری سن لو پھر غزل پڑھو۔ شیخ وزیرالدین بیمار ہو کر کرانچی ڈرک سے کول کو روانہ ہوا ہے۔ میں اگرچہ خدمت گذار خلق ہوں پر ان کی کچھ خدمت بجا نہ لا سکا اور ان سے شرمندہ رہا۔ تم ان کی دل جوئی کرنا۔ آدمی ان کے گھر بھجوانا اور ان کی خبر پوچھنا اور بھائی! اگر ہو سکے تو کسو کو یا اپنے علاقے میں مختار کاری، سررشتہ کی عرائض نویسی، کچھ نہ کچھ ان کے واسطے کر دینا۔ ضرور ضرور۔ لو اب غزل پڑھو

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ وزیرالدین کے دادا بہت معزز آدمی تھے اور غالب کے دوست تھے۔ اس وقت ان کی حالت بہت سقیم تھی۔ غالب کے پاس اکثر لوگ مدد اور سفارش کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو خدمت گزار خلق سمجھتے تھے اور ہر شخص کی مدد کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ اس خط میں انہوں نے بار بار شیخ وزیرالدین کی طرف اپنے دوست، حقیر، کو توجہ دلائی ہے کہ وہ حالات کی اہمیت کو سمجھ کر جلد سے جلد شیخ وزیرالدین کی ملازمت کا انتظام کر دیں۔

دوست کا نوجوان بیٹا

انہی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں مطلع کرتے ہیں۔

"مرزا نجف علی خاں مرحوم، تمہارے دوست ہوں گے وہ یہاں مر گئے۔ ان کے فرزند ارجمند مرزا یوسف علی خاں کو میں اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں اور ان کی سعادتمندیاں اور خوبیاں کیا بیان کروں کہ میں ان کا عاشق ہوں۔ وہ اب کول کو گئے ہیں۔ تم کو لازم ہے کہ ان کے ہاں جاؤ اور فاتحہ پڑھو اور ان کا حال ان کی زبانی سنو۔ وہ صاحبزادے ناز پروردہ گرم و سرد زمانہ نہ دیدہ ہیں۔ دو ایک حویلیاں ان کے والد ماجد کی وہاں ہیں۔ خدا جانے وہ کیا کریں گے۔ آپ کو ان کی مربّی گیری کرنی چاہیئے مگر وہ پنجشنبہ کو روانہ ہونے (پہنچنے؟) والے ہیں۔ آج دوشنبہ کو یہ خط میں تم کو بھیجتا ہوں۔ یقین ہے کہ کل پہنچے گا۔ بمجرد اس کے پہنچنے کے آپ ان سے ملیئے گا۔ ماتم زدہ کو بلانا مناسب نہیں۔ آپ کو بتقریب تعزیت جانا چاہیئے۔ یہ خط آپ کے نام ہے۔ ان کو پڑھا دیجئے۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے دوستوں اور ان کی اولاد کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ مرزا یوسف علی کے باپ، نبی بخش حقیر اور غالب، دونوں کے دوست تھے۔ غالب نے ان کے انتقال کی خبر حقیر کو دیتے ہوئے، اشارہ کر دیا کہ ایسا نہ ہو نوجوان یوسف، انہیں اونے پونے فروخت کر دیں، اس لیے لکھ دیا کہ تم ان کے باپ کے دوست کی حیثیت سے ان کے مربی بن جانا تاکہ نقصان نہ اٹھائیں۔

ساتھ ہی خیال آیا کہ ایسا نہ ہو نبی بخش اپنے آپ کو بزرگ سمجھ کر مرزا یوسف کے گھر جانے کے بجائے انہیں اپنے پاس طلب کریں اس لیے لکھ دیا کہ ماتم زدہ کا بلانا مناسب نہیں۔ آپ کو بہ تقریب تعزیت جانا چاہیئے۔ خط پڑھوا دینے سے مقصد یہ تھا کہ یوسف مرزا حقیقت حال سے واقف ہو جائیں اور نبی بخش حقیر کو غالب کی جگہ جان کر اپنا مربّی و سرپرست سمجھیں اور ان کی حسبِ ہدایت کام کریں۔

بے روزگار شاگرد کی سفارش

میر غلام حسین قدر بلگرامی، اپنے دور کے فضلا میں سے لیکن بیروزگار تھے اور پریشان حال۔ غالب اس

سے واقف تھے۔ ان کا دل اپنے شاگرد کی پریشانی پر کڑھتا تھا۔ سوچتے تھے کہ کیا کروں اور کس طرح اپنے شاگرد کو پریشانیوں سے نجات دلاؤں۔ اس سے زمانے میں منشی نول کشور سے غالب کے تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔ وہ دلی غالب سے ملے اور اب ان کی کتابیں چھاپ رہے تھے۔ غالب کو قدر کی پریشانیوں کے ساتھ منشی نول کشور کی فارغ البالی اور قدر کی لیاقت کا خیال آیا اس لیے انہوں نے لکھا۔

" صاحب! تم بہت دنوں سے بے کار ہو۔ ایک جگہ روزگار کی صورت ہے۔ بے تکلف یہ رقعہ میری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ۔ مطبع اودھ اخبار میں میرے شفیق دلی یعنی منشی نول کشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ انھیں پڑھوا دو۔ اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگذار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمہارے سپرد کریں گے۔ مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرم رہو گے۔ زندگی کا لطف اٹھاؤ گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ۔ لکھنؤ تم سے نزدیک ہے۔ اتنی راہ قطع کرنا کچھ دشوار نہیں۔ اگر نوکر نہ ہو جاؤ گے پھر چلے آنا۔ بخت آزمائی ہے۔"

غالب اپنے دوسرے اوصاف کے علاوہ بہت موقع شناس آدمی تھے۔ اس خط میں انہوں نے راست نول کشور کے بجائے قدر کو مخاطب کر کے اپنے "شفیق دلی منشی نول کشور" سے جلد جا کر ملنے کو کہا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ نول کشور کے پاس وہ کام ہو رہا ہے جو قدر کے مزاج کے مطابق تھا۔ یعنی علمی کام۔ دوسرے یہ کہ غالب کے تعلقات نول کشور سے خوشگوار تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ غالب کے بھیجے ہوئے شخص کو ٹالیں گے نہیں، تیسری بات یہ تھی کہ انہیں قدر بلگرامی کی علمی قابلیت پر اعتماد تھا۔ چوتھی بات یہ تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ قدر کو خاطر خواہ مشاہرہ ملے۔ اسی لیے انہوں نے لکھا کہ منشی نول کشور سے ملکر یہ رقعہ انہیں پڑھوا دو اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو ....." آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ اگر نوکری نہ ملے تو فکر نہ کرنا۔ اس کو بخت آزمائی سمجھو۔ ہو گیا تو بہت اچھا ہے نہ ہوا تو کوئی نقصان نہیں۔ بلگرام سے لکھنؤ دور نہیں۔ صرف تھوڑا سا کرایہ صرف ہوگا لیکن کامیابی کی توقع ہے۔

امیر مینائی کی سفارش

منشی امیر احمد امیر مینائی ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے غالب سے عمر میں ۳۲ سال چھوٹے اور اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنؤ میں اپنی شعرگوئی سے عزت اور ناموری حاصل کر چکے تھے۔ رامپور اس وقت دلی اور لکھنؤ سے نکلے ہوئے شاعروں کا مرجع و مرکز تھا۔ اس لیے امیر بھی وہیں پہنچ گئے اور انہوں نے منشی شیو نرائن کے پندرہ روزہ رسالہ معیار الشعراء میں چھپنے کے لیے غزلیں بھیجیں لیکن اپنے بارے میں کچھ نہ لکھا جس پر منشی شیو نرائن نے لکھا۔

"امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا۔ ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔"

امیر مینائی کو غالب اور شیو نرائن کے تعلقات کا علم تھا۔ انہوں نے اپنی غزلیں غالب کے پاس بھیجیں وہ معیار الشعراء میں امیر سے متعلق نوٹ پڑھ چکے تھے اس لیے انہوں نے فوراً شیو نرائن کو لکھا (۱۸۵۹ء)

اب تم یہ بتاؤ کہ رئیس رامپور کے ہاں بھی تمہارا اخبار یا "معیار الشعراء" جاتا ہے یا نہیں؟ اب کے تمہارے معیار الشعراء میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ "امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ ہم کو جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔" سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور صاحب

ہے ہیں احباب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں
ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان
وں کو چھاپ دو یعنی یہ غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں
اس کے لکھنے سے ان کا نام اور حال معلوم ہوا۔ نام اور
وہ جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس کو اب سے معیار الشعراء
چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چار ورقہ رام لعل ان کے پاس
ج دو اور سرنامہ پر لکھو۔

در رامپور۔ بہ در دولت حضور رسیدہ
بخدمت مولوی امیر احمد صاحب امیر تخلص برسد"

اس خط سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء
ہنگامے کے باعث ۱۸۵۹ء میں بھی معیار الشعراء جیسے
دستوں میں غزلیں بھی، شاعر کے بارے میں تفصیلات
علوم کیے بغیر لوگ چھاپنے سے ڈرتے تھے۔ دوسری بات
کہ امیر مینائیؔ نے معیار الشعراء میں چھپنے کے لیے راست
زلیں بھیجی تھیں اور جب شیو نرائن نے شائع کرنے
کے بجائے متذکرہ نوٹ لکھا تو امیر مینائیؔ نے اپنی غزلیں
لب کے پاس بھیجیں تاکہ وہ شیو نرائن کو اپنی طرف سے
بھیج کر شائع کرا دیں۔ تیسری بات یہ کہ امیر مینائیؔ غالباً نواب
مپور کے محل ہی کے کسی حصہ میں رہتے تھے۔ علیحدہ مکان
ا قیام نہ تھا۔ اگرچہ اس سے ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا
کہ شیو نرائن کا گل دستۂ شعر یعنی معیار الشعراء بھی نواب
احب کی نظر سے گزرے اور امیر کا کلام بھی جس سے ممکن
ے دونوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

دوست کے بیٹے کی سفارش

آخر میں ایک اور سفارش نامہ ملاحظہ ہو۔ اس میں
م مرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان کی سفارش کی گئی ہے
وہی حکیم آغا جان ہیں جن کا تخلص عیش تھا اور جنہوں
بقول آزاد ایک طرحی مشاعرے میں غالب کو مخاطب کرتے
ے پڑھا تھا۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میرؔ سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے!

انہوں نے ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے چند روز بعد انتقال کیا۔
اس وقت دلّی کے اہلِ علم مارے مارے پھر رہے تھے۔
ان میں عیش کے بیٹے حکیم مرزا جان بھی تھے۔ ۱۸۶۴ء میں
غالب کے محبوب شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر بلب گڑھ کے
تحصیلدار ہو گئے تھے۔ اس زمانے میں کسی دیسی باشندے
کے لیے تحصیلداری بہت بڑا عہدہ تھی۔ حکیم مرزا جان وہاں
وہاں صیغۂ طبابت میں ملازم تھے اس لیے غالب نے
جواہر سنگھ جوہر کو لکھا۔

"برخوردار کامگار، سعادت و اقبال نشان
منشی جواہر سنگھ کو بلب گڑھ کی تحصیلداری مبارک ہو۔
پیپلی سے نوح آئے اور نوح سے بلب گڑھ گئے۔ اب
بلب گڑھ سے دِلّی آؤ گے۔ انشاءاللہ
سنو صاحب! حکیم میرزا جان، خلف الصدق حکیم
آغا جان صاحب کے، تمہارے علاقہ تحصیلداری میں بصیغۂ
طبابت ملازم سرکار انگریزی ہیں۔ ان کے والد ماجد میرے
پچاس پچپن برس کے دوست ہیں۔ ان کو اپنے بھائی کے
برابر جانتا ہوں۔ اس صورت میں حکیم میرزا جان میرے بھتیجے
اور تمہارے بھائی ہوئے۔

لازم ہے کہ ان سے یک دل و یک رنگ رہو اور ان
کے مددگار بے رہو۔ سرکار سے یہ عہدہ بصیغۂ دوام ہے
تم کو کوئی نئی بات پیش کرنی نہ ہوگی۔ صرف اس امر میں
کوشش رہے کہ صورت اچھی بنی رہے سرکار کے خاطر
نشان رہے کہ حکیم میرزا جان ہوشیار اور کارگزار آدمی ہے"

غالب کے اس سفارش نامے میں کسی نئی جگہ پہ تقرر
کرنے کے لیے نہیں کہا گیا ہے بلکہ جواہر سنگھ کو ایک بیٹے کے
مانند ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ایک دوست دیرینہ کے بیٹے
کو اپنے بھائی کی طرح سمجھیں، یک دل و یک رنگ رہیں

باقی صفحہ نمبر ۳۵ پر

سہیل عظیم آبادی

رضوان احمد ایڈیٹر عظیم آباد ایکسپریس

۳۰ نومبر ۱۹۷۹ء کو اچانک جب یہ خبر پٹنہ پہنچی کہ آج لہ آباد میں دل کا دورہ پڑنے سے سہیل عظیم آبادی کا انتقال تو جس نے بھی سنا اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اور کسی کو بھی بر پر یقین نہیں آیا لیکن موت ایسی اٹل حقیقت ہے ں پر یقین کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔

سہیل صاحب بہار کی اردو افسانہ نگاری کا ایک باب تھے۔ وہ بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ بہت بڑے تھے لیکن ان سب سے بھی بڑے وہ انسان تھے وہ ں دوستی کو ہر شے پر مقدم سمجھتے تھے۔ ان کے مرجانے بہار کی ادبی فضا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اور جو سناٹا ں ہوتا ہے وہ بہت دیر تک ختم نہیں ہوگا۔ کیونکہ نہ نگار بہت پیدا ہوتے ہیں اور پیدا ہوں گے لیکن یسا انسان دوست پیدا ہونا مشکل ہے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ ان کی شفقت اور مجھے بچپن سے ہی حاصل رہی ہے اور شاید ان کی ہی ہمت کا نتیجہ تھا کہ میں افسانہ نگاری اور پھر صحافت کی جانب یا۔ ورنہ میرے خاندان میں تو نسل در نسل شاعری ہی تھی اور میرا شروع سے ہی رجحان شاعری کی تھا۔ میں نے ایک دو بار اپنے افسانے انہیں دیکھنے دیئے تو انہوں نے کہا کہ افسانوں پر اصلاح نہیں تی۔ افسانہ نگاری کے لیے مشق اور زبان پر دسترس ں ہے۔

میں نے جب ۱۹۶۷ء میں ماہ نامہ "زیور" نکالا رسالہ کا نام بھی انہوں نے ہی رکھا تھا میرے لیے انہوں نے واجدہ تبسم، جیلانی بانو، منور ما دیوان، عصمت چغتائی قرۃ العین حیدر، تسنیم سلیم چھتاری وغیرہ کو تعارفی خطوط لکھے اور ان کا تعاون مانگا۔ ان کی وجہ سے ہی مجھے تمام ہندوستان کے اہم قلم کاروں کا تعاون حاصل ہوا۔ اور چند برسوں میں زیور نے معیاری رسالہ کی حیثیت سے اپنا مقام بنا لیا۔

۱۹۶۷ء کی ہی ایک شام مجھے اور بہت یاد آتی ہے جب وہ مجھے اور شاہن (ان کے چھوٹے صاحبزادے) کو کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، سجاد ظہیر سے ملانے کے لیے لے گئے۔ ان سب میں صرف کرشن چندر ہم سب لوگوں سے بہت خلوص سے ملے اور سہیل صاحب سے تو وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اور شاید وہی دن تھا جب میں ترقی پسندی سے بدظن ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان بھی غریبی اور امیری کی دیوار حائل ہے۔

نظریاتی طور پر میں ان سے بے حد دور تھا لیکن ذاتی طور پر بہت قریب۔ میں نے جب اخبار نکالا تو ان کے پاس گیا اور انہوں نے بہت سی نصیحتیں کیں۔ انہوں نے کہا صحافت بہت پر خطر راستہ ہے کیونکہ حق گوئی کے نتیجہ میں دوست بہت کم بنتے ہیں اور دشمن زیادہ لیکن اگر تم اپنے اندر سچ بولنے کی ہمت و جرات پیدا کر لو تو پھر تمہیں دنیا کی کوئی طاقت جھکا نہیں سکتی۔ مصلحتوں

ہے طاق رکھ دو۔ جس چیز کو تم برا سمجھتے ہو اس کے
قلمی جہاد کرو ــــ اور اتفاق سے میرے پہلے ہی شمارے
ترقی پسندوں کے خلاف بہت سی باتیں تھیں۔ وہ
ترقی پسند تھے۔ میں نے ترقی پسندوں کے خلاف سخت سے
باتیں لکھیں لیکن انہوں نے ذاتی تعلقات پر کبھی
کا اثر نہیں پڑنے دیا۔ خود ان کے خلاف جب میرے اخبار
سی باتیں شائع ہوئیں تو میں ان سے ملنے سے کتراتا تھا۔
وہ ملے تو انہوں نے خود ہی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔
ے میں نے تو خود تم سے کہا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کے
اخبار نویس کو لڑنا چاہیئے۔ اس وقت میں اسٹیبلشمنٹ
حصہ ہوں اور تم صحافی۔ میں اس میں ناراض
ں ہوں گا۔"

چند دنوں قبل میرے اخبار میں پریم چند کے خلاف ایک
مون شائع ہوا۔ انہیں پریم چند سے بے پناہ عقیدت
وہ ایک روز میرے گھر آگئے۔ میں ان دنوں دہلی میں
پھر انہوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں اخبار کی
یف اور بہت افزائی کرتے ہوئے یہ بات لکھی کہ
۔ پریم چند فرقہ پرست تھے تو آج تک ہندوستان میں
سیکولر انسان پیدا ہی نہیں ہوا۔ میں دہلی سے واپس
تو ان سے ملا اور کہا کہ آپ اس موضوع پر اظہار خیال
یں۔ انہوں نے کہا کہ میں پریم چند کے ذہنی سفر پر
ری کتاب ہی لکھ رہا ہوں۔ یوں ایک مضمون لکھنے
بہت سی غلط فہمیاں رہ جائیں گی۔ وہ اس کتاب پر
کر رہے تھے۔ لیکن افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں
انہیں ہم سے چھین لیا۔ اتفاق سے مضمون کے مصنف
محمد شبلی سے ان کی طویل خط و کتابت ہوئی اور انہوں
پوری خط و کتابت مجھے ارسال کر دی۔ چندر گڈھ جانے
دو روز قبل مجھ سے اچانک راستے میں ملاقات ہو گئی
میں نے ان سے کہا کہ میں وہ خط و کتابت شائع کر رہا ہوں
کہنے لگے تم اسے شائع کر سکتے ہو اور بحث بھی کروا سکتے
۔ لیکن میں کوئی جواب نہیں دوں گا۔ کیونکہ یہ بحث

متنازعہ معاملہ ہے اور لوگ مجھے خواہ مخواہ اس میں گھسیٹنا
چاہتے ہیں۔

میں نے سولہ سترہ برسوں کی قربت میں محسوس
کیا کہ دو، ان کے پسندیدہ مشاغل تھے، ایک خطوط لکھنا اور
دوسرے لوگوں سے ملنا ملانا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک جگہ
رکتے نہیں تھے۔ شہر میں ہوتے تو سب سے ملتے ملاتے رہتے
جس طرف بھی نکل جاتے ان کے سینکڑوں احباب مل
جاتے۔ تنہائی سے تو جیسے ان کو سخت وحشت ہوتی
تھی۔ دوستوں سے بے حد محبت کے ساتھ اور عزیزوں
سے بے حد شفقت کے ساتھ ملتے تھے۔ وہ سب سے بے
تکلف تھے۔ غصہ کرنا تو جیسے وہ جانتے ہی نہیں تھے۔
پرانے زمیندار خاندان سے تعلق تھا۔ اس لیے رواداری
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

نئے ادیبوں کی وہ بہت ہمت افزائی کرتے تھے۔
لیکن انہیں نئے افسانہ سے بہت الرجی تھی۔ ایک بار مجھ
سے کہا تم لوگ عجیب کہانیاں لکھتے ہو آدھی بات کاغذ
پر اور آدھی پیٹ میں رکھتے ہو تم لوگوں کی کہانیاں
میری سمجھ میں نہیں آتیں۔

پریم چند اسکول سے تعلق رکھنے والے دوسرے ادیبوں
نے اپنے کو کچھ سے کچھ بدلا لیکن وہ منشی پریم چند کی ڈگر
چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے اور تن تنہا اس پر چلتے رہے
شاید ان کی اس عقیدت کا ہی نتیجہ تھا کہ ان کی موت بھی
پریم چند کے ہی گھر پر ہوئی یعنی ان کے صاحبزادے امرت رائے
کے گھر پر ؂

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

موسم کی خرابی کے باوجود ان کے جنازے میں جتنا
بڑا ہجوم تھا۔ میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا کس مکتبہ
فکر کے لوگ نہیں تھے؟

بے نقاب

محمد طارق کھولاپوری

بہت سارے لوگ میرے اطراف جی رہے ہیں
عورتیں بھی۔ مرد بھی ....
—— جس طرح میں زندگی گذار رہا ہوں
کیا اسی طرح وہ بھی اپنی زندگی گذار رہے ہیں ؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نفی میں ہے۔ کیونکہ اوروں کی طرح میرے چہرے پر بھی وہ آنکھیں ہیں جو ذہن کو نہیں پڑھ سکتیں۔ ذہن کے افق پر رونما ہونے والی پرچھائیوں کو نہیں دیکھ سکتیں۔ کسی کے دل کا حال نہیں جان سکتیں۔ صرف چہرہ پڑھ سکتی ہیں لیکن کوئی چہرہ پڑھا نہیں جاتا۔ ہر چہرہ پر نقاب ہے ——
اصلی چہرہ دیکھنے کی کوئی تدبیر مجھے سمجھائی نہیں دیتی —— میں نے کوشش کی۔ کچھ نقاب اٹھائے بھی —— اور جھنجھلا گیا۔
نقاب کے نیچے نقاب نظر آئے ——
میں بے چین ہو گیا ہوں۔ میری بے چینی میری اپنی خواہش کا نتیجہ ہے جو شاید میری روح میں بھی رچ بس گئی ہے۔ گھل گئی ہے۔
—— بے چینی کا کرب میں سہہ رہا ہوں
..... بے چینی جو انسان کو سمندر کی موجوں کی طرح بے قرار رکھتی ہے۔ اُسے مطمئن ہونے سے روکتی ہے ——
میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں جہاں یقین نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ انکار —— انکار .... کیونکہ اصلی چہرے مجھے نظر نہیں آتے —— اس سے میری روح کو سخت اذیت پہنچ رہی۔ میرا جی چاہتا ہے اپنے سر کو پٹخ پٹخ کر پھوڑ ڈالوں۔ اپنے بال نوچ ڈالوں —— اصلی روپ اور حقیقت دیکھنے کی خواہش میرے دل کے بستر پر بدستور کروٹیں بدل رہی ہیں —— کبھی جی یوں بھی چاہتا ہے کہ اپنی خواہش کا گلا گھونٹ دوں۔
لیکن چاہتے ہوئے بھی میں اپنی خواہش کا گلا نہیں گھونٹ سکتا —— میرے ہاتھ کتنے مجبور ہیں میرے اپنے ہونے کے باوجود میرے اپنے نہیں ہیں۔ میں نامکمل ہستی ہوں۔ تمام انسان بھی میری طرح نامکمل ہیں —— ؟! شاید —— نہیں یقیناً ......!!
اور میری خواہش جسے میں نے اپنے دل میں پیدا نہیں کیا جو خود ساختہ ہے مکمل ہے وہ اور نامکمل مکمل کو ختم نہیں کر سکتا ——
اسی کرب میں وقت گذر رہا ہے .....
—— دن کے وقت سورج چمکتا ہے
رات کے وقت چاند ستارے ——
سورج کو دیکھتا ہوں تو اس پر نگاہیں نہیں ٹھہرتیں۔ آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں —— میں سوچتا ہوں کوہِ طور پر چڑھ کر ایسی ہی آنکھوں سے موسیٰ نے سورج بنانے والے کا دیدار کیا تھا —— اصلی چہرے کی جھلک دیکھی تھی اور بے ہوش ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں میں ایسی کونسی کمی ہے میں سورج کا اصلی روپ نہیں

دیکھ سکتا ـــــ! جی چاہتا ہے اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالوں کتنی کمزور ہیں میری آنکھیں اور میری آنکھوں کی نگاہیں تیر کی طرح نوکدار نہیں ہیں۔ بھالے کی طرح تیز نہیں ہیں ـــــ

میں مایوس ہو گیا ہوں۔ حقیقت اور اصلی چہرہ دیکھنے کی خواہش میرے سینے میں تڑپ رہی ہے اور میرے اطراف ـــــ

نقاب آسمان پر.....
نقاب زمین پر ـــــ
نقاب چاند پر.......
نقاب مردوں کے چہروں پر.....
نقاب عورتوں کے چہروں پر.... نقاب در نقاب۔

"بے نقاب کون ہے؟!" میں اپنے ذہن سے پوچھتا ہوں۔

"بے نقاب کوئی نہیں!" میرا ذہن جواب دیتا ہے۔

پھر حقیقت کیسے نظر آئے گی ـــــ اصلی چہرے کیسے دکھائی دیں گے۔ کب دکھائی دیں گے ـــــ کب .... کب ـــــ وہ دن کب آئے گا کہ میری روح کو سکون ملے گا، شانتی ملے گی میری آتما کو ـــــ جب کوئی خواہش پوری ہوتی ہے تو آتما کو شانتی مل جاتی ہے۔ اور جب آدمی مایوس ہو جاتا ہے تو اُسکی خواہش خواہش مرتی نہیں وہ دل کے کونے میں تڑپتی ہے اور اس کی تڑپ کا درد ذہن کے خلیوں میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ آدمی کی روح جسم کا ساتھ نہیں چھوڑتی ـــــ

روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ـــــ میرا جسم اپنی روح کو جو اُسکی اپنی نہیں تھی اپنی باہوں میں سمیٹے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس سے جُدا نہیں ہونا چاہتا تھا وہ۔ لیکن روح کے پاس اس کی محبت کی کوئی قدر نہیں تھی ـــــ اس نے اپنے پروں کو پھڑپھڑایا ...... اور پرواز کر گئی ـــــ

کون بے وفا ہے ـــــ اور باوفا کون !! میں کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں، روح میری اپنی ہے اور جسم بھی میرا اپنا ـــــ دونوں کے ملاپ سے میں وجود میں آیا ـــــ

ـــــ شاید عرصہ ہو گیا۔ شاید برسوں بیت گئے۔ کتنا زمانہ گذرا میں نہیں جانتا مجھے علم نہیں۔ میری روح بے چین تھی یا پرسکون، اس کا بھی مجھے پتہ نہیں۔ کیونکہ "میں" ـــــ میں نہیں تھا۔

میں کیا ہو گیا تھا ـــــ؟!
"مٹی ـــــ!"
ہو سکتا ہے۔
"دھواں۔"
ہو سکتا ہے
"راکھ ـــــ!"
"ممکن ہے۔"

پھر یہ اچانک کیا ہو گیا ـــــ کیسے ہوا میں اچانک زمین سے اُگا ـــــ زمین سے نکلا۔ زمین کے اندر سے اٹھا ـــــ میری طرح بہت سارے لوگ بھی جو کبھی میرے اطراف جیتے تھے۔

ـــــ شاید روحیں بغیر اپنی رہائش گاہوں کے بے چین ہو گئی ہوں گی۔ بھٹک رہی ہونگی اِدھر اُدھر اپنے اپنے مکانوں کی تلاش میں ـــــ یا ـــــ انہیں قید کر لیا گیا ہوگا پنجروں میں ـــــ وہ تڑپ رہی ہوں گی پنجروں میں اُن پرندوں کی طرح جو اپنے گھونسلوں کے لئے تڑپتے ہیں۔ جو گھونسلے وہ خود بناتے ہیں اور کوئی غیر مرئی طاقت اُن کی مدد کرتی ہے ـــــ پھر صیاد نے انہیں آزاد کر دیا ہوگا اور روحوں کے مکانوں کو جو اس نے منہدم کیا تھا مسمار کیا تھا اٹھا کر کھڑا کر دیا ہوگا ـــــ یقیناً ـــــ اور روحیں اپنے اپنے مکانوں میں

داخل ہوگئی ہوگی ___

___ یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ میں زمین سے اٹھا ہوں شاید ___ یقیناً..... یقیناً ___

___ میں نے زمین کو دیکھا ___ زمین بے نقاب تھی ___ کوئی سرحد تھی نہ دیواریں۔ احاطوں میں بٹی ہوئی نہیں تھی زمین۔ ___ رنگ کے اعتبار سے ___ خطوں کے اعتبار سے بھی نہیں ___ پتھر کی طرح سخت اور گرم تانبے سے زیادہ گرم ___ زمین کا اصلی روپ کس قدر بنجر ہے ___ مگر کتنا سچا۔

___ میں نے سورج کو دیکھا ___ میری آنکھوں میں سورج کو دیکھنے کی طاقت تھی۔

سورج ننگا ہوگیا تھا ___ سوا نیزے پر آگیا تھا اب ___ آگ برسا رہا تھا وہ۔ ایسی آگ جس میں شعلے نہیں ہوتے ___ بے حد گرمی ___ بے حد حدت ہوتی ہے ___

اپنی آنکھوں میں قوت ہونے کے باوجود بھی میں نے سورج سے نگاہیں موڑلیں۔

میں نے پھر اُن لوگوں کی طرف دیکھا جو زندگی میں میرے پڑوسی تھے۔ اسی زمین پر میرے ساتھ رہتے تھے ___ جب زمین سرحدوں میں بٹی ہوئی تھی۔ رنگ و نسل کا جب زمین نقاب اوڑھے ہوئے تھی ___ ملکوں کا ___ خوب صورت مکانوں کا۔ رنگین شہروں کا سرسبز باغوں کا نقاب ___ سڑے ہوئے ٹاٹ کی جھونپڑیوں کا نقاب ___ اُجڑے گلستانوں کا نقاب ___

میں نے اُن لوگوں کا رُوپ دیکھا ___

تمام کا رُوپ یکساں ___ کوئی الگ نہیں ___ جیسے وہ اُس وقت الگ تھے۔ جب میرے پڑوسی تھے وہ ___ لباسوں کے اعتبار سے ___ رہن سہن کے اعتبار سے۔ تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے مختلف تھے۔ اب کوئی فرق نہیں تھا۔ تمام ایک جیسے لگ رہے تھے۔ تمام ننگے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے وقت تھے ___ ویسے ہی اب زمین سے پیدا ہوتے وقت بھی ننگے ___ مگر پریشان.....

بے چین گھبرائے ہوئے ___ کیوں؟!

میں کیوں بے چین نہیں ہوں اب ؟!

حقیقت دیکھنے کی خواہش اب ختم ہوگئی اس لیے ___

پھر میں نے اپنے آپ کو دیکھا ___ یکلخت گھبرا گیا ___ بے چین ہوگیا میں بھی۔ تڑپ اٹھا ___ میرا رواں رواں کانپ گیا ___ میں اپنے وجود میں بہت پہلے بے نقاب تھا ___ لیکن میں نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ کاش میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا تو میں نامکمل نہ رہتا ___

میرا اصلی روپ کس قدر گھناؤنا ہے۔ سیاہ رات کی طرح تاریک، میں ایک شمع جلا لیتا اپنے روپ کو منوّر کرنے کے لیے ___ لیکن اب میں کیا کروں ___ الصاف کا وقت قریب آچکا ہے ___ میں کیا کروں۔ جب میرا اصلی روپ ظاہر ہوگا تب کیا ہوگا ___ تب کیا ہوگا ___ ؟؟!!

○ ___

بقیہ غالبؔ کے سفارش نامے

اور جب توقع ان کی تائید کرتے رہیں۔ تاکہ وہ اپنی ملازمت پر قائم رہیں اور سازشیوں کی شرارت سے بچ کر اپنے مفوضہ خدمات انجام دے سکیں۔

غالبؔ کے یہ سفارش نامے بھی ان کے دوسرے خطوط کی طرح ان کے مزاج، ان کے علم، ان کی ہمدردی انسانیت اور دوست نوازی کی غمازی کرتے اور ان کی بلند شخصیت کو بے حجاب کرتے ہیں۔

○○

تحریک سلور جبلی نمبر پر معارف کا تبصرہ

ماہنامہ 'تحریک' اردو زبان کا مشہور و مقبول ادبی رسالہ ہے، اس کے خاص نمبر اہتمام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں تحریک کی اشاعت کو پچیس ۲۵ برس ہو گئے تھے، اسی مناسبت سے یہ نمبر شائع کیا گیا ہے، اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں بڑا حصہ طبعزاد مضامین، افسانوں اور منظومات کا ہے، اس حصہ میں انگریزی سے کئے گئے دو ترجمے بھی دیئے گئے ہیں۔ ایک موجودہ سیاسی اصطلاحوں کا تعارف اور ان کی مختصر تشریح ہے اس خاص نمبر کی ابتداء ادبی تحقیقی اور تنقیدی مضامین سے کی گئی ہے۔ قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، میکش اکبرآبادی۔ رشید حسن خاں۔ مشفق خواجہ اور محمد مشتاق شارق کے مضامین ادبی و تحقیقی حیثیت سے اور دلچسپ ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی نے موجودہ ادبی تنقید کا اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے گذشتہ پچیس ۲۵ برس اردو تنقید کا مبسوط جائزہ لیا ہے، دوسرے مضامین میں اردو کے جدید افسانے اور غزل کا جائزہ لیا گیا ہے، کیونکہ کارو تحریک کا خاص مشن ہے۔ فاضل مرتب اور ستیہ پرکاش کے مضامین اسی نوعیت کے ہیں۔ اس نمبر کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کی طرح یہ متعدد پاکستانی اہل قلم کی نگارشات سے بھی مزین ہے، اور اس کا ایک حصہ پاکستان کے بعض اصناف ادب کے جائزے کیلئے مخصوص ہے۔ ان سنجیدہ ادبی مضامین کے علاوہ افسانے، ڈرامے اور نظموں و غزلوں طویل حصہ بھی جاندار ہے، پہلے حصہ میں جناب عرشی زادہ نے مولانا شبلی کے فارسی مجموعۂ کلام دستۂ گل، بوئے گل اور برگ کی متعدد منتخب غزلوں کا کامیاب اردو ترجمہ کیا ہے۔ جناب گوپال متل نے خاص انداز سے اس کا مختصر تعارف لکھا ہے، ان غزلوں کے ترجمے کی اشاعت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "شبلی کی علمی اور دینی حیثیت کی طرح ان کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت بھی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے"۔ دوسرا حصہ بھی مضامین نظم و نثر کا رنگارنگ مجموعہ ہے، اس میں ملک کی موجودہ سرکاری زبان ہندی کے علاوہ کئی زبانوں پنجابی، کشمیری، اڑیہ، تامل، تلگو، مراٹھی، کنڑا، گجراتی اور راجستھانی کے موجودہ ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان زبانوں کی نظموں اور افسانوں کے اردو ترجمے بھی دیئے گئے ہیں۔ اسطرح اس نمبر سے اردو زبان و ادب ہی کی طرح ملک کی اکثر مشہور زبانوں کی موجودہ رفتار اور ہندوستان و پاکستان دونوں کی آزادی کے بعد کی ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے، اور نئے ادبی مسائل درجہ سے واقفیت ہوتی ہے اور اردو کے متعارف و غیر متعارف ادیبوں کی کد و کاوش کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ نمبر بہت ضخیم ظاہر ہے کہ سب مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں، خصوصاً جب کہ اکثر لکھنے والے نئے ہوں تو تحریر، طرز نگارش اور خیالات ناہمواری بھی ہوگی، مگر موجودہ حالات میں ایسے ضخیم نمبر کی اس قدر سلیقہ اور ڈھنگ سے اشاعت ہی ایک بڑا کام ہے جو گوپال متل جیسے معمر مگر جواں ہمت اردو کے خدمت گذار ہی انجام دے سکتے ہیں، مضامین کے تنوع کی وجہ سے ہر مذاق کے لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، شروع میں تقریباً ڈیڑھ سو ادیبوں اور شاعروں کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں، جن کی نگارشات اس نمبر میں درج ہیں۔

سلور جوبلی نمبر کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ کاغذ کی گرانی کے باوجود قیمت وہی ۳۵ روپے

پدما کے کنارے

مشاہد بارک پوری

پدما ایک وجیہہ اور متین عورت کی طرح مٹیالی رنگ کی ساڑی پہنے آنچل کو ہوا میں اڑاتی ہوئی رقصاں تھی، اس کی موجیں اتنی آہستہ خرام سے بہہ رہی تھیں کہ جیسے جل پریاں دھیرے دھیرے رقص کر رہی ہوں اور جنہیں دیکھ کر کوثر و تسنیم کی موجوں کو بھی شرم آنے لگے۔ گہرے نیلے آسمان کے نیچے موسیقی کی ہلکی ہلکی تانیں بکھیرتا ہوا پانی، سبک خرام ہواؤں سے مہکتی اور اٹکھیلیاں کرتی ہوئی فضا ـــــ سفید سفید بگلے سطح آب پر پانی کی چھینٹیں اڑاتے پھر رہے تھے۔ پدما کے چوڑے پاٹ پر انگنت کشتیاں رواں دواں تھیں۔ ایک چھوٹے سے گھاٹ کے نزدیک سلطانہ کی جھونپڑی تھی اسے اچھی طرح جھونپڑی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ دھان نکال کر جو پیال بچ جاتا ہے، اس سے چھپر ڈال کر ایک جھونپڑی سی بنالی گئی تھی، اس کے ساتھ ہی ایک "گؤشالہ" بھی تھا۔ جھونپڑی میں سلطانہ اور اس کے شوہر رہتے تھے۔ اور گؤشالہ میں دو گائیں اور ایک بکری۔ بانس اور مٹی سے جھونپڑی کی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ گھر کے احاطہ کے چاروں طرف بانس کی کھپچوں اور پٹ سن کی لکڑیوں سے چہار دیواری کا کام لیا گیا تھا۔ آنگن میں کدو اور سیم کی گھنی بیلیں لگی ہوئی تھیں۔

پدما کے کنارے یہ چھوٹا سا گھاٹ برائے نام تھا چوبیس گھنٹوں میں صرف دو بار اسٹیمر آکر رکتا تھا یا پھر کبھی کبھار مانجھی اپنی بڑی بڑی کشتیوں میں مسافروں کو لا کر دریا پار کرا جاتے تھے۔ صبح سویرے ایک اسٹیمر آکر رکتا، اس وقت وہ اپنے آنگن سے کھڑی کھڑی گھاٹ کا سارا منظر دیکھا کرتی تھی۔ اسٹیمر کنارے پر لگتے ہی ایک ہنگامہ سا برپا ہو جاتا۔ چیخ پکار سے کسی مچھلی بازار کا سا سماں پیدا ہو جاتا۔ ہر شخص ایک دوسرے سے پہلے اترنے چڑھنے کے لیے تگ و دو شروع کر دیتا وہ عورتیں جو قیمتی ساڑیاں پہن کر چڑھتی اترتی تھیں ان کے شوخ اور بھڑکیلے رنگ کے لباسوں سے آنکھیں خیراں ہو جاتی تھیں۔ زیورات سے لدی پھندی عورتوں کے خوشنما بلاؤز دیکھ کر سلطانہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔ ان کے گلے میں سونے کا ہار، کانوں میں بندے ہاتھوں میں سنہری چوڑیاں ـــــ کتنے سج دھج کے ساتھ وہ پُر وقار انداز سے اسٹیمر سے اترتی تھیں کسی کے بھی سر پر ساری کا آنچل نہ ہوتا تھا۔ اس کی بھی تمنا تھی کہ وہ بھی جدید فیشن کی ساڑھیاں پہنے، مگر اس کی یہ حقیر خواہش سینے میں گھٹ کر رہ جاتی۔ پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا پھر نئے ڈیزائن کا بلاؤز اور ساڑی کہاں سے پہنتی؟

ایک بار قحط پڑا تھا۔ اس وقت اس کے پاس تن ڈھانکنے کا کپڑا بھی نہ تھا۔ ایک ساڑی تھی اس پر سینکڑوں پیوند لگے ہوئے تھے۔ جب پیوند کے لیے کپڑے کا ٹکڑا دستیاب نہ ہو سکا تو اس نے ٹاٹ

کے ٹکڑے کا پیوند لگا کر ستر پوشی کی۔ مسلسل تہہ در تہہ
پیوند لگنے سے ساڑی گدڑی جتنی موٹی ہو گئی تھی۔
گرچہ وہ زمانہ گزر گیا مگر ڈھنگ کی ساڑی اب بھی
اسے نصیب نہ ہوئی۔

اس نے اپنی ساڑی پر نظر ڈالی۔ دل میں ایک
ہوک سی اٹھی۔ ہاٹ سے خریدی ہوئی "لنگی ساڑی"
دو چار خلانے کی، ایک ماہ سے پھٹ چلی تھی۔ اس کے علاوہ
کنٹرول سے خریدی ہوئی جو دوسری ساڑی تھی تار تار
اپنی رہائی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

اس دن اسٹیمر سے جو اچھی بنی سنوری لڑکی برآمد
ہوئی تھی۔ شاید کوئی نئی نویلی دلہن تھی۔ وہ اپنے شوہر
کے ساتھ مسکراتی، شرماتی باتیں کرتی ہوئی گاؤں کی
طرف جا رہی تھی۔ اس کی ساڑی قابل دید تھی۔ اس
کا خوشنما رنگ نہایت دل کش تھا۔ گرچہ سلطانہ نے
ساڑی چھو کر اس کی ملائمت اور قیمت کا اندازہ نہیں
لگایا تھا مگر اس کا جاذب نظر اور دلفریب رنگ ہی
اسے پاگل بنانے کے لیے کافی تھا۔ اس کے سرخ و
سپید جسم پر سرخ ساڑی بہت ہی بھلی لگ رہی
تھی۔

سلطانہ اپنی چہار دیواری کے اندر کھڑی سرخ
ساڑی والی کو حسرت و یاس سے دیکھتی رہی۔ اس کا
شوہر اشرف الدین علی الصباح بھات کھا کر اپنی
کشتی لیکر "چر[1]" پر چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی شام
کو ہوتی تھی۔ اس کی اپنی کوئی زمین نہیں تھی۔ سوائے
اس چھوٹے سے قطعہ اراضی کے ـــــ جس میں سر
چھپانے کے لیے انہوں نے اپنی چھونپڑی بنا رکھی تھی
اشرف نے چاروں طرف پانی سے گھرا ہوا "چر" پٹواری
سے حاصل کیا تھا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اپنے
دست و بازو سے زمین کا سینہ چیر کر دھان اُگا رہا تھا
اُن کے گذر بسر کا واحد ذریعہ دھان تھا۔ جب بھی فصل
اچھی ہوتی تو دو تہائی پٹواری ہتھیا لیتا۔ اس زمین پر سال
میں صرف ایک بار کاشت کاری ہوتی تھی۔

پھاگن کا مہینہ رخصت ہو رہا تھا۔ اس بار دو تین
ماہ سے بارش بھی نہیں ہوئی تھی۔ صبح ہی سے دھوپ
کی تپش اتنی بڑھ جاتی کہ جسم تپنے لگتا۔ تمازت سے آنکھیں
جلنے لگتیں۔ اس کے باوجود بھی کھیتی باڑی بند نہیں ہوئی
تھی کیونکہ بیساکھ میں زمین ہموار نہیں کی جا سکتی تھی۔
اس لیے تیز دھوپ میں بھی اس کے شوہر کو کھیت پر
رہنا پڑتا تھا۔ گذشتہ سال سارا دھان سیلاب کی نذر
ہو گیا تھا۔ یہ پہاڑ جیسا سال کیسے گذرے گا؟ اب تو چند
ماہ کے بعد بازار سے غلہ خریدنے کی نوبت آ گئی تھی۔

سرخ ساڑی نے اس کے اندر چھپی ہوئی عورت
کو بیدار کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اتنی قیمتی ساڑی
نہ سہی مگر اس سے ملتی جلتی ساڑی تو خریدی جا سکتی ہے
ان دنوں کپڑوں کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی تھی
پندرہ بیس روپے میں مل ہی جائے گی۔ شادی کے بعد
اسے ایک بھی پسند کی ساڑی نہیں ملی تھی۔ آخر اپنے دل میں
چھپے ہوئے ارمان کا کب تک گلا گھونٹے؟ کیا اس کے
اتنی معمولی سی خواہش کی تکمیل نہیں ہو سکتی؟ رنگ
برنگی ساڑی میں اس کا ملیح جسم کتنا نکھر آئے گا! اس
نے دل میں تہیہ کر لیا کہ شام کو جب اشرف الدین گھر
واپس آئے گا تو ایسی ہی ساڑی کی فرمائش کرے گی

اچانک اسٹیمر کے سائرن کی آواز سنائی دی۔
جیسے کہ کسی نے اسے خوابوں کی دنیا سے جھنجھوڑ کر جگا دیا
ہو۔ اسٹیمر گھاٹ سے مسافروں کو لے کر آئندہ منزل
کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ پانی میں تلاطم برپا تھا۔ لہروں
میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھلونوں کی طرح ڈول
رہی تھیں۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور سلطانہ نے
اب تک چولہا بھی نہیں جلایا تھا۔ اور نہ ہی بھات پکایا

---

[1] دریاؤں اور ندیوں میں یہاں وہاں چھوٹے چھوٹے
جزیرے نکل آتے ہیں جنہیں بنگالی میں "چر" کہتے ہیں۔

تھا۔ وہ فوراً بھاگتی ہوئی پڑوسن کے گھر میں آگ لینے
گئی۔

(۲)

دو تین ماہ مسلسل بارش نہ ہونے کی وجہ سے دھوپ
کی تمازت سے گھاس پھوس تک جل گئے تھے۔ دھرتی
تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ زمین کے سینے سے گرم گرم
بھاپ اس طرح خارج ہو رہی تھی کہ جیسے کوئی بیوہ حسرت
بھری سانس لیتی ہے۔ اشرف الدین سورج نکلنے سے
پہلے کشتی کھیتا ہوا اپنے کھیت پر پہنچتا اس وقت چڑیاں
نغمہ سرا ہوتیں۔ نسیم صبح خرام ناز سے اٹکھیلیاں کرتی
گذرتی۔ اشرف کو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی سمور کے
پر سے اس کا جسم سہلا رہا ہو۔ اس کے جسم میں
فرحت و انبساط کی لہریں دوڑ جاتیں۔ وہ سوچتا کہ کاش
اس کے بھی پنکھ ہوتے اور وہ ہوا کے دوش بدوش
کاش پر اڑتا پھرتا۔

جب سورج کا لال ساگولا افق مشرق سے طلوع
ہوتا تو خوشگوار فضا جہنم کی بھٹی میں تبدیل ہونے لگتی
پھر جیسے جیسے تپش بڑھتی جاتی۔ فضا میں چنگاریاں
سی اڑتی محسوس ہوتی کھیت میں ہل چلاتے چلاتے
اشرف الدین کے بازو شل ہو جاتے لیکن وہ اپنی دھن
میں لگا رہتا۔ کیونکہ ابھی سے زمین ٹھیک نہ رکھنے
سے برسات میں کاشتکاری ایک مسئلہ بن جاتی اور
پھر ان سب چیزوں پر بھوک غالب ہے۔ پیٹ
کی آگ وہ آگ ہے جو نہ دھوپ کی تمازت دیکھتی ہے
اور نہ لو کے تھپیڑوں کی جسے پرواہ ہے!

سورج کی گرمی سے اس کا سر چکرا جاتا، جب
وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا تو گرم گرم بالوں سے اسکی
کی ہتھیلی جلنے لگتی۔ زیادہ کام لینے سے بیل کے پاؤں
لڑکھڑا جاتے۔ منہ سے جھاگ نکلتے پھر بھی وہ اسے
ہانک کر مزید کام لینا چاہتا۔ اس پر ڈنڈے برساتا
لیکن بیل اڑیل ٹٹو کی طرح آگے بڑھنے سے انکار کر دیتے
اس میں بھلا بوڑھے بیلوں کا کیا قصور تھا، انہیں
تو ایک مہینہ سے کھانے کو چارہ بھی نہیں ملا تھا۔
گذشتہ سال سیلاب میں کھیت ڈوب گیا تھا۔
جب دھان ہی نہیں ہوا تو پیال کہاں سے آتا کہ
بیلوں کو روزانہ چارا ملتا۔ مہنگائی بڑھ گئی تھی۔
چارہ دو روپے میں ملتا تھا۔ وہ اتنا مہنگا چارہ خرید
کر بیلوں کو کھلانے سے قاصر تھا۔

اس سال بھی اس کا ستارہ گردش میں تھا۔
سال بھر چاول خرید خرید کر کھاتا رہا۔ اپنے گذر اوقات
اور کل کی فکر سے اس کی آنکھوں کی نیند اڑ گئی تھی۔
نئے دھان کے پھلنے پھولنے میں ابھی دیر
تھی۔ ابھی تو صرف چیت کا مہینہ آیا تھا۔ قسمت مہرباں
ہوئی تو پوس میں پکے ہوئے دھان کا دیدار ہو سکتا
تھا پھر بھی اس شبھ گھڑی کے آنے میں دس مہینے
باقی تھے۔

آفتاب گوشۂ مغرب میں چھپ رہا تھا اور شام
کی دلہن اپنے رخساروں پر شفق کا غازہ لگائے نمودار
ہو رہی تھی۔ اشرف الدین نے کھیت کے قریب بانس
اور پیال سے بنائے ہوئے "گؤ شالہ" میں بیل کھونٹے
سے باندھ دیئے اور ناؤ کھیتا ہوا، گھاٹ پر واپس
آ گیا۔ پدما کے کنارے ہی غسل کرنے کے لیے تین چار
ڈبکیاں لگائیں اور بھیگی ہوئی لنگی پہنے گھر آیا۔

سلطانہ نے مٹی کے برتن میں بھات اور کدو
کی بھجیا سجا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اشرف الدین
آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور مزے لے لے کر کھانے لگا
ابھی دو چار نوالے ہی حلق سے اتارے تھے کہ اچانک
کسی خیال کے تحت اس نے پوچھا ۔" کیا اور بھی کچھ
پکایا ہے؟"

" اور کیا پکاتی؟ دھوپ کی تمازت سے ساگ سبزی
کچھ بھی نہیں ہوئی۔ دو کچے آموں کی چٹنی بنائی ہے۔

ابھی لاتی ہوں۔"

چٹنی کے نام ہی سے اشرف کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کچھ نہ بھی ہو تو چٹنی اچار سے کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

سلطانہ ہنڈیا سے چاول نکال نکال کر اس کے برتن میں ڈالنے لگی پھر چٹنی دیتی ہوئی بولی۔ "۔ ایک بات کہوں؟"

"کیا بات ہے کہو؟"

"کہہ تو دوں، اگر تم میری بات پر عمل کرو۔"

"اگر مجھ سے ہو سکا تو ضرور کر دوں گا۔"

"مجھے بھی ایک لال ساڑی لا دو۔ اس روز ایک لڑکی اسٹیمر سے سرخ ساڑی پہن کر اترتی تھی۔ بالکل ویسی ہی ساڑی میں پہنوں گی۔"

اشرف کچھ سوچ کر بولا۔" جانتی ہو، آج کل ساڑی کی کیا قیمت ہے؟ معمولی سی معمولی ساڑی بھی پندرہ بیس روپے سے کم میں نہیں ملتی ہے۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں کہ تمہارے لیے ساڑی خرید کر لاؤں۔"

"اب تو میری زندگی خواہشوں کا مزار بن گئی ہے ایک ساڑی کی خواہش کی تھی سو وہ بھی پوری نہ ہو گی۔"

وہ منہ پھلا کر دوسری طرف بیٹھ گئی۔

اشرف الدین نے اس کا بغور جائزہ لیا تو دیکھا کہ سلطانہ کے چہرے پر غم و محرومی کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اگر فوراً ہی اسے نہیں مناتا تو اس کی خیر نہ تھی۔ اس کے تیکھے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔

"اچھی بات ہے۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں نے انکار تو نہیں کیا۔ مگر ابھی نہیں، پٹ سن کے موسم میں لادوں گا۔"

سلطانہ کے چہرے پر بشاشت پھوٹ آئی بولی پھر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ " میں نے فوراً لانے کے لیے تو نہیں کہا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تاڑ کے پنکھے سے شوہر کو ہوا جھلنے لگی۔ اشرف نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ سلطانہ جھوٹا برتن اٹھا کر دھونے کے لیے چلی گئی۔

(۳)

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ زمین کا تا نیجہ رنگ سبزے کا لباس پہنے جنت کا سماں پیش کر رہا تھا گلے، بکریاں اپنے بچوں کے ساتھ ہری ہری دو چرنے میں مصروف تھیں۔ گھاس کھا کر جب طبیعت سیر ہو جاتی تو زقندیں بھرنے لگتیں۔

اشرف الدین کے چہرے سے مسرت و انبساط کا نور ٹپک رہا تھا۔ اس بار بروقت بارش ہوئی تھی بارش کا ایسا تانتا بندھا تھا کہ سارا کھیت جل تھل گیا۔ سارا کھیت پورو دھان کے سبز نقش و نگار۔ لہرا رہا تھا۔ پانی پی کر دھان کے پودے بڑھنے لگے۔ جب ہوا کے دوش پر دھان کا پودا لہراتا تو ذ میں جل ترنگ سا بجتا ہوا محسوس ہوتا۔ ایسا ہوتا کہ کھیتوں میں سبز پریاں رقصاں ہیں۔

ابر رحمت کو دیکھ کر اس کے ہاتھ بارگاہ ا کی طرف اٹھ گئے۔ کارتک کے مہینے تک دھان کی با نکل آئیں گی۔ اس کے بعد سنہرے دھان سے سارا بھر جائے گا۔ تب سلطانہ کے چہرے سے مسرت کی چھلکے گی کیونکہ اس کی دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔

آساڑھ کے مہینے میں ہر سو پانی ہی پانی نظر لگا۔ دریا کا پانی بھی کھیت میں در آیا تھا لیکن سے فصل کو نقصان نہیں پہنچا۔

اس وقت جوٹ کی کاشت شروع ہو گئی

اشرف کے پاس جوٹ کے لیے قابل کاشت زمین نہ تھی۔ کافی دنوں سے غلّہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ جب تک س کے کھیت میں دھان پک نہیں جاتا، وہ بیکار تھا۔ اس نے اس لیے دوسرے کھیتوں میں مزدوری شروع کردی۔ گذشتہ سال سے قحط کے باعث مزدوری بھی بڑھ گئی تھی۔ ہزاروں لوگ موت کے شکنجے یں جکڑ گئے تھے، اس لیے آسانی سے بارہ آنے یومیہ کی مزدوری مل جاتی تھی۔ لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ چاول کے دام بڑھ گئے تھے کہیں بھی چاول بارہ آنے سیر سے کم نہیں ملتا تھا س پر بار بار ساڑی کے لیے سلطانہ کی یاددہانی۔ اس کی تنگدستی پر تازیانہ کا کام کر رہی تھی۔ پاس میں اتنے پیسے نہ تھے کہ اس کی حقیر سی خواہش پوری کرتا۔ گلے پر بھی سوکھ کر کانٹا ہوگئی۔ اس کے تھن سے جیسے کسی نے دودھ نچوڑ لیا ہو۔ دوسروں کے کھیت میں کام کاج کرکے جو مزدوری ملتی تھی، اس سے بمشکل دونوں کے پیٹ بھرتے تھے۔ اس کا نگوچھا اتنا پھٹ گیا تھا کہ استعمال کے قابل نہ رہا نگوچھا دو روپے میں آتا تھا۔ مگر ادنیٰ سی خواہش کی تکمیل بھی اس کے بس میں نہ تھی۔ کنٹرول سے ایک لنگی خریدی تھی، وہ بھی اب جگہ بہ جگہ سے پھٹ گئی تھی لیکن اسے اپنے سے زیادہ سلطانہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کی دونوں ساڑیاں اس قدر پھٹ گئی تھیں کہ اب پیوند کے قابل بھی نہ رہیں۔ اور پھر بے چاری نے عرصہ بعد ایک خواہش کا اظہار بھی کیا تھا جو پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

جب بھی اسٹیمر گھاٹ پر آکر ٹھہرتی، سلطانہ حسرت بھری نظروں سے چڑھتے اترتے مرد و عورتوں کو دیکھا کرتی اور سوچتی کہ چند روز کے بعد اس کی حالت ایسی ناقابل دید ہونے والی تھی کہ وہ گھر سے باہر قدم نہ نکال سکے گی، کیونکہ اس کی ساڑی آخری رہائی کی بھیک مانگ کر دم توڑ چکی تھی۔ وہ جہاں جہاں سے ساڑی کی سلائی کرتی، وہیں سے پھٹنا شروع ہو جاتی۔ اب وہ اپنے آپ کو ابھاگن سمجھنے لگی تھی۔ ان کے پڑوسیوں کی معاشی حالت ان سے بدرجہ بہتر تھی۔ جبکہ اس کا شوہر ان سے کم محنتی نہ تھا۔

اس نے کوئی بہت بڑی فرمائش بھی نہیں کی تھی۔ معمولی سی ایک ساڑی ہی تو مانگی تھی۔ اگر یہ حقیر خواہش پوری نہ ہوئی تو موت کے بعد کفن کا مسئلہ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گا!

(۴)

دیکھتے ہی دیکھتے کارتک کا مہینہ بھی گزر گیا۔ لیکن سلطانہ کی ساڑی خریدی نہ جا سکی۔ اس کا شوہر روزانہ ایک بار مزدور کھیت کا چکر لگاتا۔ گھر میں اناج ختم ہو چکا تھا۔ سارا مہینہ بے کاری میں گذر رہا تھا۔ اکثر کارتک کے مہینے بے کاری بڑھ جاتی ہے اور کسانوں کو بازار سے چاول خرید کر پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے۔

پڑوسی سے منت سماجت کرکے اشرف الدین بمشکل دو من دھان ادھار لایا تھا، صرف اس شرط پر کہ پہلی فصل کٹتے ہی اُن کا دھان واپس کر دے گا۔ اسی دھان سے ابتک کام چل رہا تھا ورنہ فاقوں کی نوبت آجاتی۔ مگر چند دنوں کے بعد وہ ذخیرہ بھی ختم ہونے والا تھا۔ چونکہ اس سال فصل اچھی ہوئی تھی اس لیے پڑوسی نے بھی مدد کرنے میں کوئی عذر نہ سمجھا۔ اگر خدانخواستہ اس کی فصل برباد ہو جاتی تو سبھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے۔

ایک دن اس کا شوہر مسکراتے ہوئے بولا — جانتی ہو اس سال اتنی اچھی فصل ہوئی ہے کہ گذشتہ آٹھ سالوں میں ایسا دن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

بس دو چار دنوں کی بات ہے جہاں دھان پکنا شروع ہوا
کھیت میں ہر سو سونا ہی سونا بکھرا نظر آنے گا۔
پھر ذرا سا رک کر بولا "تم بے فکر رہو۔ اس بار
تمہاری ساڑی ضرور لاؤں گا۔ اگر نیلی چھتری والا دو چار سال
اور اسطرح مہربان رہا تو میں تمہیں سر سے پاؤں تک
سونے میں لاد دوں گا۔ اس سال دوسروں کا دھان ادا
کرنے کے باوجود، ہمارے پاس اتنا دھان بچے گا کہ
سارا سال ٹھاٹ کی زندگی گذاریں گے۔"
سلطانہ اس کے جواب میں مسکرا کر بولی "زیادہ
دھان ملے گا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ہاتھ پر
ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ اب تو چاول کا مٹکا بھی خالی ہو
چکا ہے، پیٹ بھرنے کے لیے کوئی نہ کوئی انتظام کرنا
ہی پڑے گا۔"

"پہلا دھان جو ملے گا، اسے فروخت کر کے تمہارے
لیے بڑھیا سی ساڑی لاؤں گا۔ تم دھان کٹنی سے دھان
الگ کر لو گی نا؟ پھر تمام دھان چھان پھٹک کر سکھانا
پڑے گا، کیا تم اتنا سارا کام تنہا کر لو گی؟"
"پہلے تم دھان تو لاؤ۔ اگر اکیلے کے بس کا نہ ہوا
تو پڑوسنوں کو مدد کے لئے بلا لوں گی۔"
دیکھتے ہی دیکھتے چند روز میں دھان پک گیا۔ سارا
کھیت سنہرے رنگ میں نہا گیا تھا۔ جب کبھی آفتاب کی
تیز شعاعیں، گھاس پر لیکتی ہوئی پرچھائیوں، دھان
کی بالیوں سے دوچار ہوتیں تو اشرف الدین کی رگ رگ
میں ایک انجانی کپکی پیدا ہو جاتی اور اس کا جسم پسینے سے
شرابور ہو جاتا۔ اس نے مزدوروں کو لے کر دھان
کی کٹائی شروع کر دی۔ اتنا سارا دھان کاٹنا، اکیلے آدمی
کے بس کے باہر تھا۔ اشرف نے کٹے ہوئے دھان کا بوجھ
کشتی میں لاد کر گھر لانا شروع کیا۔
اس نے "چر" سے گھر تک کئی پھیرے لگائے۔
"چر" کے کنارے شیفالی کے اجلے اجلے پھول بڑے
خوشنما لگ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گائے کے
سفید بچھڑے دودھ پی کر آسودہ اور مطمئن بیٹھے ہوں
کھلیان دھان سے اٹا پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا
کہ چاروں طرف سونا ہی سونا بکھرا ہو اور رنگ اتنا پیارا
تھا کہ سنار کے بنائے ہوئے زیوروں میں اتنا نکھار
نہ تھا۔ اتنا سارا دھان دیکھ کر سلطانہ کا دل فرط مسرت
سے معمور ہو گیا۔ اس نے ساری زندگی میں اتنا ڈھیر
سارا دھان نہیں دیکھا تھا۔ ساری فضا میں دھان کی بھینی
بھینی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا میں مستی
سی چھائی ہوئی تھی اور کدو کی بیلیں بازو پھیلا کر اپنے
پھولوں کو دروازے پر جھولا جھلانے لگی تھیں۔
اشرف الدین آخری بار کشتی لے کر "چر" پر گیا
شام کو ہرے ہرے درختوں کی پھنگیں خون شفق میں
ڈوب کر پکتے ہوئے دھان کے سنہلے سنہلے خوشے سے
سورج کی زرکار شعاعیں کھیلتی ہوئی سونا ہی سونا پیدا
کر رہی تھی۔ اشرف نے واپسی پر دھان کی گٹھریاں سلطانہ
کے قدموں کے سامنے لا کر پٹخ دیں۔ سلطانہ کھلی پڑ رہی
تھی۔ اشرف بھی خوشی سے پھولا نہیں سما رہا
تھا۔
"دیکھو سلطانہ۔ اب تمہاری برسوں کی مراد بر آئے
گی۔ پڑوسنوں کو بلا کر بالیوں سے دھان الگ کر لو
بٹواری کو اس کا حصہ دینا پڑے گا۔"
"مطمئن رہیئے۔ آج رات یہ کام انجام دے دوں
گی۔" سلطانہ نے کہا۔
"اس خوشی میں پڑوسیوں کو بھی شامل کرنا پڑے
گا۔ کیوں نہ سبھوں کو دعوت دیدی جائے۔" اشرف
نے تجویز پیش کی۔
"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ کیا کیا ایکا
مچھلی کی بریانی ٹھیک رہے گی۔" سلطانہ نے اپنے شوہر
سے پوچھا۔
"جو تمہاری مرضی میں آئے پکا لینا۔ مگر تمہارے
کا "پیٹھا" کھائے عرصہ ہو گیا۔ کمبخت کے گزر سے

ھا تیار کرو تو مزہ آجائے۔"

تقریباً ساری رات سلطانہ اور اس کی بٹیہ سنوں
ل کر بالیوں سے دھان الگ کرکے بھوسی ایک طرف رکھ
۔ دھان وزن کیا تو آٹھ من ہوئے۔ اشرف نے آدھا
ان بٹواری کو بھجوا دیا۔ ایک من دھان گھر میں رکھ
تین من فروخت کر دیا۔

" تم سب کے سب دھان بیچ دوگے تو سارا سال
کیا کھائیں گے؟" سلطانہ نے اسے منع کرنا چاہا۔

"سلطانہ تم کتنی نادان ہو۔ اور بیت سارے دھان
پرسوں تک کاٹ کر لے آؤں گا۔ کیا تم سمجھتی ہو
ہمارے کھیت میں صرف اتنا ہی دھان ہوا ہے۔"
شرف نے پیار سے لپک ہلکی سی چپت اس کے سر پر
ائی۔

اشرف الدین فروخت کردہ دھان کے پینتالیس
پے لے کر ہاٹ گیا۔ جب وہ گھر واپس آیا تو رات کا
دھیرا پھیلنے لگا۔ جیسے ہی وہ آنگن میں آم کے درخت
نیچے پہنچا چلانا شروع کر دیا۔" سلطانہ جلدی آنا!"
سلطانہ فوراً گھر کے باہر آئی۔

" یہ دیکھو۔ تمہارے لیے کیا لایا ہوں" اشرف الدین
سرخ ساڑی کی تہہ کھول سلطانہ کے سر کے چاروں
ف گھونگھٹ کی طرح لپیٹ دی۔ سلطانہ کے چہرے
مسرت و انبساط کا سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ خوشی
ے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

" کتنے کی ہے؟" سلطانہ نے بار بار ساڑی اپنے
م سے لپیٹ کر دیکھنا شروع کیا۔

" اری نیک بخت! تجھے آم کھانے سے مطلب
ہے یا پیڑ گننے سے" وہ رک رک کر بولا " بیس
پے سے ایک پیسہ کم میں نہیں ملی۔"

" باپ رے باپ۔ پہلے تو یہ دس روپے کی آتی
ی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ " مگر تم اپنے لیے لنگی
ر انگوچھا کیوں نہیں لائے؟"

" سب کچھ ہو جائے گا۔ کل تک پوری فصل کٹ جائے
گی۔ پھر میں شہر جاؤں گا۔ تمہارے لیے اس سے بھی
اچھی ساڑی لاؤں گا۔ اور اپنے لیے لنگی، انگوچھا،
سب کچھ ـــــ" اشرف الدین نے اطمینان سے کہا۔
وہ لوٹے سے پانی نکال نکال کر ہاتھ منہ دھونے
لگا۔ اس کی بیوی پھٹا ہوا انگوچھا لے آئی۔

" آج کچھ امس سی ہے۔" وہ گرمی سے بے چین
ہو کر بولا۔

" ہاں۔ آج آسمان ابر آلود ہے، شاید اسی لیے"

" مگر اس موسم کا کیا بھروسہ۔ گھڑی میں ماشہ
گھڑی میں تولہ۔"

" بہرحال صبح سویرے مجھے جگا دینا۔ کوشش کروں
گا کہ کل ہی ساری فصل کاٹ لوں اور شام کے اسٹیمر سے
شہر چلا جاؤں" اشرف الدین یہ کہہ کر چٹائی پر بھات
کھانے بیٹھ گیا۔

دوسری شام سلطانہ اپنے شوہر کو اسٹیمر گھاٹ
پر الوداع کہہ رہی تھی۔ آج اس نے سرخ ساڑی پہن
رکھی تھی۔ اس کی ساڑی کی رنگینی آسمان کے تمام رنگوں کو
شرما رہی تھی۔ اس کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی
تھی۔ دل میں امنگوں کا ایک طوفان سا آیا ہوا تھا۔
اس کا شوہر اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے شہر
جا رہا تھا۔ اس کے خوابوں کی تعبیر بن کر ـــ ڈھیر
ساری چیزیں جو خریدنا تھیں۔ پھر بھی اس کی جدائی
کا خیال اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔

اسٹیمر کافی دور نکل گیا۔ اور وہ کھڑی اپنی امیدوں
کے اس کارواں کو دیکھتی رہی جو پدما کی لہروں سے کھیلتا
ہوا، منزل کی طرف گامزن تھا۔

رات کے پچھلے پہر بوندوں کی بارش شروع ہوگئی
بادل کے گھن گرج سے دل کانپنے لگا۔ ہوا میں تیزی
بڑھنے لگی۔ تند ہوائیں ایک مہیب طوفان کا روپ

باقی صفحہ نمبر ۱۷ پر

مانگے کا اجالا

حلقۂ ارباب ذوق

ایک خانقاہ تھی ادبی درویشوں کی جسے نیم خواندہ انقلاب پسندوں نے غصب کرلیا حالانکہ خدا کی زمین اُن پر تنگ تو نہیں تھی۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کے احکام سے اور اس کی اطاعت سے مسلسل روگردانی کرتی ہے تو آخر کار غضب جوش میں آتا ہے اور طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے ہیں لیکن جس قوم کو سب سے بڑھ کر عبرت ناک سزا دینا مقصود ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے چہرے مسخ کر دیتا ہے اور اس کے لوگ اپنی شناخت گم کر دیتے ہیں..... حلقۂ ارباب ذوق کا چہرہ بھی مسخ ہوگیا۔ اس کی شناخت گم ہوگئی۔ اس نے احسان فراموشی اور محسن کشی کے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا تھا۔ بزمِ داستان گویاں چند ایسے نوجوانوں نے قائم کی تھی جو افسانوی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ یہاں کہانیاں پڑھی جاتی تھیں اور اُن پر تنقید ہوتی تھی۔ اردو ادب کی تاریخ میں یہ بالکل انوکھا اور نرالا واقعہ تھا۔ قیوم نظر کے چند احباب اس تحریک سے وابستہ تھے۔ وہ قیوم نظر کو وہاں لے گئے دوسرے ہفتے قیوم نظر میراجی اور یوسف ظفر کو یہاں لے آیا اس سے اگلے ہفتے یوسف ظفر نے میراجی اور قیوم نظر کی تائید سے تجویز پیش کی کہ افسانوں کی طرح نظمیں بھی پڑھی جایا کریں اور ان پر بھی تنقید ہوا کرے۔ تجویز پسند کی گئی۔ بزمِ داستان گویاں کا نام تبدیل کر کے حلقۂ اربابِ ذوق رکھ دیا گیا۔ اس زمانے تک کسی شاعر کے لیے یہ بات تشویش کا باعث ہوا کرتی تھی کہ اس کے کلام پر اس کے روبرو محفل میں تنقید کی جائے۔ یوسف ظفر نے پہلا پتھر لڑھکایا۔ اس نے اپنی نظم تنقید کے لیے پیش کی۔ یوسف ظفر نے جس تنقیدی روایت کی بنیاد رکھی تھی اس نے حلقۂ اربابِ ذوق کے ذریعہ اردو شاعری کے ارتقا میں کتنا اہم کام سرانجام دیا۔ اہلِ نظر ہی جانتے ہیں مگر آج وہی حلقۂ اربابِ ذوق یوسف ظفر کے مرنے کی خبر سن کر قرار دادِ تعزیت بھی منظور کرنے کو تیار نہ ہوا اور ان انقلاب پسندوں کی طرف سے فتویٰ صادر کیا گیا کہ یوسف ظفر ایک ایسا رجعت پسند تھا جس کا عدم و وجود برابر ہے جو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے کمرہ نمبر ۲ میں بیٹھ کر اپنی دھواں دھار تقریروں کے ذریعہ دنیا بھر میں ایک انقلابی معاشرہ قائم کرنے آتے ہیں۔ من پسند ملازمتیں حاصل کرتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ فاعتبرو یا اولی الابصار

"اوراق"

شاعری کا مصرف

عربوں میں باہمی مفاخرت اور مخالفت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ جب کسی قبیلے کا کوئی شاعر اپنے اشعار میں اپنے قبیلے کے کارناموں کو بیان کرتا تو دوسرے قبیلے کے لوگوں کے دلوں میں یہ شوق پیدا ہوتا کہ کاش ان کا بھی کوئی شاعر ہوتا جو ان کے کارناموں کو اپنے اشعار کے ذریعہ زندہ کر دیتا۔ اس کے علاوہ عربوں کے اندر فطری طور پر شاعری کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے اور

عربی زبان میں ہر قسم کا مفہوم ادا کرنے کے لیے بڑی ہی قابلیت موجود ہے۔ مزید برآں عربوں کی طبیعتوں میں احساس اور جوش بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ خوف اور خوشی، غم و غصہ اور عیش و مسرت کے جذبات ان کو بہت جلد بے خود اور بے قابو کر دیتے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر اشعار کا ان کے دلوں پر بہت اثر پڑتا تھا بعض وقت ایک ہی شعر ان کے اندر انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جن میں سے ایک یہاں پر پیش کیا جاتا ہے۔

اعشیٰ زمانہ جاہلیت کا ایک مشہور شاعر ہے۔ اسی زمانہ میں محلق نامی ایک غریب شخص تھا جس کی کئی لڑکیاں تھیں اور ان کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بار اس کے قبیلہ کی طرف سے اعشیٰ کا گذر ہوا۔ چاروں طرف اعشیٰ کے آنے کی خبر مشہور ہو گئی۔ محلق کی بیوی کو بھی معلوم ہوا تو اس نے اپنے خاوند محلق سے کہا کہ اعشیٰ ایک مشہور شاعر ہے اس کی دعوت کر دو اور خوب خاطر تواضع کرو شاید اسطرح وہ ہم سے خوش ہو کر اپنے اشعار میں ہمارا ذکر کر دے تو ممکن ہے کہ کچھ کام بن جائے۔ چنانچہ محلق نے ایسا ہی کیا اور اعشیٰ کو اپنے گھر لاکر اس کی بڑی اچھی ضیافت کی اور نہایت عمدہ شراب پلائی۔ دوسرے دن اعشیٰ نے محلق کی تعریف میں ایک قصیدہ سنایا جس کا ایک شعر اس طرح ہے ؎

تُشَبُّ لِمَقْرُورَینِ یَصطلیانھا
وَبَاتَ عَلَی النَّارِ النَّدیٰ وَالمُحَلَّق

(دو سردی کے ماروں کے لیے آگ بھڑکائی جاتی ہے۔ جسے وہ تاپ رہے ہیں اور اس آگ پر سخاوت اور محلق دونوں نے رات گذاری۔)

اس قصیدہ کو سنتے ہی مختلف قبیلوں کے بڑے بڑے سردار محلق کے گھر دوڑ پڑے۔ انہوں نے محلق کو مبارک باد دی اور شادی کا پیغام دیا۔ اس طرح جلد ہی محلق کی تمام لڑکیوں کی شادیاں بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ ہو گئیں۔ (جامعہ)

سنانے والے بہت، سننے والا کوئی نہیں

آدمی اپنے کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔ یہی ہر دور میں آدمی کی سب سے بڑی خواہش رہی ہے۔ قدیم زمانہ میں اپنے کو نمایاں کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ "تلوار" تھا۔ اس لیے آدمی تلوار کے کارنامے دکھا کر اپنی جاہ پسندی کے جذبہ کی تسکین حاصل کرتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں پریس اور پلیٹ فارم اس کے ذریعے بن گئے ہیں، اس لئے آج لوگ لکھنے اور بولنے کے کمالات دکھا رہے ہیں۔ جس کو بھی کچھ موقع مل گیا ہے وہ چاہتا ہے کہ تحریر و تقریر کے میدان میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو نمایاں کرے۔ مزید یہ کہ تلوار کا کھیل بڑا جوکھم کا کھیل تھا۔ اس لیے نسبتاً کم لوگ اس میدان میں اترنے کا حوصلہ کرتے تھے اس کے برعکس قلم کو حرکت میں لانا یا لاؤڈ اسپیکر پر الفاظ کے دریا بہانا بہت آسان کام ہے۔ اس لیے آج ہر آدمی جاہ اور شہرت کے میدان میں دوڑ لگانے کے لیے بے قرار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری انسانی آبادی "سنانے والوں" میں تبدیل ہو گئی ہے۔ زمین کی پشت پر "سننے والا" کوئی نہیں۔

جہاں بھی دیکھئے۔ ہر آدمی دوسرے کو درس دیتا ہوا نظر آئے گا۔ کوئی اپنے بھائیوں کے درمیان خطابت کے جوہر دکھا رہا ہے اور کوئی بلاد اور وطن کے نام انسانیت کا پیغام نشر کر رہا ہے۔ کوئی عربوں کو نصیحت کر رہا ہے اور کوئی اہل مغرب کو کھری کھری باتیں سنا رہا ہے۔ کوئی اہل بدعت کے خلاف قلمی جہاد کا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ اور کوئی فرق ضالہ کی حقیقت کھولنے میں مصروف ہے۔ خود اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں کا محاسبہ کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

ان لفظی سورماؤں کی حقیقی زندگیوں کو دیکھئے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ ذاتی نمائش کا اظہار ہے نہ کہ دین و ملت کی خدمت کا۔ ہر ایک زبان سے حق

انصاف کا پیغام دے رہا ہے اور عمل سے حق وانصاف کو پامال کر رہا ہے۔ ایک شخص قوم کی تعمیر کا نعرہ لگا رہا ہوگا مگر خود اپنے زیر معاملہ فرد قوم کو برباد کر رہا ہوگا۔ ایک شخص دوسروں کو انسانیت کا پیغام سنا رہا ہوگا اور خود اس سے جس انسان کا معاملہ پڑے اس سے حیوانی سلوک کر رہا ہوگا۔ ایک شخص دوسروں سے انصاف قائم کرنے کا مطالبہ کر رہا ہوگا اور خود جب ایک شخص سے انصاف کرنے کا وقت آئے گا تو وہاں وہ بے انصافی کرنے لگے گا۔

قرآن میں شاعر اور نبی کا یہ فرق بتایا گیا ہے کہ شاعر ایسی بات کہتا ہے جس پر وہ خود عامل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قائدین شاعروں کے اسوہ پر چل رہے ہیں نہ کہ پیغمبروں کے اسوہ پر۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں جس چیز کی قیمت ہے وہ صرف عمل ہے۔ اگر آدمی زبان سے فساد اور ناانصافی کے خلاف آواز لگا رہا ہو مگر خود عملی اعتبار سے فساد اور ناانصافی کے مقام پر ہو تو آخرت میں اس کے ساتھ معاملہ اس کے عمل کے اعتبار سے کیا جائے گا نہ کہ اس کے قول کے اعتبار سے۔

(الرسالہ)

منشی نولکشور

منشی نولکشور جی نے آگرہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ابھی صرف اٹھارویں سال میں تھے کہ ان کی ملاقات لاہور کے مشہور اخبار "کوہ نور میگزین" کی روح رواں منشی ہرسکھ رائے سے ہوگئی۔

ہرسکھ جی منشی جی کی غیر معمولی ذہانت اور اختراع پسند طبیعت سے اتنا متاثر ہوئے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ لاہور لے گئے اور وہاں فن طباعت کی تعلیم دینا شروع کی۔

جب اس فن میں منشی جی مہارت حاصل کر چکے تو انہوں نے اپنا ذاتی مطبع کھولنے کا فیصلہ کیا۔

پہلی جنگ آزادی کے بعد ۲۲ سال کی عمر میں منشی جی لکھنؤ واپس آئے اور یہیں انہوں نے مطبع نولکشور قائم کیا۔ مطبع سے انہوں نے اردو کا مشہور اخبار" اودھ اخبار" ۲۶ نومبر ۱۸۵۸ کو اپنی ہی ادارت میں نکالا۔

یہ شمالی ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا اردو اخبار تھا۔ نقل وحمل کی دشواریوں اور کاغذ کی کمیابی کے باوجود صرف دس برس کے عرصہ میں اس اخبار کی تعداد اشاعت ۱۲ ہزار ماہانہ ہوگئی جو اس عہد کے لئے ایک معجزہ سے کم نہ تھی۔ شمالی ہند کے علاوہ یہ اخبار مغربی ایشیا برما اور انگلینڈ میں بھی جانے لگا۔ اور اس طرح اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔

کیمرج یونیورسٹی میں لسانیات کے ممتاز برطانوی پروفیسر ای، ایچ، پامرس نے اس اخبار میں نامہ نگار کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔

منشی جی سنسکرت، اردو، فارسی، عربی، ہندی، انگریزی، گرمکھی، مرہٹی، اور بنگالی زبانوں کی غیر مطبوعہ کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے تاکہ انہیں اپنے مطبع سے شائع کریں۔

اس زمانہ میں دینیات کا بہت چلن تھا۔ اور منشی جی کو مذہبیات اور دینیات سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنے مطبع سے سب سے پہلا قرآن شریف بڑے تزک واحتشام کے ساتھ شائع کیا۔ اس طرح انہوں نے "گرنتھ صاحب"، "جنم ساکی" "بھگوت گیتا" "رامائن" اور "اپنشد" جیسی عظیم مذہبی کتابیں شائع کیں۔

فارسی زبان کی مشہور رزمیہ نظمیں ۳۴ جلدوں

میں شائع کیا۔ اُردو اور ہندی کے اکثر عظیم اور صاحبِ طرز انشار پرداز اور شعراء کم وبیش اس مطبع سے منسلک رہے ہیں۔ خاص کر ۱۸۵۸ء کے بعد کے شعراء اور اہلِ قلم کی خدمات سے منشی جی نے بہت فیض اٹھایا مرزا غالبؔ نے اپنے کلام کا بیشتر حصہ منشی جی کے پاس اشاعت کے لیے بھیجا۔ اس طرح رنگون سے آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفرؔ نے بھی اپنا کلام طباعت کے لیے روانہ کیا تھا۔ مرزا غالبؔ نے ایک جگہ لکھا ہے

"اس چھاپہ خانہ نے جس کسی کا بھی
دیوان چھاپا ہے اس کو زمین سے
آسمان پر پہنچا دیا۔"

اپنی زندگی میں منشی جی نے اس مطبع سے چار ہزار کتابیں شائع کیں۔ موجودہ ہندستان میں کسی دوسرے مطبع کو ابھی تک یہ اعزاز نہیں حاصل ہو سکا ہے۔

(تعمیر ہریانہ)

باقی ترقی دانشوران

کرنے پر شیخ صاحب نے فرمایا کہ وہ سڑک پر سوئی ڈھونڈ رہے ہیں جو ان کے گھر میں گم ہو گئی تھی۔ اس سوال کے جواب میں کہ گھر میں گم شدہ سوئی سڑک پر کیسے مل سکتی ہے۔ دانشوروں کے جدِ امجد نے کہا کہ بھئی کیا کروں گھر میں روشنی جو نہیں۔

ترقی پذیر ملکوں کے بیشتر دانشوروں کا رویہ بالکل یہی ہے۔ کمیونسٹ ملکوں میں ہر دھاندلی پر وہ صرف خاموش ہی نہیں رہتے بلکہ اس کا جواز بھی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان ملکوں میں جہاں تحریر و تقریر کی آزادی موجود ہے وہ اس کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔

موڈرن پبلشنگ ہاؤس کی فخریہ پیشکش

افکارِ عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے افکار و خیالات کا مجموعہ جسے آمنہ صدیقی نے بابائے اردو کی تمام تحریروں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے۔ قیمت ۳۵/- روپے

مذہب اور سائنس

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مذہب اور سائنس کے موضوع پر مدلل اور خیال افروز بحث۔ پہلی بار مکمل کتاب کی صورت میں۔ قیمت ۱۱/- روپے

چند ادبی شخصیتیں

شاہد احمد دہلوی کے دلی کی ٹکسالی بامحاورہ زبان میں ممتاز ادبی شخصیتوں کے خاکے۔

قیمت ۳۰/- روپے

اُداس شام کے آخری لمحے

اس عہد کے نہایت حساس افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر کے افسانوں کا تازہ ترین انتخاب

قیمت ۱۲/- روپے

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولہ مارکیٹ (گولچہ سنیما کے پیچھے) دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سخاروف نے کہا

نوبل امن انعام یافتہ سائنسداں الیگزنڈر دی سخاروف کا موجودہ سماجی اور معاشرتی مسائل پر اظہارِ خیال

قیمت ۴/- روپے

لائبریری ایڈیشن ۷/- روپے

قوموں کے قاتل

روس کے زیرِ اقتدار آ جانے والی چھوٹی قوموں کی نسل کشی اور جلاوطنی کی لرزہ خیز روداد۔ رابرٹ کنکوئسٹ کے قلم سے

قیمت تین روپے

تلسی داس اور رام چرت مانس

اردو میں تلسی داس کی حیات، شاعری اور ان کی رامائن کا پہلا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر صفدر آہ

ڈیمائی سائز صفحات ۲۹۰

اردو کے سب سے بڑے رومانی شاعر

کا

پورا کلام

کُلیاتِ اختر شیرانی

مرتبہ

بزمِ احباب

○ تبصرہ کے لیے آپ کا اور جناب ارشد علی خاں صاحب کا شکرگزار ہوں۔ میری دیرینہ خواہش بر آئی۔

برادرم مخمور سعیدی کا مندرجہ ذیل شعر سارے شعری حصہ پر بھاری ہے۔ ؎

اس تماشے میں یہ کردار ملا ہے ہمکو
مختلف آئیں نظر مختلف اوقات میں ہم

نہ جانے کیوں شعر کون و مکاں کی سرحدیں چھوتا نظر آتا ہے۔

بمل کرشن اشکؔ

○ دسمبر کا تحریک صوری و معنوی اعتبار سے پسند آیا۔

مخمورؔ سعیدی، مظفرؔ سبزواری، عروجؔ زیدی، منظرؔ حنفی، راجؔ کھیتی، عابدؔ مناوری، گلشن بڑودوی کی غزلیں پسند آئیں۔

حکیم منظورؔ کی غزل پڑھ کر بے ساختہ باقی کے لب ولہجہ کی مٹھاس یاد آگئی۔ بمل کرشن اشکؔ کی نظم اور کرشن موہن کی غزل بھی اچھی لگی۔

افسانوں میں سے "کملادی" اور "خون" اچھے افسانے ہیں۔ ادم پرکاش لاغرؔ کا انشائیہ "ایک یوگی کی خود نوشت سرگزشت" بھی دلچسپ اور تلخ حقایق کا بہترین اظہار ہے۔

اس مرتبہ "مانگے کا اجالا" بہت دور تک پھیلا ہوا نظر آیا جس سے میں نے بھی فیض حاصل کیا۔

آپ کا مضمون "چینی کیمونسٹ، ازالۂ سحر کے بعد" پڑھا۔ ہندوستانی کیمونسٹوں کو آپ نے بڑا مفید مشورہ دیا ہے کہ "روس کی اندھا دھند نقالی کرنے کی بجائے چینی کیمونسٹوں سے کچھ سیکھنے کی کوشش کریں، جنہیں تلخ حقائق اور ذمہ داری کے احساس نے واہموں سے نجات دلا کر حقیقت پسندانہ طور پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔"

فدا المصطفیٰ فدوی

○ دسمبر کا شمارہ ظاہری و باطنی خوبیوں سے مرصع وجاذب نظر ہے، ہر تخلیق اپنے تخلیق کار کی ادبی حیثیت کی غمازی کرتی نظر آئی، خدا کرے آپ کی ادارت پرچے کو ہمیشہ انفرادی حیثیت دے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کے مراحل طے کرے۔ "آمین ثمہ آمین"

صادق گیاوی

○ اکتوبر، نومبر کے شمارے میں اڑیہ نظم "خود کلامی" اردو شاعروں کے لیے روشن مثال ہے۔ ایسی گداز پُر فضا اور منوّر نظم خال خال دیکھنے میں آتی ہے نظم کیا ہے۔ کائناتِ دل کی اداس مسکراہٹ — روح کی پُرسوز گنگناہٹ، زندگی کے زیر و بم کا غنائی اور فنی عکس، محبت کی ویران یادوں کی داستان۔

آپ کا مضمون 'جابرانہ حکومت اور کیمونزم' معرکہ کی چیز ہے۔ آپ نے صحافت کو ادب و فن کے تخلیقی حسن کی رمز و رموز سے آشنا کرا دیا۔ عام طور پر ایسے موضوعات صحافتی سوقیانہ پن کی آلائش سے پاک نہیں رہ پاتے۔ آپ نے تو انسان کے اندر کی ساری دردمندی سمیٹ کر رکھ

دی۔ اس کے اس خوف کا کہیں اسے انسانی سرشت کی نیکی
پر اپنے اعتبار سے ہاتھ نہ دھونا پڑ جائے بڑی ہنر مندی
سے اظہار کیا۔ پورا مضمون آپ کی تخلیقی قوت کا غماز ہے۔
کہانیوں میں کنور سین کی کھلاڑی، سر فہرست ہے
سوچ کی گہرائی اور گیرائی تناظر کی وسعت زبان اور بیان
کی سلاست، اسلوب کی انفرادیت اور تکنیک کی ندرت
کنور سین کے افسانوں کے امتیازی اوصاف ہیں۔ کھلاڑی
ہندوستانی معاشرے کے بنجر پن کو خوب عیاں کرتی ہے۔
باہر کہیں سے بھی آئی ہوا اسے زرخیز نہیں بنا سکتی نعرہ بازی
الگ بات ہے۔

——— بی۔ ایس ٹنڈن

○ "بزم احباب" میں دلبر ملت کامریڈ عبداللہ
کا مکتوب پڑھا اور بہت سی "پرانی بھولی بسری یادوں"
کی یاد تازہ ہوئی۔ انارکلی یاد آئی اور اس کے ساتھ ملک
نصر اللہ خاں عزیز مرحوم کا شعر ؎

مت جائیو انارکلی کی طرف عزیز
واں ہر حسین بشیوۂ رہزن ہے آجکل

اگر کامریڈ عبداللہ ملک کے مکتوب کے ساتھ ان
کا پتہ بھی درج ہوتا تو غازی ان سے براہ راست خط وکتابت
کا سلسلہ جاری کرتے۔ "آجکل" کی طرح اگر "تحریک" میں
"احباب" کے پتے شائع ہونے لگیں تو خط وکتابت کے ذریعہ
دوستانہ تعلقات استوار ہونے لگیں گے۔
"مانگے کا اجالا" اور "بزم احباب" دونوں نہایت
دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں ادم پرکاش لاغر کی تحریر
"ایک لوگی کی خود نوشت سرگزشت" پڑھ کر بے ساختہ
زبان پر استادی المکرم احسن مارہروی کا یہ شعر رواں
دواں ہوا ؎

ہزاروں کو فقط تیغ زباں سے قتل کر ڈالا
جنہیں ہم نازنیں سمجھے تھے وہ نکلے چھپے رستم

اور غازی کو ادم پرکاش لاغر نہیں بلکہ نثر نگاری
میں توانا اور "چھپے ہوئے رستم" نظر آئے۔ اللہ کرے زور قلم
اور زیادہ۔
مرزا حامد بیگ پاکستانی کی "واپسی" اور گوربچن سنگھ
بھلر کی "خون" کے عنوان سے "کرتارے" کی داستان
خوب ہی نہیں بلکہ خوب تر ہے۔
کنور سین کی "کھلاڑی" اور بمل کرشن اشک کی۔
"مجھے کسی سے گلہ نہیں ہے" پڑھ کر غازی کا من گدگد
ہوا۔ غزلیں اور نظمیں بھی خوب اور معیاری ہیں یہ بات علیحدہ
ہے کہ ان میں "فسق" کی خوشبو کم ہے اور "منافقت" کی بو
زیادہ ہے مولانا حسرت موہانی نے عاشقانہ شاعری کو
"فاسقانہ" کا نام دیا ہے اور دوسری شاعری کو "منافقانہ"
فرمایا ہے بہر صورت و بہر حال "فاسقانہ شعروں" میں مخمور
سعیدی کا یہ شعر خوب ہے۔

کھل کے برسا تھا ترے پیار کا بادل ہم پر
ہاں نہائے تھے کبھی رنگ کی برسات میں ہم

——— خان غازی کابلی

○ اس بار اداریہ کی کمی بری طرح محسوس ہوئی
کیونکہ آپ کے لکھے ہوئے اداریہ خاصے کی چیز ہوا کرتے
ہیں۔ زیر نظر شمارے میں ادبی مضمون بھی نہیں ہے۔
ویسے اس کمی کو "مانگے کا اجالا" کسی حد تک پورا کر دیتا ہے
پنجابی سے ترجمہ کیا ہوا افسانہ "خون" بے حد پسند آیا شریف
کنجاہی نے اسے بڑے ہی دلکش انداز میں ترجمہ کیا ہے۔
غزلوں کے درج ذیل اشعار نے دامن دل کھینچ لیے۔

(کرشن موہن) گرچہ ہوں میں ایک تصویر خموش
کافر ہرجائی کے البم میں ہوں

(مخمور سعیدی) اس تماشے میں یہ کردار ملا ہے ہم کو
مختلف آئیں نظر مختلف اوقات میں ہم

(خلش بڑودوی) ایک میں تن تنہا کتنے بت گراؤں گا
ہیں خدا ہزاروں اس شہر کے مکینوں میں

(مظفر حنفی) لٹاتا رہا نقد جاں چار سو
مرے در پہ دنیا سوالی نہ تھی

"آئینے اور پرچھائیں" پہ ارشد علی خاں کا تبصرہ تشنہ ہے۔

——— نجم عثمانی

اردو کے سب سے بڑے رومانی شاعر
کا
پورا کلام
کلیاتِ اختر شیرانی
مرتبہ:
گوپال متل
قیمت: —— دس روپے
سخاروف نے کہا
نوبل امن انعام یافتہ سائنسداں اکیڈمیشن آندرے سخاروف کا موجودہ سماجی اور معاشرتی مسائل پر اظہارِ خیال۔
قیمت: —— چار روپے
لائبریری ایڈیشن: سات روپے
نازش بک سنٹر کی پیشکش
گوپال متل —— ایک مطالعہ
گوپال متل کی صحافتی زندگی اور ان کے ادبی اور شعری کارناموں کا بھرپور جائزہ، آخر میں گوپال متل کی نثری اور شعری نگارشات کا انتخاب بھی شامل ہے۔
مصنف: محمد عبد الحکیم
قیمت: پندرہ روپے
نئی غزل میں کلاسیکی وقار
کی
از سر نو یافت
بانی کا مجموعۂ کلام
حسابِ رنگ
قیمت: پندرہ روپے
بسمل سعیدی
شخص اور شاعر
بسمل سعیدی کے فکر و فن پر ایک اہم کتاب۔ ممتاز اہل قلم کے مضامین، بسمل صاحب کا منتخب کلام اور ان کا طویل انٹرویو جو ماضی قریب کی ادبی تاریخ کے کئی مخفی گوشوں کو سامنے لاتا ہے۔
قیمت: اٹھارہ روپے
اردو غزل کے ارتقائی سفر
کا
نیا سنگِ میل
رُو بہ رُو
کمار پاشی کی غزلیں
قیمت: دس روپے
نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کیلیے منظور شدہ

شمارہ ۱۱ جلد ۲۷

فروری ۱۹۸۰

ادارۂ تحریر

گوپال متل

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت : پندرہ روپے فی کاپی : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ : تین پونڈ فی کاپی چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ تحریک ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر : گوپال متل

مطبع : نعمانی پریس

مقام اشاعت

۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مندرجات

خوشحالی کے لئے بچت

اپنی جمہوریہ کی 30 ویں سالگرہ پر ہم پکے ارادے اور دُگنے جوش و خروش کے ساتھ اپنے اعلان کردہ نصب العین — اپنے تمام شہریوں کے لئے بہتر مستقبل — کی طرف گامزن ہیں۔

ہمارے شریکِ کار بنئے - قومی بچتوں میں روپے لگائیے۔ ملک کی خدمت کرنے کا یہ ایک سنہری موقعہ ہے جبکہ آپ کے بچائے ہوئے روپے بڑھتے رہتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے سے پانچ کروڑ سے زائد لوگ اس میں شامل ہو چکے ہیں۔

قومی بچت اسکیمیں پونجی جمع کرنے یا اپنے لئے باقاعدہ وقفوں سے آمدنی پیدا کرنے میں آپ کی امداد کرتی ہیں جس پر ٹیکس میں بھی رعایت ملتی ہے۔

قومی بچت اسکیمیں پیش کرتی ہیں:

- سب سے زیادہ شرحِ سود۔
- تحفظ — آپ کا روپیہ سرکار کے پاس محفوظ رہتا ہے۔
- دلکشی — لکی پرائز ڈرا — چھوٹی بچتیں کرنے والوں کے لئے مفت بیمہ۔ اور بڑی رقمیں لگانے والوں کو ٹیکس میں رعایتیں۔
- ایجنٹوں اور ڈاکخانوں کے وسیع سلسلے کے ذریعے خدمات کی فراہمی، آپ کے گھر پر۔
- نامزدگی کی سہولت۔
- سیونگز سرٹیفکیٹ، ٹائم ڈپازٹ رسید وغیرہ کو ضمانت کے طور پر بینکوں سے قرضے لینے کے لئے رہن رکھا جا سکتا ہے۔

ایک بار قومی بچت تحریک میں شامل ہو جائیے، آپ کو اس کے مزید بہت سے فائدے معلوم ہوں گے۔

قومی بچت ادارہ

پوسٹ بکس 96، ناگپور- 440001

سے رابطہ بنائیے۔

davp 79/416

ابتدائیہ

گوپال مِتّل

جنوری کے شمارے میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ ایک یوگی کی خود نوشت سرگزشت پر مصنف کی حیثیت ادم پرکاش لاغر کا نام غلطی سے دے دیا گیا تھا۔ یہ کہانی دراصل بلراج کمار کی ہے۔

قارئین تحریک کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ناگپور یونیورسٹی کی شعبۂ اردو کی صدر ڈاکٹر زرینہ ثانی کو ان کی تصنیف "سیماب کی نظمیہ شاعری" پر مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے دو ہزار روپے کا انعام دیا ہے یہ رقم پہلے انعام پر دی جاتی ہے اسی کتاب پر بہار اردو اکاڈمی کی طرف سے ایک ہزار روپے کا انعام ملا زرینہ ثانی اردو کی اچھی شاعرہ اور اردو ادب کی بہت اچھی ناقد ہیں۔ دونوں انعاموں پر ہم انہیں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

بزمِ احباب میں قاضی سلیم کا خط مستحق توجہ ہے ہم ان کے اس مشورے سے متفق ہیں کہ اردو کے قارئین کو دوسرے ادب سے روشناس کرانا ضروری ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں اس سلسلے میں ہم حتی الوسع کوشش کرتے بھی رہے ہیں۔ پھر بھی تحریک کے مضمون نگاروں سے گذارش ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے ادب پاروں کے ترجمے ہمیں بھیجیں۔ دوسری زبانوں میں اردو کا ادب ترجمہ ہو کر شائع ہو رہا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اردو والے بھی ان زبانوں کے ادب سے بہتر آگاہی حاصل کریں۔

گزشتہ چند ماہ سے میں دیکھ رہا ہوں کہ اردو شاعری بالخصوص غزل میں ایک طرح کی بے کیف یکسانیت راہ پا رہی ہے۔ پہلے یہ یکسانیت پیروی داغ کا نتیجہ تھی اس کے بعد ترقی پسندوں کی نعرے بازی کا۔ دلوں سے اس میں رنگا رنگی پیدا ہوئی تھی اور یہی چیز جدید غزل میں باعث کشش تھی۔ ماحول کی ناگواری کا شکوہ بجا لیکن کیا شاعری کی قربانی دینے سے ماحول سازگار بن سکتا ہے۔ غزل گو شعرا سے درخواست ہے کہ وہ ادب اور صحافت کے فرق پر سنجیدگی سے توجہ دیں، اور غزل کو اظہارِ ذات کا وسیلہ ہی رہنے دیں۔

تحکمانہ نظامِ حکومت اور جیوتی باسو

گوپال متّل

یہ عجیب بات ہے کہ انتخابات کے بعد ہندوستان میں تحکمانہ نظام حکومت کے قیام کا خطرہ سب سے زیادہ سی پی ایم آئی کے لیڈر جیوتی باسو کو لاحق ہے۔ غالبًا وہ کوئی مخصوص آئینہ استعمال کرتے ہیں ورنہ انھیں اپنی ذات پر مخالفِ حاکمیت ہونے کا شبہ نہ ہوتا۔ مقامِ شکر ہے کہ کانگریس آئی کی مخالف جمہوری پارٹیاں جنہیں انتخاب میں شکست ہوئی ہے معاملہ فہمی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ وہ اپنی شکست کو خندہ پیشانی سے قبول کر رہی ہیں اور اس معاملے میں آر ایس ایس کے سر سنگھ چالک شری دیورس کی ہمنوا ہیں کہ جمہوری نظام میں مخالفت کے معنی دشمنی نہیں ہوتے۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ وہ جیوتی باسو کے اس قسم کے بیانات سے دھوکا کھا جائیں گی کہ تحکمانہ نظام حکومت پر فرقہ پرستی تک قابل ترجیح ہے۔

خود حکومتی پارٹی کو بھی اس کا احساس ہے کہ اس کا جھگڑا جمہوری پارٹیوں سے نہیں جن کے ساتھ اس کے اختلافات جزوی ہیں بلکہ اصل ٹکراؤ اس میں اور کمیونسٹوں میں ہے جن کے سرخیل جیوتی باسو ہیں۔

بمبئی کے جریدے "آن لکر" نے جب سنجے گاندھی سے کمیونسٹوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے دو ٹوک لفظوں میں کہا کہ "وہ اب بھی میرے خلاف ہیں اور میں بھی بدستور ان کا مخالف ہوں۔ میں نے چتاونی دی تھی کہ کمیونسٹوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب بھی وقت آئے گا وہ ہمیں دغا دے جائیں گے جیسا کہ سب جانتے ہیں انہوں نے یہی کیا۔"

سنجے گاندھی سے لوگوں کو کتنے ہی اختلاف ہوں لیکن ان کی اس بات پر سبھی جمہوریوں کو خواہ وہ کانگریس آئی میں شامل ہوں خواہ اس کے مخالف، سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ آپس کے اختلافات بجا لیکن اختلافات کی وجہ سے کمیونسٹوں کو کسی قسم کی شہ نہیں ملنی چاہئے۔ افغانستان میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں اس کی وجہ سے کمیونسٹ خطرے سے خبردار رہنا اور بھی ضروری ہے۔ اسٹیٹسمین کی حالیہ اشاعت میں اس کے نامہ نگار ایم۔ ایل۔ کوٹرو کا کابل سے جو مراسلہ شائع ہوا ہے اسے پڑھ کر کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ افغانستان پر اس نے جابرانہ حملہ کیا ہے اسے مقامی افغانوں کی تائید حاصل نہیں۔ روسی وہاں عارضی طور پر نہیں آئے بلکہ مستقل قیام کا ارادہ رکھتے ہیں اس امید پر کہ شاید اس قبضے کے دوران وہ دماغ شوئی کے ذریعہ افغانوں کی ایک نئی نسل تیار کر دیں جو اسلام کی بجائے کمیونزم پر ایمان رکھتی ہو۔ ایسا وہ کر پائیں گے یا نہیں اس کا جواب تو وقت ہی دے گا لیکن روسیوں کے عزائم کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہئے۔

روس کی جارحیت کا دام دور تک پھیلا ہوا ہے جس نے صرف پاکستان اور چین کو ہی نہیں بلکہ جاپان کو بھی مشوش کر دیا ہے۔ سوویٹ خطرے پر اظہار خیال کرتے ہوئے جاپان کی ڈیفنس ایجنسی کے ڈائریکٹر جنرل گنیری یا سنیٹا نے کہا ہے۔

"یہ بات ہمارے نوٹس میں ہے کہ سوویٹ روس مشرق بعید میں اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کر رہا ہے۔ روس کی زمینی افواج میں جتنا اضافہ ہوا ہے اس کا نصف اس خطے میں ہوا ہے

بقیہ صفحہ ۵۰ پر

غزل

کرشن موہن

رازِ دل کھولے سخن سے پہلے
خامشی بولے دہن سے پہلے

رہروِ کوئے تمنا ہر شب
گالیاں کھائے ملن سے پہلے

نورِ احساس کے باعث دھرتی
جگمگائی تھی گگن سے پہلے

اپنے احساس کا رسیا تھا میں
کامنی تیرے بدن سے پہلے

تیری گدرائی ہوئی کایا کو
دِل نے دیکھا تھا نین سے پہلے

شعر کی عظمت و شہرت کے لئے
بانکپن چاہیے فن سے پہلے

لطف آتا ہے اگر گیتوں میں
مستی دل ہو کہن سے پہلے

ہم کہ ہیں کام پجاری ہم نے
تن کو ٹھہرایا ہے من سے پہلے

کرشن موہن تھا شکھی من اپنا
شوق کے باولے پن سے پہلے

بمل کرشن اشک   راہ گیر

وہ سڑک پر تھا جب اس نے اپنے چاروں سمت دیکھا
گڑگڑاتی دو لبسیں رستے سے گزریں
کوئی چلایا "تمہاری ماں کا زندہ باد مارا"
اک بھکاری نے بدن سے مکھیاں جھٹکیں اور اپنے پاؤں پھیلا کر
کہا "بھوکا ہوں بابا"
ایک غازہ سے لدی لڑکی نے چوروں کی طرح سہمی ہوئی
منزل کی جانب پاؤں رکھا
چائے کی دکان پر بیٹھے ہوئے گاہک نے اس کو آنکھ ماری ــــ عادتاً ــــ
اور سورج غیر رسمی طور پر مغرب میں اترا

اس نے پوچھا یہ جو اتنا کچھ ہے آخر اس کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔
ایک اندھے آدمی کو راستے پر ڈال کر اس نے یہ سوچا
کچھ نہ کچھ معنی تو ہیں ــــ پھر خود سے پوچھا
یہ جو اندھا آدمی تھا اس کی خاطر اس کے کچھ معنی اگر تھے بھی تو کیا تھے۔

ساتواں دن

اس نے اپنی پچھلی انگلی کو اٹھایا
لفظ ہونٹوں سے اتارا ــــ کیوں کہ جب تک لفظ تھا ــــ
سوچ میں کچھ حزنیت کچھ خبط گوندھے،
آنکھ کو بینائی بخشی تبغض بخشا،
بازوؤں کو دوستداروں کے گلے کو گھونٹنے کا اور سینے سے
لگا لینے کا دہرا فن سکھایا،
جسم عریاں کو جہاں تخلیق دی، تخریب بھی دی۔

اس نے دیکھا اور اسے معلوم تھا جو کچھ ہے وہ اچھا نہیں بھی ہے اگرچہ خوب بھی ہے،
اور تھکے ماندے سے لہجے میں کہا "سب خوب ہے"
اتنا کہہ کر اس نے کروٹ لی اور ایسے بند کیں آنکھیں کہ جیسے سو رہا ہو

دِل دریا سمندروں ڈُونگے

گوپال متل

اس مرتبہ "ماتنگے کا اجالا" میں انتظار حسین کا مضمون شائع کر رہے ہیں جو سلیم احمد کی کتاب "اقبال ایک شاعر" پر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب میں نے نہیں دیکھی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن انتظار حسین کے تبصرے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اہم کتاب ہوگی۔

تبصرے کے شروع میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

"اقبال کی سیاسی حیثیت کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ اقبال پر سوچنا ایک خطرناک بات ہے کیوں کہ خیال بہرحال ایک آزادی کا طالب ہوتا ہے۔ اس کے وجود کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ وہ پہلے سے کسی نتیجے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ سوچنے کے معنی اختلاف کرنے کی آزادی کے ہیں۔ خواہ انجام کار ہم اختلاف کرنے کی بجائے اتفاق ہی کریں۔ خیال ہمیشہ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے۔ جس کے دونوں رخ آزادانہ طور پر کھلے ہوتے ہیں ہم اس تلوار کو استعمال کرنے کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں نہ ہمت"

سلیم احمد کی کتاب کے بارے میں انتظار حسین کا یہ کہنا کہ وہ اس تلوار کے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بہت اہم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ناقدوں اور شارحین نے اس وقت تک اقبال کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس سے اقبال کی شاعری سے کچھ زیادہ بحث نہیں کی ہے یہ ہے کہ ان کی مفکرانہ اور سیاسی حیثیت بھی کھل کر سامنے نہیں آتی کیونکہ بیشتر حضرات نے اقبال کے پیکر کو اپنی مصلحتوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ میں خود اقبال پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنا رہا ہوں۔ اس مقصد کے لئے میں نے اقبال کے کلام کا بھی مطالعہ کیا اور ان پر لکھی ہوئی بہت سی تصانیف اور مضامین کا بھی۔ جن میں کچھ تصانیف غیر ملکوں کی بھی ہیں۔

میں ان لوگوں میں ہوں جن کے نزدیک تحقیق اور تنقید کا مقصد مدح یا قدح نہیں بلکہ صداقت کی تلاش ہے۔ مطالعے کے دوران بے شمار مسائل سامنے آئے۔ اور ہر بار کسی طے شدہ فیصلے پر پہنچنے میں دشواری پیش آتی آخر پنجابی شاعری کے ایک مصرعے نے جو اس مضمون کا عنوان ہے میری مشکل حل کر دی۔ شاعر جب اپنے تخلیقی عمل میں مصروف ہوتا ہے تو وہ منطقی انضباط سے آزاد رہتا ہے۔ خود اسے پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے دل کے دریا کی کون سی موج تہہ نشیں ابھر آئے گی۔ ایک شاعر کی حیثیت سے اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ نکتہ مجھے کافی اہم معلوم ہوا۔ مثلاً اقبال کے چار مصرعے ہیں:۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

مجھے یہ مصرعے بہت پسند ہیں۔ یہاں اقبال کا رویّہ رسول کے تئیں وہی ہے جو بیٹے کا باپ کے تئیں ہوتا ہے۔ وہ رسول کے حقِ شفاعت سے مستفیض ہونے کی بجائے اللہ سے یہ کہتے ہیں کہ اگر مجھے اپنی کسی غلطی کی پاداش بھگتنی بھی ہے تو اس کی خبر مصطفےٰ کو نہیں ہونی چاہیے۔ یہ مصرعے بے شمار نعتوں پر بھاری ہیں لیکن حیرت ہے کہ اقبال نے انہیں اپنے کسی مطبوعہ مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کیا آخر

لہ دل ایک ایسا دریا ہے جو سمندر سے بھی گہرا ہے

یوں ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب وہ تخلیقی عمل سے آزاد ہوتے
منطق کی گرفت ان پر پھر سے مضبوط ہو گئی۔ اگر ایسا ہے تو
شاعر اقبال کے ساتھ بے انصافی صرف انکے ناقدوں نے نہیں
بلکہ خود اقبال نے بھی کی۔ ظاہر ہے کہ جس شاعر کا یہ
ویہ ہو اس کے لئے محشر میں "دامن یزداں چاک"
کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

اگر ہم اقبال کو شاعر مان لیں تو ان کے کلام
میں جو تضادات نظر آتے ہیں وہ اہم نہیں رہتے کیوں کہ
اس صورت میں ہم انہیں ان کی مختلف کیفیات قلبی کا نتیجہ
قرار دے سکتے ہیں اور شاعر پر کب کون سی قلبی کیفیت طاری
ہو تی ہے یہ تو خود اس کے بس میں بھی نہیں ہوتا۔

اقبال کی شاعری اور ان کی عملی زندگی میں جو تضاد تھا
اس کے بارے میں بھی بہت کچھ پڑھا ہے لیکن یہ تضاد
کہاں نہیں حسان بن ثابت کے اشعار تو مسجد مبارک نبوی
میں منبر رسول پاک سے نشر ہو تے تھے۔ ایک بار انہوں
نے رسول کے سامنے اپنے یہ دو شعر پڑھے۔

لَقَدْ غَدَوْتُ اَمَامَ الْقَوْمِ مُنْتَقِبًا

میں صبح کو اپنی قوم کے روبرو ایک ایسی تلوار پر تلے میں ڈالے نکلا

بِصَارِمٍ مِثْلِ لَوْنِ الْمِلْحِ قَطَّاعِ

جو نمک کے رنگ کی اور بہت تیز تھی۔

تَحْفِزُ عَنِّي نِجَادَ السَّيْفِ بنہ

اس تلوار کے پرتلے کو مجھ سے ایک زرہ نے دور رکھا تھا جو وسیع ہے

فَضْفَاضَةٌ مِثْلُ لَوْنِ النِّهْيِ بِالْقَاعِ

اور ایسی چمکتی ہے جیسے چٹیل میدان میں تالاب کا رنگ نمایاں ہوتا ہے

یہ شعر سن کر رسالت مآب مسکرائے تھے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا وجہ نہیں مسکرائے تھے
کیوں کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے حسان کی بہادری اس واقعہ
سے ظاہر ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی حضرت صفیہ
بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ غزوہ خندق
میں عورتیں اور بچے قلعے کے سب سے اونچے حصے میں بحفاظت رکھے گئے تھے۔ اور خود حسان رضی اللہ عنہ بھی وہاں (بطور محافظ)
موجود تھے۔ اتفاق سے ادھر کوئی یہودی نکل آیا۔ میں نے
اسے دیکھ لیا اور ڈری کہ کہیں یہ شخص یہاں سے واپس جاکر
دشمنوں کو ہماری بے سرو سامانی سے باخبر نہ کر دے۔ اور
ہمیں اچانک کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ جائے یہ سوچ کر
میں نے حسان رض سے کہا "جاؤ اسے جاکر مار ڈالو" حسان رض نے
کہا "دختر عبد المطلب، اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے۔ تم تو
جانتی ہو کہ میں اس کام کا آدمی نہیں ہوں"۔ میں نے یہ جواب
سنا تو خود ایک ڈنڈا لے کر نیچے اتری اور اسے مار گرایا۔
جب اس کام سے نپٹ کر اوپر واپس گئی تو پھر حسان رض
سے کہا: "اچھا تو جاؤ اور اس کے ہتھیار اور کپڑے وغیرہ
اتار لاؤ۔ وہ مرد ہے میں اس کے کپڑے نہیں اتار سکتی"۔
اس کا جواب حسان رض نے دیا کہ "بنت عبد المطلب میں اس کا
سامان لے کر کیا کروں گا"[۳]

اگر حسان کے قول و فعل کے تضاد پر ہم برہم نہیں ہوتے
تو اقبال کے قول و فعل کے تضاد پر برہم کیوں ہوں۔ البتہ
یہ ضرور ہے کہ جب حسان کے قول و فعل کی نشاندہی کی جا سکتی
ہے تو اقبال کے قول و فعل کے تضادات کیوں نہیں ——

ضمناً گزارش ہے کہ اقبال کو موچی دروازے کا شاعر
اولاً فیض نے نہیں کہا تھا۔ یہ سب سے پہلے باری علیگ
نے کہا تھا۔ جو اپنے آپ کو اشتراکی ادیب لکھتے تھے
ان کا پورا نام عبد الباری تھا۔ جب اشتراکی ادیب بنے
تو عبدیت پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا اور وہ صرف باری

---

[۱] دیوان ص ۲۵۷۔ [۲] دیباچہ دیوان حسان مع شرح برقوقی
صفحہ ق، طبع مصر ۱۹۲۹ء،
[۳] دیکھئے تاریخ ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۱۰۸۔ ابن قتیبہ
نے کتاب المعارف (صفحہ ۱۳۷)
طبع مصر) میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت حسان رض مرد میدان
نہ ہونے کے باعث کسی غزوے میں شریک نہ ہو سکے۔ ابن
عبد البر نے الاستیعاب میں ان کی دائمی عدم شجاعت کو
تسلیم نہیں کیا۔ مگر یہ بات مانی کہ سر کی چوٹ کے صدمے
سے جنگ کے قابل نہ رہے تھے۔ اس لئے غزووں میں

چار نثری نظمیں

احتشام اختر

ہدایت

( )

روشنی کی کوئی سرحد نہیں
کوئی مذہب نہیں
ہوا کا کوئی جسم نہیں
کوئی ملک نہیں
پانی کا کوئی رنگ نہیں
روشنی کو کوئی نام نہ دو
ہوا کو کوئی جسم نہ دو
پانی کو رنگین نہ بناؤ
پانی میں لہو نہ ملاؤ

ناکامی

روز شب آتے ہیں
گزر جاتے ہیں
اور میں یوں ہی کھڑا ہوا ہوں
میں ابھی تک
غم کی سڑک پار نہیں کر سکا

آرزو

دشت زندگی میں
کاش کوئی مسافر آئے

مجھے ڈھونڈے
مجھے پالے
میں چشمۂ آب ہوں
میں زیرِ سنگ ہوں

تعاقب

خواہش کے شکاری کتے
میرا پیچھا کر رہے ہیں
میری بوسونگھتے ہوئے
زندگی کی آخری حد تک
آگئے ہیں
اب خوابوں کا گہرا غار بھی
مجھے بچا نہیں سکتا

ٹاہلی ٹپ گیا چنگیاڑا

گوپال مِتّل

پنجابی کے مشہور صوفی شاعر بُلّے شاہ نے کہا ہے:

چل بُلیا چل اوتھے چلیے جتھے رہنوے ساری انھے
ناں کوئی تیری جات پچھانے ناں کوئی تینوں منّے

(بُلّے شاہ چل وہاں جاکر رہیں جہاں سبھی اندھے ہوں نہ کوئی تیری شخصیت جان سکے اور نہ کوئی تجھے مستحق عزّت واحترام سمجھے)

بلّے شاہ ایک ایسے دور میں جی رہے تھے جہاں اہلِ فن کا ظاہر نہیں باطن دیکھا جاتا تھا۔ بلّے شاہ فقیر منش اور صوفی مزاج۔ وہ آسائشِ دنیوی سے ہی بے نیاز نہیں تھے بلکہ نام ونمود سے بھی۔ جس معاشرے میں وہ جی رہے تھے وہاں ایک باکمال کے لیے آسائشِ دنیوی کو خیرباد کہنا تو ممکن تھا لیکن اپنے چہرے پر گردِ ملامت ملنا یا عقیدت او احترام سے بچ نکلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے بُلّے شاہ صرف صوفی ہی نہیں بلکہ صوفیوں کے فرقۂ ملامتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں اپنے چہرے پر گرد ملنا مطلوب تھا اور یہ خواہش اس دور کے معاشرے میں پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ خواہش ان کی ۲۸ مئی ۱۹۰۸ء کو پوری ہوئی جب انہوں نے سابق ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں بھدوڑ میں دیوندر ستیارتھی بن کر جنم لیا۔ ستیارتھی کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ ضرور آیا تھا جب انہوں نے اپنے انجام سے بچ نکلنے کی کوشش کی تھی اور خودکشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن علّامہ اقبالؔ نے انہیں اس سے باز رکھا۔ غالباً وہ بھی چاہتے تھے کہ بُلّے شاہ کی جنم جنانتر کی آرزو اس جنم میں ضرور پوری ہونی چاہیئے۔

آوارگی اور خانہ بدوشی کی زندگی انہوں نے ۱۹۲۷ء میں شروع کی جب وہ کالج سے بھاگ نکلے۔ شانتی نکیتن میں ٹیگور سے ملے تو ٹیگور نے بھانپ لیا کہ اس شخص کو اس کی ڈگر پر چلنے سے باز رکھنا نہ ممکن ہے نہ سُود مند لیکن انہوں نے اس کی آوارگی میں اس مشورے سے ایک معنویت پیدا کر دی کہ وہ لوک گیت جمع کرنے کے لیے ہندوستان بھر کی یاترا کرے۔ زادِ سفر نہ انہوں نے دیا نہ ستیارتھی نے مانگا۔ خالص بھکشو کی طرح ستیارتھی اپنی یاترا پر چل نکلے۔ ان کے حصہ میں صرف گردِ سفر آئی لیکن ہندی اردو پنجابی اور انگریزی چاروں زبانوں کو لوک گیتوں کی ایک ایسی بے بہا دولت ملی کہ اگر دیوندر ستیارتھی اور کچھ بھی نہ کرتے تو بھی یہ ان کی شہرت دوام کے لیے کافی تھا۔

دو سال کی آوارگی کے بعد ایک بار جب وہ گھر پہنچے تو گھر والوں کو گمان گزرا تھا کہ اب اسے ہوش آگیا ہوگا۔ کیوں نہ اس کے پاؤں میں شادی کی بیڑی ڈال دی جائے لیکن ستیارتھی بیڑی کو بھی ساتھ لے بھاگے تاکہ گردِ سفر کا کچھ حصہ اسے بھی مل جائے۔

ستیارتھی کی زندگی میں اور بھی کئی موقعے آئے تھے جو انہیں ایک باقاعدہ اور باضابطہ زندگی پر آمادہ کر سکتے تھے۔ وہ ہندی آجکل، کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پدم شری

کا خطاب بھی ملا۔ لیکن ہر بار۔

ٹاہلی ٹپ گیا چنگیاڑا

یہ مصرعہ بھی ننگے شاہ کا ہے اور اس کا مطلب ہے چنگاری شیشم کے درخت کو پھلانگ گئی۔

بظاہر یہ ایک انہونی بات نظر آتی ہے لیکن اگر ہم جان جائیں کہ چنگاری خود شیشم میں پنہاں تھی تو بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ مطلب صاف ہے۔ جب بھی کوئی مادی آسائش اُن کے راستے میں آئی ستیارتھی کا معنوی وجود اس کے سماجی وجود سے اُوپر اٹھ گیا۔ آخر ننگے شاہ کی جسم جمناسٹری آرزو کو تو پورا ہونا ہی تھا۔

اب ستیارتھی کا بالکل وہی حال ہے جس کی ننگے شاہ نے آرزو کی تھی۔

آوارہ و مجنو نے رُسوا سربازارے

کافی ہاؤس میں جب لوگ اس پر آوازے کستے ہیں اور اس کی تحقیر کرتے ہیں تو برہم ہونے کی بجائے ستیارتھی کے چہرے پر ایک قسم کی آسودگی ہوتی ہے جیسے کسی کو تردان پراپت ہو رہا ہو۔

لوک گیت جمع کرنا اس کا معمولی کارنامہ نہیں تھا لیکن تخلیقی ادب میں بھی اس کا مقام اونچا ہے۔ عالمی ادب کے بارے میں کوئی طے شدہ رائے دینے کا میں اہل نہیں لیکن تھوڑا بہت مطالعہ میں نے ضرور کیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کا بھی تراجم کی شکل میں تھوڑا بہت مطالعہ میں نے کیا ہے۔ جو تھوڑی بہت معلومات مجھے ہیں ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ستیارتھی ایک افسانہ نویس کی حیثیت سے جو مقام رکھتے ہیں وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہو سکتا ہے۔

اردو میں قرۃ العین حیدر کو چھوڑ کر فکشن کے شعبے میں خاص طور پر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بیشتر حصہ فارمولائی ہے۔ نہ اُس میں احساس کی پرتیں ہیں نہ شعور کی زیریں لہریں۔ یہ دونوں چیزیں دیویندر ستیارتھی کی کہانیوں میں بافراط موجود ہیں۔

دیویندر ستیارتھی ادب و آرٹ کا وہ پیکر ہے جس کے قالین میں اَن گنت گرہیں ہیں اور گرہوں کا ان گنت ہونا ہی قالین کی امتیازی وصف۔ ہر گرہ اپنا رنگ اور آہنگ رکھتی ہے۔ ستیارتھی کی ایک کہانی میں بے شمار کہانیاں جلوہ دکھاتی ہیں۔ بادی النظر میں ستیارتھی کا عمل گنجلک نظر آتا ہے۔ لیکن تھوڑا غور سے دیکھنے پر یہ ماڈرن PAINTING کا بے نظیر اور اچھوتا نمونہ دکھائی دے گا۔ ستیارتھی جیسا پیکر تراش ادبی دنیا میں مشکل سے ملے گا۔ شبدوں کا مایا جال انجام کار انتہائی پیچیدہ لیکن دل پذیر عمل میں ڈھل جاتا ہے۔ قاری کے دماغ پر تصویر کے بعد تصویر بنتی جاتی ہے۔ تمام تصویروں کا مجموعی تاثر صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ادب و آرٹ کا کوئی بھی ارفع اور اعلیٰ نمونہ تنقید و توصیف سے ماورا ہوتا ہے۔ یہی حال ستیارتھی کے آرٹ کا ہے۔

ندی ، پُل ، اور ہم

گوپی ناتھ امن کے نام

دیوندر ستیارتھی

:۱:

رچترلوک سے آگے مدھر گیتم ۔ کوئی سپت رشی، کوئی ستیہ کام، کوئی ننکا سندرم جے ہو جے ہو لنکا سندرم کی جے ہو!

کون سا تیوہار آیا ؟ کون اپنا کون پرایا ؟ سنگم سے کون نہا کر آیا ؟ کاشی بائی نے دودھ ناتھ کا منہ چڑھایا۔

کیا ہاتھی، کیا کہانی، دونوں کو چاہیئے مہادت۔ ستوتی سُندری مہوا بھٹیارن منہ پھیر کے بولی "ساتِ سروں کا میل سرگم !"

ہم امرت سنتان ! ستیہ کام کا چترلوک، جیسے کالی داس کا شلوک۔ ندی سب سے مہان !

ستیم، شِوم، سندرم ! ہم کیوں جائیں کہیں اور ؟ ہم تو آئے ہیں کتھا گرام تین ندیوں کا سنگم۔ لوری، چترا اور مِترا تین ندیاں تینوں کا ایک نام لوماتا۔ لوری میّا ! تیرا پانی امرت!

پہلے لوری میں چترا آملتی ہے، پھر مِترا، جو سرسوتی کے سمان دکھائی نہیں دیتی

سنگم سے آگے ندی کا نام لوری۔

دھیرے بہو لوری میّا، دھیرے بہو !

سنگم سے آگے لوری پر لوکاؤں کا پل، جیسے نئی بہو کی آنکھ کا جادو۔

ٹنکر جات لوری میّا : نٹ پُتری ہو، گوجر کنیا یا بجلے کی بٹیا۔ جُلاہے کے گھر میں آکر ٹنکر ہی کہلائے گی۔ جیسے لوری میں مل کر ہر ایک ندی لوری بن جاتی ہے۔

:۲:

رتھ کر گھے پر بنا رشیم نہیں کاکا انوپم۔ کیا پُروا کیا پچھوا۔

پانڈو رنگ کا گھر لال اٹاری۔ گھر کے پاس گڑی ہے نال۔

پانڈو رنگ کی پتنی روپ متی پر لوک سدھاری۔ جاتے جاتے پانڈو رنگ کے ہاتھ میں کلیانی کو سونپ گئی اور ننھے منے پیتامبر کو نئی ماں مل گئی۔

سنگیت کار دودھ ناتھ کاشی بائی کا رسیا۔ لیکن وہ اسے منہ نہ لگاتی۔

ہم پنچھی اِک ڈال کے، جیسے دِن اک سال کے ! چلا گیا ہے یہی راستہ لوک یان تک ؛

بنجارا پربت پر جگ مایا کے کلا منڈپ میں، کاشی بائی کا بھرت ناٹیم دیکھتے دیکھتے ۔ کلا پریمی پراچین کال سے ورتمان میں پلٹ آتے۔

انتر من نے اونچی چٹان کو کاٹ کر کاشی بائی کو مُدراؤں میں دکھایا۔ جے ہو، جے ہو، کاشی بائی کی جے ہو !

:۳:

ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا۔ اس کا بیٹا لوک پال لنکا ہو آیا۔ اسے ہمیشہ نئی کہانی کی لوٹ رہتی۔

پتن تانترک کا وہی سوال :

"لوک پال لنکا میں ہے یا کتھا گرام میں ؟"

یہ سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے۔ باتیں چرچی گرم کھلائے۔ کیسا جادو، کیسا ٹونا ! کیسا ہنسنا، کیسا رونا !

:۴:

گھنگھرو بجاتی آئی بہروانی۔ پیچھے پیچھے کلیانی، گے آگے کاشی بائی۔ روز سونے کی طرح ہم کو نہ پرکھا بلائے:

جوگ مایا کا ہاتھی۔ رام دھن۔ نہادت لنکا سندرم جوگ مایا کے پجاری شنکر شمبھو کی بیٹیا شوانی اور پانڈورنگ کا بیٹا پیتامبر، ہنستے ہنستے، رام دھن کی سونڈ پر جا بیٹھتے سونڈ اوپر، اٹھ جاتی۔ دونوں بالک ہاتھی کے سر سے ہوکر لنکا سندرم کی گود میں جا پڑتے۔ اور اس کے ساتھ آواز ملا کر گاتے۔

شِو مندر میں دیوتا جاگے
بھوت لنگوٹی چھوڑ کے بھاگے
بھوتوں میں کچھ بھوت کے بچے
کوئی پیچھے کوئی آگے

:۵:

پانڈورنگ کا بُنا ریشم لنکا تک جا پہنچا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ لنکا میں سب باون گز کے! لنکا کا سنگیت کون سنائے؟

"سانجھ بھئی پنچھی گھر آئے!" پانڈورنگ گنگنایا۔
کر گھے پر ٹھک ٹھک۔

دروازے پر دستک
"کون؟"
"مہمان"
"دھنیہ بھاگ!"
مہمان خوش! بھگوان خوش!

پانڈورنگ نے مہمان کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اوڑھنے کو دوشالہ، سرہانے تکیہ
"چھوٹے بچے بھی بڑے سپنے دیکھتے ہیں!"
مہمان کا اشارہ پیتامبر کی طرف۔
"آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا!" گاتے گاتے
روپ متی اور ا[illegible] سو گئی۔ اسو[illegible] پانڈورنگ

بیٹا۔ بڑھاپے کی لاٹھی۔ اس کا نام نیلامبر بھی سوچا، دگمبر بھی۔ روپ متی کی پسند پیتامبر۔
وہ مان پر گیا۔
آنکھیں بڑی بڑی، چہرہ لمبوترا، ناک ستواں بال گھنگھرالے۔

تیرے ہی بچے، تیرے ہی بالے
دھرتی ماں! چھاتی سے لگا لے

:۶:

راجا کی کہانی مہمان کی پانڈولپی میں سما گئی۔
راجا اندھا تھا۔
نگر میں منادی کرائی:
"جو بھی راجا کی نین جیوتی لوٹائے، راج سنگھاسن پائے!"
الکھ دھاری اگھوری نے یہ چمتکار کر دکھایا
اس خوشی میں ہزار کبوتر اڑائے اور ایک توتا۔
لیکن سنگھاسن پر بیٹھتے ہی اس کی اپنی آنکھیں جاتی رہیں۔

اندھیر نگری اندھیر راجا!

ٹکے سیر بھاجی، ٹکے سیر کھاجا!
راجا کی مسکان، شبھ گھڑی۔
مونچھ داڑھی سے بڑی .. .. ..
ایک سو ایک رانی۔ انامکا پٹ رانی، جس نے بنجارا پربت پر جوگ مایا کا مندر بنوایا۔
رانی کی کہانی، جیسے دور سے آتی مندر کی گھنٹیوں کی آواز۔

آگے پیچھے لوک یان، اپنا اپنا دیپ دان!
ٹھمری، پٹہ، دادرا، گائے امرت ستھان!
پیچھے مڑ کے دیکھو گے تو پتھر کے ہو جاؤ گے۔ یہ تو مہمان کے دیش میں بھی کہتے ہوں گے۔
جوہا پستک کی بھومکا کتر گیا!

:۷:

مہوا بھٹیارن سے سنو اجات شترو کی گاتھا۔
چترگپت کا پوتا، چکرورتی کا بیٹا ۔ اجات شترو۔
بانس کے گھنے جنگل میں رہتا تھا رات بھر گیتا پڑھتے رہنا، اس کا کام۔

ایک دن چوہا گیتا کو کتر گیا
چوہوں سے رکشا کے لیے بلی پالی
بلی کے لیے دودھ کہاں سے آئے؟ ایک گائے رکھ لی۔

گائے کی رکھوالی کون کرے؟ گھر میں ایک لگائی آ گئی۔ اس نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔
ایک دن ترہ دلتا اور جگنی کی انگلی پکڑے جوگ مایا کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا

کسی نے پوچھا۔ "بابا! یہ کیسا روپ؟"
بابا نے کہا "بیٹا! گیتا پھیل گئی!"

آگے چل کر وہ مورتی کار بنا۔ انترمن نے بابا سے مورتی کلا سیکھی۔
اس کی موت کے بعد انترمن نے ترہ دلتا اور جگنی کو اپنی بیٹوں سے بڑھ کر مانا۔ اور ان کے بیاہ پر پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ کاکا انوپم کے بیٹے۔ آنند اور نارائن۔ ایک کا بیاہ ترہ دلتا سے ہوا۔ دوسرے کا جگنی سے۔
ماتھے پر جھومر، پیروں میں گھنگھرو۔ ایک گڑیا ریشم کی، دوسری چندن کی۔ گڑیا کا بیاہ رچاتے رچاتے، ترہ دلتا اور جگنی بیاہنے لائق ہو گئیں۔
کیا کھویا کیا پایا؟ دیپ سے دیپ جلایا۔ چلو رے ڈولی اٹھاؤ کہار، پیا ملن کی رت آئی۔

تین چپاتی، چار براتی
گڑیا دودھ ملائی کھاتے
چھوڑ کے بابل کا گلیارا
ساجن کے گھر جاتی

:۸:

ناری او ناری، ہم تیرے پجاری
ناٹک آرمبھ ہونے سے پہلے ایک سو ایک کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ کتھا گرام پر ہم نہادت جے ہو جے ہو کتھا گرام کی جے ہو! ہم بلہاری! اب ہماری باری واہ رے الکھ دھاری!
ناٹک کا منگلاچرن آگے آیا۔ رنگ منچ کا روپ سوایا۔

آ رے سونے تیری باری
کان چھوڑ کنپٹی ماری
من کی جیت، جگت کی جیت
من ہارا تو دنیا ہاری

:۹:

مہوا بھٹیارن کی یہی کامنا کہ یہاں کی پانڈولپی میں کتھا گرام جاگے۔ جیسے دلہن کی نتھ کا موتی۔
آگ سے نکلے دھواں، پتھر سے آگ۔ ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا۔ اس کا یہی راگ۔ بندھ گیا سو موتی!

بول ری کٹھ پتلی ڈوری! تو کیوں روتی؟
ایک توے کی روٹی، کیا چھوٹی کیا موٹی
ہاتھی سے کیا دوستی، جب چوکھٹ چھوٹی
آیا ماما کٹھ پتلی والا پہنے اک تلسی کی مالا
چھوڑ کے جے، بجے دھنی گائے راگ جھنجھوٹی

"پھر سے اجنبی بننے کی بات پر کون کان دھرے؟ یہیں ہماری نال گڑی، ہے،" لوک پال کی تان یہیں ٹوٹی۔

ہاتھوں سے گرا پھول تو آنکھوں سے اٹھایا
کس راگ کا ٹکڑا ہے یہ پہلے سے سوایا
کیا نام ہے گڑیا کا، کوئی ہم سے تو پوچھے۔
کس راگ کا تھا بول، یہ کس راگ میں گایا

:۱۰:

سندھیا آئی چلی پروائی

دور دیش کے سپنے لائی
کاکا الو تم سے کہو، ذرا سنبھال کر گھونٹا اتارے
کہیں ناؤ کو نہ لے ڈوبے۔
ہم امرت سنتان! واہ رے من مانجھی!
لوک یان کی یہی پکار، کتھا گرام کی گاتھا ابھی اور آگے
جائے گی
سنار نے جتنی دیر میں دلہن کی نتھ بنائی، لوہار نے
اتنی دیر میں چار بیلوں کے پھال بنا ڈالے
مہتوا بھٹیارن کا وہی بول "سو سنار کی ایک لوہار
کی!"
گرو کا آشیرواد پنچم ٹھیک لگایا
کومل نشاد من بھایا۔
رام قسم کوئی برا نہ مانے!
واہ رے دودھ ناتھ!
سمے بتلائے گا کہ کوئی بھی کہانی کتھا گھاٹ پر آسکتی
ہے۔
تھر تھر کانپے جیرا ہمارا!

:۱۱:

میگھا چھائے آدھی رات۔ راگ ملہار
لوک یان کی پگڑی کتھا گھاٹ کے سر پر، چتر لوک
کے جوتے بارہ پتھر کے پیروں میں۔ اس اوول بدل کو
کون سراہے؟
رام دھن کی جھنکار اندھیرے کو چیر گئی۔
"گھوڑے کی لگام کس نے تھامی؟" اپنے سوال کا
جواب نہ پاکر لوک پال اداس ہو جاتا۔
"دودھ ناتھ اور کاشی بائی کا جوڑا ٹھیک رہے گا؛"
مہمان نے کہا۔
"پیٹ بھی ایک چیز ہے۔ مگر پیٹ ہی ایک چیز نہیں
ہے۔" ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا بولا
پیٹ کی آگ سے ناؤ چلے۔ ممتا سے گھر پھولے
پھلے۔
[illegible]

کیا دلیل، کیسی تکرار!
یہ سچ ہے تو پھر جھوٹ کیا ہے؟
خالی جیب، پیسہ نہ دھیلا
تین گرد، ایک چیلا
آدمی اکیلا
اب گلہری رنگ لائی
گھنگھرو کی جھنکار، اپنا جادو ساتھ لائی
دس دن کی باڑھ کے بعد پانی اتر گیا۔ جیسے موتی
کی آب اتر گئی۔
جگت سیٹھ کا دِوالا نکل گیا
تم وہاں، ہم یہاں۔ چیل کے گھونسلے میں ماس
کہاں؟ محاورہ بدل گیا
کینچلی چھوڑ کے سانپ نکل گیا۔

:۱۲:

"مشعلوں کے جلوس میں چلنے والوں کے ہاتھ رہا
الکھ دھاری نے کٹوا ڈالے!" ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا بولا
ارمانوں کی محفل کون سجائے؟
سہایان کا بھلا ہین یان۔ کہاں سے آیا، کدھر
جائے؟
جگنی نٹ کھٹ اور چنچل ترولتا ہنسی کی پھلجھڑی۔ کیتکی
کا جادو مہمان کے سر چڑھ کے بولا۔
تین تانترک کی پتنی کیتکی۔ پتنی، چوتھے بیاہ کی۔
پوتھی ہو گئی پانی پانی۔ پڑھنے میں چتر کلیانی
ہم امرت سنتان!
"ہرجائی درباریوں سے تو چورا چکے بھلے، جو انت
تک اپنے ساتھی کے ساتھ چلے!" مہوا بھٹیارن گنگناتی
رہی!
ہنستے ہنستے ہی گھر بستے، بول اٹھا کٹھ پتلی والا
کیا ادھاری مینا مر گئی، سب کچھ دیکھا بھالا
ماں تھی چیل باپ تھا کاگا، نکال کوٹھری بولی
[illegible]

۱۳:

کاگا بولا " اٹھ چڑیا، کھچڑی پکا!"

چڑیا بولی "کاگا رے کاگا! ابھی اڑجا۔ جا دال دل کا دانہ لا۔"

"ماں تو ایک ایک سوئی جوڑے۔ نٹ کھٹ بیٹا ایک نہ چھوڑے!" لوک پال مسکرایا۔

سپت رشی کا بسایا کتھا گرام۔ جے ہو۔ جے ہو۔
سپت رشی کی جے ہو!

"ہم ڈھول کی طرح کام کریں گے۔" لوک پال نے کہا۔

"تو ہم اسے پیا کریں گے۔" دودھ ناتھ بولا
آنکھ لجائی، دھی پرائی، ہوا بھٹیارن سوئی
ریشم کی ایک گڑیا "کوئی"، دوسری "اکوئی"
جتنی دیر میں ٹھٹھیرے نے ایک کٹوری بنائی،
اتنی دیر میں کمہار نے تین گھڑے اتارے

"سپت رشی کا نیا جنم کب ہوگا؟" پانڈو رنگ کا وہی سوال۔ وہ اپنے ریشم کی تعریف کے پل کبھی نہ باندھتا۔ بس یہی گنگناتا رہتا۔

سنگیت لوک پال سے، ایسا گیا کہ بس
گندھاریوں رکھب میں لگایا گیا کہ بس
ان گنت گاؤں لودی کی باڑھ میں بہہ گئے پچھلے سال
پھر بھی لودی میّا کا گن گان۔
آہٹ پر کان، گلے گلے پانی
آنسو ایک، کلیجہ دو ٹوک
یہ کیسی نادانی!
آیا لوک پال، بھاگا شیطان۔ ابھی کل کی بات ہے
ہم غوطہ لگا کر ابھرے۔
اپنا سا حال ہم دوسرے کا بھی جانتے ہیں۔
ہے بھگوان! کس کی یہ آواز کان پڑی؟
اجڑا جو یہ نگر تو بسایا نہ جائے گا!
گاؤں کے رہنے والے یہاں کون لائے گا؟

۱۴:

سے دھونا!
اپنا اپنا اگیات داس
سور پنکھ کون چرائے؟ مور چھل کون ڈلائے؟
"ہم ایک ہیں!" کاکا مہار تھی کی پکار۔ "آؤ آؤ، نر ناری! دیکھو ایکتا کی چترکاری"
ہم ایک ہوتے تو نمائش کیوں ہوتی؟
یہ گاتھا بھی رہی ادھوری۔ کون مٹائے پاس کی دوری؟

اب کہاں راجا کا راج، جب گابھن گابھ ڈالتی اور راجا کے کان پر جوں نہ رینگتی۔

کیا بولی راجا کی دائی؟ چور چور موسیرے بھائی!
ہم ایسی اسامی نہیں کہ مور کے ہتیارے کے دم میں آجائیں!

چار مینڈک ایک ساتھ ٹرّائے۔ جیسے چار وید پاٹھی پاٹھ کرتے کرتے آئے۔
جو بھی کام کا نکلا، اسے سدا اپنایا۔
وہی کیا جو اپنے آپ ہمارے جی میں آیا۔

بھلا ہم کتھا گرام کو چھوڑ کر کہاں جانے لگے؟ ہم تو اسے ہی اپنا سارناتھ مانتے ہیں۔ کتھا گرام کی مٹی نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ آدمی وہی جو اپنے سر پر لے سنکٹ پرایا۔

سپت رشی نے کہا تھا "ادھ جل گگری چھلکت جائے"
انہوں نے تو یہ بھی کہا تھا کہ آدھے اساڑھ بیری کے بھی برسے! لیکن لوک پال سپت رشی پر ہنستا رہتا۔ بھوا بھٹیارن کا وہی بول:

بول میرے گڈّے، گڑیا قبول؟
چھما کرو جنم جنم کی بھول!

کبھی ہرن دیکھے جنگل میں چوکڑیاں بھرتے، کبھی اکیلا مور! لہرائی ریشم کی ڈور۔

جاؤ سب اپنا اپنا رستہ لو!
کوئی شبد سسکی میں ڈوبا اور کوئی انگڑائی میں۔
بانسری کون بجائے؟
ہم چپ چاپ سرنگ سے ہو کر آئے۔

نہیں ہوتا۔

"ناٹک کا کتھانک" لوک پال کی نئی کہانی۔ سچ جھوٹ کے بیچ ڈوبی دیوانی۔

رام دھن — جوگ مایا کا ہاتھی۔ کبھی چنگھاڑ بھی چپ۔ لنکا سندرم کے ہاتھ میں آنکھیں۔

"اپنے ڈھائی چاول الگ نہ پکاؤ!" سپت رشی کا دل لنکا سندرم دہراتا رہتا۔

"چور پر مور!" دودھ ناتھ کا بول کاشی بائی کا ن ڈانوا ڈول۔

"مور بھی تو سانپ کا ہتھیارا ہوتا ہے۔" کھڑکی سے جھانک کر پانڈو رنگ نے کہا۔

ہر کسی کا یہی بول "یہ میرا ہزارواں جنم!"

:۱۵:

ہتھیارے نے مور کے سر سے بوجھ اتارا!
لوک پال کا یہی بول — کون جیتا کون ہارا؟
ماماڈم ڈم کٹھ پتلی والا بولا" رونے کی آواز ہنسنے کی آواز سے ٹکرائی۔

گھر آنگن کی سیج دھیج کس کام آئی؟
گائے نے بوجھ ہلائی
رائی کا پربت، پربت کی رائی!

چلا گیا ہے یہی راستہ دائیں کنواں، بائیں کھائی
دودھ ناتھ نے ٹھمری گائی۔

دودھ ناتھ جیسا سنگیت کار چراغ لے کر ڈھونڈو تو نہیں ملے گا۔ وہ تو کوئی گندھرب ہے، جو دیولوک سے دھرتی پر اتر آیا۔

ماماڈم ڈم کٹھ پتلی والا اپنے کھیل میں کمہار کے گدھے کو بھی لے آیا اور راجا کے مسخرے کو بھی۔

کمہار کا گدھا آدھی رات کے سناٹے میں رینکتا اور مسخرے کی نیند حرام۔ ایک روز اس نے کہا "ہے بھگوان کمہار کا گدھا مر جائے!"

سورج آگنے پر آنکھ کھلی تو دیکھا، کمہار کا گدھا تو سلامت ہے۔ اس کا اپنا ہاتھی دم توڑ گیا۔ بلک بلک کر بولا "ہے بھگوان! تم کتنے مورکھ! گدھے اور ہاتھی کی پہچان بھی بھول گئے!"

دودھ ناتھ کا راگ بہاگ؛
بے دردی تو ہے درد نہ آوے
نارائن محبوب سانورے
گھائل کر، پھر راہ دکھاوے!

:۱۶:

پہاڑی پیپل کی سرنگ سے ہو کر جوگ مایا پہنچنے میں کچھ کم دیر نہ لگتی۔ اونچی سیڑھیاں چڑھنی پڑتیں۔

دوسرا راستہ، جو مچھلی کمان سے سیدھا بانس کے گھنے جنگل میں ہو کر شیش محل جاتا، پہلے راستے سے دگنا

جوگ مایا کے پچھواڑے سے شیش محل تک جاتی پتلی سی پگڈنڈی۔

ہم بھلے، جوگ مایا بھلی
ریشم سے اچھا ریشم بننے والا۔ اسے کیا کہو گے، جس کے دماغ پر تالا؟

شیش محل کے پاس بنا چھت کی بارہ دری مہمان کے من بھائی۔

آبادی سے دور۔ آتی بھلی نہ جاتی۔ شیش محل کی قسمیں کھاتی۔ پہلے ہی شیش محل کا ——— رنگ روپ لے دے کر ایک کھنڈر سے بڑھ کر نہ تھا۔

سامنے پڑی چیز دکھائی نہ دیتی۔ سارا گھر چھان مارتی کلیانی کی یہی بات۔

آنسوؤں کے سمندر میں تیرتے ٹاپو جانے کتنی بار ایک دوسرے کو چھو جاتے، پھر الگ ہو جاتے۔

:۱۷:

دودھ ناتھ سے پوچھو۔ آگے جو قدم اٹھتا ہے وہ پیچھے کیوں پڑتا ہے؟

آگے بھرت نائیم، پیچھے سنگیت۔ دائیں بائیں لوک یان۔ ہمارے ساتھ ہنستا گاتا دیپ دان۔

بانسری پر راگ مال کوس۔ پانچ سروں کا راگ

ڈولی میں دو کہار، پالکی میں چار۔ ڈولی کی یہی بات۔ اگلا کہار پچھلے کہار کو ساودھان کرتا رہتا۔ دائیں کنواں، بائیں کھائی۔ ساودھان! ہوشیار! دائیں گھوڑا، بائیں ہاتھی!

مہمان کے ساتھ کیتکی بھی ڈولی میں بیٹھ کر برات میں ہو آئی۔ اس کا پتی پتن تانترک اسے روک نہ پایا

"بھوتوں کا جلوس"، لوک پال کی نئی کہانی۔ کاشی بائی کا ایک نام دیو یانی۔ اس کی چنری دھانی۔

"جب تک ایسا پانی نہ برسے کہ اوپر نیچے کی مٹی ایک ہو جائے، دھان کیسے بوئے جائیں؟" ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا بولا

کاشی بائی کی ڈولی آئی۔ رک جاؤ، ڈولی والو، رک جاؤ۔

پہاڑی پیپل کی سرنگ سے مہمان کا ہے ہر روز آنے جانے۔

آنا نہ پائی، مفت کی پاؤں گھسائی
اتر گئی سب اترن پترن۔ کل کی بات کل کے ساتھ۔ اپنا ہاتھ جگن ناتھ۔

کاشی بائی نے مہمان سے کہا "اب ہم اجنبی تو نہیں"
آئینہ آگے سے نہیں ہٹتا،
صاف کہہ دو ابھی سویرا ہے!

دودھ اتھ کے کان کاشی بائی کی "ہاں" سننے کو ترس گئے۔

:۱۸:

"ہے کوئی بھگوان کا پیارا، پیٹ کی آگ بجھائے؟" بھکارن کی پکار۔

ڈیڑھ اینٹ کا مندر بنانے کی بات مہمان کے گلے نہ اتری۔ ڈھائی چاول کی کھچڑی کی اور بات۔

آنتیں کب تک کوستی رہیں گی؟

"اپنا جنم جنم کا ناتا۔" کیتکی مہمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی رہی۔

مٹھوا بھٹیارن لوک پال پر برس پڑی "موئے! تو ٹاٹ کا کفن بھی نہ پائے!"

تیس تانترک کا نشا لوک پال:
پال پہلے سے آ کے بیٹھا ہے
جیسے دھونی رما کے بیٹھا ہے
اِک کہانی سنانے آیا ہے
اِک کہانی سنا کے بیٹھا ہے

لنکا سندرم کا وہی مذاق "گدھا مرا کمہار کا دھوبن ستی ہوئے!"

چار دن کی برکھا کے بعد لوری میّا کا پاٹ کہاں سے کہاں آ پہنچا۔ مچھلی کمان اور کام روپ میں پانی بھر گیا

اکڑوں بیٹھا مہمان، انتر من کی مورتیاں دیکھتے دیکھتے، جانے کس وچار میں ڈوبا رہا۔

پانڈو رنگ کی یہی بات کہ چور سیڑھی لگا کر گھر میں آئے اور سارا ریشم اٹھا کر لے گئے۔ اتنی عمر ہونے کو آئی۔ ایسی چوری پانڈو رنگ نے پہلی بار دیکھی۔

"ہے بھگوان! ہونٹ بہت سوکھ رہے ہیں تھوڑی سی ملائی کھلا دے!" بھکاری نے آواز لگائی۔

آندھی کے تھپیڑے سے اڑ کر چار چھپر پہاڑی پیپل کے پاس جا پڑے۔

لوک پال بولا "بلک بلک کر رونے والے کو سبھا میں لاؤ گے تو سبھا پر سوگ چھا جائے گا۔"

:۱۹:

ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا یہ اپدیش دینا نہ بھولتا کہ جب تک گھر سے دکان اور دکان سے گھر آتے جاتے رہو گے، تم آدمی نہ بن سکو گے۔

ایک چٹان کو کاٹ کر انتر من نے سپت رشی کو دھیان مدرا میں دکھایا۔ انتر من کی کلا کا چمتکار

سب کا یہی دعویٰ کہ سپنے میں سپت رشی کے درشن ہوئے۔

آدمی یاترا اور شیہ کرے اور کسی کو سہہ یاتری بنانے میں بھی ڈھیل نہ کرے۔

"دیکھنا تو یہ ہے کہ ہم اتیت میں جی رہے ہیں یا

درستان میں ؟" مہمان بولا

۲۰

پانڈورنگ ریشم بنتے بنتے کلیانی کی طرف دیکھ کر گنگناتا رہا۔

منہ پر منہ رکھ کے کہا، آئینہ دیکھ
بولی پھر رک کے ذرا، آئینہ دیکھ
اپنی ڈفلی ہو تو راگ اپنا ہو
راگ یہ خوب بجا۔ آئینہ دیکھ

:۲۱:

تتلی کے پنکھوں پر جس نے رنگ لگائے، اسی نے پرندے، حیوان اور انسان بنائے۔

انسان نے بنائے کتنے دیش
دور کا مہمان کیتکی سے اپنا ہی پتہ پوچھتا رہا۔
کہیں پربت، کہیں کھائیاں۔ گھنگھرو، ڈفلی، شہنائیاں، گھر گھر ملیں بدھائیاں
اپنے گھر میں کوئی جاگا۔ بھوت لنگوٹی چھوڑ کے بھاگا۔

"کبھی ہم بھی پالکی میں بیٹھتے تھے۔" چلتے چلتے ٹھٹھک گیا مہمان۔

"اپنے پاس بس تین روٹیاں"، لوک پال مسکرایا
مہوا بھٹیارن گنگناتی رہی۔
کچھ مہکتے سے گیت اور بھی ہیں۔
ماما ڈم ڈم کے میت اور بھی ہیں

:۲۲:

جو بھی جلوا جائے، دھیروں موتی لائے
راجا کے محل میں موتیوں کا کیا کال؟
ریشم بنتے بنتے پانڈورنگ گنگناتا رہا۔
سورج دوار کون اب کھولے
دودھ میں مدھو کون گھولے
بہت دنوں کی بات جادو ٹونا
انتر من کی بات کون ٹٹولے
سات جنم کر گجھے کی ٹھک ٹھک۔ یہ تو مہمان کے دیش میں بھی کہتے ہوں گے۔

موتی رے موتی تیری آب کیسی
پریمی کے نینوں میں آنسو جیسی
سپت رشی کا سپنا کون دکھائے؟ وہی سلائے، وہی جگائے۔

چاند آدھی رات کا!
کانہ مہارتھی کا بھاشن۔ مور کی ہتیا کی بات آج پھر دہرائی۔ رام دہائی
پریم رُت کیا بولی؟ آدھی باسی روٹی، دودھ میں ڈبولی۔

کیتکی نے موتی پرو دئے
ناؤ بیچ منجدھار۔ کتھا گھاٹ کی اد بات۔
ہاتھ باندھے کھڑا رہا دودھ ناتھ۔ کاشی بائی نے آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔

"اتنا مت چھیڑو، نہ اتنا گدگداؤ" بس مسکرادی کیتکی مہمان کا ہاتھ جھٹک کے بولی
لوک پال کے دل میں کیا ہے؟
اک سناٹا، کھسیانی مسکان
لنکا کی پہچان۔ دیپ دان
گونج اٹھی کلکاری۔ ہم تو اپنے ہی آبھاری۔
اب اور کتنا انتظار؟
کاشی بائی پر دودھ ناتھ کی آنکھ
"سال کا پہلا دن" لوک پال کی نئی کہانی۔ کہاں کھو گئی دیوانی؟
کٹھ پتلی کا کھیل، سات سروں کا میل۔
پر تمہا کس کی بنے رکھیل؟
گم سم اپنی طلسم تشیل۔

:۲۳:

چلو سنگم چلتے ہیں۔ کاکا انو ہم مل گئے تو ناؤ میں جل وہار کریں گے۔ یہ مہمان نے کیتکی سے کہا۔
اس کا ہاتھ کیتکی کی کمر میں
آنکھ میں اک آنسو آیا۔ کس کا سندیسہ لایا!

جوگ مایا کے مور کو ہتیارے نے کیوں مار ڈالا؟
لہو کے چھینٹے کہاں کہاں تک پہنچے؟
پانڈورنگ ریشم بنتے بنتے گنگناتا رہا۔
پانی بہت ندی میں تھا، کیا کہتے تلسی داس
ڈوب مرے وہ لوگ، چھوڑ کے ساری آس
ہاتھی بھی کھانے کو مانگے، جب تک جان میں جان
بھوکے گھوڑے کو چاہیئے، کچھ دانہ کچھ گھاس
:۲۴

ندی میں دیپ دان
سرکنڈے کی ننھی ناؤ پر اندھیرے میں جلتا دیپ۔
گلی گلی کی سکھیاں۔ سب کے اپنے اپنے دیپ۔
سب کا یہی وشواش کہ موت کے بعد بھی دیپ آگے
آئیں گے اور اندھیرا چھنٹ جائے گا۔
دیئے کی روشنی پرلوک تک دکھائی دیتی ہے
چمک اس کی بجلی پرلوک تک دکھلائی دیتی ہے
:۲۵

آپ ہی نرتکی، آپ ہی ناٹک کار، ماما ڈم ڈم
کٹھ پتلی والا
راجا کا دربار
ستار پر راگ دیو گندھار
راجا نے سنگیت کار کو انعام دیا
گھر جا کر دیکھا تو وہ شالہ بیچ سے پھٹا ہوا نکلا
پتنی بولی " یہ تو ایسے ہے، جیسے کچھ لکھا ہوا ہو۔
پڑھ کر تو بتاؤ۔ "
" ہری اوم " سنگیت کار بولا
" ہری اوم سے آگے تت ست کہاں ہے؟"
" اری بھاگوان! یہ دوشالہ تت ست سے پہلے
کا ہے "
:۲۶

لے سکو تو اپنے آپ کو آڑے ہاتھوں لو۔ ہم تو سیدھے
سادھے آدمی ہیں۔ رستے کے اینچ پینچ ہم کیا جانیں۔
۔ زمانے کے ہیر پھیر سے بھگوان بچائے۔
اینڑے بینڑے پہیلیاں

ہم امرت سنتان
ایک آدمی کتنے نام گنا سکتا ہے؟
ایک راگ میں کتنے شبد سما سکتا ہے؟
سنتوش۔ ہمارا ہر بت کی پہچان۔
سرنگ کے آر پار جھانکتا اجالا۔ لوک یان
"اب تو موہن جودڑو بھی آ گیا کٹھ پتلی کے کھیل میں"
ماما ڈم ڈم بولا
:۲۷

جھومتا آتا ہے ہاتھی گلی میں۔
ہاتھی کا نام ۔ رام دھن
مہاوت لنکا سندرم۔
آدمی ہر حال میں خوش! یہ تو مہان کے دیش
میں بھی کہتے ہوں گے۔
مورتی کار اور چتر کار سر جوڑے کیا سوچتے رہے!
سپنے کا مطلب کون بتائے؟
ہتیارے نے مور کی ہتیا کر ڈالی ۔ مور پنکھ
کی خاطر۔
جوگ مایا کی سیڑھیاں۔ آدھی اوپر، آدھی نیچے
اوپر سے آتا مہان کیتکی سے آ ملا
کھڑے کھڑے اس کے کان میں کیا کچھ کہہ ڈالا
اچھا سے آگے کامنا۔ کچھ دیکھا، کچھ سمجھے۔ چپ
چاپ سی سادھنا۔
ایک چٹان جیسے چیتا مہر کی انگلی تھامے کھڑی
کلیانی۔
دوسری چٹان جیسے کیتکی کے کان میں کچھ کہتا سا
مہان۔
تیسری چٹان، جیسے کاشی بائی کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈالے کھڑا دودھ ناتھ۔
چوتھی چٹان پر انتر من کی کلا کا چمتکار ۔ کاشی
بائی کی پرنام ملہار
:۲۸

اب تو کبوتروں کے شوق میں کتھا گرام کی
آنکھیں آسمان سے لگی رہتی ہیں۔
چپکے سے پاؤں دھرتا کون آیا!

پیار کے دن آئے۔
پانی میں کون آگ لگائے؟
گاتھا کی کیا سیما ریکھا
گھنگھرو کی جھنکار — لوک پان کے آر پار۔
یہ کہنا تو ٹھیک نہ ہوگا کہ لنکا یاترا میں لوک
پال کا دماغ چل گیا۔
کتھا گرام والو، سنو۔ آج پھر آئے گا ماما ڈم
ڈم کٹھ پتلی والا
درشکوں کے بیچ اس کا بیٹا لوک پال
ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی رہی کاشی
بائی کتھا گھاٹ پر پاس سے گذرا دودھ ناتھ۔ کاشی
بائی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔
ادھ کھلا کمل کھل جائے گا۔ اس دن کی راہ
دیکھو، دودھ ناتھ!
پانڈورنگ پر کلیانی کا جادو۔ لیکن روپ متی کی
یاد اداس کر جاتی
اٹھ گئے سنسار سے اپنے چاہنے والے
جو پرندے آواز پر لگے ہوتے ہیں، وہ آواز
سنتے ہی آجاتے ہیں۔

:۲۹:

شبد کوش میں شبدوں کی بھاونا بھی رہتی ہے۔
میگھ دوت، پڑھو، میگھ دوت
وہی پرانا کتھا گرام، وہی پرانے رستے۔
تیوہار مناؤ۔ بانسری بجاؤ۔ پرنام مدرا پر پھول
چڑھاؤ۔

دودھ ناتھ کا آلاپ گونجتا رہا — مورے مندر اب
لوں نہیں آئے!
لوگ پھر آگے بڑھیں گے۔
سوکھا چرمر ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا
ٹھونٹھ پر بیٹھا پرندہ ڈرتا رہا
سانس کی یہ دھونکنی چلتی رہی
لوکاؤں کے پل پر دھیرے دھیرے، سندھیا کی
جھنکار ڈھلتی رہی!

ریشم بنتے بنتے پانڈورنگ گنگناتا رہا!
کتھا سونے کی لنکا کی، اسی کا نیڈ میں لوٹی ہے

ہے جتنی پریم کی گاتھا، اسی پیالی میں گھولی ہے

:۳۰:

کیتکی نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ
لیا۔
تر دلتا کیا بولی؟ من کی کھڑکی کھولی۔
مہوا بھٹیارن، سوہن سندری، گاتے گاتے آئی
بدھائی ہو، بدھائی ہو، بدھائی!
آگے پیچھے بیچ پات کے سات پیڑ، بچپن کے دوستوں
کی طرح آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔
مہمان نے اپنے دیش کی گاتھا سنائی کہ ایک بوڑھا
مسافر سو رہا تھا۔ دو چیونٹیاں اس کے سر پر جا پہنچیں۔
ایک نے دوسری چیونٹی سے کہا "یہاں ایک پتلی سی
گلی نکلتی تھی۔ اب چٹیل میدان!"
جگنی اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔
گھنگھرو کی جھنکار سب کو گھیرتی رہی۔
لوک پال کی نئی کہانی۔ پھر وہی لنکا کی یاد
آگے پیچھے آنکھوں کے گھیرے، دائیں بائیں
شبدوں کے ڈیرے۔

:۳۱:

"ہاتھی جیسا بادل آیا۔ میگھ دوت سندیسہ لایا۔"
ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا بولا۔
دبلی پتلی کیتکی، سانچے میں ڈھالی
واہ ری مدن منجری، سب کی دیکھی بھالی
روپ اور سندرتا کا اک سندر سنگم
چھین چھبیلی الہڑ، مستانی، متوالی
لوک پال سے کون کہے کہ اپنے من کو ٹٹول۔
ہاتھ سے چھوٹ کے آئینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا دیوالی
کی گاتھا تھکن سے چور۔
یہ تو لیلا ہے دوجی کے دھان کی
یہ کہانی ہے دیئے کی اور طوفان کی

ہم امرت سنتان ! واہ رے لوک یان !
کاکا کا جادو سر چڑھ کے بولا۔
کاشی بائی کو سب کی پہچان۔
تھوڑی پر تین تل۔
کاشی بائی کا روپ انوپ جیسے باڑے کی دھوپ۔
"لوک پال لنکا میں ہے یا کتھا گرام میں؟" تین تانترک کا یہی بول۔

۲۲:

دودھ ناتھ روتا رہا مور کے سمان۔
اس کی یہی فریاد کہ یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے
کاشی بائی نے تیوری چڑھائی۔ منہ سے کچھ نہ کہا
گلے نے بھڑا دیا۔ جگنی اٹھلائی۔ لوک پال کی نئی کہانی آگے آئی۔
بلی نے بچے دیے۔ کاشی بائی مسکرائی
جادو گر تو بھر سکتا ہے راجا۔ آگے زیادہ نہیں چلے گا۔ کھوٹا سکہ نہیں چلے گا۔
کٹھ پتلی کے کھیل میں کاکا ہار بھی آگئے۔
بھاشن دھواں دھار، شرو تاؤں کے ریلے میں
بکھر گئے سب لوگ، جو آئے تھے میلے میں
مور کی آنکھ میں آنسو آئے، دیکھ کے اپنے پاؤں
دودھ ناتھ کیا بڑبڑایا، بیٹھ کے اکیلے میں
واہ رے شطرنج کے کھیل! پیدل کا وزیر سے میل۔
معمولی سا پیادہ، بادشاہ کی جان کا دشمن
بات کاشی بائی پر آکر ٹھٹھک گئی۔ اسے کون سلجھائے؟
"کون بنائے بیگن کا بھرتا؟ جگنی یا ترو لتا؟"
مہمان بولا
سپنے کی بات کہتے کہتے کیتکی خود ہی سو جائے
آدمی وہی جو ایڑیاں رگڑ رگڑ کے نہ مرے۔ ہیرا پھیری کرے تو ایسی کہ کوئی دھرے پر پانی نہ پھرے
"اپنا اپنا کھٹراگ ہے لوک پال کی نئی کہانی جیسے لائی

نیند سے چونک اٹھا۔
رستہ روکے کھڑی رہی چٹان
جیسے کسی مہاجن کا ابھیمان

۲۳:

کاشی بائی کی نظر پر دودھ ناتھ کیسے چڑھے
اپنے سینے پر ہاتھ دھرتی تو کاشی بائی چاپلوسی کی باتیں نہ کرتی۔
کیتکی آج پھر مہمان کے ساتھ گھومتی رہی۔ تیر تانترک سے اس کی باگ ڈور سنبھالے نہ سنبھلی۔ تینی چوتھے بیاہ کی
تین تانترک اکڑوں بیٹھا، سر پر ڈھائی بال
چوری کا گڑ اور بھی میٹھا، ہنس کے بولا مٹھو لال
ایک بولی، تین کام! یہ تو مہمان کے دیش میں کہتے ہوں گے۔
تین تانترک بات بات میں مہمان کو کاٹتا رہا۔ بھول کر بھی دھمکی پر نہ اترتا۔
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم
تیور کو کچھ اس طرح سے، پہچان گئے ہم
آگے بڑھو، آگے چلو، آگے دیکھو۔
راجا کا بھید کس نے پایا
ندی کا گھیر کس نے پایا
ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا، راجا کی کتھا اپنے ساتھ لایا
راجا کا دربار
آیا ایک کلاکار
چاول کے چار دانوں پر، گیتا کے چار شلوک لکھ لایا۔
راجا نے اس کے دونوں ہاتھ کٹوا دیے۔ اور انعام میں دو گاؤں دے ڈالے۔
بنٹا دھار! ستیاناس!
اننا رے دھواں دھار!

۲۴:

کاکا اٹو پیم کے بیٹے کتھا گھاٹ کے آگے، پیدل چل کر، ندی پار کرنے پر مجبور۔

نارائن پانی میں اتر گیا۔
آنند کچھ سوچتا سا کھڑا رہا۔
سولہ سنگار کئے سلیکھا ترنگی نے آکر کہا " مجھے بھی ندی پار جانا ہے۔"
آنند نے اشارہ کیا۔
سلیکھا اس کے کندھوں پر بیٹھ گئی۔
نارائن نے گھر آکر ساری بات سنائی۔
کاکا انوپم بولے " ارے مورکھ! آنند نے تو سلیکھا کو پار اتار دیا۔ تیرے من پر وہ ابھی تک سوار ہے!"

یہ کتھا کوئی مہوا بھٹیارن سے سنے۔ خوب نمک مرچ لگا کر سناتی ہے۔

:۳۵:

اسی راہ سے ہو کر آئی دلہن کی ڈولی
اسی راہ سے لوگ مرگھٹ پہنچے
کل کہاں ڈھونڈو گے ہم کو؟
اصول کا تیاگ، ایمان کی موت۔ تیاگ پتر کیوں دیا؟

آگ اگر بجھ گئی تو آدمی کس کام کا؟
آگے پیچھے ہاتھی گھوڑا۔ ہم نے پھر کتھا کو موڑا
باسی بھات میں بھگوان کا کیا نہوڑا؟
مہمانوں کا ایک ٹھکانا، پانڈو رنگ کی لال اٹاری
روز وہیں کا آنا جانا، پانڈو رنگ کی لال اٹاری
سب کے من کو کیسے بھا گئی، سب کے من پر کیسے چھا گئی
روز وہیں پر پینا کھانا، پانڈو رنگ کی لال اٹاری
چیتنا کے سات بھاگ من کی دھارا کے نیچے رہتے۔
بس ایک بھاگ اوپر تیرائے
جب بھی چیتنا پوری کی پوری ابھر آئے
آدمی پاگل کہلائے۔
گلی گلی اور گھر گھر، کوئی ہیرا کوئی کنکر!
بولے یہاں سے بوریئے بدھنے اٹھائیے!
ڈولی کے دو کہار، پالکی کے چار
[illegible]

لوک پان میں اندی ممتا، پتے میں پیار دُلار
کیسے کوئی اپرادھی ملنے، کس پر دوش لگائے؟
رام قسم کتھا کا بھید، کیسے من سے باہر آئے؟
سنا لوں سے اٹی پڑی ہے۔ من کی نگری،
کٹھ پتلی میں ماما ڈم ڈم، کتھا گرام کا ناٹک لائے
ہم کیا کریں؟ اپنے آپ سے ڈریں
لوک پان کی نئی کہانی بولی " مور کا ہتیارا نرا گنوار"
للت پورنا چھوڑ دیئے، جب تک ملے ادھار

:۳۶:

آگ پانی ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ یہ تو مہمان کے دیش میں بھی کہتے ہوں گے۔
جانے ہیں ہر سال سمٹ کر رہ جائے لوری کا پاٹ
بات نہیں دو ایک باٹ کی، کہئے پورے بارہ باٹ
آدمی وہی جو وش کا پان کرے، مرتے مرتے بھی من کی بات کہے۔ اچھا وعدہ پورا کیا۔
اچھی خبر لی۔ اچھی نباہی
کیسے کہیں کہ سیت رشی کو ہم آج تک نہیں بھولے
اندر آنسو باہر آنسو، ہم تو ہرے پیک کے باسی
سات جنم کی بات ادھوری، چھائی کیسی گھور اداسی۔
لوری ندیا بہتے بہتے، جانے کون سا راگ سنائے
کٹھ پتلی کے وہی اشارے، کیا رانی کیا داسی
کتھا گرام کی مٹی ہم سے روٹھی۔ اپنا تو یہی کہنا
دستو، یہی سار ناتھ
ڈفلی والے، ڈفلی بجا۔
ہم سے تو کہا، بیٹھئے، ہم آتے ہیں۔ اور آپ جا کر سو رہے۔
پہلے جیبل پھر آلنگن، میلے میں بھی ہم اکیلے
کتنے دکھ اور کتنے سنکٹ، ہم نے چپکے چپکے جھیلے
دربار ی بن جانے سے، ہم سدا سدا کترائے
[illegible]

"آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا، مہوا بھٹیارن بولی.

:۳۷:

من ورنداون پیاسا. پیاس مٹے تو کیسے؟ یاترا تھوڑا سی کوس کی، کٹے تو کیسے.

گوکل نہ گئے تو لوٹے پیاسے کے پیاسے!
لوک پال کی پول کون کھولے؟
اپنے آپ سے بات چیت. کیسی جھاڑ پھونک؟
چھو کر دیکھو، کیا بولیں گے یہ پتھر کے لوگ
کاگا رے کاگا! میرا بھیا آتا ہو تو ابھی اڑ جا، کاشی بائی مسکرائی.
کاگا جھٹ اڑ گیا.
"آج بھیا آئے گا." اس نے سوچا

:۳۸:

چاہے ہم بھوکے رہ جائیں، چاہے کھائیں روز ادھار دیکھیں کٹھ پتلی کا کھیل، چاہے بک جائے گھر بار

پچھوا کی سوندھی باس.
ریشم بنتے بنتے کون اداس؟
ہر چہرے کے پیچھے کتنے روپ!
ایک کو سائی، ایک کو بدھائی. ایک کو بیٹا، ایک کو بھائی!
اپنا اپنا ٹھور ٹھکانا، اپنا اپنا پورھا دھام
کس کی چنتا ہے اوروں کو، اپنے کام سے کام
اب کہاں وہ پکے دھان سی دھوپ
اب کہاں وہ اپنا کام روپ
دودھ ناتھ کی یہی کامنا، کاشی مائی بر مالا ڈالے.
کہاں کہاں مدھوبن میں گھومے، کٹھ پتلی والے.
پہلی ملاقات، گرمی کے بعد برسات
پتلی پر دال بھات، کوئی گہری بات
کیتکی کا یہی دوش کہ کیسر کی ہتھیلی الٹ دی.

:۳۹:

دہی شوانی اور پپیتا سیر اٹ پٹ چٹ پٹ نٹ

کھٹ گیت

آلو شفتالو کے بعد، الکن بلکن اپنا میت
الکن بلکن، دہی چٹاکن
اگلا جھولے، پگلا جھولے
ساون ماس کریلا پھولے
پھول پھول کی بالیاں
بابا گئے دلی

لائے سات پیالیاں
ایک پیالی پھوٹ گئی
نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی

:۴۰:

مہوا بھٹیارن بولی: آج کہاں وہ میرا جوبن!
آگے سے مسافر گزرا. مڑ کے نہ دیکھا. اپنے آپ پہ ترس آیا."

ہیرے کی کنی چاٹنے کی بات آگے آئی. پھر بھی ہم نہ مرے.

اب کہاں وہ مہکا مہکا پیار، جو ہوتا ہے پہلی بار.

:۴۱:

آیا ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا آیا
پوچھو اب کے کون سی گاتھا لایا.
راجا کا سپنا. سارے دانت جھڑ گئے.
"اس کا تو یہ ارتھ ہوا مہاراج کہ آپ کے سبھی سمبندھی آپ کے سامنے مر گئے." ایک تانترک بولا
راجا لال بھبھوکا
تانترک کی موت، ہاتھی کے پاؤں تلے!
"اس کا تو یہ ارتھ ہوا مہاراج کہ آپ کی آیو سبھی سمبندھیوں سے بڑی." دوسرا تانترک بولا
راجا خوش. اسے انعام ملا. ایک ہاتھی.

:۴۲:

کیتکی روتے روتے جان ہلکان کرتی رہے گی،

اگر مہمان اسے چھوڑ کر چلا گیا۔
جب ہنسی آئی، آنکھ بھر آئی۔
اپنی پوتھی اپنے پاس۔ اترتی ندی کنارے ڈھلے
"اپنے کو دہراتا اتہاس"، لوک پال کی نئی کہانی۔
ابھی کل تک تھے کیسے بھولے بھالے۔ اجڑے
گاؤں سے کیا ناتا؟

جس پر جیسی پڑے گی، وہ نباہ لے گا
ہر پرندے کی اپنی بولی
دودھ ناتھ کا راگ ملہار
البیلے کی نار، چھما چھم پانی بھرے!
ہاتھ رسریا، کاندھے گگریا
ترچھی چتون سے گھائل کرے!

۴۳:

بادل کی اک ناؤ بنائی۔ بانی کیری۔ پانڈولپی میں سمائی۔
نیند میں ہی نہیں، جاگتے میں بھی ہم سپنا دیکھنا نہیں چھوڑتے۔
آنکھوں میں کٹی رات
"پاگل میری بندیا، پایل دیوانی!" کیتکی گاتی رہی
آنکھوں میں جگایا ہوا جادو نظر آیا۔
ڈولی میں بیٹھ کر مہمان جوگ مایا کی سیڑھیاں چڑھتا تو اس کے ساتھ کبھی کیتکی آ بیٹھتی کبھی جگنی، کبھی ترلتا۔
آپ پوچھیں، ہم بتائیں۔ جواب دینے لائق کچھ ہو، تب نا!
سال میں ایک بار، راجا کی یاد، شیش محل میں دیپ مالا۔
جوگ مایا کے شکھر سے کتھا گرام ایسے لگتا، جیسے بچوں نے مل کر کھلونے سجائے۔
ایک پہیلی، ایک کہانی۔ سپنے میں بھرت ناٹیم۔
ایسی نیند سب کو آئے۔
زری وہ ہتیا کیسے کوئی بھلائے۔
رچنا وہی جو جیون کی سیما چھو جائے۔
جوگ مایا کی تین سو چونسٹھ سیڑھیاں،
کالے اور سفید پتھر کی۔ جیسے سال کے دن۔

۴۴:

گھٹائیں چاند پر سو بار آئیں
مگر وہ چاند کو جھٹلا نہ پائیں
مہمان کی پانڈولپی میں سپت رشی کی یہ گاتھا بھی آگئی۔

ایک نٹ کھٹ سی نرتکی بھرت ناٹیم کے تال پر تھرکتی سی، سپت رشی سے یہی کہتی۔
"مہاراج! میری بھیا کی پوچھ اوھ اجلی ہے یا آپ کی داڑھی؟"
سپت رشی مسکرا دیتے۔
جب سپت رشی کو اٹل روگ نے آگھیرا اور وہ مرتیو شیا پر پڑے انتم سانس کی راہ دیکھ رہے تھے، مدن منجری نرتکی ان کا کشل منگل پوچھنے آئی۔
سپت رشی بولے۔
"سن، دھرم پتری! میری داڑھی ادھک اجلی ہے"
ڈبڈبائے نینوں سے سپت رشی کی دیومورتی کو نہارتے ہوئے مدن منجری نے پوچھا "مہاراج! یہ بات آپ نے اس سمے کیسے کہی؟"
وہ بولے۔ "پہلے مجھے یہی دچار بنے بیت کیے رہتا کہ میری دھولی داڑھی پر دھبہ نہ لگ جائے۔ بھگوان کا لاکھ دھنیہ باد۔ میری داڑھی پر کوئی دھبہ نہیں لگا۔"
سپت رشی کا ایک نام "تتھا گت" گاتھا میں گاتھا میں گاتھا، ہاتھی ماتھا۔ ایک نام "جاتک"

۴۵:

سوم رس کی بات سب کو راس آتی ہے۔
ہم ندی کو دیکھ لیں تو پیاس آتی ہے۔
گاتھا راجا الکھ دھاری کی۔ ایک پر دس ٹوٹ پڑے، دس پر سو، سو پر ہزار۔ ایسے میں بھلا بچا الکھ دھاری پاٹلی پتر کی سیناؤں سے کیسے لوہا لیتا؟ اس کی سینا کو ہار کا منہ دیکھنا پڑا۔
راجا کو قیدی بنا کر سارناتھ میں رکھا۔ اور ایک دن اس کی ہتیا کر ڈالی۔

یہ کہانی مہوا بھٹیارن سے سنو گے تو پہاڑی پیپل، سرنگ پار کر جاؤ گے۔

"یہ نام، کتھاگرام!" لوک پال کی نئی کہانی، جس کی گمبھیر، ندلیر بھاشن دھواں دھار، شبد لہو لہان۔

"لوک پال لنکا میں ہے یا کتھاگرام میں؟" جتن انترک کا وہی سوال۔

۴۶:

پانڈو رنگ کی دوسری پتنی — کلیانی۔ اسے پاکر بھی وہ روپ متی کو کہاں بھول پایا؟ ریشم بنتے بنتے وہ لگناتا رہتا —

چمکتے جگنو آدھی رات، اپنی تو یہی کہانی
اٹھ کلیانی ریشم کات، چھوڑ دے اب من مانی۔
لوک پال کیا بولا اپنی نئی کتھا میں
جاگی من میں آگ لگاتی مست جوانی

"کسی کی چوتھی پتنی بننے میں کیا تک؟" مہمان نے لیتکی سے کہا

جگنی نے انگڑائی لی۔

تر و لتا کی چوٹی کندھے سے ہو کر سینے پر آئی۔

کیتکی نے بانسری بجائی۔

کیا کہتے پتھر کے لوگ؟

کتنا کچھ نظروں سے اوجھل۔ ماما ڈم ڈم کا وہی بول۔

دانہ دنکا سدا چگنا ہے۔ سدا چگے گا۔
ٹکڑی کا کبوتر ہے، اکیلا نہ اڑے گا۔

۴۷:

چترلوک میں آکر سُلیکھا نرتکی بولی

"اس رات کے مہمان! میرا چتر مجھے دے
کچھ دام اگر چاہیے، مجھ سے وہ لے لے!"

ستیہ کام نے کہا۔

"آج کدھر راستہ بھول گئی، سلیکھا؟ جان بھی لے لو۔ چتر کی کیا بات؟"

اس نے سُلیکھا کو چتر بھینٹ کر دیا۔

وہ چلی گئی۔

سُو مجھے کیا خاک؟ ستیہ کام غمناک!

وہ مون دھارے بیٹھا رہا، جیسے موسم بدل گیا۔

پانڈو رنگ کو پتہ چلا تو مہمان کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے ریشم نہ بنا۔

جسے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں، اسے نہ دیکھ سکنے کا افسوس۔

۴۸:

سویرے سویرے راجا کے آگے آئی پتلی بائی اپنی فریاد لے کر۔

"مہاراج! آپ نے میرے بھائی، بیٹے اور پتی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا آدیش دے ڈالا۔ میں انہیں چھڑانے آئی ہوں۔"

راجا کی چتون تنی، نظر اٹھی، بنجارن کا روپ نہارا
ایک چمبن، تین آلنگن!

اسے اپنے پاس بٹھا کر راجا بولا۔

"تین میں سے ایک کو چھوڑ سکتا ہوں۔"

"تو میرے بھائی کو چھوڑ دو۔"

راجا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

تم نے بھائی کو ہی کیوں چنا؟ نہ کوکھ کا لال نہ ماتھے کا سہاگ!"

"مہاراج پتی تو راہ چلتے مل جاتا ہے۔ بیٹا — اپنی کوکھ کی سوغات۔ انگاروں پر کٹھالی۔ کٹھالی میں پگھلتا سونا۔ ماں جائے بھائی کی رہی بات۔

مہوا بھٹیارن سے سنو گے یہ گاتھا تو ایسا لگے گا کہ اس نے ریشم بن ڈالا۔

۴۹:

چترکار ستیہ کام کے بیٹے اگنی متر کی پنچ ردی بانس کے گھنے جنگل میں، شیش محل کے پاس۔

بیاہ ہو جانے پر بھی وہ پتنی سے دور رہا
ماتا بھوجن رکھ جاتی
وہ لکھتا رہتا۔

جب لکھنے سے من اوب جاتا، وہ ستار پر کسی

نہ کسی راگ کا آلاپ کرتا رہتا۔
ماتا جل بسی تو ساس کا کام بہو نے سنبھال لیا۔
"تم کون ہو؟" اگنی متر نے ستار ایک طرف رکھ کر پوچھا۔
"تمہاری پوتی۔"
اگنی متر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
"پستک سماپت۔ تم کہو گی تو سنگیت کی بھی چھٹی کر دیں گے۔"

:۵۰:

مچھلی کمان کا ایک نام رام لیلا میدان، جہاں ہر سال یہ لیلا ہوتی۔
سوتر دھار بدلتا اور اپنی گنجی ٹانٹ پر ہاتھ پھیرتا رہتا۔
ابھی نہیں بدلے کی بھاؤ نا۔
اب تو کاغذ کا راون جلانے کی ریت مٹ جائے تو اچھا ہو گا۔
"شنکر شمبھو سے کہو، رامائن کی کتھا سنائے۔"
مہمان بولا
ہماری آنکھ دھوئی دھلائی!
اگیا بیتال کی دہائی۔
واہ رے آلو شفتالو! تجھے کون سمجھائے؟
واہ رے اٹکن بٹکن! کب ختم ہو گی یہ بھٹکن؟
اوپر کا پانی نیچے جائے، اوپر کیسے رہ پائے؟
کتنے دکھ کی بات ہے۔ جوگ مایا کے مور کو اپنے ہی رکت سے نہانا پڑا!
میلے ٹھیلے کی بولی رچنا میں گھولی
مدھو بھری کشوری، دودھ میں ڈبولی
مہمان کے ہاتھ میں پانڈولپی جیسے دودھ ناتھ کے ہاتھ میں ستار۔
آنکھ کے آگے جوگ مایا کا سنہرا کلس
کاشی بائی کے کندھے پر سنہرا آنچل

:۵۱:

سپت رشی نے کہا تھا۔
"ستیہ میو جینتے!"
ستیہ کی سدا وجے ہوتی ہے۔
ماماڈم ڈم کی اور بات۔
کھیل شروع کرنے سے پہلے وہ یہ بول ضرور ال
"اے جھوٹ کے نائدوں سے منکر انسان!
سچ بول کہ سچ تباہ کر دے گا تجھے۔"
"لوک پال لنکا میں ہے یا کتھا گرام میں؟" تیز تانترک بولا۔
اور رے اسیم!
کوئی نہیں جانتا، تم کہاں ہو؟
پھر بھی ان دو کی آواز ہمارے کانوں کو چھو جاتی ہے۔
قافلے کی گھنٹیوں کی گونج پیچھے رہ جانے والوں رہ رہ کر، منزل کا احساس جگاتی ہے۔
لوک پال کا یہی روگ۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کہ نہیں پاتا۔ رگوں میں انگڑائی لیتے لہو کی پکار وہ کہہ سن پایا؟ اس نے کتنے دکھ اٹھائے پالے رہی ہاتھ مہمان نے کہا۔
اسی راہ سے آئی سلیکھا اور کا کا ستیہ کام سے ا چتر مانگ کرنے گئی۔
سلیکھا کے چتر کے بنا چتر لوک کتنا اداس۔
لوک پال کی نئی کہانی "موہن جو دڑو سے کون" رنگوں نے شبدوں کو سہلایا۔ یہ کیسے کہا جائے؟ ا پال کے ہاتھوں ہوا ہر بار شبدوں کا اپمان!
کیا کتھا گرام کی کتھا انت تک اس کا ساتھ د گی؟ سپت رشی کا آشیرواد تو کتھا گرام کو سدا پرا رہے گا۔ جے ہو، جے ہو، سپت رشی کی جے ہو

:۲:

ہم سب اپنے ستیا ناسی
ہر کوئی مرگھٹ کا باسی
جادو اپنی آنکھ کا!
ریشم بنتے بنتے پانڈورنگ گنگناتا رہتا۔
ایک گرو کے چیلے کتنے پاپڑ بیلے

دیوانے پر پھینکے، اس نے کتنے ڈھیلے
کیا بولا آج ماما ڈم ڈم، کٹھ پتلی والا
بنجاروں سے کہہ دو، اب ہم نہیں اکیلے

:۵۳:

سانپ ہر سال کینچلی اُتارتا ہے
پہلے منہ سے، پھر سارے تن سے
یہ تو مہان کے دیش میں بھی ہوتا ہوگا۔
کام روپ کی کامنا کب مچلی
پنچھی کی اڑان کب رکی ؟
لوک پال کی نئی کہانی کتنی آگے بڑھی
نہ وہ شوانی کو لایا
نہ پیتا مبر کو، نہ ماما ڈم ڈم کو
نہ اپنے آپ کو !
ریشم بنتے بنتے پانڈو رنگ گنگناتا رہتا۔
لوکاؤں کے پل کے نیچے، لوری بہتی رہی
سب کی کاتھا الگ الگ جس نے جیسی کہی۔
"بھرت ناٹیم ناچتے ناچتے گھر بن ڈھل جائے گا"
دودھ ناتھ نے کہا۔
"بے مانگے سو دودھ برابر، مانگے ملے سو پانی"
کاشی بائی مسکرائی۔

:۵۴:

آنکھ دبا کر دیکھتا مہان
کیتکی بات کرتی تو پھول جھڑتے
کا کا مہارشی اپنے کو نیتا کہتے۔
اپنے ہی بھاشن میں اپنے آپ ڈوبے رہتے۔
ستیاناس ! بنٹادھار !

ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی والا گنگنایا۔
کوئی سیانا کوئی نٹ کھٹ، اور کوئی انجان
اپنے کو ہی کھوج نہ پایا، کوئی بھی انسان
لوک پال ننگا ہو آیا، اکھل پتھل کے بیچ
دیکھا سنا بہت کچھ اس نے، اب نہ رہا نادان

:۵۵:

لوک پال کی نئی کہانی

"اپنی بات راکھ کا ڈھیر"
اپنے ہی میں گم سُم
ایک ہم ہیں کہ سیت رشی کے ٹیک سے چل کر
کہ اگست رشی کے ٹیک سے چل کر آ پہنچے لال اناری
دور کے مہان سے بھینٹ کرنے !
بلبل نے کہا بیٹھ کے، بلبل کے برابر ا
مر جاؤں تو رکھ دینا مجھے گل کے برابر !

:۵۶:

چتر لوک کے پاس تیج پات کا پیڑ
شہد کا چھتہ دیکھتے ہی مہان خوشی سے اچھل پڑا۔
جھٹ پیڑ پر چڑھ گیا۔
چھتے کو ہاتھ لگانے بھر کی دیر تھی۔
مکھیاں اس سے لپٹ گئیں۔
وہ بھی چھتہ اتار کر ہی ٹلا
انگ رنگ کیا ہو گیا۔
کھاٹ سے لگا رہا، کئی دن تک
کیتکی نے دن رات ایک کر ڈالا
"آنکھوں کے آگے پلکوں کی برائی"
لوک پال کی نئی کہانی
ریشم بنتے بنتے پانڈو رنگ گنگناتا رہا
پلٹ گئے لنکا کو پھر بوڑھے بنجارے
رستہ تھا جب ٹیڑھا میڑھا کیا کہتے بیچارے
بارش میں بھیگتی کیتکی
پانڈو رنگ کے گھر آئی۔
پیچھے پیچھے آیا مہان
پہلے کپڑے بدلے
پھر پیٹ پوجا

:۵۷:

ایک سانچے کا ڈھلا

کتھا گرام کا، آ گا پیچھا
لوگ پال کی نئی کہانی
"آ لو شفتالو"،
سانجھ کی پرچھائیاں بڑھتی گئیں
کیسی گھور نراشا
چھوڑ دیہ تماشا
ہر شبد کا ہے الجھا الجھا؟
ایک ہاتھ کی دینی۔
ایک ہاتھ کی لینی۔
کون اسے درشا رے۔
کیسے ماں کی ممتا۔
لوری بن جا رے۔
دودھ ناتھ جیسا جیون ساتھی۔
کاشی بائی کو نہیں ملے گا۔
اسے کون سمجھا رے؟
ہر جھانکی نینوں کے اندر
دیکھو، کھل کھیلی کیتکی
مہمان کے ساتھ
تین تا نترک بے چارہ ڈرپوک
وہ اس کی چوتھی پتنی
پوتھی میں کیسے کوئی ڈھونڈے اپنا نام؟
راگ دیش کار۔
"تورے کارن جاگی سگری رین!"
آٹھ آٹھ آنسو اب کون رلائے؟
آٹے اور دال کا بھاؤ یاد آئے!
جانے کب سے سنسان پڑی ہے من کی نگریا!
اپنے اپنے میت گئے
گونج رہ گئی گیت گئے۔
دھوپ کی انگلی کون پکڑے
ہاتھ کی پوتھی کون چھینے؟
"لوک پال لنکا میں ہے یا کتھا گرام میں؟" تین
نترک بولا

راستہ روک کے کہہ لیں گے، جو کہنا ہے ہمیں
من پر لنکا کی چھاپ۔
پہاڑی جیل سے نیچے کھائی میں کود کر
کسی نے جان دینے کی ٹھانی
دوسرا آدمی اسے سمجھاتا رہا
اسے سمجھاتا رہا
جان سے ہاتھ دھونا مہاپاپ!
آدھ گھنٹے بعد
تیسرے آدمی نے دونوں کو ایک ساتھ
کھائی میں چھلانگ لگاتے دیکھا۔

:۵۸:

کون نگر کے رہنے والے
کس نگری میں جھانکے
میاں تم کون ہو کہاں کے
ترچھے ہو یا بانکے۔
کبیر کی بانی آگے آئے۔
من پر چھاپ لگائے
آدھی نیند کون چرائے؟
بولا ملا ڈم ڈم کٹھ پتلی والا
"مور کا پیارا کہاں سے آئے
کہاں جائے؟ . . . . ."
اب تو آگے قدم نہیں اٹھتا۔
آج سنیں گے دودھ ناتھ سے
راگ گورکھ کلیان
نشاد کومل
باقی سر شدھ لگتے ہیں
رات کے پہلے پہر کا راگ

:۵۹:

لکھت پڑھت سے کم نہیں، میلے کی ریل
پیل۔
اپنے آپ سے بے خبر، شبدوں کی ٹھیلم ٹھیل
یہ آندھی آنچل میں باندھی!

بلی چوہے پر جھپٹی!
نیولے نے سانپ کی گت بنائی
مرنہ جانے آنکھ کا پانی
دال بھات ہوگا تو کاگا بہت آرہیں گے!
کیا بھائی کیا بھتیجے، بھانجے بھی آرہیں گے!

:۶۰:

رات کے سناٹے میں گلی کا بوڑھا کتا
بلک بلک کر روتا رہا۔
کون جانے اسے کس کی موت
دکھائی دے گئی۔
اس بوڑھے کتے کو لوک پال اپنی کہانی میں
کبھی نہ لا پایا۔
اسے کون سمجھائے کہ اپنا ہی بیچا کرد
چھوڑ دو جو کھونٹ کی یہ بھٹکن
گاتا تھا بھی تو سانسوں کی ڈور سے بندھی ہے!
کاگا رے کاگا! تیری وہی کائیں کائیں!
لوک پال کی کیا نشانی
ڈوب مری راجا کی رانی
گاتا رہا انامکا کی
جو منجدھار میں ڈوب مری
اور راجا بھی اسے بچا نہ سکا۔
ریشم بنتے بنتے پانڈورنگ گنگناتا رہا۔
گھٹانا اس کو کہتے ہیں، بڑھانا اس کو کہتے
ہیں۔
کسی کو مارنے والے بھی خود مرتے ہی رہتے ہیں
اگر پہاڑ بھی ہوتا آج تو ٹل جاتا۔
آج کدھر بھول پڑے
گرمی بہت پڑتی ہے آجکل
ایک شام سوز کے نام
آج سویرے، کس کا منہ دیکھا؟
جیسے جوگ مایا کا مور
آج بھی گا رہا ہو۔
"ویشنو جن تو تینے کہئے

جے پیر پرائی جانے رے! ۔۔۔۔"

:۱۱:

پانڈورنگ کا بنا ریشم اتنا ہی بڑھیا ہ
کاشی بائی کا بھرت ناٹیم
دودھ ناتھ اور اگنی متر کا سنگیت۔
آنند اور نارائن کی بہی اچھا کہ اب بابو آر
کرے
لیکن کا کام الو ہم ناؤ کھیتے کو ہی ہو جاملے
مہمان کے سر پر اڑتے پرندے
اسے جنم بھومی کی یاد دلاتے رہتے۔
ایک جھٹکا سا لگتا

:۲:

کتھا گرام کی آنکھ ہر روز کھلتی
اور لوگ اپنے چاروں طرف،
پیار سے نہارتے
سیتا کے دھرتی میں سما جانے کی گاتھا
بار بار دہرائی جاتی
پانڈورنگ کے ہونٹوں پر کبیر کی بانی۔
کاشی سے دھن اُڈپی
دھن کا کاشی جائے
کاشی پھوٹی پنڈتو!
دھن کہاں، سمائے؟ ۔۔۔
کاشی بائی کی بے رخی سے تنگ آکر دودھ نا
سوچتا
دھرتی پھٹ جائے اور وہ سما جائے
"زیادہ عقل بھی اجیرن ہوتی ہے!" مہو
بولی۔
"آشیر واد کیسا؟ اب تو سر اب بھی اپنا
کھو بیٹھا ہے" پانڈورنگ نے چٹکی لی۔
"ہاتھی گھوڑا پالکی، جے کنھیا لال کی ..
راگ پیلو
"آنکھ ہوگی تو آنسو بھی ہوں گے!" دا
کی آواز پنجم سے نیچے۔

۶۳:

کوئی کہانی کہہ رہا ہے۔ ہم سن رہے ہیں
ایسا تو یہاں کے دیش میں بھی ہوتا ہوگا۔
"آتما کی آنچ" واہ ری دیوانی!
لوک پال کی نئی کہانی
آتما میں پڑے تو پرماتما کی سوجھے۔
"اندھیرے میں ناٹک لوٹیاں مارتے پھروگے تو
مایا کیسے پہنچوگے؟" کلیانی کی تان نہیں ٹوٹی۔
ی کی پوری کھیپ، سن اگیا بیتال!
رنگ بیچ پر جٹ گئی۔
واہ رے ہیرا لال بیتا لال!
ہمیں نہانے کا اپدیش دیتے ہو!
کتھا گرام میں ہمارا جنم ہوا
چترا، مترا اور لوری کا سنگم۔

۶۴:

آپ بیتی کہیں کہ جگ بیتی؟
مہوا بھٹیارن بولی
"شاباش ماما دم دم شاباش!"
جھکی ہوئی گردن کو آئینے دیکھا
آئینے کی بات پتھر سے کون پوچھے؟
گڑیوں کا میلہ آیا
جاگو پالکی والو جاگو
جاگو ڈولی والو جاگو
گڑیا گئنے پر دیوانی
ایک گڑیا روپ لیکھا، ایک دیوانی
"بدنام، گڑیا!" پپیتا مہر بولا
شوانی نے اسے باہوں میں بھینچ لیا۔
وہ کبوتر کی اڑان دیکھتا رہا۔

۶۵

جب بھی کوئی کاکا الوئیم کو بدنام کرتا، وہ
دیتے۔
وہ خوب سمجھتے تھے کہ بدنام انہیں نہیں،
نے کی مہروں سے بھری مٹکی کو کیا جا رہا ہے۔

مکان کی نیو کھودتے سمے یہ مٹکی ملی۔
راجا کی سات سو مہروں سے بھری مٹکی
ہر مہر پر ناچتا مور
مٹکی پر راجا کا نام ۔ الکھ دھاری
یہ مٹکی کاکا الوئیم نے اپنی کھاٹ کے نیچے دبا رکھی
تھی۔
رات کو گھر آکر کھاٹ کے نیچے زمین پر منہ رکھ
کر کہتے۔
"آج تجھے ایک سو ایک نے بدنام کیا!"
مٹکی چوری ہو گئی۔
اب کوئی انہیں بدنام نہ کرتا۔
یہ گاتھا مہوا بھٹیارن سے سنو گے تو وہ
نیچے سے اوپر تک جوگ مایا کی سیڑھیاں چڑھ
جائے گی۔

۶۶

کاکا الوئیم ڈوب مرے
کتھا گرام میں ایک اور دیپ بجھ گیا۔
کیا ہر جنم میں کاکا الوئیم کی مرتیو ڈوب کر ہی
ہوئی؟
کتھا گرام ارتھی کے ساتھ چلتا رہا۔
شوک سبھا میں سب نے کاکا الوئیم کو "لوک
دیو" کہہ ڈالا
"کیا ہم جیتے جی لوک دیو نہیں بن سکتے؟" پانڈو
رنگ بولا

۶۷

چترلوک کی دیوار پر لٹکا ہوا چترکار کے دیکھتے
دیکھتے گر گیا۔
جوگ مایا کا ہاتھی رام دھن اچانک لنکا سندرم
کے سامنے بھگوان کو پیارا ہو گیا۔
لنکا سندرم کے آنسو کون پوچھے؟
اس نے سات دن تک اَن کو منہ نہ لگایا۔
ایک روز وہ بھی دم توڑ گیا۔ مہاوت ہو تو
ایسا!
منجدھار میں ڈوبی۔

برات سے بھری ناؤ
دولہا دلہن سمیت ایک سو ایک براتی۔
جیسے ایک غتابڑی یا ہنڈیا میں سما گئی۔
"کون سا زمانہ یاد آ کے رہ گیا؟" مہوا بھٹیارن
گنگناتی رہی۔
کون تھے کسی چیز سے کیا ہو گئے!
گھڑے سے بوند بوند پانی ٹپکتا رہا۔
اچانک گھڑا پھوٹ گیا۔
چھنا گھوڑا جھر جھرا، کوڑی کے کام کا!
اس کی لاٹھی کی آواز!
اس نے رکھا، اس نے اٹھایا!
جیسے آج بھی کالانوبیم ناؤ رکھے ہوے ہوں!
جیسے رام دھن اسی طرح مچھلی کیان سے گزر رہا
ہو۔ کندھے پر لنکا سندرم، ہاتھ میں آنکھیں۔
جیسے برات سے لدی ناؤ آ رہی ہو ہماری آنکھوں
کے سامنے!

:۶۸:
کھیلتے کھیلتے بچے ایک دوسرے کی پٹائی کر ڈالتے
کئی بار سب مل کر کسی ایک کو نشانہ بناتے۔
"یہ سر کس کا؟"
"پنچوں کا!"
"تو بچے بدھائی!"
سمجھو، اس بے چارے کی شامت آئی۔
مہوا بھٹیارن پاس کھڑی دیکھتے دیکھتے بولی۔
"گجرے کی قسم! اگجرے کی قسم! کھیل میں جو روئے
اسے کھیل سے نکال دو۔"
لوک پال کی کہانی "دل بڑی سوغات۔"
واہ رے لوک پان! تھم گیا طوفان۔
کبھی ڈنڈا ڈولی۔ کبھی چور سپاہی۔ کبھی آلو
شفتالو، کبھی اکلن بلکن
شوانی اور پیتا مبر کا ایک ہی کھیل۔ گڑیا
کا بیاہ۔

:۶۹:
تم کہتے ہو، تمہارا مول
لوک اور پرلوک کے برابر۔
ہم کہتے ہیں، مول بڑھاؤ
ابھی تم ہمارے لیے۔
بہت سستے ہو!

تمہیں دولہا پسند ہے
ہمیں بھی لڑکی پسند ہے
رام ملائی جوڑی
ایک چندا، ایک چکوری!
کتھا گرام کی بولی ٹھولی، سلجھے نیں ڈھالی
"سالی آدھی گھروالی!"
"گنجی کیا نچوڑے، کیا نہائے!"
"اندھی پیسے، کتا کھائے!"
"دائی سے پیٹ کون چھپائے؟"
کتھا گرام کھل کھلا کر ہنسنے لگتا۔

:۷۰:
آج تو ہمیں بیٹھے بیٹھے سورج ڈوب گیا۔
ہمارا ہاتھ چھوڑ دو۔
اب ہم جائیں گے
بھرت ناٹیم کا سمے ہو گیا۔
مہمان نے کیتکی سے کہا۔
"ہم اپنے آپ کو بھرت ناٹیم سے ونچت نہیں
رکھ سکتے۔"
"تمہارا نام ہوگا ہمارا کام!" کیتکی مسکرائی
بارہ برس پیچھے گھوڑے کے دن بھی پھرتے
ہیں:
"آپ گاتے کیا ہیں؟" لوک پال کی نئی کہانی۔ ایک
اور دیہاتی۔ وہ تو ہم ایسوں کو بازار میں بیچ ڈالے۔
سچ پوچھو تو آپ نے ہمیں مول لے کے چھوڑ دیا
یہ تو لنگا نیں ہی کہتے ہوں گے۔ الایچی دانے حلوائی

بھریں، شکر کے بوروں میں۔ تم کالوں میں، ہم
بوروں میں!
کیوں نہ آنکھوں سے سنیں خوشبو کی بات! واہ
رے گھوڑی کے لال!
سچ جھوٹ کا فیصلہ کون کرے؟ بچے کچھے
ہی کھوج۔ کہاں گنگوا تیلی، کہاں راجا بھوج!
کہتا وہ اک اک بات کی، دو دو پہر ملتی نہیں! بازی
ہاتھ رہی! ہولی جلائی ہم نے شعلے کے سامنے۔
لوک پال نے بہت بنائی بات۔ کہیں دیکھے نہیں
اس رنگ کے اس باس کے پھول۔ اگیا بیتال کی دہائی
ہم کو تو پتھر مارے بھی موت نہیں؛ میرے بھائی!
بان لگی شترو کی آدھی بات۔ ہمیں پرائی کا سنا
نام۔ اب کہاں آرام؟ ہاتھ میں ہاتھ لیا۔ سلیکھا کے
بارے میں سوچتے رہے کا کا ستیہ کام۔ وہ اپنا چتر
لینے چلی آئی تو کیسے انکار کرتے؟
چھوٹا اپنا دیس ہم پردیسی ہو گئے! پڑ گئے لینے
کے دینے! اس کا ندھے چڑھے، اس کا ندھے اُترا!
ہر بات سر آنکھوں پر!
ریشم بنتے بنتے پانڈو رنگ گنگناتا رہا۔
"چمکیں سبھی کے کان میں سونے کی بالیاں
جوتا چھپا کے نیگ لیں، دولہا کی سالیاں!"

۴۱:

کون سا خوف پھیل گیا، مہوا بھٹیارن سے پوچھو
ترولتا اور جگنی نے سوتے چرمر کو داڑھی میں
انگلیاں پھیرتے دیکھا۔ جس کا یہی اندیشہ کہ وہ کیتکی
اور مہمان کے چکر سے نکالیں۔
اس نے یہ بھی کہا کہ یہ کتھا گرام کی آبرو کا سوال
ہے۔ پھر ماما ڈم ڈم آ نکلا۔ اس نے بھی سو کھا چرمر
کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ چین
بنترک کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کنوئیں میں چھلانگ لگا
چکا ہوتا۔
مہوا بھٹیارن نے بات کو سانپ کی طرح الٹ پلٹ
کر کے

۴۲:

کیتکی نے مہمان کو جگایا تو اس کا ہاتھ اس
کے کندھے سے اترتے ہوئے اس کی کمر تک آیا۔
آگے بڑے بھلے کا بھید!
بالم اپنے آپ کو بھگوان مان!
اپنے نام کا ایک
جیسے سان پہ چڑھی تلوار
وہ گنگناتا رہا۔
بستی دور اور پاس مسان
رات اندھیری، راہ سنسان
سر پہ ہے گھنگھور گھٹا
بے ڈھب بجلی کی مسکان

۴۳:

توتے کو پڑھایا "میرا نام ہیرامن!"
سو کھا چرمر یم راج کی راہ دیکھتا رہا اور من ہی
من کہتا رہا۔ بوڑھے توتے نہیں پڑھتے۔
ادھ کھلے نین۔ دل بے چین۔ یہ تو مہمان کے دیش
میں بھی ہوتا ہوگا۔
بھیتر سے ہم باہر آگئے، کیسے رہتے پھر اپنے
میں!
پنگھٹ جیسا روپ کسی کا، دیکھ لیا پھر
سپنے میں۔!

۴۴:

کتھا گرام میں یہی وچار سب کو جھنجھوڑتا رہتا
کہ آنے والا کل کیا لائے گا۔
آج پھر کیتکی مہمان کے ساتھ گھومتی رہی، اپنے
اور اس کے ہاتھ کی ریکھائیں چومتی رہی۔
کس کا کس پر احسان؟
گھر سے اچھے وقت نکلے۔
ڈرتے ہیں نہ اڑ جائیں کہیں تیز ہوا پر!
تین تانترک تپتا رہا۔ کیتکی کے نام کی مالا جپتا رہا
میری داڑھی بڑی یا مہمان کی؟

اب کیتکی جانے، اس کا کام جانے!

۷۵:

ترولت اور جگنی مل کر کیتکی کو چھیڑتی رہتیں کہ جہان میں کیا دیکھا۔ مخطوطہ چھپاؤ ہاتھوں میں اکیا رکھا ہے ان باتوں میں!

پانڈو رنگ ریشم بنتے بنتے گنگناتا
آدھا ریشم لال الاری، آدھا کاسنی روپ، ریشم ریشم ریشم ریشم
آدھی گاتھا اکھن بُکّسن، آدھی جاڑے کی دھوپ ریشم ریشم ریشم
آگے پیچھے، دائیں بائیں، گم سم سات جنم کی بات
وہی پریم رُت جاڑا گرمی اور وہی برسات، ریشم ریشم ریشم

شوانی اور پتامبر کو گڑیا کا بیاہ رچانے سے اوکاش نہ ملتا۔

کلیانی کا اپنا گیت۔
آدھی چھاؤں آدھی دھوپ، گاگر گاگر ڈولے پنگھٹ
پنہارن کا روپ انوپ، گاگر گاگر ڈولے پنگھٹ
اپنی اپنی تیکھی چتون جیسے اندی گہری ندیا
ہولی میں پھر اڑا گلال، گاگر گاگر ڈولے پنگھٹ

۷۶:

مہوا بھٹیارن کی وہی بات
جیسے بٹلی پھر ہلاس کا پر بھاؤ۔ وہی شرد ہی گات
چھینکتے چھینکتے برا حال
آپ بڑوسن، لڑیں! لڑے ہماری جوتی
لوک پال کی نئی کہانی "بھرت ناٹیم کی ایک رات"
چنتا کی کیا بات؟
لاکھوں کا جوڑ توڑ۔
گاتھا میں نیا موڑ
لٹ الجھی سلجھا جا رے بالم، مورے کر مہندی لگی ہے۔!
مرتے دیر نہیں لگتی!
اشاروں سے اشارہ ہے پھر آنا!
آنکھیں پھیرتے ہو طوطے کی سی۔
باتیں کرتے ہو مینا کی سی

کتھا گھاٹ، ایک پہیلی، اپنی پہچان
مچھلی کمان، ہار جیت کا میدان
پہاڑی پیپل کی سرنگ کتنی سنسان
تنہائی کی اور بات۔
نئی بہو کے سندر نین اور سندر اس کا انترمن
سندر اس کے ماتھے پر جھومر، سندر پائل کی چھن چھن

۷۷:

ماما ڈم ڈم یہ جانکی بھی لے آیا کتھ تلم کے کھیل ہیں۔
جیسے کوئی جاگتے میں سپنا دیکھے۔
سپت رشی بولے
"ایک بار میں نے جلاہے کے گھر میں جنم لیا، جب میں نے مدھوبن میں جا کر گگن رشی کے درشن کیے۔
"ادھر میں ان کے چرنوں پر جھکا، ادھر انہوں نے میرے چرن چھو کر کہا آنے والے رشی کو پرنام!"
"سچ پوچھو تو گگن رشی کی بھوشیہ بانی ہی میرے اس جنم کا کارن"
ریشم بنتے بنتے پانڈو رنگ گنگناتا رہا۔
سپت رشی کے جنم انیک، کیسے گاتھا میں آ پائیں!
جیسے ساگر تٹ پر بالک، شنکھ سیپیاں چنتے جائیں۔

۷۸:

مہوا بھٹیارن بولی!
"اتنا ہی منافع لو جتنا آٹے میں نمک!"
لوک پال چلتے چلتے دیکھتا رہا کہ کون کون پیچھے آ رہا ہے۔
مہوا بھٹیارن گاتی رہی!
اجڑی بچھڑی نگری بس گئی، ناچ اٹھا سنسارا
راگ ملہار میں دھرپد گایا، پار برہم کا بھید پایا!

۷۹:

کاکاستیہ کام کا بیٹا اگنی متر۔ دودھ ناتھ سے بڑا سنگیت کار۔ کلا منڈپ میں راگ الہیا بلاول گاتے گاتے

ہم پہ آتے ہی دم توڑ دیا۔
دودھ ناتھ سات دن تک روتا رہا۔ بلک بلک کر یہی کہتا۔
"میرا جواب اب کون دیا کرے گا۔ اور اب میں کس کا جواب دیا کروں گا!"

:۸۰:

جوگ مایا کا ہاتھی رام دھن اب کہاں، نہ مہاوت لنکا سندرم رہا۔ پھر بھی یہی لگتا کہ شِوانی اور پتا سبر پیلے کے سمان ہنستے ہنستے رام دھن کی سونڈ پر جا بیٹھے۔ سونڈ ماتھے پر اٹھی اور دونوں بالک سر سے ہو کر لنکا سندرم کی گود میں جا پڑے۔

جال اٹھی بھر گھر گھر پریم کی جیوتی
آنکھ سے ڈھلکے آنسو جب بھی بن گئے موتی
رنگ منچ پر جاگی تھا جھلمل جھلمل
نئی بہو سے پوچھو کاہے آنسو سے منہ دھوتی

:۸۱:

اندھے کو اندھا کیسے راہ دکھائے؟
سوتے کو سوتا کیسے جگائے؟
"جب تک مہمان یہاں ہے، کیتکی اپنی ہو کر بھی پرائی۔" پتن تانترک کی یہ بات بھی آ گئی مہمان کی پانڈو واپسی میں۔

ہم قربان! ہانے دئیا!
پریم پر چھاوا!
اکھّی پٹّی کس نے پڑھائی؟
"اوئی ماں!" ہے بھگوان!
دیکھ منہ کو ہتھیلی آئی۔
بیچ بیچ میں لگا تھا کتنی الجھ گئی۔ رام دہائی!
انتظار میں لگتا دن دن ایک مہینہ
جا ہے ماتھے سے ایڑی تک بہہ جائے پسینہ
ہم جیتے نہیں ہیں، کچھ اپنا بارتے ہیں
الٹو کی دم فاختہ! کیا پدّی، کیا پدّی کا شوربا!
ہم کہلاتے سوئے لنگوٹے!

تم دیکھو دائیں بائیں ہاتھی، ہم دیکھیں آگے پیچھے گھوڑے!
کیتکی کو مہمان کا انتظار رہتا۔
کبھی وہ اسے "مرگ نینی" کہتا، کبھی "مدن منجری۔"
کاجل دھواں دھار، کام روپ کے آرپار۔
پتن تانترک۔ سوم رس کا رسیا۔ مہمان کے جانے کی راہ دیکھتا رہتا۔

چپکے چپکے کچھ کہا اور کچھ پکار کے
کچھ اپنے من سے کہہ دیا کچھ من کو مار کے

:۸۲:

اب تو ماما ڈم ڈم کٹھ پتلی کے کھیل میں اپنے بیٹے لوک پال کو بھی لے آیا۔
"اس میں جھگڑا کیا ہے؟ جو اُن کا ہے، وہ لے لیں جو ہمارا ہے، وہ ہمارے پاس رہنے دیں۔" مہوا بھٹیارن بولی۔
جوتا کھویا اندھا گھوڑا، ایک ہی بات۔ یہ تو لنکا میں بھی کہتے ہوں گے کہ جوتے پر جوتا دکھائی دے جائے تو سمجھو سفر پر نکلنا ہوگا۔

:۸۳:

"کالا میگھ آنکھ کا جادو" لوک پال کی نئی کہانی۔
ننھی چڑیوں کی چہکار
دھڑکن نیل گگن کے پار
سور جوگ مایا کا وہ، سات جنم کا میت
ہتھیارے کے ہاتھ میں، سسک رہی ہے پریت
ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا دکھائی دیتا ہے ایسا تو راون کی لنکا میں بھی ہوتا ہوگا
کیتکی بال چھٹکائے سوتی رہی اور سپنے میں مہمان کے ساتھ سرنگ پار کرتی رہی۔
ماما ڈم ڈم کے کھیل میں یہ بات بھی آ گئی کہ ایک بار سپت رشی نے سور کے روپ میں جنم لیا اور کسی نے ان کی بھی ہتیا کر ڈالی۔

کنگال ہے جو کیسے طلبگار بن سکے
جو بک گیا وہ کیسے خریدار بن سکے
کامنا کبھی بوڑھی نہیں ہوتی؛ نہ بھاونا مرتی ہے
ہماری آتما کبھی کبھی موسم بے موسم ہم سے ہی
ڈرتی ہے۔

:۸۴:

دودھ ناتھ نے کہا؛
"واہ ری کاشی بائی! تیری آنکھ کی صفائی!
اسی کا دل لوٹا، جس سے آنکھ لڑائی
ہم ادھر رکتے ہیں، کاشی بائی اُدھر۔ وہ جانے
اور اس کا ایمان۔ آج سے کل نزدیک ہے۔
جو اپنی بھول گرد کے ماتھے تھوپے، اس سے
بڑا کون اپرادھی۔ گجر بجا چاہتا ہے۔
سب اپنے کیے کو روتے ہیں۔ آج زبان کھلی
ہے کل بند ہے۔
کیتکی کی بات وہی۔ آسمان پہاڑ کے تھگلی لگائے
پتن تانترک کی جان پہ بن گئی۔
آکاش دور ہے، دھرتی کٹھور ہے!
اپنے نینا مجھے دے، تو گھوم پھر کے دیکھ۔
الجھی بات، سیدھی بات۔ تین پہاڑ، جیسے آسن
سے آسن جوڑے بیٹھے تین جوگی۔
لوک پال کی نئی کہانی۔ "الجھی تانی۔" جگنی نٹ
کھٹ، ترہ ولتا مستانی، کیتکی دیوانی۔
دونوں طرف ایک ہی ڈر!
جو اُدھر ہے وہی اِدھر!

:۸۵:

کاشی بائی کو پتہ نہ چلا کہ دن چڑھ گیا
دودھ ناتھ نے اسے جگایا۔
"دیولوک کی اپسرا جاگ، اب تو جاگ!"
وہ یہ بولی کہ نیند آتی ہے۔
کہاں جائے دودھ ناتھ، کدھر جائے؟ لوک
پال کیا بتائے۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ دودھ ناتھ کچھ کھا کر مر جائے۔
کئی بار وہ کہہ چکا ہے کہ اگنی متر کے سمان اس کا
بھی ایک دن گاتے گاتے سم پہ دم ٹوٹ جائے گا۔

:۸۶:

مندر والی گلی میں مدھوشالا کھلنے کا کارن مہان
آج تک نہ جان سکا۔
لوک پال کی نئی کہانی میں وہی پرانی بات کہ موسم
آئے گا، جائے گا اور پریم کا دام چکائے گا۔
کسی کے شبد بان کے سمان چھوٹتے، کسی کے منہ
سے پھول جھڑتے۔
تم آلو شفتالو، ہم ٹکن ٹبکن۔ کتھا گرام نے
کیا کچھ دیا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی کمی کھٹکتی رہی۔
ریشم بنتے بنتے پانڈو رنگ گنگناتا رہا۔
دکھی من میرے، اب کیا رونا!
مندر کے کلس میں کتنا سونا!

:۸۷:

ناؤ آ لگی گھاٹ پر۔ لوک پال کی نئی کہانی "بارہ
مسالے کی چاٹ"! اناڑی کا سونا بارہ باٹ
مہان کو کیتکی کی آنکھیں پسند ہیں، جو سبز رنگ
کی ہیں۔
اسے گدگداتے ہوئے وہ کہتا "آ میری بلّی، میاؤں
میاؤں!"
لوک پال سوچتا رہ جاتا کہ وہ اتنا نہ ہنسے کہ رونا
پڑے۔ پھٹی چٹائی، ٹوٹی کھاٹ۔ آدھے سے زیادہ
سوکھ گیا لوری کا پاٹ۔
ہنستے ہنستے بھی آتے ہیں آنسو!
کوئی گلے لگ کے ملا، کسی نے ہاتھ جوڑ کے پرنام
کیا۔
جوگ مایا کا نیا ہاتھی — جوانی سے کچھ اترا ہوا!
نیا مہاوت ایک دم جوان
الکھ دھن جاگی۔ لوک پال کے آر پار
متر منڈل کی جے جے کار!

:۸۸:

پہلے جلوس میں سب کے سب داڑھی مونچھ والے
دوسری طرف سے آیا ایک اور جلوس۔ سب کے
سب گنجے۔

تیسرے جلوس میں اندھے بہرے اور لولے
لنگڑے۔

چوتھے جلوس میں سب کے سب بندر۔ سب
کے ہاتھ میں کنکر۔

جلوس تو مہمان کے دیش میں بھی نکلتے ہونگے۔

:۸۹:

جوگ مایا کے نئے ہاتھی کا نام۔ ایراوت۔
مہاوت ـــ اُڑ کھٹولا۔ اُس کے تن سے ہاتھی
کے پسینے کی دُرگندھ آتی رہتی۔ سو کھا چرمرا اسے
اپدیش دیتا کہ وہ سنگم پر جاکر اشنان کر آئے۔

"اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے۔" مہوا بھٹیارن
بولی وہ مہمان کو "ریشم کا آدمی" کہہ کر ہنستی تو ہنستی
ہی چلی جاتی۔

:۹۰:

جو بابتی کا انتظار کرتا رہا۔ آنکھ کا اندھا، نام
نین سُکھ۔

ماما ڈم ڈم مہمان کے ساتھ جوگ مایا کی سیڑھیاں
چڑھتے چڑھتے اپنے بیٹے لوک پال کی تعریف کے
پُل باندھتا رہا۔

مہمان نے سوکھے چرمرُ سے پوچھا کہ رات
کو نیند آجاتی ہے یا نہیں؟

سوکھا چرمرُ دودھ ناتھ کے کندھوں پر
سوار۔ وہ پسینہ پسینہ۔

آدھی سیڑھیاں نیچے، آدھی اوپر۔ دودھ
ناتھ سیڑھیاں چڑھتا رہا۔

:۹۱:

مہمان کی شبھ اچھائیں راس آئیں۔
گھی کے دیئے جلے
کلامنڈپ میں بھرت ناٹیم ناچتے ناچتے کاشی بائی
نے دودھ ناتھ کے گلے میں برمالا ڈالی۔
"اب ممتا کے پھول کھلیں گے۔" سوکھے چرمرُ
کا آشیرواد۔

:۹۲:

ہوا سویرا
دوُدھ ناتھ نے دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
دلہن مسکرائی

:۹۳:

ایک بادل اُدھر سے چلا، ایک اِدھر سے۔
دل کی بات ہونٹوں پر آئی
کلیانی نے سونے کی تھالی میں بھوجن پروسا۔
سونے کا گڑوا، گنگا جل پانی!
مردنگ پر تھاپ۔
مردنگ نہ ہوتا تو کیا تھاپ نہ پڑتی۔
مردنگ کا بھی کیا بھروسا؟
آج ایک کے ہاتھ میں، کل دوسرے کے!

:۹۴:

دھُونی کے پاس بیٹھا جوگی سلیکھا کے کاکوں
کی گنتی کے پتھر جوڑتا رہتا۔
ایک دن جوگی نے سُلیکھا کو روک کر کہا
"دیکھ اپنے پاپوں کا پربت"
ہونٹوں پر زہریلی مسکان
سلیکھا وہیں ڈھیر
اسی سمے جوگی نے بھی دم توڑ دیا۔

:۹۵:

لمبی قطار میں چلتے چلتے ایک چیونٹی بولی۔
"بھاری پتھر دیکھا اور چوم کے چھوڑ دیا!"

:۹۶:

کیتکی کی یہی کامنا کہ کلامندر کے سامنے کی دوسری
چٹان کو کاٹ کر انترمن اسے دیپ دان کی مُدرا
میں دکھائے
انترمن ایک چٹان کو کاٹ کر جوگ مایا کے
مورکی مورتی گھڑتا رہتا، جیسے تمھارے نے

موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

:۹۷:

پُورَب پچھم، اُتر دکھن۔ کاتاکی جے جے کار۔
لوک پال کی نئی کہانی " تم ڈال ڈال، ہم
پات پات "
دھواں زیادہ آگ کم!
سات جنم کی بات۔
" اپنے گھر سے چلی گا تھا۔ گھوم پھر کر وہیں
لوٹ آئی " مہوا بھٹیارن بولی۔
ستر سال، سات مہینے اور سات دن کا ہوکر
آدمی دیوتا بن جاتا ہے۔ یہ تو مہمان کے دیش میں
بھی کہتے ہوں گے۔
سو کھے چُرمُر کو دیوتا بنے تیس سال سے اوپر
ہو گئے۔

مہمان کی پانڈولپی کا ایک نام " اک شتابدی
میرے اندر، اک شتابدی باہر۔"

:۹۸:

سپت رشی کا بسایا کتھا گرام۔ جیسے ناری کے
ماتھے کا جھومر۔
" اپنے دیپ آپ بنو!" سپت رشی کا اَنتم بول
دیپ دان تو ہر سال ہوتا ہے۔ لیکن ہم آج
تک آپ اپنے دیپ نہ بن پائے
جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا؟
جنگل نہ ہوتا تو کیا مور نہ ناچتا
مور کا بھی کیا وشواش۔
آج اس جنگل میں، کل اس جنگل میں

:۹۹:

مور کی ہتھیا کی بات کیسے چھپے رہتی؟
ماما ڈوم ڈم اسے بھی لے آیا کٹھ پتلی کے کھیل میں۔

مرتے مرتے مور کے منہ سے نکلا۔
" ہے رام!"

:۰۰:

پانڈورنگ بھی تھا ان لوگوں میں، جو مور
کی لاش کے پاس بیٹھے رات بھر جاگتے رہے۔
رہ رہ کر اس کے من میں یہی وچار اٹھتا
کہ کہیں مور کے لہو کے چھینٹے ہمارے ہاتھوں پر
تو نہیں لگے۔
آج بھی ریشم بنتے بنتے وہ اپنے آپ سے پوچھتا
رہتا کہ کہیں ہم بھی تو مور کے ہتھیارے نہیں ہیں

:۰۱:

جوگ مایا کا نیا ہاتھی ایراوت ــــ قابو سے
باہر۔
نیا مہاوت ایک دم اناڑی۔ انکس سے کام
لینا نہیں جانتا۔
ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، راستے سے ہٹ جاؤ
بے قابو ہاتھی آ رہا ہے۔
" مہاراج! انکس تو گاتھا کو بھی چاہیے"
مہوا بھٹیارن کی تان یہیں ٹوٹی۔
مہمان نے کہا۔ " میرا نام چنگ چانگ ہے
کے اس پار میرا گھر، جہاں سے ریشم آتا ہے
سے بات بن سکتی تو میں یہاں بھاگ کر کیوں
تم سب بھول گئے۔
مور نے یہ بھی تو کہا تھا ــ
سب کو سنمتی دے بھگوان!

نخشب جارچوی

(۱۹۲۰ء — ۱۹۶۷ء)

محمد مشتاق شارق

اختر عباس نام۔ نخشب تخلص۔ وطن جارچہ ضلع بلند شہر۔ نخشب کے والدین عرصہ ہوا ترک سکونت کرکے میرٹھ آگئے تھے۔ جارچہ کی محض نسبت تھی ورنہ اصل وطن میرٹھ تھا۔ تعلیم صرف ہائی اسکول تک پائی تھی مگر ذاتی کاوش سے استعداد علمی پیدا کرلی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں، امروہے کے ایک مشاعرے سے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا پھر کچھ مشاعرے اپنے مکان پر کرائے۔ ابتدا میں نخشب مختلف اساتذہ کے رنگ میں شعر کہہ کر اپنی غزل پڑھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قسم کا نیاپن تھا۔ سامعین اس سے لطف اٹھاتے تھے اور توجہ سے شعر سنتے تھے۔

نخشب بڑی حسین و جمیل شخصیت کے مالک تھے۔ کشیدہ قامت، گورا رنگ، خوبصورت نقش و نگار کچھ دن تک کھدر کے کرتے اور پاجامے کا شوق رہا پھر قیمتی شارک اسکن یا سیاہ سرج کی عمدہ سلی ہوئی شیروانی۔ اسی کپڑے کی ٹوپی، چوڑی دار پاجامے اور جودھپوری جوتے کو مستقل طور پر اپنے لیے اختیار کرلیا۔ یہ لباس ان کے جسم پر بھلا بھی لگتا تھا شروع میں بدن چھریرا تھا۔ بعد میں مائل بہ گداز ہو گیا تھا۔

شاعری کی حیثیت سے نخشب بڑے باحوصلہ تھے۔ معاصرین کے مقابلہ میں انہوں نے بہت جلد اپنے آپ کو نمایاں کرلیا تھا۔ ہندوستان کے ہر بڑے مشاعرے میں ان کی شرکت لازمی تھی۔ ان کا ترنم سادہ مگر پرکشش تھا۔ اس میں تصنع اور سُروں کی نمائش کو دخل نہ تھا۔ بھاول پور کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں۔

> "اس مشاعرے میں مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ حضرت سیماب اکبر آبادی جناب جوش ملسیانی میرے والد محترم محروم صاحب، اسد ملتانی اور اختر صہبائی بھی تشریف لائے تھے لیکن جو رنگ نخشب جارچوی اور شعری بھوپالی نے جمایا وہ کسی سے نہ جم سکا۔"[۱]

نخشب جارچوی کی سیرت کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ ریاکاری کو اسمیں مطلق دخل نہ تھا بڑی جلدی تعلقات پیدا کرلیتے تھے۔ سہارنپور سے دہلی تک ریل انکی تھی۔ جب جی چاہے خود چلے جائیں جب جی چاہے دوسروں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ بھی معمولی درجے میں نہیں فرسٹ کلاس میں ۱۹۴۴ء کی بات ہے میں اس زمانے میں کھاتولی (مظفر نگر) میں ملازم تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے سامنے پی۔ ڈبلو۔ آئی کا بنگلہ تھا۔ وہ میرے احباب میں سے تھے۔ روزانہ شام کو ٹہلتا ہوا ان کے یہاں پہنچ جاتا تھا ایک دن سہارنپور سے آتے ہوئے نخشب صاحب نے مجھے ان کے یہاں بیٹھا ہوا دیکھ لیا۔ گاڑی سے اتر کر میرے پاس آئے کہنے لگے یہ جگہ مشاعرے کے لیے بہت اچھی ہے۔ چائے اور دعوت کا انتظام یہ کر ہی دیں گے۔ اگلے ہفتہ مشاعرہ یہیں ہوگا۔ یہ کہہ کر چل دیے۔ پی۔ ڈبلو۔ آئی کو مشاعرے سے کیا تعلق۔ کہنے لگے میں مشاعرے کے اہتمام سے واقف نہیں آپ انتظام کر دیجیے [illegible]

نے کیا اچھی بات ہے۔ آپ بھی دیکھیں مشاعرہ کیا ہوتا ہے
چنانچہ اگلے ہفتہ شام کی گاڑی سے فیض جھنجھانوی، ماہر دہلوی
ماہر القادری اور شکیل بدایونی اور نہ جانے کتنے شاعروں
کو لے کر آ گئے۔ صبح تک مشاعرہ چلا۔

بھاول پور کے جس مشاعرے کا ذکر جگن ناتھ آزاد
نے کیا ہے۔ اسی مشاعرے کے تذکرے میں انہوں نے
بیان کیا ہے کہ مخشب جسکے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ریت
کی زیادتی سے سب کے کپڑے خراب ہو گئے تھے اور تمام
جسم پر ریت جم گیا تھا۔ "سب اسی خیال میں تھے کہ
بھاول پور پہنچ کر اطمینان سے منہ ہاتھ دھوئیں گے۔
مخشب کو نہ جانے کیا سوجھی، حضرت ایک اسٹیشن پہلے
غائب ہو گئے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلے گئے۔ جب
ریل بھاول پور پہنچی تو کیا دیکھتے ہیں کہ آپ جناب
نہائے، دھوئے صاف ستھرے لیے بال سنوارے،
سیاہ شیروانی زیب تن کئے سیکنڈ کلاس سے برآمد
ہو رہے ہیں..... حکومت کی طرف سے جو لوگ ہمارے
استقبال کے لیے آئے تھے، وہ بھی دھوکہ کھا گئے۔ وہ
بزرگ شعراء سیماب اکبرآبادی، والد محترم محروم صاحب
جوش ملسیانی، اسد ملتانی وغیرہ کے لیے ہار لے کر آئے
تھے۔ وہ انہوں نے سب کے سب مخشب جارچوی کے گلے
میں ڈال دیئے اور ان کے علاوہ کسی شاعر کو درخور اعتنا
ہی نہ سمجھا۔ اسٹیشن پر ہماری سواری کے لیے کار تھی
اور ایک لاری جو ٹرک کی طرح پیچھے سے کھلی تھی۔ انہوں
نے کار تو مخشب جارچوی صاحب کو پیش کر دی اور لاری
میں باقی سب شعراء کو سوار کرا دیا۔" ایسی نہ جانے ان
کی کتنی باتیں ہیں، اگر بیان کی جائیں تو تذکرۂ فسانہ بن
جائے۔ مختصر یہ کہ مخشب جارچوی کی فطرت میں جہاں سادگی
تھی وہیں شوخی بھی تھی۔ آخر میں وہ فلمی دنیا اور ریس
(گھوڑ دوڑ) کے ہو کر رہ گئے تھے۔ فلم زینت کی مشہور
قوالی ہے

آہیں نہ بھریں شکوہ نہ کیا، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا

سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ان کی ایک
اور غزل ہے

بڑی مشکل سے دل کی بےقراری کو قرار آیا

بھی بڑی مقبول ہوئی۔ پھر وہ خود اپنی فلمیں تیار کرنے
لگے۔ انتقال سے کچھ دن پہلے مخشب جارچوی پاکستان ہجرت
کر گئے۔ بے اعتدالیوں کی وجہ سے ہندوستان ہی میں ان
کی صحت پر خراب اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ کراچی جا کر
گیس اور اختلاج قلب کی شکایت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک دن
ریس کے گھوڑوں کو دیکھ کر واپس ہو رہے تھے کہ دل
کا دورہ پڑا۔ ان کے چھوٹے بھائی حکیم امیر حیدر نے دوا بھی
چاہی مگر وہ جاں بر نہ ہو سکے اور ۲۵ اگست ۱۹۶۷ء
کو بعمر سینتالیس سال اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ برسوں
پہلے وہ خود ایک مقطع میں اس کا اظہار کر چکے تھے ؎

آپ مخشب اضطرابِ دل سے کیوں گھبرا گئے
رفتہ رفتہ یہ کڑی مشکل بھی سر ہو جائے گی

مذہباً مخشب شیعہ تھے مگر تھے بہت غیر متعصب
والد نے جارچہ کے ایک اچھے گھرانے میں شادی کر دی
تھی مگر انہوں نے بیوی کو کبھی بلایا نہیں۔ ہاں خرچ
دیتے رہے بعد میں طلاق دے دی تھی۔

مخشب شاعر سے زیادہ انسان تھے۔ وہ میرے
خصوصی احباب میں سے تھے۔ بڑے بے تکلف اور صاف
دل کبھی کسی مصرعہ یا ترکیب سے مطمئن نہ ہوتے تو مجھ
سے یا اظہر رامپوری سے برملا اظہار کر دیتے اور اکثر
ہمارا مشورہ قبول کر لیتے۔ ایسے موقعوں پر ان کی
عادت یہ تھی کہ مناسب تمہید کے بعد کہتے "چلو گھر تک
چلیں، چائے پئیں۔" راستے میں کھانے کا کچھ سامان
خریدتے اور پھر مصرعہ یا ترکیب پر بحث شروع ہو جاتی
ایک دن کہنے لگے کئی دن سے ایک لفظ بدلنا چاہتا ہوں
مگر بدل سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے کہا مصرعہ پڑھیے
انہوں نے پڑھا مصرعہ

اگرچہ درد ہوں لیکن لبوں پر آہ نہیں

کہنے لگے "اگرچہ" کھٹکتا ہے۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا یہاں لفظ 'تمام' رکھ دیجئے۔ پھڑک اٹھے۔ اس دن سے اسی صورت میں شعر پڑھتے تھے پورا شعر یہ ہے ؎

تمام درد ہوں لیکن لبوں پہ آہ نہیں
بقید ضبط محبت کوئی گناہ نہیں

نخشب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ انہیں سبھی اساتذہ کے معیاری شعر یاد تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تو معمولی ترمیم سے بعض اشعار کو اپنا لیتے۔ وحید الہ آبادی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

اسے نخشب نے اس طرح اپنایا ؎

چلا جو کوچۂ جاناں کی سمت میں نخشب
تو دور تک مجھے سمجھانے زندگی آئی

اسی طرح انہیں ہر مشاعرے کے کامیاب شعر یاد تھے وہ اس پر بہت غور و خوض کرتے تھے کہ کس خوبی کی وجہ سے کون سا شعر مقبول ہوا۔ اس سلسلے میں اظہار رامپوریؒ کی دوکان پر کئی کئی روز تک بحث ہوتی۔ کہتے تھے کہ اس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا اور اچھے برے شعر کا امتیاز پیدا ہوا۔

کاش نخشب فلمی دنیا سے دور رہ کر شعر و سخن کی خدمت میں لگے رہتے۔ ۱۹۴۵ء میں "مشعلِ راہ" کے نام سے نخشب نے اپنا مجموعۂ کلام شائع کرایا تھا۔ یہی ان کا ادبی ترکہ ہے جو اردو شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں انتخاب کلام ملاحظہ فرمائیں:۔

آیا تو انقلاب زمانہ بروئے کار
لیکن تری نظر کا سہارا لئے ہوئے

وہ نظریں مرے دل کا منشا سمجھ کر
مجھے چھینے لیتی ہیں اپنا سمجھ کر!

جنوں کے دور میں ایسی بھی اک گھڑی آئی
کہ اپنے حال پہ بے ساختہ ہنسی آئی!

جو نظر جلوؤں کی زد میں آ گئی خیرہ ہوئی
ہم تمہیں بچ کر تمہاری رہگذر سے دیکھتے

اپنے مرکز پر ہی ہوتی ہے ہر اک شے بے نقاب
گردش ایام کو ہم تیرے در سے دیکھتے

جوش میں آئے تو دامن کی اڑا دیں دھجیاں
ہوش میں آئے تو کانٹوں سے رفو کرتے رہے

حریم ناز ہے یہ جلوہ گاہ طور نہیں
یہاں نظر نہیں دل آزمائے جاتے ہیں

جیسے تنہا دلِ مجبور ہی محسوس کرتا ہے
کچھ ایسی گفتگو بھی میرے ان کے درمیاں آئی

کوئی کس طرح راز الفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

یہ عالم بھی گذرا تری انجمن میں
نہ اٹھا ہی جائے نہ بیٹھا ہی جائے

جھجک کر گفتگو کرتا ہے اپنا راز کہہ دینا
اسی نازک سے پردے میں تمنا پائی جاتی ہے

احترامِ حسن خود بیں کا تقاضہ تھا یہی
باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر سے دیکھتے

کب تک آخر شکوہ سنجِ بے رخی نخشب نہوں
یہ روّیہ آ رہے ہیں عمر بھر سے دیکھتے

ح۱ باتیں ہماری یاد رہیں۔ مطبوعہ ضمیمہ قومی آواز مورخہ ۳ جولائی ۱۹۷۷ء

ح۲ فیضؔ جھنجھانوی۔ دہلی پولیس میں ملازم تھے۔ ان کے کمالات شعری سے متاثر ہو کر سر شانتی سروپ بھٹناگر نے اپنے محکمہ میں ان کی خدمات منتقل کرالی تھیں۔ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور اچھا پڑھتے تھے۔ ان کی شاعری عام سطح سے بلند تھی۔ آبشار کے نام سے ان کا مجموعۂ کلام چھپ

چکاہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :۔

زندگی کو تو مری عقدۂ مشکل نہ بنا !
برق رکھ دے مرے سینے میں مگر دل نہ بنا

فکرِ نشیمن و غمِ گل سے نجات ہے
بجلی مرے لیے نگۂ التفات ہے

فقط نظر کو چراغِ رہِ طلب نہ سمجھ
ضرور گم شدگی بھی ہے جستجو کے لیے

نمبر۳ ماہر القادری (۱۹۰۶ء ــ ۱۹۷۸ء) بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ حیدر آباد میں کچھ دن مہاراجہ کرشن پرشاد شادؔ کے دربار سے منسلک رہے۔ تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے۔ کراچی سے ایک ماہنامہ ’فاران‘ کے نام سے نکالا۔ اچھا کہتے اور اچھا پڑھتے تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :۔

ساقی کی نظر آج گھٹاؤں کی طرف ہے
برسات کی ہر بوند گہر ہو کے رہے گی

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھادی

میرے حالِ دل کی کس صورت سے رسوائی ہوئی
روک لی ظالم نے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی

نمبر۴ شکیل بدایونی (۱۹۰۶ء ــ ۱۹۷۰ء) وطن بدایوں۔ جگر مراد آبادی سے استفادہ کیا۔ مختلف مقامات پر ملازمت کرنے کے بعد آخر میں فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اچھا کہتے تھے اور اچھا پڑھتے تھے۔ ان کے فلمی گیت بہت مقبول ہوئے۔ پانچ شعری مجموعے شائع ہوئے۔ نمونۂ کلام :۔

راہبر کی نہ فکرِ منزل کی !
کر رہا ہوں میں پیروی دل کی

بے تعلق ترے آگے سے گزر جاتا ہے
یہ بھی اک حسنِ طلب ہے ترے دیوانے کا

اے شکیلؔ ان کی محفل سے جاتے تو ہو
اور اگر دل نے پوچھا کہاں چل دیے

تو نے سوچا کبھی دامن کو بچانے والے
کچھ سکت ہاتھ میں ہوتی تو یہ داماں ہوتا!

نمبر۵ باتیں ہماری یاد رہیں۔ مطبوعہ ضمیمہ قومی آواز مورخہ ۳ جولائی ۱۹۷۷ء

نمبر۶ اظہار رام پوری (۱۸۹۹ء ــ ۱۹۷۱ء) دہلی بازار، میرٹھ میں ان کی تمباکو کی دوکان شاعروں کا اڈا تھی۔ صاحبِ فن تھے۔ مزاج میں شوخی کو دخل تھا۔ ’ماہ و انجم‘ کے نام سے ان کا انتخاب کلام شائع ہو چکا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے

شائستۂ مذاقِ محبت ہے اس کا درد
دل دے کے جس نے درد لیا ہو جواب میں

مجھے اظہار اب صبحِ وطن کی یاد کیا آئے
بڑی غم خواریاں کی ہیں سوادِ شام صحرا نے

بزعم عقل کھاتا ہے فریبِ آگہی کیا کیا
مگر ہوتا ہے کیا اور سوچتا ہے آدمی کیا کیا

عمل نہیں ہے تو ممکن نہیں حصولِ کار
تمام عمر ہو آہ و فغاں تو کیا ہوگا

یہ کیا کہ نہ ہو میری ہی قسمت میں تغیر
کچھ اور ہے یہ گردشِ ایام نہیں ہے

مانگے کا اجالا

اقبال ایک شاعر

اقبال کی سیاسی حیثیت کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا ہے کہ اقبال پر سوچنا ایک خطرناک بات ہے۔ کیوں کہ خیال بہر حال ایک آزادی کا طالب ہوتا ہے اس کے وجود کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ وہ پہلے سے کسی نتیجے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ سوچنے کے معنی اختلاف کرنے کی آزادی کے ہیں، خواہ انجام کار ہم اختلاف کرنے کی بجائے اتفاق ہی کریں۔ خیال ہمیشہ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے جس کے دونوں رخ آزادانہ طور پر کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم اس تلوار کو استعمال کرنے کی نہ صلاحیت رکھتے ہیں نہ ہمت۔"

بہر حال سلیم احمد نے اس تلوار کو استعمال کر ڈالا ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ اس کے استعمال کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور ہمت بھی۔ اور دو دھاری تلوار کے طور پر ہی استعمال کیا ہے۔ تلوار کے دونوں رخ آزادانہ طور پر کھلے ہوئے ہیں پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ کون سا رخ کس وقت بروئے کار آ جائے پس کوئی اس گمان میں نہ رہے کہ چوں کہ سلیم احمد نے اس کتاب میں علامہ اقبال کے بارے میں سوالات اٹھائے ہیں اعتراض کئے ہیں۔ اس لئے اقبال کے معترضین بچ کر نکل گئے ہیں۔ سلیم احمد نے انہیں بچ کر نہیں جانے دیا ہے، جہاں جہاں بیچ میں آئے ہیں ان پر خوب تلوار چلائی ہے ــــ مثلاً کہیں یہ سن لیا کہ فیض صاحب نے اقبال کو موچی دروازہ کا شاعر کہا ہے بس فوراً ہی تلوار نیام سے نکل آئی، ویسے فیض صاحب نے یہ بات کہاں لکھی ہے یا کس سے کہی ہے۔ اگر کسی کی زبانی یہ بات پہنچی ہے تو سلیم احمد نے کیا اطمینان کر لیا ہے کہ راوی معتبر ہے خیر یہ روایت صحیح بھی ہو پھر بھی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ اس سے یہ تو پتہ چل ہی گیا کہ سلیم احمد علامہ اقبال کے بارے میں جذباتی بھی ہو سکتے ہیں اور طیش میں آ کر اچھا دفاع بھی کر سکتے ہیں۔ اس مضمون میں اس شمشیر زن نے فیض صاحب کے ساتھ ساتھ ان سب نقادوں کو بھی نپٹا دیا ہے جنھوں نے بربنائے ترقی پسندی یا اپنی سیکولر سوچ کی بنا پر "شکوہ" اور "جواب شکوہ" پر ناک بھوں چڑھائی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اغیار سے نپٹنے کے بعد سلیم احمد خود اس مضمون کے بارے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اقبال سے اختلافات ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ باہر والوں کو اس سے شہ نہیں ملنی چاہئے۔

اقبال سے اختلافات کو سلیم احمد اپنا اندرونی معاملہ اس بنا پر سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال میں اقبال ہمارے وجود کا حصہ ہیں۔ جب ہم اقبال کے بارے میں سوچتے ہیں تو در اصل اپنے بارے میں سوچتے ہیں۔ سلیم احمد کی یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے مگر اس بات سے ایک بات اور سمجھ میں آتی ہے۔ محض اقبال کی سیاسی حیثیت کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ خوف نہیں بیٹھا ہے کہ اقبال پر سوچنا ایک خطرناک بات ہے اس کے ساتھ اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ اپنے اندر جھانکنا، اپنے اندر اترنا ایک خطرناک کام ہے۔ سلیم احمد پوچھتے ہیں کہ "کتنے لوگوں نے اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے" اور کہتے ہیں کہ "اقبال پر اب تک جو

کچھ لکھا گیا ہے اس کا نوے فی صد حصہ اقبال کے خیالات اور نظریات کی تشریحات پر مشتمل ہے" وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی۔ اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی کوشش میں اندیشہ یہ تھا کہ کہیں اپنی ذات سے آنکھیں چار نہ کرنی پڑ جائیں سہولت اسی میں نظر آئی کہ تخلیقی تجربے سے منہ موڑ کر خیالات اور نظریات کی تشریح شروع کر دی جائے اور جتایا جائے کہ اقبال شاعر نہیں بلکہ مفکر تھے تخلیقی تجربے کا تبادل خیالات و نظریات سوچنے کا نعم البدل عقیدت مندی۔ سلیم نے اسی کتاب میں کہیں اورنگ زیب کے بارے میں ایک دور رس بات کہی ہے "اورنگ زیب میں بابر کا شاعر اور شہنشاہ مساوی قوت رکھتے ہیں مگر اورنگ زیب کے حالات کا تقاضا ہے کہ شاعر کو قتل کیا جائے اور شہنشاہ کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ اورنگ زیب کا المیہ بھی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی" بس تب سے اب تک ہمارا یہی المیہ چلا آ رہا ہے۔ شہنشاہیت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے حالات کا تقاضا یہ ٹھہرا کہ شاعر کو قتل کیا جائے اور مصلح کو کو آگے بڑھایا جائے —— پاکستان میں تو یہ تقاضا اور بھی شدید ہو گیا ہے، جو لکھنے والا اس تقاضے کو پورا نہیں کرتا، وہ ترقی پسندوں کی لغت میں رجعت پسند ہے اور محبان وطن کے حساب سے وطن دشمن ہے۔ پاکستان میں پائی جانے والی یہ مخلوق اقبال سے بھی یہ تقاضا پورا کرا کے مانی۔ اس نے اقبال کے یہاں شاعر کو قتل کیا اور مصلح اور مفکر کو آگے بڑھایا۔ اقبالیاتی تنقید یہی کچھ ہے۔

سلیم احمد نے اس کتاب میں یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اقبالیات کی وجہ سے ہمارا اقبال کے ساتھ رشتہ جو مردہ ہو گیا ہے اسے پھر سے تازہ کیا جائے" اقبال کو اپنے وجود کے اندر زندہ کیا جائے۔ کیسے کیا جائے۔ طریقہ انہوں نے یہ سوچا ہے کہ خیالات و نظریات کی تشریح کو خیرباد کہہ کے اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کتاب اولاً اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی کوشش ہے۔

اب اقبال کا تخلیقی تجربہ اس نوع کا تو ہے نہیں جس نوع کا میر کا یا غالب کا تخلیقی تجربہ ہے۔ اقبال کے تخلیقی تجربے کا خمیر برصغیر کی مسلمان قوم کے تجربوں سے اٹھا ہے۔ بالخصوص اس کی ناکامیوں کے تجربوں سے تو اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی کوشش بالواسطہ طور پر برصغیر کے مسلمانوں کے تجربوں کو بھی سمجھنے کی کوشش بن جاتی ہے۔ اسی لئے تو سلیم احمد نے اقبال کے ترقی پسند نقادوں کو اغیار میں شمار کیا ہے کہ انہیں تو مسلمان قوم کے تجربوں سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ سو وہ اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھیں گے کیسے۔ سو وہ اقبال پر جو اعتراض کریں گے وہ اسی ناسمجھی کی بنا پر ہو گا اس لئے غلط ہو گا۔ اسی خیال کے تحت سلیم احمد پہلے اقبال کے معترضین کو رفع دفع کرتے ہیں۔ پھر مسلمان قوم کے ان تجربوں کی روشنی میں اقبال کے تخلیقی تجربے کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں اور بیچ بیچ میں سوال اٹھاتے ہیں — اسی لئے ایسے مقام بھی آئے جب سلیم احمد اقبال پر سوال اٹھاتے اٹھاتے اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ شاعر اگر تجربے کی تہہ تک نہیں گیا تو یہ اس کی اپنی جھجک ہے یا مسلمان قوم کی۔ مثلاً "شکوہ" کے بارے میں کہ "اس میں مسلمانوں کے دلوں کا ایک چور پکڑ آ گیا ہے لیکن اقبال میں یہ سہار نہیں ہے کہ اس تجربے کی تہہ میں ذرا دور تک اتر سکیں۔ یہ سہار اقبال میں نہیں ہے یا خود مسلمانوں کے تجربے میں کوئی ایسی بات ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اس تجربے کے اندر ہی نہیں اتر سکے"

مگر سلیم احمد ہر جگہ اس نکتہ کو یاد نہیں رکھتے۔ اچھا ہوتا کہ اقبال کی زمین سے لاتعلقی کو بھی وہ اس طور سمجھنے کی کوشش کرتے کہ زمین کی سہار اقبال میں نہیں تھی۔ یا خود مسلمانوں کے تجربے میں کوئی ایسی بات تھی ان کے لئے کوئی بڑا روحانی تجربہ نہ بن سکی۔ سلیم احمد کہتے ہیں کہ "اقبال جبلت اور زمین دونوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے" بڑی حد تک یہ ٹھیک بات ہے۔ مگر ایک وقت یہ ہے کہ اقبال کا جب زمین سے کوئی تعلق قائم ہوتا نظر آتا ہے تو سلیم احمد کی عقلیت رستے میں آن کھڑی ہوتی ہے۔ اقبال کے ایک شارح نے ان کے شاہین کا ماخذ ان کے بچپن کے ایک تجربے میں تلاش کیا" اقبال کو بچپن میں کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ لیکن ان کے کبوتر جب اڑان پر آتے تو باز، شکرے اور بحری، ان کے کبوتر پکڑ لے جایا کرتے جس سے اقبال کو بڑا دکھ ہوتا تھا۔ بعد میں بچپن کا یہی تجربہ ان کے تصور شاہین کی شکل میں برآمد ہوا" سلیم احمد ہنستے ہیں

یہ کیسی بچکانہ بات ہے۔ بلند سطح پر وہ ان کے شارحین کو
سمجھتے ہیں جنہوں نے شارحین کا ماخذ نطشے کے یہاں تلاش
یا ہے۔ اس سے بھی بلند سطح انہوں نے اپنے لئے تلاش کی
ہے کہ انہوں نے دوسرے شارحین سے آگے نکل کر یہ پتہ
لگایا ہے کہ نطشے کے یہاں اس علامت کی کیا صورت تھی
ور اقبال کے یہاں آکر اس کی کتنی قطع و برید ہو گئی ہے سلیم احمد
ی عالمانہ تشریح واقع قابل قدر ہے۔ مگر مجھے ایک اور وسوسہ
ستا رہا ہے کہ کہیں سلیم احمد کے ساتھ بھی اور نگ زیب والی
اردات تو نہیں گزر گئی۔ سلیم کے یہاں ایک وقت میں شاعر
ور عالم مساوی قوت رکھتے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حالات
ے تقاضے کے تحت شاعر بچھڑ گیا اور عالم طاقت پکڑ گیا۔ شاید
ماخذ بچپن میں تلاش کرنے کی کوشش کو تحقیر سے دیکھنے والا
سلیم احمد شاعر سلیم احمد نہیں ہے، عالم سلیم احمد ہے۔ عالم سلیم احمد
س توجیہ پر حاشیہ چڑھاتے ہیں "ذرا سی نفسیاتی باریک بینی سے
ور کام لیا جائے تو ان کا تصور قوت، امام بخش گاما پہلوان
کشتی دیکھ کر پیدا ہوا ہوگا اور ممکن ہے کہ ساقی نامہ والا
صور حرکت سیال ٹونٹ کی کسی ندی میں نہانے کا ردعمل ہو"
یں اگر مضمون لکھ رہا ہوتا تو یہی فقرے جو سلیم نے طنزیہ
ہجے میں لکھے ہیں بہت سنجیدگی سے لکھتا تخلیقی تجربہ کتابی
طالعہ سے جنم نہیں لیتا۔ ایسے ہی تجربوں سے نشو و نما پاتا
ہے جنہیں علما بچکانہ باتیں سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں

اور اس لئے بالعموم تخلیقی تجربے کو سمجھنے سے قاصر رہتے
ہیں اور دریا عالم سے بے شک کچھ نہ کہے تخلیقی
آدمی کو تو بہت کچھ دیتا ہے۔ میر انیس اگر گومتی سے سیراب نہ
ہوتے اور فرات ان کے تصور میں موج زن ہوتا تو
مجھے شک ہے کہ ایسی روانی پیدا ہوتی جو ان کے کلام سے
مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

بہر حال اقبال ایک شاعر، ایک فکر انگیز کتاب ہے
اقبالیاتی تنقید کا تو یہ حال ہو چکا ہے کہ کتاب پڑھتے چلے
جائیے کوئی ردعمل ہی نہیں ہوتا۔ مگر یہ کتاب ہمیں جھنجھوڑتی
ہے۔ اسے آرام کے ساتھ نہیں پڑھا جا سکتا۔ یہ کتاب
اتنا بے آرام کرتی ہے اور سلیم کے اٹھائے سوالات اتنا
بے اطمینان کرتے ہیں کہ آدمی اقبال کے بارے میں نئے سر
سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے یہ کتاب اقبال کے بارے
میں نئے سرے سے سوچنے کی تحریک ہے اور مجھے
کچھ ایسی جھرجھری آ رہی ہے کہ علم بہت ہو چکا۔ اب اقبال
کے بارے میں کچھ بے علمی کی باتیں ہونی چاہئیں کیونکہ
یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے کہ رستم زماں گاما پہلوان حکیم
الامت علامہ اقبال کے ہم عصر تھے اور ان کے بعد ہماری
پہلوانی اور شاعری دونوں کا درجہ کم ہوتا چلا گیا۔

انتظار حسین ——— شب خون آلہ آباد

ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں

کے معاشی معیار کو بلند کرنے کی سمت میں

دلی انتظامیہ کی کامیابیاں

- ہریجنوں اور کمزور طبقوں کی بھلائی کی اسکیموں پر تیزی سے عمل۔
- ہریجن بہبود پر گزشتہ سال انتظامیہ نے ۷۰ لاکھ روپے صرف کئے جب کہ اس سال ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے کی اسکیموں پر عمل درآمد۔
- ۳۷ ہریجن گھرانوں کو بسیں خریدنے کے لئے مالی امداد۔
- ایک ہزار سے زیادہ ہریجن طلبہ کو چار لاکھ ۲۵ ہزار روپے کے وظائف۔
- ۲۰۰ روپے سے کم آمدنی والے ہریجن والدین کے بچوں کو ۴۵ روپے فی بچہ کے حساب سے وظائف۔
- پسماندہ طبقوں اور کمزور طبقوں کے ۲۲ ،۷ ،۵ طلبہ کو ۱۶ لاکھ ۲۹ ہزار روپے کے وظائف۔
- ہریجن طلبہ وطالبات کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوسٹل۔
- ۵۰۰ روپے سے کم ماہانہ آمدنی والے والدین کے طالب علموں کے لئے ہوسٹلوں میں مفت رہنے کا بندوبست
- مقابلے کے امتحانات میں بیٹھنے والے ہریجن اور پسماندہ طبقوں کے نوجوان لڑکے ولڑکیوں کو مفت تربیت دینے کی سہولت
- ۱۷۸۰ ہریجن کاریگروں کو اپنے دھندے چلانے کے لئے ہر ایک کاریگر کو ۵۰۰ روپے کے مفت اوزار وغیرہ
- ۳۰۰۰ صفائی کرمچاریوں کو ۸ لاکھ روپے کی لاگت کے ٹھیلے۔
- دلی میں تقریباً سبھی ۱۴ ہزار ہریجن گھرانوں کو مکان بنانے کے لئے زمین۔
- ہریجن بستیوں کے سدھار پر ۲۰ لاکھ روپے خرچ۔
- ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کے لوگوں کو مکان بنانے کے لئے ۱۵۰۰ روپے فی گھر کے حساب سے مالی امداد۔
- ہریجن بہبود کے کاموں میں مصروف غیر سرکاری تنظیموں کو ۵۰ فیصد سے ۸۰ فیصد تک مالی امداد

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں اور غریبوں کی حالت سدھارنے میں

سب سے آگے دلی انتظامیہ

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات واشاعت، دلی انتظامیہ دلی۔

بزمِ احباب

تحریک دسمبر ۷۹ء زیرِ مطالعہ ہے۔ افسانوں کو چھوڑ کر باقی تمام حصہ میں پڑھ چکا ہوں۔ سانگے کا اجالا اچھے اقتباسات لئے ہوتے ہے۔ "آئینہ اور پرچھائیں"، پر تبصرہ بہت ہی مختصر اور نامکمل سا ہے۔ تبصرہ نگار نے سبل کرشن رشک کے لہجے کی تازگی، اور سوچ اور احساسات کے معاملے میں ان کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لئے جن اشعار کو شامل بنا کر پیش کیا ہے ان میں کچھ زیادہ جان نہیں —— البتہ اشک صاحب کی تازہ نظم جو اسی شمارے میں شاملِ اشاعت ہے (مجھے کسی سے گلا نہیں ہے) بہت اچھی ہے اور تبصرہ نگار کے اس خیال پر پوری اترتی ہے کہ سبل کرشن رشک صرف غزل کے شاعر نہیں وہ بہت عمدہ نظم بھی کہتے ہیں۔

تازہ شمارے میں غزلیں زیادہ ہیں، جن میں بعض ایک اچھے شعر مل جاتے ہیں، مخمور سعیدی کی غزل کا یہ شعر سادگی کے باوجود کافی پسند آیا۔

تیری باتوں کی طرف دھیان ہمارا نہ گیا
کھوئے کھوئے سے رہے اپنے خیالات میں ہم

اس شعر کو پڑھتے ہی مجھے اپنی پرانی غزل کا یہ شعر بے ساختہ یاد آگیا۔

تازہ شمارے میں ادبی اور تنقیدی مضامین کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے

—— سلیمان خمار بیجاپور

آپ کا مضمون افغانستان پر روسی قبضے کا واحد جواب —— ہند پاک دوستی" بروقت اور اچھا مضمون ہے۔ دنیا کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ آج امنِ عالم کے لئے کوئی خطرہ ہے تو وہ صرف روس ہے مختصر تاریخ اگر دیکھیں تو اس ملک نے ہنگری چیکو سلواکیہ، جرمنی، کوریا، مصر اور اب افغانستان کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ ملک ہنگامے کا قائل ہے اور ان ہنگاموں میں خون بہانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اگر ہمیں دنیا میں حق رکھنا ہے تو ہمیں چاہئے کہ اس ملک کے خلاف بھرپور پروپگنڈا کریں اور چھوٹی چھوٹی طاقتوں کو یکجا کریں تب ہی اس عفریت سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

فرقۂ دانشوراں کے تحت آپ نے جو لکھا ہے وہ درست ہے کیوں کہ چند برسوں پہلے میں بھی اسی نام و نہاد فرقۂ دانشوراں کا اسیر تھا۔ اب میں آزاد ہوں۔ اس لئے اب میں دانشور نہیں ہوں۔ کیوں کہ اب میں سرخ سویرا اور لال پھریرا کے نعرے بلند نہیں کرتا۔

سہیل عظیم آبادی مرحوم واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ رضوان احمد نے بہت مختصر مضمون لکھا ہے جو تشنہ محسوس ہوتا ہے۔ مرحوم سے میری ملاقات گیا میں ہوئی تھی۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ مہاراشٹر کا ایک افسانہ نگار بھی آیا ہوا ہے تو وہ خود ملنے آئے تھے بہت دیر تک ادب پر باتیں ہوئی تھیں۔ رضوان احمد کا ترقی پسندی سے بدظن ہونا حق بجانب ہے

—— احمد عثمانی، مالیگاؤں

اردو کے کتنے رسالے آئے اور چلے گئے مگر تحریک اسی شان اور اسی استقامت سے جاری و ساری ہے تین چار دن پہلے تحریک (اکتوبر نومبر) ملا تب ہی سے یہ احساس کھٹک رہا ہے عرصے سے کچھ نہیں لکھا آپ اپنے کرم سے پرچہ بھیجے جا رہے ہیں مگر ہم جیسے سست قدم لکھنے والوں کا نعم البدل آپ نے ڈھونڈ لیا ہے آپ نے دیس کی دوسری زبانوں کے ترجمے شریک کرکے اردو والوں پر احسان کیا ہے آج یہ خط دراصل آپ کو مبارکباد دینے اور اس کام پر مزید اکسانے کے لئے ہی لکھ رہا ہوں

اردو اکیڈیمیاں اردو کی انجمنیں سیاست بازوں کا شکار بن کر رہ گئیں آخری کوشش یہ کی جا سکتی ہے کہ ملک کی

بڑی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ملا کر کل ہند بنیادوں پر ایک محاذ بنایا جائے (میرا عقیدہ ہے کہ ہر سچا آرٹسٹ انسانیت دوست ہوتا ہے اور درد مند دل رکھتا ہے) تبھی تو وہ حسن اور آہنگ تخلیق کرنے میں ایک عمر لگا دیتا ہے ورنہ مادی آسائشوں کی کسے ضرورت نہیں ہوتی) مگر سوال یہ ہے کہ یہ محاذ تب کیسے بنے جب پچھلی نسلیں اردو کے ساتھ فارسی عربی بھی جانتی تھیں۔

آج انگریزی کے توسط سے یورپین لٹریچر تک ان کی پہونچ ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ اپنے ہی دیس کی بہن زبانوں سے اس کے ادب سے واقف نہیں حالانکہ اس ملک کے باسی ہونے کے ناطے یہ سارا سرمایہ ہمارا ورثہ ہے ہمارا سبھی اس پر اتنا ہی حق ہے جتنا ان زبانوں کے بولنے والوں کا اب دیکھئے اسی شمارے میں آپ نے اڑیا اور مرہٹی کی نظمیں شائع کی ہیں اردو کی بیشتر نظموں کے مقابلے اڑیا کی یہ نظم ہی رکھ لیجئے۔ ایک چھوٹے سے جذبے سے کیسے پھوٹتی لہلہاتی ایک چھتنار پیڑ کی صورت ایک کائی بن جاتی ہے اردو میں ایک نثری نظم بھی یہ پھیلاؤ نہیں سمیٹ پاتی جو راما کانت رتھ کر پاتے ہیں مارڈھیکر نے اب تک لال ہے یہ مٹی میں فضا قائم کی ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ایک مہم کی صورت میں دیسی زبانوں کے ادب کو اردو میں منتقل کرنا شروع کریں تو دوسری زبانوں کے ادیب شاعر ہم سے قریب ہوتے جائیں گے ان کو لگے گا۔ اردو پڑھنے والے ان کو جانتے اور محبت سے پڑھتے ہیں تب وہ کل ہند ادیبوں کے محاذ میں شریک ہو کر ہماری آواز میں آواز ملائیں گے تب وہ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کریں گے اردو تو ہندوستان گیر زبان ہے اس کے لکھنے والے ہر صوبے میں مد رہتے بستے ہیں اپنے اپنے صوبوں کے اچھے ادب کا انتخاب کر کے ترجموں کا کام بڑے پیمانے پر شروع کریں تو یہ پراجکٹ جلد ہی پورا کیا جا سکتا ہے آپ کا وقیع ماہنامہ آپ کی ہمہ گیر شخصیت اگر عمومی طور پر اپیل کر سکے تو اس مہم کا آغاز ممکن ہے اردو اکیڈیمیاں بھی عبرت پکڑیں گی۔ مشترکہ فرنٹ بن جاتے تب ہی اردو کے لئے حق مانگ سکیں گے

———— قاضی سلیم اورنگ آباد

بقیہ صفحہ ۴۶ سے آگے

اس کی نکلیئر آبدوزوں کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے۔ اگر طاقت کے اس اضافے میں نئی ہمہ گیر منصوبہ ہے تو واقعی اس سے جاپان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ غالباً وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے لیکن ان کے عزائم کیا ہیں اس سے ہم بے خبر ہیں، ہم پرسکون ہیں لیکن اپنے عوام کو سوویٹ روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے آگاہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔"

اس سے پہلے بھی جاپان کی دفاعی ایجنسی نے سوویٹ روس کے ارادوں کے بارے میں تشویش ظاہر کی تھی اس ایجنسی نے کہا تھا:

"سوویٹ یونین اس صدی کے چھٹے دہے سے اپنے فوجی بجٹ میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے اب وہ اتنا طاقتور ہے کہ یوروپ اور مشرق بعید میں امریکہ کی فوجی طاقت اور اس کی نکلیئر طاقت کا قوی مدمقابل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اپنی بڑھتی ہوئی بحری اور ہوائی طاقت کی بنا پر سوویٹ یونین کسی وقت بھی امریکہ کے بحری مواصلات میں خلل پیدا کر سکتا ہے۔ اب سوویٹ یونین کی فوجی طاقت اس قابل ہے کہ وہ ایسے خطوں میں مداخلت کر سکے جو روس سے بہت دور ہیں"

روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے جاپان تک کا متشوش ہونا ایسی بات نہیں جسے ہند اور پاکستان آسانی سے نظرانداز کر سکیں۔ افغانستان میں روسی فوجیوں کی موجودگی مسز گاندھی کو بھی ناپسند ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان فوجوں کو وہاں سے ہٹنے پر کیسے مجبور کیا جائے۔ جب تک یہ فوجیں وہاں رہیں گی ہند اور پاکستان کے لیے تشویش کا باعث رہیں گی۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں حکومت ہند جو قدم بھی اٹھائے گی وہ محتاط رہ کر ہی اٹھائے گی۔ کیوں کہ پاکستان کی فوجی طاقت میں اضافہ بھی اس کے لیے تشویش کا باعث ہے لیکن ان لوگوں سے تو خبردار رہنے کی اشد ضرورت ہے جو ہمہ وقت روس کے جرائم کی پردہ پوشی میں مصروف رہتے ہیں وہ کسی وقت بھی دغا دے سکتے ہیں اور اگر گنجائش ہو تو شاید روس کے پانچویں کالم کا فریضہ انجام دینے کے لئے بھی تیار ہو جائیں

مندرجات

پنجاب اور آندھرا کی لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

ماہنامہ تحریک نئی دہلی

شمارہ ۱۲ جلد ۲۷

مارچ ۱۹۸۰

ادارۂ تحریر:

گوپال متل

پریم گوپال متل

سالانہ قیمت: پندرہ روپے فی کاپی: ایک روپیہ ۲۵ پیسے

بیرونی ممالک سے

سالانہ: تین پونڈ فی کاپی: چھ شلنگ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

مینیجر ماہنامہ تحریک ۹۱ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر گوپال متل

مطبع:- نعمانی پریس

مقام اشاعت

۹- انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تحریک سلور جبلی نمبر پر معارف کا تبصرہ

ماہنامہ تحریک، اردو زبان کا مشہور و مقبول ادبی رسالہ ہے، اس کے خاص نمبر اہتمام سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں تحریک کی اشاعت کو پچیس برس ہو گئے تھے، اسی مناسبت سے یہ نمبر شائع کیا گیا ہے، اصلاً اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں بڑا حصہ طبع مضامین، افسانوں اور منظومات کا ہے، اس حصہ میں انگریزی سے لئے گئے دو ترجمے بھی دیئے گئے ہیں۔ ایک موجودہ سیاسی اصطلاحوں کا تعارف اور ان کی مختصر تشریح ہے، اس خاص نمبر کی ابتداء ادبی تحقیق اور تنقیدی مضامین سے کی گئی۔ قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی، معکش اکبرآبادی۔ رشید حسن خاں۔ مشفق خواجہ اور محمد مشتاق شارق کے مضامین ادبی و تحقیقی حیثیت سے اہم اور دلچسپ ہیں۔ شمس الرحمان فاروقی نے موجودہ ادبی تنقید کا اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے گذشتہ پچیس برس کی اردو تنقید کا مبسوط جائزہ لیا ہے، دوسرے مضامین میں اردو کے جدید افسانے اور غزل کا جائزہ لیا گیا ہے، گوپال متل کا اداریہ تحریک کا خاص نقش ہے۔ فاضل مرتب اور سنیہ پرکاش کے مضامین اسی نوعیت کے ہیں۔ اس نمبر کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ ہندوستانی ادیبوں کی طرح یہ متعدد پاکستانی اہل قلم کی نگارشات سے بھی مزین ہے، اور اس کا ایک حصہ پاکستان کے بعض اصناف ادب کے جائزہ کے لئے مخصوص ہے۔ سنجیدہ ادبی مضامین کے علاوہ افسانے، ڈرامے اور نظموں اور غزلوں کا طویل حصہ بھی جاندار ہے، پہلے حصہ میں جناب عرشی زادہ نے مولانا شبلی کے فارسی مجموعہ کلام دستۂ گل بوئے گل اور برگ گل سے منتخب غزلوں کا کامیاب اردو ترجمہ کیا ہے۔ جناب گوپال متل نے خاص انداز سے اس کا مختصر تعارف لکھا ہے، ان غزلوں کے ترجمے کی اشاعت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "شبلی کی علمی اور دینی حیثیت کی طرح ان کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت بھی مسلمات کا درجہ رکھتی ہے"۔ دوسرا حصہ بھی مضامین نظم و نثر کا رنگا رنگ مجموعہ ہے۔ اس میں ملک کی موجودہ سرکاری زبان ہندی کے علاوہ کئی علاقائی زبانوں پنجابی، کشمیری، اڑیہ، تامل، تلگو، مراٹھی، کنڑا، گجراتی اور راجستھانی کے موجود ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان زبانوں کی نظموں اور افسانوں کے اردو ترجمے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس طرح اس نمبر سے اردو زبان و ادب ہی کی طرح ملک کی اکثر مشہور زبانوں کی موجودہ ادبی رفتار اور ہندوستان اور پاکستان دونوں کی آزادی کے بعد کی ادبی سرگرمیوں کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اور نئے ادبی مسائل و رجحانات سے واقفیت ہوتی ہے اور اردو کے متعارف و غیر متعارف ادیبوں کی کد و کاوش کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ نمبر بہت ضخیم ہے۔ ظاہر ہے کہ سب مضامین یکساں نوعیت کے نہیں ہیں۔ خصوصاً جب کہ اکثر لکھنے والے نئے ہوں تو تحریر، طرز نگارش اور خیالات میں ناہمواری بھی ہوگی، مگر موجودہ حالات میں ایسے ضخیم نمبر کی اس قدر سلیقہ اور ڈھنگ سے اشاعت ہی ایک بڑا کام ہے جو گوپال متل جیسے معمر مگر جوان ہمت اردو کے خدمت گذار ہی انجام دے سکتے ہیں، مضامین کے تنوع کی وجہ سے ہر مذاق کے لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، شروع میں تقریباً ڈیڑھ سو ادیبوں اور شاعروں کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں، جن کی نگارشات اس نمبر میں درج ہیں۔

سلور جوبلی نمبر کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ کاغذ کی گرانی کے باوجود قیمت وہی ۵۰ روپے

ابتدائیہ

گوپال متل

لال قلعے کے مشاعرۂ جشن جمہوریت میں سامعین کے ایک گروہ نے جس انداز سے ہنگامہ آرائی کی وہ بہت افسوس ناک ہے۔ چیف ایگزیکٹو کونسلر شری کیدار ناتھ ساہنی اور بیگم خورشید قدوائی کے ساتھ ان کا رویہ بڑا ہی قابلِ اعتراض تھا۔

اردو والوں سے ہم ہمیشہ یہ گزارش کرتے رہے ہیں کہ انہیں اپنے مطالبات پر تو ثابت قدم رہنا چاہیے لیکن ہنگامہ آرائی اور مشتعل ہونے سے اجتناب کرنا چاہیے اس طرح ہمارے مخالفوں کی تعداد بڑھتی ہے اس سے اردو کے کاز کو فائدہ نہیں نقصان پہنچتا ہے۔

دلی ایڈمنسٹریشن کی اردو صلاح کار کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے میں جانتا ہوں کہ شری کیدار ناتھ ساہنی کا رویہ اردو کے تئیں ہمدردانہ ہے۔ اردو کے فروغ اور اسکی ترقی کے لئے ان کے سامنے جو تجویز بھی رکھی گئی اس پر عمل کرنے کی انہوں نے پوری پوری کوشش کی اگر یہ کوششیں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئیں تو اس میں ارادے کی کمی کو دخل نہیں بلکہ اس بات کو دخل ہے کہ دلی میں اسمبلی نہیں اور موجودہ ایڈمنسٹریشن کے اختیارات محدود ہیں۔

دلی میں اردو اکاڈمی کے قیام کی تجویز کا انہوں نے خیر مقدم کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے میں فوراً ہی مصروف ہوگئے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ کام وہ حکومت ہند کی رضامندی اور امداد سے ہی کرسکتے تھے۔ سلسلہ جنبانی میں انہوں نے تساہل نہیں برتا حکومت ہند کے مختلف شعبوں میں یہ ایڈمنسٹریشن اب تک چکر کاٹ رہی ہے۔ اگر تجویز کو عملی جامہ نا حال نہیں پہنایا جاسکا تو کم سے کم شری ساہنی کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

دلی سرکار کے کچھ شعبوں میں کام اردو میں بھی ہونا چاہیے یہ مطالبہ انہوں نے فوراً مان لیا اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے۔

دلی میں ایسے اسکولوں کی قائمی کا مطالبہ جہاں اردو ذریعۂ تعلیم ہو مان لیا گیا۔ اس سلسلے میں جو مشکلات سامنے آئیں ان سے کمیٹی کے ممبروں کو آگاہ کرتے رہے اور اصلاح احوال کے لئے جو جو مشورے دیئے گئے ان پر عمل بھی کیا گیا۔

ان اسکولوں کے لئے تربیت یافتہ استاد نہیں مل رہے تھے۔ اخباروں میں اشتہار بھی دیا گیا لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا آخر شری ساہنی نے صلاح کار کمیٹی سے رجوع کیا اور یہ کہا کہ شرائط میں کچھ نرمی بھی برتی جاسکتی ہے جس ممبر نے جس امیدوار کا نام بتایا اسے انٹرویو کے لئے ... میں تاخیر نہیں ہوتی۔

پھر کتابوں کا مسئلہ تھا۔ درسی کتابوں کے لئے حسب ضابطہ این۔ سی۔ آر۔ ٹی سے رجوع کیا گیا اور محکمہ نے وعدہ بھی کیا لیکن آپ جانتے ہیں اتنے بڑے محکموں میں تاخیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ آخر ساہنی جی نے یہ طے کیا کہ جو کتابیں مقررہ نصاب سے مشابہت رکھتی ہوں انہیں کو داخلِ نصاب کرلیا جائے۔

اوپر کی تفصیلات کو پڑھئے اور پھر بتائیے کہ کیا شری کیدار ناتھ ساہنی اس سلوک کے مستحق تھے جو سامعین کے ایک گروہ نے ان کے ساتھ کیا۔

مجھے کمیونسٹوں کو ایک اور دانشور مل گیا۔ ان نئے دانشور کا نام جگن ناتھ آزاد ہے۔ روس کا دورہ کرنے کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ جو لوگ روس میں تحریر و تقریر کی آزادی پر پابندی کی بات کرتے ہیں وہ رجعت پسند ہیں کیونکہ پراودا اور دوسرے اخباروں میں حکومت پر نکتہ چینی شائع ہوتی رہتی ہے۔ آزاد صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ان کو روسی زبان آتی ہے یا نہیں اگر نہیں تو انہوں نے یہ بات کیسے معلوم کر لی کہ پراودا اور دوسرے روسی اخباروں میں کیا شائع ہوتا ہے۔

آزاد صاحب ترقی پسندی کے میدان میں غالباً نو وارد ہیں۔ ورنہ روس سے ایک ایسی صفت منسوب نہ کرتے جس کا دعویٰ خود روسی حکمرانوں کو نہیں۔ تجربہ کار ترقی پسند اور خود روسی حکام اپنے اعمال پر نکتہ چینی کو سماج دشمن عناصر کا کارنامہ بتاتے ہیں اور ان عناصر کو کچلنے کا جواز بھی پیش کرتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہاں حکومت پر نکتہ چینی کی عام اجازت ہے اور یہ نکتہ چینی سرکاری اخباروں میں شائع بھی ہوتی ہے۔

آزاد صاحب کی روسی زبان سے ناواقفیت کوئی خاص بات نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی اخباروں کو پڑھنا بھی پسند نہیں کرتے ورنہ انہیں سخاروف کے بارے میں ضرور معلوم ہوتا۔ سخاروف کو روسی ہائیڈروجن بم کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اسے نوبل انعام ہی نہیں ملا بلکہ روس کا سب سے بڑا اعزاز آرڈر آف لینن بھی ملا ہے۔ اس شخص کو حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کے الزام میں پہلے گورکی کے مقام پر جلا وطن کیا گیا اور جب اس کے بعد بھی وہ نکتہ چینی سے باز نہیں آیا تو اسے دھمکی دی جا رہی ہے کہ اسے کسی اور مقام پر جلا وطن کر دیا جائے گا جہاں کا ماحول گورکی کے مقابلے میں زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ سخاروف واحد شخص نہیں جسے آزادیٔ اظہار پر مصر ہونے کی سزا ملی ہے بے شمار روسی جو حقیقی معنوں میں دانشور ہیں گورکی اور سائبیریا میں نظر بند ہیں۔ یہ اطلاعات ہندوستان کے سبھی چھوٹے بڑے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں۔ کیا ان تمام اخبارات اور جرائد کے مدیر رجعت پسند ہیں یا یہ کہ آزاد صاحب سرگرمیوں میں اتنے منہمک رہتے ہیں کہ انہیں کسی اخبار کی ورق گردانی کی مہلت نہیں

فروری کے شمارے میں "دل دریا سمندر ڈونگے" کے عنوان سے جو مضمون تھا اس کی آخری چند سطریں شائع ہونے سے رہ گئیں آخری فقرہ اس طرح تھا "پورا نام عبدالباری تھا اشتراکی ادیب بنے تو عبدیت پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے" یہ فقرہ شائع ہونے سے رہ گیا۔ اس کے فوراً بعد میرا نوٹ تھا جس میں یہ اعتراف کیا گیا تھا کہ حسان بن ثابت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ یہ نوٹ بھی شائع ہونے سے رہ گیا۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ کو میں نے خط میں لکھ دیا تھا کہ یہ اعتراف آئندہ شمارے میں شائع کر دوں گا اس سلسلے اب انکی تحریر ملی تو وہ شائع کیا۔

عصری ادب کے تازہ شمارے میں جدید شاعروں کے جرائم کی جو فہرست شائع ہوئی ہے وہ کافی دلچسپ ہے۔

"عادل منصوری صاحب کا مشغلہ نماز پڑھنا ہے جس کا ذکر وہ سوال نامہ کے جواب میں فرماتے ہیں
خلیل الرحمٰن اعظمی جو ایک زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے سکریٹری تھے آخر عمر میں پابند صوم صلوٰۃ ہی نہیں تھے بلکہ نعت وغیرہ لکھنے اور دقیانوسی حد تک مذہبی خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ کمار پاشی ہندو مت کی طرف راغب ہوئے۔ کرشن موہن ویر ساورکر پر نظم لکھنے لگے۔ عمیق حنفی بسم اللہ الرحمٰن سے آغاز کلام کرنے لگے اور نعت وغیرہ تصنیف کرنے لگے۔"

جرائم کی اس فہرست کو پڑھ کر اکبر کا مندرجۂ ذیل شعر یاد آ گیا!

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اردو والوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی ترقی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے ہیں۔ فاروقی صاحب نے ہیں اور مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیت کار کا ثبوت دے چکے ہیں۔ لہٰذا جہاں تک ان کی کارکردگی کا تعلق ہے ترقی اردو بورڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت

سے وہ اپنے فرائض کو اور بھی عمدہ طریقے سے انجام دے سکیں گے کیوں کہ وہ ایک اچھے منتظم ہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب سے انہیں خصوصی دلچسپی بھی ہے۔ اور ایک ناقد کی حیثیت سے پوری اردو دنیا ان سے واقف ہے۔

غالب اکاڈمی میں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا۔ اس کی کارروائی البتہ مایوس کن تھی ایک مقرر نے اردو کی جیلہ صلاحیتوں کو شدید پر محمول کیا۔ باقی مقررین نے اردو کے ایسے مسائل کا ذکر کیا جن کا ان کے منصب سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی مندرجہ بالا صفات کا ذکر یا تو ہوا ہی نہیں یا ہوا تو برائے نام۔ ان کی اپنی تقریر البتہ نپی تلی تھی۔

ڈاکٹر زرینہ ثانی کو ان کی تصنیف سیاب کی رزمیہ شاعری پر مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور بہار اردو اکیڈمی کی طرف سے انعام ملنے پر مبارکباد دیتے ہوئے ہم نے انہیں ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو لکھا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کا کوئی عہدہ نہیں ہے اس غلطی کے لئے میں خود ذمہ دار تھا اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

اطلاع نامہ بابت ماہنامہ تحریک

ازروئے فارم نمبر ۴

وقفۂ اشاعت	ایک ماہ
ایڈیٹر اور مالک	گوپال متل
قومیت	ہندوستانی

پتہ: ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

پرنٹر پبلشر	گوپال متل
قومیت	ہندوستانی

پتہ ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں گوپال متل تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم کے مطابق درست ہیں۔

گوپال متل - پرنٹر بقلم خود

۲۵ فروری ۱۹۸۰ء

گوپال متل صاحب کی علالت

۲۰ فروری کو گوپال متل صاحب کی آنکھ کے موتیا بند کا آپریشن سر گنگا رام نرسنگ ہوم میں ہوا۔ آپریشن کامیاب رہا اور متل صاحب ایک ہفتہ اسپتال میں رہ کر گھر آگئے ہیں لیکن ڈاکٹروں نے ایک ماہ تک لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا ہے۔ تازہ شمارہ متل صاحب نے خود ترتیب دے دیا تھا لیکن ان کی غیر موجودگی میں کچھ بے ترتیبی راہ پا گئی ہو تو نظر انداز فرمائیں۔ اپریل کا شمارہ بھی اسی وجہ سے شائع نہیں ہوگا۔

پریم گوپال متل

افغانستان میں روسی مقاصد سامراجی یا نظریاتی

گوپال متل

جو لوگ یہ آس لگائے ہوئے بیٹھے تھے کہ روسی فوجیں عالمی رائے عامہ سے متاثر ہو کر افغانستان سے واپس چلی جائیں گی انہیں افغانستان کے موجودہ صدر ببرک کارمل کا وہ انٹرویو پڑھ کر کافی مایوسی ہوئی ہوگی جو انہوں نے انڈین ایکسپریس کے نامہ نگار کلدیپ نیر کو دیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ روسی افغانستان کو کب خالی کریں گے افغانستان کے صدر نے کہا کہ جب تک رجعت پسند پاکستان سے قوم پرست چین سامراجی امریکہ اور صیہونی مصر کی سازشوں کو شکست نہ ہو جائے گی۔ گویا جب تک دنیا بھر پر روس کا غلبہ نہیں ہو جاتا روسی افغانستان ہی میں رہیں گے۔

سب سے دلچسپ بات کارمل صاحب نے یہ کہی کہ اکتوبری انقلاب کے بعد سوویت یونین نے کہیں بھی اپنا قبضہ نہیں جمایا۔ غالباً چیکوسلواکیہ کے واقعات کا انہیں علم نہیں۔ اسے چھوڑیئے خوقند کی عارضی حکومت تو اشتراکیوں کے اس وعدے کے پیش نظر قائم ہوئی تھی کہ انقلاب کے بعد مسلم خطوں کو خود ارادیت کا حق حاصل ہوگا۔ لیکن جب یہ عارضی حکومت قائم ہوئی تو روسیوں نے اسے بالجبر کچل دیا اس میں کسی نظریے کو نہیں بلکہ خالص سامراجی عزائم کو دخل تھا۔ سفاروف کوئی امریکی رجعت پسند نہیں تھا بلکہ لینن کا قریبی ساتھی تھا۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں جو ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی لکھا ہے:

"جب ترکستان سوویٹ کی طاقت ایک غیر مقامی اور جارح قوت کی حیثیت سے مسلمانوں کی مخالفت کر رہی تھی تو اسے ایسے ایسے حلیف ملے جن کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ حلیف اسے یورپی قومیتوں میں ملے ان میں آرمینیائی بورژوا تھے سبیریا کے مالدار روسی کسان تھے۔ زارشاہی کے افسر تھے اور روسی پادری تھے۔ ایک استحصال پسند معاشرے کی یہ تمام شاخیں ترکستان میں زارشاہی نوآبادیت کے نمائندوں کی حیثیت سے اشتراکیت کے پرچم تلے اکٹھا ہو گئیں اور یہ قدرتی بھی تھا۔ بائیں بازو کی اشتراکیت ایک بڑے پیمانے پر مقامی آبادی کے غارت گرانہ جاگیردارانہ استحصال کی صورت میں نمودار ہوئی جس میں سرخ محافظوں، آبادکاروں اور افسروں سبھی نے حصہ لیا۔"

افغانستان میں کچھ ایسے قبائل بھی آباد ہیں جو روسی استبداد سے بھاگ کر وہاں آتے تھے کچھ زارشاہی کے عہد میں اور کچھ اشتراکی دور میں۔ انہیں کارمل صاحب کس طرح یقین دلائیں گے کہ روسی افغانستان میں اپنے سامراجی عزائم کی تقویت کے لئے نہیں بلکہ کسی ترقی پسند نظریئے کو فروغ دینے کے لئے آئے ہیں۔

ابھیشاپ

کرشن موہن

میتھن کے لئے شِو پاروتی
ایکانت میں پہنچے مستی میں
جب ان کی خواہش جاگ اٹھی
اک مور کہیں سے آ پہنچا
شِو جی اس دخل بے جا پر
ناراض ہوئے
اور مور کو یہ ابھیشاپ دیا
تیرا جیون
میتھن سے رہے گا وِنچت ہی،
اِس کارن ہی
مور اپنے پاپی پیروں کو
جب دیکھ کے اشک بہاتا ہے۔
تو مورنی آ کر ان اشکوں کو پیتی ہے
یوں زخمِ تمنا سیتی ہے
اور ہو جاتی ہے گربھ وتی
جے ہو شِو جی، سنسار پتی

غزلیں

فضا ابن فیضی

یوں ہی اندھیرے اجالے سے واسطہ رکھنا
ہزار سخت ہوں حالات، حوصلہ رکھنا

معانی بن گئے چہرے کی رفتہ رفتہ گرد
نفس نفس وہی لفظوں سے رابطہ رکھنا

بلا کی بھیڑ ہے باہر، کہیں نہ کھو جاؤ
چلے ہو گھر سے تو اپنا بھی پتہ رکھنا

نہ بھول جانا، نئے شہر میں ہمیں جا کر
ذرا کبھی کبھی ہم سے بھی سلسلہ رکھنا

تمہارے پاؤں کے نیچے کوئی زمیں نو رہے
روایتوں ہی پہ بنیاد تجربہ رکھنا

نئے ہیں ذہن، نئی آگہی، نیا اسلوب
ابھی فضول ہے ترسیل کا گلہ رکھنا

نقوش عصری رویوں کے غیر واضح ہیں
یہ عکس چمکیں گے، شفاف آئینہ رکھنا

نہ پوچھ ہم سے کہ ہم نے کہاں سے سیکھا ہے
چھپا کے سادہ سی باتوں میں فلسفہ رکھنا

یہ آگہی کا سفر ہے، یہاں مناسب ہے
خود اپنے آپ کو بے زاد و مرحلہ رکھنا

پڑے ذہن ہیں ہم کار آگہانِ قدیم
ہمارے آگے نیا کوئی مسئلہ رکھنا

نہ کھینچ اتنی بلند اپنے گھر کی دیواریں
کہ لازمی ہے ہوا کا بھی راستہ رکھنا

ہیں سبھی تیرے مجرم، یہ بدگمانی چھوڑ
یہ روز روز کا اچھا نہیں گلہ رکھنا

خیال رکھنا، جو ہم سے تعلقات بڑھیں
کوئی ہمارے لیے اور ضابطہ رکھنا

فضا قلم نے خراشیں جو رخ پہ چھوڑی ہیں
تم اپنے پاس انہیں منجملہ صلہ رکھنا

کرشن مراری

وہی دلکش سماں یک فضا میں گنگناتا ہے
وہی بیتا ہوا لمحہ نرنتر یاد آتا ہے

مجھے مدہوش کرتا ہے مری اس ہوشمندی میں
جنوں کا شوخ سا جھونکا خرد کو جھنجھناتا ہے

کبھی کیفیتِ نظارگی کا لطف پیہم کبھی
کسی بے کل تمنا کی چبھن میں ڈوب جاتا ہے

بکھرتا سا ہوا عنصر یقیناً اک تجلی کا
کسی ترتیب میں رم کر کوئی منظر دکھاتا ہے

وہی اک تشنگی بے کل سی قربت کی ہی تڑپائے
وہی ترکِ وفا کا حادثہ پھر یاد آتا ہے

مری بے تابیوں کا آشنا اڑتا سا اک لمحہ
وہی اک شبنمی انداز پلکوں پر سجاتا ہے

کسی آہٹ کو ناپے ہے کوئی منہ بولتا جادو
اجالوں میں سمٹتا سا اندھیرا جھلملاتا ہے

وہی حرفِ تمنا جو نفی ہو کر رہا آخر
کسی آسودگی سے سربسر دامن بچاتا ہے

عقیدت کی کرن مسکائے رہے جب دل کے آنگن میں
نگاہوں کا جہاں سو رنگ پا کر جگمگاتا ہے

پانچ پاکستانی پنجابی نظمیں

ترجمہ: ڈاکٹر نریش

دو بھکاری

○ — الطاف قریشی

آنکھ بچاری مجھ سے پوچھے
سر آنسوؤں کے ساتھ زمیں پر
لاکھوں شکلیں گر پڑتی ہیں
کس کس کو چھوڑوں
کس کس کو
چن کر پلکوں پر رکھ لوں
کہو
آنکھ کو کیا جواب دوں

وہم

○ — افضل احسن

باہر بالیں پر بیٹھا
ننھا سا کوا
کب سے کاں کاں بول رہا ہے

اندر
مینٹل پیس سے گر کر
ٹوٹ گئی تصویر تمھاری

گاڑی چاند گھڑی اور وہ

○ — منظور احمد

کھڑکی ایک — مسافر دو
پہیوں کی اندھی رفتار
سانسوں کی ننگی تلوار
سرخ ندی کا گرم بہاؤ
جسموں کی خوشبو

سب جیسے رک گئے دفعتاً
گاڑی — چاند — گھڑی
اور وہ

آزادی

○ — باقی صدیقی

اونچی اونچی دیواریں بھی
باندھ نہیں پاتی ہیں
پھولوں کی خوشبو کو

جوانی

○ — باقی صدیقی

مئی جون کی کڑی دھوپ میں
چلے کہیں پر قریا۔

نظم و غزل

شانت سمندر

مصوّر سبزواری

سپید، اجلی، اچھوتی سی ریت کے بدن میں
ہیں داشتہ گندے پانیوں کی
تھے بیچ میں میری ناف کے کچھ
سیاہ گھونگھے سیہ صدف سے
جو حرفِ بدنام بن کے منسوب ہو گئے تھے مری ہوس سے
وہ ڈھلتی شب میں کسی سمندر کا گرم شہوانی حبشی بوسہ
نچوڑ لیتا تھا خفیہ اعضا سے میرے سب لذتیں لہو کی
اور پھر سحر سے پہلے
مرے شگفتہ سپید آنگن کے سارے ہیرے سپید مونگے
نگل کے گھڑیال اونگھتے رہتے ڈھیرے ڈھیر سے
مگر یہ لگتا ہے کچھ دنوں سے
سسکتے پانی کی تہہ بہ تہہ مچھلیاں ہی ساری جھلس گئی ہیں
کہانیاں آبِ سبز کی سب عظیم خواہش سے مر گئی ہیں
ہیں ریگِ مردہ کی دھبہ دھبہ سی کوئی چادر
مرے شکم میں سپید ہیروں کی بجھتی آنکھوں کی چند قبریں
نہ کوئی گھونگھا نہ کوئی سیپی
وہ لمسِ آتش زدہ کا مانوس سا بلادہ
کہاں سے آئے؟

سمندر اب بوڑھا ہو چکا ہے
سمندر اب شانت ہو چکا ہے

ساحل احمد

۴ ایک صف پیڑ کھڑے ہیں
چھوٹے یا کہ بڑے ہیں

سب پتھر میلوں کے
اکھڑے ہوئے پڑے ہیں

شہر میں خنجر لے کر
قاتل نکل پڑے ہیں

بیچوں بیچ سڑک پر
دو ہی پاؤں گڑے ہیں

گرد میں لپٹے آہو
کچھ حیران کھڑے ہیں

ابر گریزاں ساحل
چہرے زرد پڑے ہیں

غزلیں

دلکش اعظمی

رات بھر ایوانِ شب میں شور و غل ہوتا رہا
صبح کا روشن پرندہ شاخ پر سوتا رہا

شام کی سرگرمیوں نے چن لیا جب عکسِ گل
اپنے اوپر دھند رکھ کر آئینہ روتا رہا

سانس سے ٹوٹا نہ اس کی خوشبوؤں کا سلسلہ
ایک لمحے کا تقاضہ عمر بھر ڈھوتا رہا

جسم تھا اس کی بدلتی خواہشوں کا آئینہ
دھوپ جب تک ساتھ تھی پرچھائیاں ڈھوتا رہا

ایک شاخِ بے ثمر تھیں وقت کی خوش فہمیاں
اوس کے ہاتھوں یہ لمحہ رائیگاں ہوتا رہا

سر پھرا سمجھا گیا، لیکن بہت چالاک تھا
قہقہوں سے شہر کی دیوار جو دھوتا رہا

گھنے سائے منوّر وسعتوں میں
لہو باقی نہیں جلتے دیوں میں

خزاں کے آئینے میں عکس تیرا
مری پہچان ہے جاتی رتوں میں

اثر میں ہے علاقے کا علاقہ
ہوائیں ایک جیسی ہیں گھروں میں

بضد ہیں سبز لمحوں کی خراشیں
بہت پانی ہے سوکھی ندیوں میں

سبب اک حادثہ بردار لمحہ
دھواں پھیلا ہوا ہے بستیوں میں

نزولِ قحط ہے شیشہ گری پر
نئے چہرے پرانوں آئینوں میں

کوئی تکیہ نہیں روشن فضا پر
ہوا لے جائے گی پھر بدلیوں میں

ہوا کے لمس تک دلکشؔ اتارو
لچک ہوتی ہے نازک ٹہنیوں میں

غزلیں

اختر نظمی

راہ گیروں سے ربط پیدا کر!
دور جانا ہے، بات سمجھا کر!

رات بھر جاگنے سے کیا حاصل
خواب کا راستہ نہ روکا کر

فاصلے سوچنے نہیں دیتے
مجھ کو دیکھو مرے قریب آ کر

کیوں چمکنے لگے ہیں شب ریزے
میری پلکوں کی چھاؤں میں آ کر

خود سے اچھی نہیں شناسائی
اپنے [illegible] میں کچھ نہ سوچا کر

اپنے در سے بھی مجھ کو کچھ نہ ملا
میں پشیماں ہوں ہاتھ پھیلا کر

میں نے اک بات سوچ لی نظمی
زندگی کے غموں سے گھبرا کر

مصطفیٰ مومن

مبہم مبہم سا ہے منظر چاروں اور
پھیلا سا ہے ایک سمندر چاروں اور

سہمی سہمی سی بیٹھی ہے تنہائی
خوف نے پھیلا رکھے ہیں پر چاروں اور

جل جائے گی ساری کھیتی ندی کی
آگ لگی ہے پانی کے اندر چاروں اور

پہلے پتھر کی دیوار اٹھائی جائے
پھر بنواؤ شیشے کے گھر چاروں اور

وقت کا شیشہ سینے میں چبھ جائے گا
گرتے ہیں رہ رہ کے پتھر چاروں اور

کوٹھے کی دیوار نہ توڑی جائے گی
بھر گیا پانی کان کے اندر چاروں اور

غزلیں

شاہ حسین نہری

بے حسی کے آنگن میں شورِ بدحواسی ہے
میری زندگی شاید، سازِ ناسپاسی ہے

رات، گرم سورج کی سازشوں کا قصہ ہے
بولتا اندھیرا ہے، جاگتی اداسی ہے

ہر طرف ہے خاموشی، رات ہے گھنی پھر بھی
اک کرن سی آتی ہے، شے کوئی صدا سی ہے

پر سکوں اجالوں کی اب کہاں وہ بے لوثی
نیند سی فراغت بھی لمحۂ قیاسی ہے

شاہ! کن اجالوں کی کس نگر کی ہے یہ بات
کون آدمی تھا وہ، اب کہاں کا باسی ہے

کامران رشید

محفل سے تمہاری مرے ہمراہ چلے ہیں!
تاریک اجالے جو چراغوں کے تلے ہیں!

ہر ایک کرن میرے تصور کا ہے پرتو
کوکب میرے افکار کے سانچے میں ڈھلے ہیں

درد و غم و آلام نے بخشی ہیں ضیائیں
ورنہ یہ شب و روز برے ہیں نہ بھلے ہیں

گفتار کی دنیا سے الگ اپنا جہاں ہے
ہم لوگ تو کردار کے سائے میں پلے ہیں

منکر تری عظمت سے ہوا جو بھی اسی نے
تھک ہار کے آخر کفِ افسوس ملے ہیں

کینہ کوئی دل میں نہ زباں پہ شکایت
ہم شمع کی مانند خموشی سے جلے ہیں

افسانہ "ماتم" کا سلسلہ صفحہ 26 سے آگے

میں روگی کی خبر لینے نہیں گیا۔ گوبند سے کہہ دیا کہ اس کے
پاس کم سے کم لوگ جائیں۔ تھوگر کا مریض جھٹکے میں چلا جاتا ہے۔
اس کا دل بس ...

گوبند نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ شاید اس کی بیوی نے
اس کی چلنے نہیں دی۔

ایک دن ضد کر کے میری پتنی کو بھی ساتھ لے گیا۔
نیٹو کی ماں بہت بار کہہ چکی ہے کہ بہن جی کو ساتھ لانا۔ انھیں
بھیج دیجئے ورنہ وہ اداس ہو جائے گی۔

میری بیوی نے آکر بتایا۔
وہاں تو میلہ لگا رہتا ہے۔ نیٹو کی ماں جو اس کی خبر لینے جاتا ہے
اسے اٹھنے نہیں دیتی۔ اسے بٹھائے رکھنے کے لیے چائے پانی منگواتی
رہتی ہے۔ دور نزدیک کی ہر بات سنے بغیر اسے چین نہیں۔
"اور گوبند؟" میں گمبھیر ہو گیا۔
وہ اس کی بات کیا ٹالے گا۔ وہ اس کا کہا مانتا جاتا ہے۔ دھڑا
دھڑ پیسہ خرچتا جاتا ہے۔ اور کہتا ہے:
کیا ہوا جو خرچ ہو رہا ہے، پیسہ تو آنی جانی ...
چپ کرو۔ میں تڑپ اٹھا۔

دسویں دن گوبند کے بھائی کا فون آیا۔
بھابی چل بسی، آپ فوراً نرسنگ ہوم آجائیں۔ بھائی صاحب
تاکید کرتے ہیں۔

نرسنگ ہوم جا کر میں نے دیکھا۔ دل پھٹ جانے کے کارن
بہت سارا خون منہ کے راستے باہر بہہ گیا ہے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے
موت ہوئی۔ وہ اپنی چھوٹے بھائی کو ڈانٹ رہی تھی جو اس کے خیال
میں اپنی بیوی کی جابلی بن گیا۔ ماں باپ سے دور ہو گیا۔ آدھ
گھنٹے تک لگاتار بولتے رہنے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گئی
اس کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔

مجھے نرسنگ ہوم پہنچے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ گوبند میرے
پاس آکھڑا ہوا:
آپ ہی اسے یہاں لائے تھے، آپ ہی اسے لے جائیں۔
وہ آنسو پونچھنے لگا۔
میں گھر چلتا ہوں، آپ ایمبولینس میں لاش لے کر آجائیں
اس نے چار ہزار کے نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔
آپ نرسنگ ہوم کا حساب چکتا کر دیجئے!
اس کی بات سن کر میں گھبرا گیا۔
یہ کیا کرتے ہو۔ تمہارا من ٹھیک نہیں، تم ایمبولینس میں آؤ
تمہارا سکوٹر میں لے جاتا ہوں۔
وہ نہیں مانا۔ مجھے لاش کے ساتھ آنے کو کہہ کر چل پڑا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے دیکھا گوبند بلاک کے پارک میں کھڑا بڑا سا شامیانہ
لگوا رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا:
لاش کو پارک میں ہی رکھ دیں، اوپر جگہ ہی کتنی ہے۔ بہت لوگ
آئیں گے۔ میں نے سب کو فون پر اور آدمی بھیج کر خبر کر دی ہے۔

لوگ اکٹھے ہونے لگے۔ عورتیں لاش کے گرد بیٹھ کر ماتم کرنے لگیں
میں ذرا دوری پر گوبند کے پاس بیٹھ گیا۔ جو بھی آتا اس کے گلے لگ کر
آنسو پونچھتے ہوئے آس پاس بیٹھ جاتا۔ جب کافی لوگ آگئے تو میں
محسوس کیا گوبند بار بار میری طرف دیکھنے لگتا ہے، جیسے مجھے کچھ کہنے
کو کہہ رہا ہو۔ آخر میں ناراض ہو کر وہ نیٹو کو ڈانٹنے لگا۔ پتہ نہیں کب
اسی وقت میں نے وہاں بیٹھے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا:
ہوتا وہی ہے جو بھگوان کو منظور ہوتا ہے لیکن اس آدمی نے اپنی طرف سے کوئی
کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ہر ممکن علاج کیا۔ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا۔ پیسہ پانی کی
طرح بہایا۔ ٹیکسی سکوٹر والوں کا پیٹ بھرا۔ اس مہنگائی میں اتنا کون کرتا ہے؟ ... ابھی ابھی
نرسنگ ہوم کا بل میں خود دے کر آیا ہوں۔ پہلے تین ہزار۔ ڈیڑھ سو تو کمرے کا کرایہ
تین ہزار، صرف تین ہزار! میرے بات کو کاٹتے ہوئے گوبند چیخ اٹھا
پورے بارہ ہزار خرچ ہو گئے۔ وہ عجیب نظروں سے سب کے چہرے پڑھنے لگا
شاید بارہ ہزار سے بھی اوپر ہو۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے
آپ کو تو سب معلوم ہے۔ میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا۔ آئے
فائل آپ کو دکھاتا رہا۔

بقیہ صفحہ ۱۲ پر [illegible]

غالب کا ایک منظوم خط اور جواہر سنگھ جوہر

مسلم ضیائی (مرحوم)

غالب کے ابتدائی کلام میں، جو نسخۂ فوجدار محمد خاں، نوشتہ ۷ صفر ۱۲۳۷ھ میں موجود ہے، ایک شعر ملتا ہے:

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا ۱؎ واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

اس شعر سے ان کی ذہنی کشادگی اور مذہبی و فکری نقطۂ نظر میں ایک بڑی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے کسی جفا شربِ حسینہ سے متعلق حسبِ ذیل شعر کہا تھا:

اس جفا شرب پہ مرتا ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ
مالِ سُنّی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال ۱؎

میرے خیال میں غالب نے یہ شعر کہنے تک مذہب تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک وہ سنّی بھی تھے اور صوفی بھی ۲؎

نیا مذہب یا نئے نظریات اختیار کرنے والوں کے جذبات اور خیالات ابتداً بہت شدید ہوتے ہیں، جن کی بڑی شدت سے تبلیغ بھی کی جاتی ہے۔ چنانچہ مذہبی تبدیلی کے اس ابتدائی دور میں، غالب نے بھی منقبتِ علی میں جو قصیدے لکھے اور غزلوں کے مقطع کہے ان سے ان کے جذبات کی شدت اور مذہبی غلو کا اظہار ہوتا ہے:

غالب ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

لیکن مطالعہ، مشاہدہ، فضل حق خیرآبادی جیسے فلسفی دوستوں کی صحبت انگریزوں سے تعلقات نیز ان کا رہن سہن اور گفت و شنید کے طریقوں و دیکھ کر ان کے مذہبی غلو میں آہستہ آہستہ کمی ہوتی گئی جس کا نتیجہ مذکورہ شعر ہے۔ کلکتے کے سفر کے دوران نظارہ نے چشمِ تنگ کو وا کر دیا ۳؎ چنانچہ جب انھوں نے پہلے ۱۸۲۸ء میں گلِ رعنا کے لیے کلام کا انتخاب کیا اور پھر ۱۸۳۲ء کے قریب منتخب دیوانِ ریختہ تیار کیا تو منقبتِ علی میں مذکورہ غزلوں کے مقطعے خارج کر دیے اور نئے انداز سے سوچنے لگے جو ان کی وسعتِ نظری پر دال ہے۔

غالب کی یہی وسعتِ نظری تھی جس کے باعث ان کی محفل اور احباب میں ہندو، مسلمان اور کالے گورے کے درمیان امتیاز نظر نہیں آتا۔ وہ اپنے انگریز دوست میجر جان جیکب کے مرنے پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ جانی بانکے لال کے داماد کی موت پر درد انگیز تعزیت نامہ لکھتے ہیں اور احمد حسین میکش کی موت پر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی محفل میں متعدد شمعیں ہیں جو آئینہ خانے میں چراغاں کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں اور ان کی دنیا میں کئی آفتاب ہیں جن کے گرد ان کے سیارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ وہ خود ایک ایسا نیرِ اعظم ہیں جس کے گرد شیفتہ، تفتہ، نیر اور حالی جیسے روشن ستارے بھی گردش کرتے ہیں اور رائے چھج مل اور ان کے دونوں بیٹے، جواہر سنگھ جوہر اور ہیرا سنگھ جیسے سیارے بھی۔

رائے چھج مل فخر الدولہ دلاور الملک احمد بخش خاں رستم جنگ جاگیردار لوہارو اور فیروز پور جھرکا کے متوسل بلکہ غالباً مختار یا وکیل تھے اور چونکہ احمد بخش خاں کی اسکیم کے مطابق، غالب کی پنشن (انگریزی) حکومت سے احمد بخش کی معرفت ملتی تھی اس لیے غالب اور چھج مل کے تعلقات پہلے کاروباری اور اس کے

۱؎ عمدۂ منتخبہ میں دوسرے مصرعے کی ابتدائی شکل یہ ہے "خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال"۔

۲؎ غالب پر ابتدا ہی سے بیدل اور صوفیہ کے باعث تصوف کا اثر تھا۔ بعد کا ایک شعر ہے جس میں انھوں نے کہا ہے:

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم نیست در دہر، قلم مدعی و نکتہ گواست

۳؎ حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

پیدا ہو گئے چنانچہ اب وہ اپنے معاملات میں ان سے مشورے کرنے اور اپنا دردِ دل ان کے سامنے بیان کرنے میں تکلف محسوس نہ کرتے تھے جس کا ثبوت وہ خط ہیں جو کلیاتِ نثرِ غالب اور سبد باغ دودر میں موجود ہے ع۱

اپنی پنشن کے سلسلے میں جب غالب احمد بخش سے مایوس ہو کر انصاف طلبی کے لیے کلکتے گئے تو لکھنؤ، بنارس باندے اور کلکتے سے چنج مل کو خط بھیجتے اور دلی کے حالات دریافت کرتے رہے کہ ریذیڈنسی اور اہل کاران جدید و قدیم کا کیا حال ہے؟ اور نئے جاگیر دار لوہارو، شمس الدین احمد خاں اور نئے ریذیڈینٹ کے درمیان کیسے تعلقات ہیں۔

کلکتے سے واپس آنے کے بعد بھی غالب سے اس خاندان کے تعلقات نہایت دوستانہ بلکہ عزیزانہ رہے، چنانچہ ۱۸۵۳ء میں چنج مل بیمار پڑے تو غالب نے جواہر سنگھ کو لکھا کہ تمھارے والد اکثر بیمار رہتے ہیں "ان دنوں میں خصوصاً چھاتی پر اس شدت سے نزلہ گرا کہ گھبرا گئے اور زیست کی توقع جاتی رہی۔ بارے اب کچھ صحت ہو گئی ہے بھائی اب یہ آفتابِ سر کوہ ہیں۔ ہیرا (سنگھ) کا ان کے پاس رہنا اچھا ہے ع۲

ایک اور خط سے معلوم ہوتا ہے کہ چنج مل غالب کے پاس ہفتہ میں دو تین بار آتے، دیر تک ساتھ رہتے اور مختلف مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔

پھر انھوں نے ۱۲۷۷ھ میں وفات پائی تو غالب نے جو عموماً قطع تاریخ کہنے سے گھبراتے تھے ان کے لیے تاریخ کہی جس میں انھیں "دوستِ دیرینہ" کے الفاظ سے یاد کیا ہے؛

گویند رائے چنج مل شیریں کلام مرد
دیرینہ دوست رفت ازیں تنگنا دریغ
گفتم کسے ز سالِ وفاتش نشاں دہد
غالب شنید و گفت چہ گویم بسا دریغ ع۳

غالب کے انہی دیرینہ دوست کے بیٹے منشی جواہر سنگھ جوہر غالب کے محبوب شاگرد تھے اور شاید فارسی کے سوا اردو میں بہت

ع۱ کلیاتِ نثر میں ۹ خط اور سبد باغ دودر میں ان کے نام ایک خط ہے۔
ع۲ خطوطِ غالب صفحہ ۵۷۷
ع۳ اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۷۔

کم شعر کہتے تھے۔ وہ غالب کے نہ صرف محبوب شاگرد تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غالب ان دونوں بھائیوں یعنی جواہر سنگھ اور ہیرا سنگھ کو اپنے بچوں کی مانند تصور کرتے تھے چنانچہ ایک خط میں حکیم مرزا جان ولد حکیم آغا جان (عیش؟) کی جواہر سنگھ کو سفارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنو صاحب! حکیم مرزا جان خلف الصدق حکیم آغا جان صاحب کے، تمھارے حلقۂ تحصیلداری میں بصیغۂ طبابت ملازم سرکار انگریزی ہیں۔ ان کے والد ماجد میرے پچاس برس کے دوست ہیں۔ ان کو اپنے بھائی کے برابر جانتا ہوں۔ اس صورت میں حکیم مرزا جان میرے بھتیجے اور تمھارے بھائی ہوئے"

غالب کو اپنے بعض دوسرے شاگردوں مثلاً تفتہ وغیرہ کی مانند جواہر سنگھ جوہر پر بھی فخر تھا، چنانچہ کہتے ہیں:

تا میکشی و جوہر و تخمور داریم　　شانِ دگر و شوکتِ دیگر داریم
در میکدہ بیریم کہ میکش از ماست　　در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

کلیاتِ نثرِ فارسی اور اردوئے معلیٰ میں جوہر کے نام تین خط ہیں۔ سبد باغ دودر میں، جو ان کے بھائی نے ۱۸۷۰ء میں علی کاتب سے لکھوائی اور غالباً اس کے مرتب بھی تھے، جواہر سنگھ کے نام (۱۴) اور ہیرا سنگھ کے نام ایک خط ہے۔ ان خطوں میں جواہر سنگھ کو ان الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے؛

سعادت و اقبال نشانا / جانِ من و جانانِ من / سعادت و اقبال نشانا! جانا! / نو نورِ دیدہ و سرورِ سینۂ غالب / برخوردار کامگار / سعادت و اقبال نشانی! /

جن سے غالب کی اس محبت کا اندازہ ہوتا ہے جو انھیں جواہر سنگھ جوہر سے تھی لیکن بدقسمتی سے جواہر سنگھ کا کلام نہیں ملتا۔ صرف اردوئے معلیٰ

ع۴ سبد باغ دودر میں غالب کے مکتوب بنام جوہر نوشتہ ۳۰ اگست ۱۸۴۹ء میں غالب نے ایک موصولہ سفینے کے بارے دریافت کیا ہے کہ "ایں سفینہ چہ می باید کرد، اگر دیباچہ یا تقریظ می خواستند می بایست کہ نخست آنچہ منظور بود دراں ورق رقم کردہ آنگاہ سوی من رواں می داشتند۔ تا آں نگارش سمتی بود و خود را نثری فراہم آوردمی۔ چوں چناں نکردند، اکنوں خود ایں کنند کہ بمن نویسند کہ چہ نویسم۔" معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوہر کا مجموعۂ شعر تھا جسے اصلاح یا تقریظ لکھنے کے لیے غالب کے پاس بھیجا گیا تھا۔

ان کے نام خط میں ایک غزل غالب کی اصلاحوں کے ساتھ ہے جس میں غالب لکھتے ہیں :

" برخوردار!

تمہارا خط کا پہنچنا اور چھاپے کے قصیدے کا پہنچنا اور سیر اسنگھ کا ادھر روانہ ہونا معلوم ہوا۔ .... غزل تمہاری ہمکو پسند آئی اصلاح دے کر بھیج دی گئی۔ اس کا تم خیال رکھا کرو کہ کس لفظ کو کس معنی کے ساتھ پیوند ہے۔

چرا نہ یاس بجانِ امیدوار افتد

یہاں "افتد" مہمل ہے۔ "یاس بدل افتادن" و "یاس بجان افتادن" روزمرہ نہیں اور بھی کئی "افتد" ایسے ہی ہیں۔

۱۔ سیاہ بختم اگر بر سرم گذار افتد
لباسِ سایۂ ہما نیز سوگوار افتد

سوگوار ہونا سائے کا باعتبار سیاہی رنگ ہے۔ اب یہاں "افتد" ٹھیک ہیں۔

شنیدہ ام ہجفائے تو منتہا ست عدو
چرا نہ شور بجانِ امیدوار افتد

"شور افتادن" روزمرہ ہے اور "یاس افتادن" غلط۔

۳۔ بہ جرم کز دوزخ کسان دوزخ را
کجا برند، چو آہم شرارہ بار افتد

یہاں "افتد" بمعنی "واقع شود" ٹھیک ہے۔

۴۔ نہ گبرم و نہ مسلماں بہ جرم کہ مرا
سوائے دوزخ و مینو کجا گذار افتد

یہ شعر تمہارا خوب ہے۔ آفریں!

۵۔ قرار در وطن افسردہ می کند دل ہا
خوشا غریب کہ دور از دیار افتد

یہاں بھی "افتد" صحیح و با معنی ہے۔

۶۔ نسیم قیب کہ رسوا تم خجل نہ کند
خوش است پیشِ نگریاں پردہ دار افتد

یہاں بھی "افتد" بمعنی "واقع شود"۔

۷۔ تراکہ شیوہ دگرگوں کنی بہ خشم نہاں
خوش است گر ز جفا بیرون قرار افتد

افتد یہاں بھی ٹھیک ہے۔ بات اتنی تھی کہ "گرا" لفظ تھا "گئی" صاف ہے سے خطِ رخِ تو بدل دادہ، خط آزادی

۸۔ ستم کہ در شکنِ زلف تابدار افتد

وہ صورت اچھی نہ تھی۔ یہ طرز خوب ہو گئی۔ معنی کا عیار کامل ہو گیا ہے۔

۹۔ چکد ز خامۂ جوہر سخن، چنانکہ مگر
بزور موج گہر از بحر بر کنار افتد"

ایک اور غزل کے چار شعر ملاحظہ ہوں۔

۱۔ تو و زراہ کرم بر سرم گذار غلط
من و بہ رہ نشستن بہ انتظار غلط

۲۔ بہ دبہ زہد بد آموزیم مکن، زاہد!
من و زشاہدِ مے توبہ در بہار غلط

۳۔ بعد در خور پرسش نیم مگر و قتے
شود بکاہشِ من، راہ آں نگار غلط

۴۔ بر آں سرم کہ دگر با کسے نیامیزم
امید لطف ز یارانِ روزگار غلط

ان دو غزلوں کے جملہ تیرہ اشعار کے سوا، جوہر کے دو اردو اور تین فارسی قطعات بھی ملتے ہیں، پہلے دو قطعے، برہان قاطع اور درفش کاویانی کے لئے لکھے گئے۔

(۱) ایں نسخہ کہ غالباً چو او دیگر نیست
تالیف لطیف، غالب دوراں ہست
جوہر ایں گفت سالِ طبعش، طبعم
زیبا فرہنگ قاطع برہان ہست

(۲) تتمہ
دریں کتاب مسمّی بہ قاطع برہان
نگر کہ خامۂ غالب چہ مایہ گوہر سفت
بیا کہ جوہر رنگیں صغیر بے کم و کاست
"درفش کاویانی و فرہنگ" سالِ طبعش گفت[1]
۱۲۸۱

[1] : آخری مصرعے کے اعداد ۱۲۸۷ ہوتے ہیں۔ ان میں سے سر (احمق = ۱۰) کو کاٹ دیا جائے تو "تتمہ" نکلتا ہے۔ یہ قطعہ قاطع برہان کے دوسرے ایڈیشن درفش کاویانی مطبوعہ اکمل المطابع دہلی صفحہ ۱۵۳ پر شائع ہوا ہے۔

دوسرے دو اردو قطعات، میاں داد خاں سیاح کے نام سے چھپی ہوئی لیکن غالب کی تصنیف، لطایف غیبی مطبوعہ اکمل المطابع۔ دہلی ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئے تھے۔

(۱)

لیک لطائف الحق کی یہ تصنیف ہے
دشمن اس سے ہوگا بے خبر
ہے پئے اظہار سال عیسوی
قول حق کا زہے تیغ تیز
۱۸۶۵ء

جب چھپی یہ لطائف غیبی
پھر تاریخ اس کی ہاتف غیب
سر احمق کو کاٹ کر بولا
"طبع کو بھائی یہ لطایف غیب

تیسرا فارسی قطعہ "اردوئے معلی" طبع اول۔ دہلی کے صفحہ ۱۴۴ پر ہے۔

چو اردوئے معلی گشت تالیف
ہمانا یک جہاں گردید طالب
پئے سال سیحائی طبعش
بگو جوہر "نسخہ اردوئے غالب"

بہر حال یہ ہیں جواہر سنگھ جوہر جن سے غالب کے تعلقات بزرگانہ بلکہ پدرانہ تھے۔ جن کی تصدیق اردوئے معلی کلیات نثر فارسی اور سبد باغ دو در میں موجود خطوط کے علاوہ اس منظوم خط سے ہوتی ہے جو اس موقع پر پیش کیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ ہوا میری نظر سے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں کلیات غالب فارسی کے دو قلمی نسخے گذرے۔ ان میں سے ایک میں تاریخ کتابت موجود ہے اور دوسرا ناقص الآخر ہے۔ اوّل الذکر نسخے میں، متن سے پہلے، جلد کی پشت پر مجھے غالب کا وہ منظوم خط ملا، جس کے مکتوب الیہ جواہر سنگھ جوہر ہیں۔

اس نسخے کے آخری صفحے پر ترقیمہ یہ ہے۔

"دیوان صاحب سرچشمۂ معانی و بحر بیکران سخن دانی، اسد اللہ خاں، غالب تخلص"

"یہ غالب است، بدستخط، حقیر فقیر، محمد عالم ولایتی، برنہ خلام والاحقام"۔

"مولوی صاحب جلیل الشان ...... باتمام انجامید تحریر بتاریخ دہم شعبان ۱۲۵۳ھ[1]

یعنی یہ نسخہ کلیات فارسی کی اشاعت اول ۱۸۴۵ء سے تقریباً آٹھ سال پہلے لکھا گیا تھا[2] لیکن چونکہ یہ منظوم خط نہ تو اس دیوان کے متن میں ہے اور نہ طبع اول طبع ثانی اور طبع ثالث میں، اس لئے اس کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا اگرچہ ظاہر ہے کہ عارف کی وفات کو ۱۸۵۲ء سے قبل لکھا گیا لیکن کہ اس کے آخر میں غالب اور عارف کی طرف سے جواہر سنگھ کو سلام لکھا گیا ہے۔

یہ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جواہر سنگھ اپنے والد کو خط نہیں لکھتے تھے۔ ان کے والد خصوصاً والدہ کا غم جدائی سے برا حال تھا

سبد باغ دو در میں غالب کے ارشاد خطوط سے معلوم ہوتا ہے ۱۸۴۹ء میں جواہر سنگھ آگرہ میں تھے ابتدائی دو خطوں میں غالب نے لکھا ہے کہ " در نوشتن نامہ دیر میکنید وہم این در ویش وہم پدر بود نگراں می دارید ...... "[3]

دوسرے میں لکھتے ہیں کہ "دو راے صحیح مل، پدر شما عاشق شماست واز ہجر شما اندوہگین۔ اغلب اوقات بمن می پیوند واز شما سخن می راند جدائی شما از بسیار گرد است کہ آئین کار آموزید و از روزگار رتبہ اندوزید۔ بہ ہنجار گذارش کہ را دارسید و چوں کار گذار شدہ باشید بپایہ ہائے بلند فرا رسید۔

اگر ایں جا محبت وصحبت درآنجا دست بہم ندہد و روزگار مساعدت نکند، دراں شہر مپائید و بوطن باز آئید ہیچ گاہ بدیدہ گراں نبینید در باز آمدن سبکساری و شرمساری ـــــــــ

---

[1] مطابق ۹ نومبر ۱۸۳۷ء

[2] اس مضمون کے بعد میں نے "نسخہ آرزدہ سرا نجام" کے عنوان سے اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ اردو کراچی ۱۹۷۰ء

[3] اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۰۸ اس خط پر سنہ درج نہیں بجز ہجری اور عیسوی تاریخیں درج ہیں جن تقویم سے مقابلہ کر کے اس کی تاریخ تحریر ۱۴ ربیع الاول ۱۲۶۱ھ = ۲۳ مارچ ۱۸۴۵ء نکلی ہے۔

نیست [1]

"سبکساری و شرمساری" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگرہ میں جس مقصد سے جواہر سنگھ گئے اور ماں باپ سے جدا ہوئے تھے، اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی اس لئے شرمندگی کے باعث باپ کو خط نہیں لکھتے تھے۔ غالب کے خط سے اس منظوم خط پر روشنی پڑتی ہے کیوں کہ دونوں کے مضامین میں اشتراک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں خط راتے چھجمل نے غالب سے اپنے بیٹے کو بلانے کے لئے لکھوائے ہیں اس طرح میرے خیال میں یہ خط ۱۸۵۶ء (۱۲۷۳ھ) میں لکھا گیا ہے خط شروع ہونے سے پہلے حسب ذیل عبارت ہے۔

"مرزا اسداللہ خاں (۱۰۰)

بہ لالہ جواہر سنگھ نوشتہ بودند"

اس عبارت کے آخری لفظ "بودند" سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط کافی عرصے کے بعد نقل کیا گیا ہے۔ اب یہ منظوم خط ملاحظہ کیجئے جو اپنی مثال آپ ہے۔

خط

وفا جو ہرا از تو غم دور باد
دلت سرخوش بادۂ سور باد
رسید از تو الفت فزا نامہ
روان تازہ کن دلکش نامہ
نہ خواہم کہ در عرصۂ روزگار
نشیند ترا بر دل از غم غبار
ز رنجوائی من حوز غم کہ من [2]
ندارم غم ہستئ خویشتن
نہ جاں از منست و نہ جسم آن من
خود از مردن من چہ نقصان من

حدیثی است شائستہ و سودمند
ز شائستگی بودہ دانا پسند
• گر از من نباشی نکوی شنو
زانکس کہ فرزند اوی شنو
چنین دادہ فرمان کہ در ساز راہ
نباشی بہ حیلت گری عذر خواہ
عزیزان رہبر و گرامی کیستند
بشادی دراں تہنیت می زنند
بشادی بدیں جمع ابناز کرد
چو گردند اینان تو ہم باز گرد
الا تا نسنجی دریں زاں بہ است
چنین خواستست آنکہ فرماندہ است
مشو سخت کوش و شو سخت گیر
دریں آمدن باش فرماں پذیر
بحکم پدر چوں گزیدی سفر
بگرد از سفر ہم بہ حکم پدر
دریں رفتن و آمدن شاد باش
بہ تہنیت از طعنہ آزاد باش
ز ہجر تو مادر بہ تاب اندر است
گدازاں چو شکر در آب اندر است
پدر نیز مشتاق دیدار تست
بصد گونہ خواہش طلبگار تست
ترا خواہد از بسکہ خواہد ترا
نخواہد گر او پس کہ خواہد ترا!
بیاد دو خونیں جگر را ببیں
بما در نشیں و پدر را ببیں
دلم تن، چراغ سحرگاہیم
قدم نہ براہ ہوا خواہیم
بیا، تا بہ بینی کہ چوں می تپیم
چساں دیدہ تا دل بخوں می تپیم
بیا تا نم غرق خوں بنگری
دردی مرا از پدر دوں بنگری

---

[1] اورینٹل کالج میگزین اگست ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۰
[2] آنکہ یکہ شمار رفتہ اید رنجور ہم ۔ دردی در شانہ پدید آمد و ریش از اعضا سر برزد ۔ ہم دل گرا بیناں بود و ہم زخم دیر بہم آں سلسلہ فرامش بودم و تا منزل نواب امین الدین خاں جر مسرای خویش نمی رفتم۔
الیضاً صفحہ ۱۰۸-۱۰۹

بیا تا بہ بینی کہ از روزگار
ستوہم بجائے رسید است کار
کہ می نوشتم کہ خستگی نثر و رش
بیا ستمے تاب ما مر الفرع
بیاد بیاد بیاد بیا
سرآمد سخن والدعا والدعا
کہ داں جیوں نخوانی ورق تمام
ز نیشتر سلہ در عارت سلام

غالب کا یہ منظوم خط اپنی آپ مثال ہے ان کی نظم و نثر کے کسی مجموعے یا کسی دوست یا عزیز کے نام کوئی منظوم خط نہیں ملتا اس خط کے لفظ لفظ اور خصوصاً آخری اشعار سے اس محبت اور یک دلی کا اظہار ہوتا ہے جو غالب کو چھج مل کے خاندان اور خصوصاً اپنے عزیز شاگرد جواہر سنگھ جوہر سے تھی۔ افسوس۔ افسوس جوہر کا کلام ناپید ہے ورنہ غالب اور اس خاندان کے تعلقات پر شاید کچھ اور بھی روشنی پڑ سکتی۔

ے یہ اور اس کے بعد والا شعر سبد باغ دودر میں ہیں۔ اورینٹل کالج میگزین۔ اگست ۱۹۶۰ء کے کلیات نثر غالب میں شیفتہ کے نام ایک خط ہے مگر اسے نثر مرجز میں شمار کیا جاتا ہے، نظم میں نہیں بانحوہم پروا من بندہ کہ غمناکم دز غصہ جگر چاکم۔ خواہم ستمے گفتن۔ دیروز کہ جی رفتند۔ آں نامہ فرستادند۔ کز دیدن آں خون شد۔ وا حا جگر از اندہ گفتم چہ کنم غالب۔ چوں کار۔ دگرگوں شد۔ می بایدم آہنگ رفت۔ تا عذر سخن خواہم۔

ماتم

کنور سین

اب اسکی وہی رٹ۔

گوبند کی بیوی کو مرے دیر ہی کتنی ہوئی۔ ابھی تو مرنے والی کا شریر بھی ٹھنڈا نہیں ہوا پارک میں پڑی لاش جیسے اپنے گرد بیٹھے لوگوں کو پہچان رہی ہو۔

کچھ دیر پہلے گوبند کا نٹ کھٹ بیٹا نیٹو ادھر اُدھر بھاگا گیا پھرتا سب کی نظروں میں آ رہا تھا۔ گوبند اسے سمجھاتا پچکارتا اندر ہی اندر جھنجھلا رہا تھا —— مورکھ نہیں جانتا کہ ماں مرگئی ہے —— یہ دکھانت جیون بھر...

نیٹو کو شاید سب کچھ پتہ ہوتے ہوئے بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ کبھی ماں کی لاش کے پاس جاتا۔ وہاں بیٹھی دلاپ کرتی عورتوں کو دیکھتا کبھی پارک کی دیوار پر چڑھ کر اس کے اونچے گیٹ پر جا بیٹھتا۔ وہاں سے دوسرے لڑکوں کو اپنے پاس آنے کے لئے کہتا ہوا خوش ہونے لگتا جیسے پارک کے بیچوں بیچ ایک لکیر کھنچی ہو —— اس پار ماتم، اس پار کھیل۔

میں جانتا تھا گوبند کی بیماری بھر کم بیوی خون کے دباؤ کی مریض ہے ——

ساتھ والے کوارٹر میں تو رہتا ہے گوبند۔ اچھا خاصہ بزنس ہے اس کا۔ صبح چھ بجے سے کر رات کے دس بجے تک کام میں مست رہتا آدھی رات گئے تک بیوی کی باتیں سنتے ہوئے مسکراتے چلے جانا۔ گرمی ہو یا سردی کمرے ہی میں سونا۔

گوبند کی بیوی اتنی جلدی مر جائے گی یہ میں نے نہ سوچا تھا۔ یوں تو اس کا موڈ پل پل بدلتا رہتا۔ ابھی بچوں کو ڈانٹ رہی ہوتی۔ شادی کے وقت بچے کو الٹی سیدھی سنا رہی ہوتی ابھی انہیں پیسے دے کر لاڈ جتا رہی ہوتی۔

میرے ساتھ اس کی بول چال نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کی سے تو وہ اور بھی کھچی کھچی رہنے لگی جب سویرے سویرے سیر میں کا راستہ روکے پڑی اس کی چارپائی کو میں نے جھٹکے سے سرکا دیا۔ میں کیا کرتا؟ میری شرم کا تقاضہ تھا۔ وہ کھاٹ پر بڑے بے سرے ڈھنگ سے سو رہی تھی۔ اس کا بلاؤز چھاتیوں سے اوپر ہو گیا تھا اور پیٹی کوٹ اونچا ہو کر...

میں جانتا ہوں یہ اسکا قصور نہ تھا۔ اندر سے اسے ایسی گھبراہٹ ہوتی کہ کپڑے تو کیا وہ اپنے کو بھی اتارنے کو تیار ہو جاتی۔ خون کا دباؤ بڑھتے ہی بے چین ہو کر کمرے سے باہر نکل آتی۔ بالکنی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھومتی۔ ہر کوارٹر کے سامنے رک کر پڑوسیوں سے باتیں کرنے لگتی۔

لوگ اسے جھنجھور اور فساد کی جڑ کہتے۔ اس سے گھبراتے لیکن انتظار بھی کرتے۔ اس کے خون کا دباؤ کبھی کبھی جوان کنواری لڑکیوں پر الٹی سیدھی پھبتیوں کا روپ دھارن کر لیتا اسے گھر گھر کی خبر رکھنے پر مجبور کر دیتا۔ بہوؤں کو اپنے گھر والوں کے خلاف اکساتا۔ لوگ کچھ بھی کہتے میں اس کی مجبوری سمجھتا۔ وہ بدنامی سمیٹتی رہتی میں اس کے لئے ہمدردی سے بھر جاتا۔

میرا ماتھا اس دن ٹھنکا جب وہ ایک ہی دن میں دوبار ڈاکٹر کے پاس ہو کر لوٹی۔ گوبند نے ہمیشہ کی طرح اسے ٹیکسی سے اتارنے اور ٹیکسی کا بھاڑا چکانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگائی۔ اکثر وہ لوگوں کے بالکونی میں نکل آنے اور آپس میں اشارے کرنے تک انتظار کرنے

بعد ہی سکوٹر یا ٹیکسی کو جانے دیتا۔ پہلے کبھی میں نے اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا لیکن آج اسے ایک ہی رٹ لگاتے دیکھ کر بہت سی باتیں میری آنکھوں میں گھوم گئیں۔

اس دن گوبند نے بتایا:

ڈاکٹر نے آج بلڈ شوگر بھی بتائی۔ زیادہ بولنے اور جوش میں آنے سے منع کر دیا پاؤں کا زخم بھرنے تک خاص دھیان رکھنے کو کہا ورنہ حالت کسی بھی سمے نازک ہو سکتی ہے۔

اس دن بھی اس نے میرے ہاتھ میں نسخہ اور دواؤں کا بل تھما دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ لیکن میں اس کی بات نہیں سمجھا اس کی بیوی کی بیماری پر اپنی چنتا ظاہر کرتا رہا۔

یہ بات ایک سال پہلے کی ہے وہ سارا دن پلنگ پر لیٹی رہتی اس کی بیٹی اسے اٹھ کر باتھ روم تک جانے سے بھی منع کرتی رہی۔ اس کی جھنجھلاہٹ کو نظر انداز کر کے ہر کسی کو اس کے پاس آکر بیٹھنے اور باتیں کرنے سے روکتی رہی۔ لیکن شام کو سب بے کار ہو گیا نیچے کے کوارٹر میں پوتے نے اپنی دادی کے بال پکڑ کر اسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اونچی آواز میں لڑائی کی بو سونگھتے ہی گوبند کی بیوی سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنی بیٹی کو بھیانک نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اسے ایک طرف دھکیل کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی۔ دوسرے ہی پل اس نے اپنی دادی کا اپمان کرتے ہوئے پر ڈانٹ پھٹکار شروع کر دی۔ لڑکا غصے میں تھا۔ اس نے دادی کے ساتھ ساتھ اسے بھی دو چار سنا دیں۔ وہ سناٹے میں آئی کھڑی رہ گئی۔ لڑکے نے اسے گھر گھر میں فساد کرانے والی سیاپے کی نائن کہہ ڈالا۔

رات کے گیارہ بجے میری بیوی نے کروٹ بدلی۔

"یہ عورت ہر کسی کی بات میں ٹانگ اڑاتی ہے"

"بے چاری کیا کرے۔ اس کے اپنے بس میں ......"

میرے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی بلاک کو بجنے لگا پہلے گوبند کی زبان سے گندگی جھڑی پھر اس کی بیوی نے بگل بجا دیا۔ ایک گھنٹہ چیخنے چلانے اور گالیاں برسانے کے بعد وہ سانس لینے کو رکی تو میں نے گوبند کے کندھے پر ہاتھ رکھا:

"اور کچھ نہیں تو اس کی صحت کا ہی ...."

گوبند چونکا اور اپنی بیوی کو کھینچ کر اندر لے گیا۔

ٹھیک ہے اس کی صحت خراب تھی۔ وہ نت نئے ڈاکٹر کے پاس جاتی۔ سکوٹر ٹیکسی کا بھاڑا بھرتی۔ میڈیکل سٹورز بل دیتی۔ لیکن وہ اس گفتار کے ایک سال بعد مر جائے گی اس کی مجھے بالکل امید نہ تھی۔

گوبند مجھے اس کی بیماری کے بارے میں بتاتا رہتا۔ چھٹی والے دن فائل اٹھا لاتا جس میں بیماری سے متعلق کاغذات ہوتے۔ بہت کچھ کہنے کے بعد وہ لمبا سانس لیتا۔

"ڈاکٹر کچھ بھی کہیے میں اسے مرنے نہیں دوں گا ناگپال جی آپ ہی بتائیں اس عمر میں بیوی کا چلا جانا سہن ہو سکتا ہے؟ پیسے کا کیا ہے؟ آپ دیکھ ہی رہے ہیں پانی کی طرح بہا رہا ہوں سوال اس کے ٹھیک ہونے کا ہے تین بچوں کی ماں ہے آخر وہ اپنے ہی کو لے بیٹھتا۔ مجھے یقین ہے اس کے ساتھ میں بھی جاؤں گا" وہ فائل میرے ہاتھ سے لے لیتا اور اسے پھر سے کھول کر میری طرف دیکھنے لگتا۔ میں کچھ نہ کہتا صرف اس کی بیوی کی بیماری پر پریشانی کا اظہار کرتا۔

اب گوبند کے گھر ڈاکٹر اکثر آنے لگا ٹیکہ لگانے نرس تو روز آتی محلے میں ہر کوئی گوپال کی تعریف کرتا۔ اس کی بیوی میں سو عیب نکالتے لیکن اس کے ساتھ ہمدردی جتاتا۔ گوبند ڈاکٹر نرس اور دواؤں کے بارے میں سنتا ہوا چپ چاپ بھٹرا لوگوں کے چہروں کو دیکھتا رہتا۔ دوسرے لوگ اپنے اپنے کوارٹر میں چلے جاتے تو وہ میرے پاس بیٹھ جاتا۔ اپنی بات کو دہراتا:

لوگ نہیں جانتے میں کس سنکٹ میں پڑ گیا ہوں۔ جب سے بلڈ شوگر کا پتہ چلا ہے میرا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ ایک ڈر مجھے بار بار آ جکڑتا ہے۔ میں کہتا ہوں جس عورت کے ساتھ تیس سال گذارے ہوں اور جس سے میرے تین بچے ہوں۔ جس کے ساتھ اگنی کو ساکشی مان کر جینے اور مرنے کی قسم کھائی ہو اس کی موت کی کلپنا کرنا آسان بات نہیں۔ سوچتا ہوں اس کے پیچھے میں بھی چلا گیا تو بچوں کا کیا ہوگا!

اسے اس طرح بولتے دیکھ کر میں اداس ہو جاتا۔

تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔ بہن جی کو ہوا کیا ہے؟ ان کی آیو ہی کتنی ہے؟ یہی کوئی چالیس سال۔ میں تمہیں ستر اسی برس کے لوگ دکھا سکتا ہوں جنہیں خون کے دباؤ کے ساتھ بلڈ شوگر بھی ہے۔

گوبند جواب میں کہتا!
آپ ٹھیک کہتے ہیں انشورکر— آپ کی بات سچ نکلی۔ لیکن مجھے
نا ہے تیٹو کی ماں بچے گی نہیں۔ آپ تو دیکھ رہے ہیں کہ میں نے اپنی طرف
سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ پھر بھی... ایک بات کہے دیتا ہوں میں
اس کے بغیر اپنی زندگی بے کار سمجھتا ہوں۔
میں خاموش ہو جاتا اور سوچتا اس کی بات سنتا اس کے ساتھ
ہمدردی جتاتا ہے!
آپ نے نیا نسخہ نہیں دیکھا۔ کیا ہوا اگر دھیان سنگھ ایک بار
آنے کے چالیس روپے چارج کرتا ہے۔ اس کا دور ہونا بھی مجھے نہیں
... پیسہ تو انسان کے ہاتھ کا میل ہے۔
وہ فائل اٹھا لاتا اور اسے میرے ہاتھ میں تھما کر مجھے اس کے
ورق پلٹتے دیکھتا رہتا۔
دس دن پہلے جب ڈاکٹر دھیان سنگھ ایک ہی دن میں تیسری
بار گوبند کے گھر آنے کے لئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو میں چونکا۔ میرے
من نے کہا بات ہاتھ سے نکلنے لگی۔ میں نے لپک کر ڈاکٹر کو روک لیا۔
"ڈاکٹر صاحب! کیا حالت بہت خراب ہے؟"
"پھر بھی....."
"E C G کچھ نہیں بتاتا۔ روگی کہتا ہے اسے چین نہیں۔"
"شوگر؟"
"وہ پہلے جتنی ہے۔"
اتنے میں گوبند کا موٹر سائیکل بھی آ پہنچا۔ میں اس کے ساتھ ہی
اس کے کوارٹر میں چلا گیا۔ اس کی بیوی درد سے چھٹپٹا رہی تھی۔
اٹھ اٹھ کر اپنی چھاتی کو دبا رہی تھی۔ اسے شکایت تھی کہ وہ سانس
نہیں لے پا رہی۔ گوبند کو دیکھتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا۔
ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کا E C G کیا۔ پہلے کے دو
گراف نئے گراف سے ملائے۔ میرے ہاتھ میں تینوں گراف تھمانے
کے بعد بولا:
یہ تینوں ایک جیسے ہیں۔ دل کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں
ہوئی ہے۔
وہ مجھے اور گوبند کو اندر کے کمرے میں لے گیا!
میں E C G پر وشواس کرتا ہوں لیکن میری شردھا واہگورو
میں ہے۔ آپ مریض کو ابھی نرسنگ ہوم میں لے جائیں۔ میں فون
کئے دیتا ہوں۔
نرسنگ ہوم کا سن کر گوبند کی بیوی کانپ سی گئی:
کیا گھر پر علاج نہیں ہو سکتا؟
میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔!
ڈاکٹر کہتا ہے، آپ چارپائی کے نیچے قدم رکھنے کے بھی قابل
نہیں۔
میری بات سن کر وہ سن ہو گئی جیسے خون کا دباؤ ایک
دم گر گیا۔
گوبند نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا!
آپ پڑھے لکھے ہیں۔ ڈاکٹروں سے بات کر لیں گے میرے
لئے.....
اسی دوران وہ اپنے رشتہ داروں کو فون بھی کرتا رہا۔
ٹیکسی چل رہی تھی۔ گوبند آہیں بھر رہا تھا:
میں نے کسر نہیں چھوڑی۔ گھر بار پھونک ڈالا۔ ایشور ہی مالک
ہے۔
تیٹو کی ماں کو ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر لیا گیا۔ وہ خاص
تشخیص کے لئے مقررہ کمرے میں چلی گئی۔ میں اور گوبند اس کے رشتہ
داروں کے ساتھ باہر رہ گئے۔
اپنے گرد کھڑے لوگوں کو دیکھتا ہوا وہ مجھے کہنے لگا:
آپ ہی جا کر کمرہ بک کر لیجئے۔ فارم وغیرہ بھرنا ہوگا۔ فیس اور
کرائے کا مجھے بتا دیجئے وہ اپنے بھائی بندوں کی طرف منہ کر کے کہتا
چلا گیا!
کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آدمی کماتا کس لئے ہے۔ لکشمی بھی تو
تیٹو کی ماں کے ساتھ ہی میرے گھر آئی۔ اس پر خرچ نہیں کروں گا
تو اور کس پر کروں گا۔ تم بس بھگوان سے پرارتھنا کرو، پیسے کی چنتا نہیں۔
دوسرے دن روگی کو ایمرجنسی وارڈ سے نکال کر اس کے کمرے میں
پہنچا دیا گیا۔
ڈاکٹر نے بتایا:
چنتا کی کوئی بات نہیں کچھ دن آرام کی ضرورت ہے۔ شاید اگلے
ہی ہفتے گھر واپس چلی جائے۔ اسے پریشانی اور بھیڑ سے بچایا جائے۔

پتھر

پوسٹر/آرٹ

شیخ مبین اللہ

اس شہر کے مین روڈ پر ہر روز جاتی ہوئی گاڑیوں اور اور جوان لڑکیوں کو دیکھ کر منشی کانت گہری سوچ میں غرق ہو جاتا ہے۔ لی لی یاد آجاتی ہے۔ وہ گہری سانس چھوڑتا ہے اور بوڑھے کتے کی طرح بے دم ہو جاتا ہے۔ منہ سے رال ٹپکتی ہے۔ رال سوکھ جانے کے بعد منہ میں گوند لیٹی ہوئی لگتی ہے۔ دونوں ہونٹ بند ہو جاتے ہیں زبان میں لکنت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔
منشی کانت محسوس کرتا ہے جیسے شہر کی تمام جوان لڑکیاں اور گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ "کہاں"، اور "کس لئے" دوڑتی ہیں۔ وہ سب دوڑ دوڑ کر تھک جاتی ہیں اور ان کی زبانیں نکل پڑتی ہیں اس دوڑ کی آواز گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز کی طرح ہوتی ہے۔

لیکن منشی کانت کو محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آواز پائل کی جھنکار ہو۔ چھم چھما چھم..... چھم۔ منشی کانت اپنے داہنے ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو منہ میں ڈال کر ناخن کترنے لگتا ہے۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ پیچھے کرتا ہے۔ گھنگھرالے بالوں میں انگلیوں کو چھپا کر گدگدانے لگتا ہے۔ اس درمیان وہ سوچتا ہے کہ آیا لی لی بھی دوڑتی ہے کہ نہیں؟ ناخن کترتے کترتے وہ گوشت کو بھی کاٹ لیتا ہے خون رسنے لگتا ہے۔ نمکین خون۔ پہلی دفعہ اپنے خون کے ذائقے سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ضدی بچہ اپنی ماں کے تھنوں کو زبردستی چوسنے کی طرح وہ اپنی انگلی کو چوسنے لگتا ہے۔ وہ ادھر ادھر اپنی تجسس بھری نگاہ دوڑاتا ہے۔ کافی غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ "لی لی" بھی دوڑ رہی ہوگی۔
"پس نوشت: لی لی کے شہر میں ہو یا اس کی گلیوں میں، بہت سارے کرشن چوڑا کے درخت ہیں۔

لی لی:

لی لی مہانتی۔ عمر ڈھلی نہیں۔ گداز جسم۔ مرمریں بانہیں اور سب کچھ۔ عمر کے لحاظ سے جوانی بھی ہے۔ اس کا اصلی کام کیا ہے اور نام کچھ اور نہ رکھ کر "لی لی مہانتی" کس لئے رکھا گیا اس سلسلے میں مزید معلومات دستیاب ہو نہیں سکی ہیں۔
لیکن شاید اس نے اپنا نام بدل لیا ہے۔ اس کی چال ڈھال اور نگاہِ غلط انداز سے پتہ چلتا ہے کہ عشق کرنے کی عمر آ گئی ہے۔ عشق کے ساتھ عمر کا جو رشتہ یا تعلق ہے۔ وہ بات کوئی دوسرا اقرار نہ کرنے پر لی لی مہانتی ضرور اقرار کرے گی لیکن نام کے ساتھ عشق کا کیا رشتہ ہے؟

اکثر لڑکیاں عشق کرنے سے پہلے اپنا نام [illegible] ہیں۔ شاید نام کی تبدیلی میں کوئی لذت بھی ہوگی۔

فائدہ نہ ہو، نہ سہی۔ چھوٹے نام مثلاً لی لی، سنالی، ڈلی، کنی، جولی وغیرہ وغیرہ کی پکار سے لڑکیاں محفوظ ہوتی ہیں اور پکارنے والوں سے واقعی جیسے محبت کرتی ہیں اسی انداز سے ذرا مسکرا بھی دیتی ہیں۔ لی لی مہانتی بھی ایک دن ہنسی تھی منشی کانت کے ساتھ پہلی ملاقات کے دن۔

منشی کانت:۔

منشی کانت کھنتیا۔ نوجوان۔ عمر تقریباً [illegible] گی۔ اسے منشی کانت نام بالکل پسند نہیں اکثر گھر کے دوسرے افراد پر خفا ہوتا ہے۔ اور ماں پر برستا ہے کہ وہ اس کا نام کچھ اور رکھ کر منشی کانت کیوں رکھا (مثلاً بولو، ٹوٹو، ٹنکو، بوبلو)

وہ بیٹے کے بارے میں اس طرح کا سوال اور اعتراض سنتی ہیں۔ بہت ہنستی ہیں، ہنس ہنس کر بے دم ہونے کے بعد بھی منشی کانت کو اس سلسلے میں سمجھا دینا ان کے بس کا روگ نہیں۔ وہ صرف ہنستی ہیں اور ہنستی ہیں اور منشی کانت بے وقوف کی طرح ان کے منہ کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ جیسے وہ واقعی بے وقوف بن گیا ہو۔ اسی طرح کی معمولی باتوں سے وہ جذباتی بن جاتا ہے اور کچھ دیر کے لئے واقعی بے وقوف بھی۔

ہمدردی:

واقعی منشی کانت تمہارے لئے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے تم کس لئے اسطرح بے وقوف بن جاتے ہو؟

اس طرح بے وقوف نہیں بننے سے کیا کام نہیں چلیگا؟....

دونوں کی داخلی آواز:

لی لی اور منشی کانت۔ دونوں نے آپس میں پہچانا کہ نہیں کچھ معلوم نہیں آس پاس بیٹھنے پر بھی دونوں کے اندر ایک خلا تھا جس خلا کو ناپنا مشکل تھا۔ جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس خلا کو ناپنے کے لئے لی لی مہانتی بہت ساری تصویریں کھینچتی ہیں۔ بدسے بدن لگے ہوئے عریاں مرد اور عریاں عورتوں کی تصویریں پھر بھی وہ اس خلا کو ناپنے میں ناکامیاب ہے وہ ہار جاتی ہے۔ بار بار آئینہ کے سامنے ماڈل کی طرح کھڑے ہو کر صرف اپنے گرد و پیش کا نظارہ کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی تصویر دوسرا روپ اختیار کرتی ہے۔ منشی کانت کے دل میں یہ افسوس رہ جاتا ہے کہ کسی نے اسے پہچانا نہیں۔ پہچاننے کی کوشش تک بھی نہیں کی۔

کسی ایک نمائش گاہ کے اسٹال کے سامنے منشی کانت کی لی لی مہانتی کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

منشی کانت کو وہم ہو گیا تھا کہ اسٹال کے پاس شاید کوئی ماڈل رکھی ہوئی ہے۔ سنہرے رنگ کے جسم پر فیروزی لباس دیکھ کر اس کے تمام احساسات بیدار ہو گئے تھے۔ اس کی دونوں آنکھیں قرب و جوار کا جائزہ لے کر پھر اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھیں۔ اس نے ہوشیاری سے اپنے داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت بڑھائی۔ لیکن یہ کیا؟ اس کی ناک سے جیسے ایک خوشبو ٹکرائی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ یہ ماڈل نہیں تھا۔ منشی کانت کے شعور میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اور لڑکی سے آشنائی پیدا کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ تعارف کے لئے گفتگو ضروری تھی۔ یہ بات اس نے پہلے ہی کہیں کسی کتاب میں پڑھی تھی۔ منشی کانت نے سوچا کسطرح بات شروع کی جائے؟ عجیب کشمکش کے عالم ایک ڈرامائی انداز میں اس نے شروع کیا:۔

: کیا آپ شہر میں رہتی ہیں؟
: شہر میں، لیکن اس شہر میں نہیں۔
: میں بھی۔
: آپ ----؟
: منشی کانت۔
: اور میں لی لی۔
: یہ شہر مجھے بہت ہی بھاتا ہے۔
: مجھے بھی ----

پس نوشت :۔

محبت ایک اضافی لفظ ہے جس کا مفہوم ابھی تک انسانی ذہن کی گرفت سے باہر ہے۔

بات چیت کرتے ہوئے وہ لوگ کسی ایک کافی ہاؤس کے اندر گئے۔ یہ کافی ہاؤس لی لی مہانتی کو بہت ہی پیارا لگا۔ کافی کی چسکی لیتے ہوئے اور کافی ختم ہونے کے بڑی دیر بعد تک وہ لوگ بات چیت کرتے رہے۔ شروعات کے بعد بانہوں میں بانہیں ڈال کر دوڑنے کے لئے تیار ہوئے۔ بہت تیزی سے راستے میں دوڑتے ہوئے گاڑیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دوڑتے گئے۔ اور لی لی مہانتی ہر روز حدیثِ دل کا نیا نیا سبق حفظ کرنے لگی۔

دوسری آواز:

منشی کانت اور لی لی مہانتی دوڑتے اور صرف دوڑتے گئے۔ اس شہر سے اس شہر کو اور اس شہر سے پھر کسی اور کو.....

اس تگ و دو کے درمیان موسم سرما آ گیا اور اس نے لی لی مہانتی کو بے چین کر کے رکھ دیا۔ یہ بات منشی کانت کو معلوم نہیں۔ اس سردی میں لی لی مہانتی کے تمام اعضا آگ کی گرمی کے لئے

بے چین ہو گئے ہیں اور لی لی مہا نتی۔ تھر تھر کانپنے لگی ہے دانت سے دانت بج رہے ہیں اس نے اپنی پشمینی پوشاک پہن لی اپنے آپ سے جکڑ گئی اور صدائے بازگشت سننے لگی۔

صدائے بازگشت: ا:

لی لی ۔۔۔۔۔ مہانتی

(لی لی مہانتی نے اثبات میں اوں کہا)

منشی کانت بزدل ہے۔

منشی کانت ڈرپوک ہے۔

منشی کانت بے حس ہے۔

منشی کانت اپاہج ہے۔

منشی کانت نامرد ہے

واقعی منشی کانت بے حس ہے کیوں کہ اسے یہ بھی احساس نہیں کہ سردی آگئی ہے۔

لی لی مہانتی نے طے کیا، چلی جائے گی کسی دوسرے شہر کو ۔۔۔۔ منشی کانت کو جھنجھوڑ کر اس نے آواز دی (منشی کانت)

صدائے بازگشت: ۲:

منشی کانت ۔۔۔۔۔ منشی کانت کھنشیا ۔۔۔۔

(منشی کانت نے اثبات میں سر کو ہلایا)

تم بزدل ہو!

تم ڈرپوک ہو!

تم بے حس ہو!

تم اپاہج ہو!

تم نامرد ہو!

اور تم واقعی بے حس ہو کیوں کہ تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ سردی کب کی آگئی ہے!

لی لی مہانتی کی آواز پر منشی کانت چونک سا پڑا۔ اس کے دل میں ہیجان برپا ہو گیا۔ اس نے خود کو بار بار نادم کیا۔ اپنی مردانگی پر اسے شک سا ہو گیا۔ اس کے اعضا سرد ہو رہے تھے اس نے اپنی خواہشوں کو بیدار کیا، جذبات کو گدگدایا اور زور سے اپنے جسم کی چٹکی لی۔ سب ٹھیک تھا۔ بالکل ٹھیک۔ پھر کس لئے ۔۔۔۔ ؟

لی لی مہانتی نے سوچا کہ اسے کچھ نہ کچھ کہنا چاہئے۔ اس لئے اس گفتگو کا آغاز کیا۔

گفتگو:

: تم بزدل ہو؟

: (خاموشی)

: تم ڈرپوک ہو؟

: (خاموشی)

: تم بے حس ہو؟

: (خاموشی)

: تم اپاہج ہو؟

: (خاموشی)

: تم نامرد ہو؟

: نہیں نہیں نہیں (میں) نامرد نہیں اور بے حس بھی۔

منشی کانت کی زبان سے بے حس کی آواز سن کر لی لی مہانتی کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ لی لی مہانتی کو منشی کانت پر شبہ ہونے لگا کہ منشی کانت کو سب کچھ معلوم ہے لیکن ۔۔۔۔۔

لی لی مہانتی نے بیٹھنے کا انداز بدل ڈالا گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ بائیں ہاتھ سے بائیں پاؤں کی انگلیوں کے ناخنوں کو کریدنے لگی دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے زمین پر لکیر پر کھینچنے لگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ منشی کانت کو چھوڑ دے گی کیوں کہ ایک کھلونے کے ساتھ دلہا دلہن کا کھیل کھیلنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں اور وقت ہو بھی تو اس کی عمر کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ لی لی مہانتی تیار ہو گئی۔ سردی کو احتیاط سے بغلوں میں سمیٹ لیا۔ اپنی خواہشوں کو بیدار کر کے گرانے سے پہلے رات کی بے شمار گاڑیوں اور ہم عمر لڑکیوں کے بالمقابل دوڑنا شروع کیا اور دوڑتی گئی۔

منشی کانت نے خود کو تسلی دی کہ وہ ایک شہری بزدل ہے۔ وہ رات میں دوڑتے ہوتے لوگوں سے بار بار سوال کرے گا بہت سارے سوالات۔

پہلا سوال: میں کیا مرد ہوں؟

جب مرد ہوں تو کیا بزدل ہوں؟

دوسرا سوال: لی لی مہانتی کے ساتھ دوڑتے ہوئے مجھے جانور کیا بزدل نہیں؟

بقیہ صفحہ ۴۴ پر

غزلیں

افضال ملک

میرا ادراک دیکھتا ہے اُسے
حادثہ جو گزرنے والا ہے

سرد سورج غروب ہوتا ہے
لمحہ لمحہ ٹھٹھرنے والا ہے

تو جیسے خوابگاہِ شب میں ملا
وہ تجھے یاد کرنے والا ہے

پھر فضا میں سماعتیں چونکیں
پھر وہ نغمہ بکھرنے والا ہے

دل جلا ہی لیا، تو کیا! کہ یہی
روشنی راہ میں کرنے والا ہے

چاندنی سیڑھیاں لگاتی ہے
چاند سے کون اترنے والا ہے

ٹہنی ٹہنی ہے پیڑ اداس یہ کیوں
کیا کوئی گل بکھرنے والا ہے

شب میں قبریں صدائیں دیتی ہیں
کون اندھیروں میں مرنے والا ہے

تارہ ٹوٹا، مگر کیسے معلوم!
کس جگہ پر یہ گرنے والا ہے

تارہ تارہ ہے شب اداس افضال
ٹوٹ کر کوئی گرنے والا ہے

رام پرکاش راہی

پھر وہی کربِ گذارش وہی منشا اپنا
کوئی اظہار کی صورت نہ تقاضا اپنا

چہرہ در چہرہ لیے اپنے کیئے کے تیور
جانے کس سوچ میں گم صم تھا سیہ سایا اپنا

بے طنابی سے بگولوں کی کشاکش ہے وہی
کیا ہوا دشتِ تمنا میں بھی خیمہ اپنا

عکس در عکس کے گرداب میں الجھا الجھا
مسخ تھا آئینہ خانے میں سراپا اپنا

اس مفاجات و مکافات کے معمورے میں
فرق تا عرضِ مناجات ہے حصہ اپنا

چشم تا چشم کے زینے کا توسط یعنی
دل ہی الہام ہے اور دل ہی صحیفہ اپنا

بے تکی بات ہے اڑ جائے گی بے پر راہی
تم نے لکھا ہے ہواؤں پہ فسانہ اپنا

نظمیں

ماندگی

خالد سعید

افق کے پار
کوئی دستِ روشن جھلملاتا ہے،
کرہوں سے بلاتا ہے[1]
افق کی سمت کھلتا آہنگ زینہ
اور زینے کے سرے پر
شفق کا دشتِ روشن
افق کی سمت ہے پیہم مسافت
شفق کی ٹھوس ہاتھوں میں، —— قدم کے نیچے زینہ
یہ زینے آگ کے ہیں، اوس کے ہیں، کیا بلا ہیں
—— یہ زینے اک بلا ہیں
شفق کی ٹھوس ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی ہے
اور ہوا کے ہونٹ پر چاندی کے دانے

[1] یہ مصرعہ [illegible] صاحب کا ہے۔

سرابِ

شاہد کلیم

میں نے سُن رکھا ہے یہ
بوند بوند شبنم تو رات بھر برستی ہے
جسم پر گلابوں کے کھیلتی ہے ہنستی ہے

تم نے سُن رکھا ہے یہ
بوند بوند شبنم کو جسمِ گل ترستا ہے
تشنگی کے شعلوں میں ہر نفس جھلستا ہے

دشت کی مسافت کو طے کرے گا
آخر کون ؟

میں بھی پاشکستہ ہوں
تم بھی پاشکستہ ہو
رات ہو چلی ہے اب
اپنے اپنے گھر لوٹیں۔

شاہ ظہیر

اذیت !!
لہو جلنے لگا
عبادت !
اپنا مفہوم مانگتی ہے

فلک کی آنکھ نم ہے
انصاف کہاں ؟
ساری عدالتیں بند ہیں،

وقت کی تہ آلود میں
اس صدی کا سارا جھوٹ
[illegible] ہے۔

[illegible]
انتظار [illegible] ہیں
انصاف کو کب
اس [illegible]!
[illegible]

غزلیں

اکرام کاوشؔ

صبحِ امید خوں چکاں کیوں ہے
ہر روش پر دھواں دھواں کیوں ہے

ریت ہی ریت ہے مگر مجھ کو ؛
ڈوبنے کا ہوا گماں کیوں ہے

نئی تنویر کھٹکھٹاتی ہے در
بند افکار کا مکاں کیوں ہے

شور ، ہنگامہ ، محفلِ یاراں
میرے احساس پر گراں کیوں ہے

میں نے بھی سیکھ لی اداکاری
مجھ پہ حیراں یہ جہاں کیوں ہے

زندگی رخ بدلتی رہتی ہے !
اس یقیں پر تمہیں گماں کیوں ہے

اجڑے دل کی اداس سرحد پر
عشرتِ غم کا امتحاں کیوں ہے

دلِ کاوشؔ میں کہکشاں بن کر
ایک چہرہ [illegible] کیوں ہے

دوہے

اعجاز

خوشیاں رنگ بکھیرتیں گلیوں گلیوں گھوم
موت کا گھر نزدیک ہے کیسے نہیں معلوم

ابھی وقت ہے تو سنبھل سرمت دھن نادان
چلو موت کے گھر چلیں مانگیں جیون دان

برسوں ہی جس سے ہوئی ایک سنہری بات
سنا وہ گڑیا کانچ کی ٹوٹ گئی کل رات

قدم قدم اس بھول نے مجھ کو کیا خوار
دانش ور سے دل لگی دیوانے سے پیار

ہیرا سمجھا دیر میں پیا سا کرے پکار
ٹوٹا مٹکا کوپ میں جھٹ سے دیا اتار

اقبال کی رباعی کے بارے میں وضاحت

اکبر علی خاں عرشی زادہ

جناب گوپال متل نے تحریک بابت فروری ۱۹۸۰ء میں سلیم احمد کی کتاب اقبال ایک شاعر پر انتظار حسین کا تبصرہ شب خون الہ آباد سے مانگے کا اجالا کے تحت نقل کیا ہے۔ اور ابتدا میں دل دریا سمندر ڈونگے کے عنوان سے اقبال کے ناقدین اور شارحین کے رویے پر گفتگو بھی کی ہے۔ جو سوال متل صاحب نے اٹھایا ہے یعنی کسی شاعر کے قول و فعل میں تضاد کا ہونا اس پر مولانا عرشی سے انهم یقولون ما لا یفعلون میں حضرت حسان بن ثابت، مولانا روم اور امیر مینائی کے حوالے سے بحث کی تھی یہ مضمون شب خوں اور پھر تحریک بابت اگست ۷۹ء میں نقل ہو چکا ہے۔ اردو والوں کا رویہ ہمیشہ انتہا پسندی کا رہتا ہے سراسر مدح یا سراسر قدح۔ کسی شاعر یا ادیب سے محبت ہو جانا قدرتی بات ہے لیکن وہ اپنے قارئین کی کمزوری بن جائے یہ سمجھ میں نہیں آتا بہر حال ہمارے نقادوں کا رویہ بھی عام پڑھنے والوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ اسی المیے کا شکار اقبال بھی ہیں۔

متل صاحب نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوتے اقبال کی ایک فارسی رباعی کو بھی پیش کیا ہے لیکن چوں کہ یہ رباعی اقبال نے اپنے مجموعہ ہائے کلام میں سے کسی میں شامل نہیں کی اس لئے متل صاحب کو یہ گمان ہوا کہ۔

"وہ (اقبال) جب تخلیق عمل سے آزاد ہوئے تو منطق کی گرفت ان پر پھر سے مضبوط ہو گئی۔ اگر ایسا ہے تو شاعر اقبال کے ساتھ بے انصافی صرف ان کے ناقدوں نے نہیں کی بلکہ خود اقبال نے بھی کی۔ ظاہر ہے کہ جب شاعر کا یہ رویہ ہو اس کے لئے محشر میں "دامن یزداں چاک" کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔"

دراصل متل صاحب کے علم میں اس رباعی سے متعلق ایک واقعہ نہیں ہے ورنہ وہ اقبال　　کے بارے میں شک سے کام نہ لیتے۔ ہوا یہ کہ اقبال کی یہ رباعی مشہور ہوئی اور بہت پسند کی گئی۔ پسند کرنے والوں میں ڈیرہ غازی خاں کے ایک صاحب بھی تھے انہوں نے اقبال کو یہ لکھا کہ وہ یہ رباعی ان کو عطا کر دیں۔ اقبال نے اپنے عاشق کی خواہش کے احترام میں رباعی سے دست برداری لکھ دی۔ اسکے بعد رباعی کو اقبال اپنے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کر سکتے تھے۔ ان صاحب کے نام اقبال کی دست برداری ظاہر کرنے والا خط بصورت عکس اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ کے صفحہ ۳۸ پر چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور من و عن ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

ڈیرہ غازی خاں بلاک نمبر ۴
جناب محمد رمضان صاحب عطائی۔
سینئر انگلش ماسٹر
گورنمنٹ ہائی اسکول
ڈیرہ غازی خان
D.G. KHAN
حال رخصتی ملاحظہ کریں

لاہور ۱۹ فروری ۱۹۳۶ء

جناب من　　میں ایک مدت سے صاحب فراش ہوں۔ خط و کتابت سے معذور ہوں۔ باقی شعر کسی کی ملکیت نہیں آپ بلا تکلف وہ رباعی جو آپ کو پسند آ گئی ہے اپنے نام سے مشہور کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ فقط

محمد اقبال لاہور

اس خط پر عطائی صاحب نے درج ذیل نوٹ تحریر فرما دیا ہے ؟

رباعی گنجینہ یہ ہے جو حضرت اقبال نے حسب وعدہ ارمغان حجاز میں طبع نہیں ہونے دی۔ بلکہ اس کی بجائے الفاظ بدل کر ایک دوسری رباعی رقم فرمائی ہے مگر یہ کہاں اور وہ کہاں

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر روز محشر عذر ہائے من پذیر

از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر در حسابم را تو بینی ناگزیر

حقیر عطائی عفی عنہ

لیکن اقبال رباعی کے الفاظ سے دست بردار ہونے کے باوجود بھی اس کے خیال اور مضمون سے دست بردار نہ ہوئے اور یہ موقوم کو ظاہر کرنے والی ایک اور رباعی نظم کی جو درج ذیل ہے :

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہ مارا
حساب من ز چشم او نہاں گیر

ارمغان حجاز طبع اول صـ ۲۳

یہ دوسری رباعی ارمغان حجاز میں موجود ہے اور ثابت کرتی ہے کہ اقبال کے انداز فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور پہلی رباعی کی مجموعۂ کلام میں عدم شمولیت ایک وعدے کا ایفا اور ایک دوست کی خواہش میں تھا۔

بقیہ ماتم

وہ رکا :

مجھے پوری رقم یاد نہیں - یہ تو فائیل ہی ...
مجھے لگا وہ اٹھنے ہی والا ہے ۔

میں نے جھٹ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا :

بارہ بجے پڑ بیں لگ جاتا، آپ پیچھے بیٹھنے والے تھوڑی ہیں - فائیل لانے کی کیا ضرورت ہے - میں جو بیٹھا ہوں مجھے سب ...

اب رہ رہ کر وہ ایک ہی رٹ لگانے لگا -

آنے والوں کے ساتھ آنسو بہانے کے فوراً بعد فائیل کی بات کرتا اور رقم گننا شروع کر دیتا - حتیٰ کہ عورتوں نے لاش کو نہلا دھلا کر نئی ساڑھی میں لپیٹ دیا اور مرد اسے تختے پر رکھنے کے لئے اٹھنے لگے -

●●

بقیہ پتھر

تیسرا سوال : وہ کیا نامرد ہے اور وغیرہ وغیرہ ...؟

(مسلسل)

منشی کانت کے سوالوں کا جواب نہیں ملا ۔ اس کے تمام سوالات لی لی مہا نتی، اس کی ہم عمر دیگر دو شہزادوں اور دوری ہوئی گاڑیوں کے وجود سے ٹکرا کر صدائے بازگشت کی صورت میں واپس آگئے اور وہ صرف صدائے بازگشت ہی سن سکا۔

منشی کانت کے کان اور سر بھائیں بھائیں کر رہے ہیں - بار بار اسی ایک ہی طرح کی صدائے بازگشت کو سن کر اس نے اندر کچھ محسوس کیا - وہ فی الحال اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے بالکل معذور ہے - اس نے محسوس کیا جیسے سچ مچ وہ بے حس ہو جائے گا - کچھ دیر کے بعد ..... کچھ کہنے کے لئے اس نے کوشش کی - لیکن کچھ کہہ نہ پایا - اس شہر کے کچھ گونگے آدمی کی طرح اس نے صرف اقبال کیا -

وہ بزدل ہے -

اور نامرد ------

اور وغیرہ ------

مانگے کا اُجالا

کونارک مندر

اڑلیسہ کے مشہور راجہ نرسنگھ دیو کی فتح بنگال کا واقعہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اسی فتحیابی کی یادگار کے طور پر راجہ نرسنگھ دیو نے کونارک میں "سوریہ دیو" (سورج دیوتا) کی پرستش کے لئے غالباً ۱۲۵۰ء میں ایک مندر بنایا تھا یہ آج سے تقریباً ۷۲۸ سال قبل کی بات ہے۔

شہر پوری سے ۳۲ کلو میٹر دوری پر سمندر کے ساحلی علاقے میں پراچی ندی کی ایک شاخ "چندر بھاگا" کے کنارے یہ مندر بنایا گیا تھا۔

یوں تو اڑلیسہ میں جگن ناتھ جی کا مندر (واقع پوری) لنگ راج جی کا مندر (واقع بھوبنیشور)۔ مکند دیو کا بارہ باٹی قلعہ (واقع کٹک) کھنڈ گیری، ادے گیری اور دھولی گیری (واقع بھوبنیشور) تاریخی اعتبار سے مشہور ہیں لیکن جو بین الاقوامی شہرت کونارک کے مندر کو حاصل ہے وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

اس مندر کو دیکھنے کے لئے ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک کے سیاحوں کی بھیڑ ہمیشہ لگی رہتی ہے۔

کونارک سنگتراشی اور معماری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اصلی مندر MAIN TEMPLE منہدم ہو چکا ہے۔ لیکن سکھ شالہ "PORTICO" شکستہ حالت میں ہے۔ اس کے عجیب و غریب نقش و نگار نیز سنگتراشی اور معماری کے اعلیٰ فنی نمونے آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتے ہیں۔

اس مندر کی ساخت اڑلیسہ کے دیگر مندروں سے مختلف ہے چوں کہ یہ سورج دیوتا کی پرستش کے لئے بنایا گیا تھا اس لئے اس کی ساخت ایک رتھ کی طرح ہے اس کے دونوں بازوؤں پر بارہ مہینوں کی علامت کے طور پر بارہ جوڑے یعنی چوبیس پہئے اور مندر کے سامنے ہفتہ کے سات دنوں کی علامت کے طور پر سورج دیوتا کی سواری کے لئے سات گھوڑے تیار ہوئے تھے۔

نیچے سے اوپر تک یہ مکھ شالہ معماری اور سنگتراشی کی نقاشی سے بھرپور ہے۔ اس میں جس طرح انواع و اقسام کے جانور، پرندے، بیل بوٹے، پھول پھل، چڑیوں اور ما فوق الفطرت اجسام کی مورتیں تراشی گئی ہیں اس کی مثال ہندوستان کے دوسرے کسی بھی مندر میں پائی نہیں جاتی رقاصوں اور رقاصاؤں کی مورتیں عیاشی اور ہیجان انگیز شہوت پرستی کے عجیب و غریب نمونے ہیں۔

روایت کے مطابق ۱۲۰۰ سنگتراش مسلسل بارہ سال کی محنت کے بعد اسے تیار کر پائے اور ریاست اڑلیسہ کی بارہ سال کی شاہی آمدنی تقریباً چالیس کروڑ روپے اس کے لئے خرچ کئے گئے تھے اس مندر کی بلندی ۲۲۷ فٹ اور مکھ شالہ کی بلندی تقریباً ۱۴۳ فٹ تھی کونارک کا یہ مندر بھوبنیشور کے "لنگراج مندر" اور پوری کے "جگن ناتھ مندر" سے زیادہ بلند تھا۔

اصل مندر منہدم ہو چکا ہے "مکھ شالہ" کا بھی کچھ حصہ ٹوٹ کر صرف ۱۰۴ فٹ کی اونچائی تک رہ گیا ہے سمندر کی ۱۴۱ فٹ بلندی پر صرف ایک پتھر سے تیار شدہ "دوہی نوتی" (کلس) کا وزن تقریباً ۲۵ لاکھ کلو گرام تھا۔ مکھ شالہ کے سامنے صرف ایک پتھر سے تیار شدہ نوگرہ مورتی کا وزن تقریباً ۲۰۷۲۰ کلو گرام تھا۔

(۔ شیخ مبین اللہ شاعر، بمبئی)

جدید افسانہ اور ترقی پسند افسانہ

جدید اور ترقی پسند افسانے میں فرق بنیادی طور پر دو مختلف رویوں اور زاویہ ہائے فکر کا ہے۔ ترقی پسند افسانہ "ترقی پسند مصنفین" کی تحریک کے زیر اثر نمودار ہوا جب کہ جدید افسانہ آزاد اور فطری ماحول میں پروان چڑھا اور نئی معراج کو پہنچا۔ جدید افسانہ "زمان و مکان کی حدبندیوں سے ماورا" ہے۔ جب کہ ترقی پسند افسانہ "زمان و مکان سے اوپر اٹھنے کی باتیں کرنے کے باوجود زمانی طور پر مقید اور مکانی طور پر منسلک اور وابستہ" ہے۔ جدید افسانہ ایک وسیع حلقہ انسان دوستی کے مشرب کی تحریک کا ثمر ہے جس میں سماجی

شعور کے علاوہ روحانی ارتقاء تہذیبی نکھار اور تخلیقی سطح شامل ہے۔ جب کہ ترقی پسند افسانہ "خاص پہلو" کو کُل سے کاٹ کر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جدید افسانہ کی ہمہ گیر اقدار کے مقابلے میں ترقی پسند افسانہ سامنے آیا۔ لیکن تہذیبی و سماجی شعور کی غذا سے محرومی کے باعث بہت جلد مرجھا گیا۔ دراصل "ترقی پسند مصنفین" کی لفظی ترکیب ہی بڑی گمراہ کن اور فریب دہ ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس انجمن یا تحریک سے وابستہ ادیب و فن کار عظمتِ انسان، معاشرے کی خوش حالی، معاشی مساوات اور حق و صداقت پر یقین رکھتے ہیں (کیوں کہ ہر سچا فنکار بنیادی طور پر ترقی پسند ہوتا ہے اور وفا کیشی اس کا شعار ہوتا ہے) اس تحریک کے پسِ پردہ جو چھپے ہوئے عزائم تھے اب وہ ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ وہ افسانہ نگار جو اس تحریک سے وابستہ ہو کر افسانے لکھتے رہتے ہیں ان کے پیشِ نظر غیر ملکی نظریہ (یعنی مارکس ازم اور لینن ازم) کا پرچار تھا۔ ان ادیبوں نے ادب کو نہایت دیدہ دلیری سے پہلے تو اشتراکی سیاست کے تابع مہمل بنا دیا اور پھر انہوں نے ایک خاص منصوبہ بندی اور درآمد شدہ مینی فیسٹو کے تحت افسانے سپردِ قلم کئے جن میں مصنوعی طبقاتی کشمکش اور جدلیت کو خاص طور پر نمایاں کر کے پیش کیا۔ ان لوگوں نے ادب کو "میکانکی اور مشینی رفتاروں" کے تابع کیا اور انسانی آزادی کے فطری حق کو مجروح کیا۔ اس طرح ذاتی مقاصد کے حصول کی لگن میں فن کے مقدس اصول کو قربان کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں بیشتر ایسے لوگ تھے جو ذہنی افسردگی، شکستگی، نامرادی، مایوسی اور گھٹن کا شکار تھے۔ مایوسی اور شکست خوردگی سے مغلوب ہو کر انہوں نے معاشرے کی اعلیٰ اقدار کو پامال کیا اور لادینیت، لامذہبیت انتشار ARCHY کی سطح میں آکر ترقی کے خواب دیکھنے لگے یہ صحیح ہے کہ تمام کے تمام ادیب جو ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے افسردگی و شکست خوردگی کا شکار نہیں تھے۔ پریم چند اور کرشن چندر جیسے عظیم فن کار اپنی ذہنی پختگی اور شعور و آگہی کی وجہ سے نہ تو جنسی ناآسودگی کا شکار ہوتے اور نہ ہی غیر ملکی نظریہ کی اندھا دھند تقلید میں اپنے معاشرے کے دکھ درد کو بھولے۔ پریم چند کا "کفن" آج بھی مقصد و فن کے امتزاج کا خوب صورت افسانہ تصور ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر رشید جہاں اور سجاد ظہیر جیسے ادیب جو نام نہاد ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، ناآسودگی اور انتشار کی دلدل میں دھنسے چلے گئے۔ پریم چند ترقی پسند تحریک سے صرف اس حد تک وابستہ رہا کہ وہ ایک مخلص اور سچے فنکار کی طرح اعلیٰ اقدار پر یقین رکھتا تھا۔ لیکن اس تحریک کے پیچھے چھپے ہوئے سیاسی عزائم سے یا تو وہ ناواقف تھا یا پھر حسن ظن رکھتا تھا۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ اس عظیم فن کار نے محض مقصد آفرینی کی خاطر فن کو مجروح نہ کیا جیسا کہ عموماً ترقی پسند تحریک کے پیروکار منصوبہ بندی کے عمل میں مبتلا ہو کر فن کو قربان کر دیتے ہیں۔ اس کی واضح مثال شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" ہے جہاں ناول کا فن مصنف کی شدید منصوبہ بندی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مصنوعی طبقاتی کشمکش، جدلیت، اقتصادی ناہمواری اور معاشرتی برائیاں کو نمایاں کرنے کی خاطر یہ ناول صحافت اور عام واقع نگاری کی سطح پر آ گیا ہے۔ یہ ناول نہ تو کوئی عظیم نظریۂ حیات پیش کرتا ہے اور نہ ہی جمالیاتی حظ پہنچاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کے سامنے سوائے ذاتی ترقی اور ذاتی مفاد کے اور کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ اگر ان کے سامنے کوئی ملکی، ملی احساس یا عظیم آدرش ہوتا تو یہ لوگ ہر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو فوری طور پر نہ ڈھالتے۔

جمیل آذر — اوراق، لاہور

شدت کا سبب سیاست

سیاسی اختلاف ہمیشہ شدت پیدا کرتا ہے۔ قدریہ اور جبریہ فرقوں میں جو شدت نظر آتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ دونوں فرقے سیاسی اسباب کے تحت پیدا ہوئے خلافت راشدہ کے آخری دور میں سیاسی اقتدار بنو ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔ بنو امیہ نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ بنو ہاشم کی طرف سے کسی متوقع بغاوت کو کچلنے کے لئے انہوں نے ان کے اوپر سخت مظالم کئے۔ یہی وقت ہے جب کہ جبر و اختیار کے نظریات، مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ بنو امیہ نے اپنی سیاست کی نظریاتی توجیہ کے لیے جبر کا سہارا لیا۔ انہوں نے کہا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے بنو امیہ کا بنو ہاشم سے خلافت چھیننا اور ان کے افراد پر سختیاں کرنا سب خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہو رہا ہے، اس میں کسی انسان

کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے جواب میں ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے دوسرے گروہ نے کہا کہ انسان آزاد ہے اور خود اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی راہ منتخب کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس طرح نظریۂ اختیار کا مطلب، اس وقت کی فضا میں یہ ہو گیا کہ بنو امیہ ظالم ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ارادہ سے کیا ہے خدا کے حکم کا اس سے کوئی تعلق نہیں —— کوئی بحث اگر خالص علمی مقصد کے تحت نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے دوسرے مفادات و محرکات کام کر رہے ہوں تو دونوں فریقوں کی طرف سے شدت اور مبالغہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی قدریہ اور جبریہ کے ساتھ ہوا۔ قدیم کتابوں میں ان مباحث پر جو شدت پائی جاتی ہے وہ اسی سیاسی پس منظر کا نتیجہ ہے۔

یہی معاملہ [illegible] دوسرے عنوان کے ساتھ خوارج کا تھا جنھوں نے ایمان اور عمل کے بارے میں انتہا پسندانہ اعتقادی مباحث پیدا کئے۔ خوارج نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ چوں کہ اسلام میں مسلمانوں کی قائم شدہ حکومت کے خلاف جنگ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، انہوں انہیں اپنے اقدام کے لئے ایک نظریاتی جواز درکار تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایمان و عمل کے مسئلہ کا سہارا لیا۔ انہوں نے ایمان کی ایسی تعریف پر اصرار کیا جس میں عمل بھی لازمی طور پر داخل ہو، صرف ایمان کسی کو مسلمان قرار دینے کے لیے کافی نہ ہو۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وقت کے حکمراں مسلمان نہیں ہیں اور ان کے خلاف خروج کرنا جائز ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جانب کے لوگوں نے جوابی شدت اختیار کی انہوں نے اس پر زور دیا کہ صرف ایمان کسی کے مسلمان ہونے کیلئے کافی ہے، اس کے لئے عمل لازم شرط نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کی صورت میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف بغاوت جائز قرار پاتی تھی دوسرے نظریے کی صورت میں ان کے خلاف بغاوت کرنا حرام تھا یہی سیاسی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ایمان و عمل کی بحث نے وہ شدت اختیار کی جو ہم کو قدیم کتابوں میں دکھائی دیتی ہے۔

سیاسی اسباب کے تحت جو نظریہ پیدا ہو اس میں شدت کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ طلاق المکرہ لیس بشیٔ کا فتویٰ اور قرآن کو غیر مخلوق کہنا حکومت کی نظر میں اسی لیے سنگین جرم تھا کہ وہ خلافت [illegible] سیاسی پہلو پیدا کر رہا تھا

الرسالہ، دہلی

تبصرے

آذری

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نئی نسل کے ان چند معتبر محققوں میں ہیں جو ادھر برسوں سے فارسی ادبیات کے سلسلے میں اردو کے پڑھنے والوں کی واقفیت کا دائرہ وسیع کرنے کی مبارک کوشش میں مصروف ہیں۔ فارسی شعر و ادب کے سلسلے میں عام طور پر لوگ چند ناموں اور کاموں کی تحسین و تعبیر سے آگے نہیں بڑھتے۔ بالعموم کلاسیکی فارسی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ فارسی شاعری کی مرکزی روایت سے باہر اس کے علاوہ جو کچھ ہے، اس سے آگہی ذرا کم ہی بات ہے، ہماری واقفیت کی سطح بھی بہت پست ہے۔ کبیر احمد جائسی نے اپنے تحقیقی سفر میں، فارسی کی مرکزی روایت سے ہٹ کر اسکے "حاشیائی ادبیات" کو نقطۂ آغاز بنایا ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے انجام دینے کا حوصلہ کرنا بذات خود ایک قابل توجہ بات ہے۔ بعض اوقات کسی بڑی زبان کی مرکزی روایت، تکمیل کا حق پیدا کرنے کے بعد جامد ہو جاتی ہے اور اظہار کے معجزوں کا ظرف ہے نئے عصر ایسے مرحلوں پر اس زبان کے حقیقی مراکز سے باہر مقامی بولیوں کے زیر اثر شعری اظہار کی توانائیوں سے ہم کنار ہوتا ہے ایران سے باہر وسط ایشیائی ریاستوں میں فارسی ادبیات کے فروغ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور غالباً اسی ضرورت پر کبیر احمد جائسی بھی اصرار کرتے ہیں، یہی اصرار آذری پر ان کے ترجمے کا محرک ہوا ہے۔ اسی جذبے کے تحت اس سے قبل انہوں نے یان ریپکا کی کتاب H TORY OE RERION LITERATURE میں تاجکی ادبیات پر برزی بیکا کے ایک باب کا ترجمہ تاریخ ادبیات تاجیکستان کے نام سے کیا تھا جسے کتابی شکل میں انجمن ترقی اردو دہلی نے شائع کیا ہے۔

آذری مشہور محقق احمد کسروی تبریزی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ ایران کا شمال مغربی صوبہ آذر بائیجان تہذیبی اور لسانی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اس علاقہ میں عرصہ سے ترک آباد ہیں اور ترکی بولتے ہیں۔ اب تک عام غلط فہمی یہ تھی کہ یہی مخصوص ترکی اس علاقے کی قدیم زبان ہے۔ یہ خیال بھی عام رہا ہے کہ اگر وہاں ترکوں کی آمد سے پہلے کوئی ایسی بولی تھی تو وہ ختم ہو گئی ہے۔ احمد کسروی تبریزی نے تاریخی شواہد کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ ترکوں کے حملے کے وقت یہاں کی زبان آذری تھی۔ انہوں نے قدیم آذری کے بعض نمونوں کا ———— جدید آذری سے موازنہ کر کے بعض اہم لسانیاتی نتائج اخذ کئے ہیں۔

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے احمد کسروی کی اس تحقیقی کتاب کا اردو میں ترجمہ کر کے　　　ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔

کتاب کی قیمت بارہ روپے ہے اور اسے مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر نے شائع کیا ہے۔

انور صدیقی

ایک ہستی ایک انجمن

یہ کتاب یونی ورسٹی ٹریننگ کالج میسور کے سابق پرنسپل جناب سید نذیر احمد کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کا ایک گلدستہ ہے جسے جناب سلیم احمد تمنائی نے مرتب کیا ہے جیسا کہ کتاب کے

مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے جناب سید نذیر احمد صاحب مرحوم گونا گوں خوبیوں کے مالک تھے اور ان کی زندگی دنیا کے لئے مشعل راہ تھی۔ ان کی تمام زندگی دوسروں کی بہتری و بہبود میں صرف ہوئی اور آخر دم تک وہ اسی کام میں مصروف رہے۔

کتاب میں سلیم تمنائی صاحب کے بھرپور مضمون کے علاوہ نذیر صاحب کے مختلف دوستوں اور عقیدت مندوں نے نثری اور شعری خراج پیش کیا ہے۔ نذیر صاحب کی مختلف سرگرمیوں کی چند تصاویر بھی کتاب میں شامل ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے ایک ایسی شخصیت سے ہمارا تعارف ہوتا ہے جو عمل پیہم کا جیتا جاگتا نمونہ ہے اور جس کی پیروی زندگی کی کامیابی کی دلیل ہے۔

کتاب کی اشاعت کے لئے مرحوم کی صاحبزادی اور صاحبزادگان تعریف کے مستحق ہیں۔ کتاب پر قیمت درج نہیں

– ارشد علی خاں

تبسم

زیر تبصرہ کتاب جناب رام لعل نابھوی کے بعض مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ رام لعل صاحب نے شاید پچھلے دس برس ہی سے ادبی تخلیق شروع کی ہے لیکن اسی عرصہ میں ایسی شہرت حاصل کر لی کہ ہند و پاکستان کے جرائد میں ان کی نگارشات شائع ہونے لگیں۔ مزاح کے علاوہ رام لعل صاحب کا دوسرا شعبہ خاص انشائیہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باطل عار نہیں ہے کہ زیر نظر مجموعے کے مضامین کچھ مزاح اور انشائیہ کا امتزاج معلوم ہوتے ہیں کچھ مضامین مثلاً "بولے" "ایک صبح" "اندازے سے ملاقات" "ایک لعنت" "خدا اور انسان" وغیرہ میرے خیال میں بالکل انشائیے ہیں انشائیہ کی جسے انگریزی میں ESSAY کہتے ہیں خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے مختلف پہلو ہلکے پھلکے ڈھنگ سے دکھائے جاتے ہیں جن پر کبھی تبسم زیر لب تو ہو جاتا ہے لیکن کھل کر ہنسی نہیں آتی دوسری طرف مزاحیہ مضامین میں طنز، تضحیک اور خالص مزاح شامل ہوتے ہیں جنہیں قاری زندگی کی کچھ قدریں تو بعد میں دیکھتا ہے پہلے کھل کر ہنستا ہے۔ رام لعل صاحب کے مضامین "لفافہ" "رسم اجرا" "چکر" "تو کون ہیں" "خواہ مخواہ" اور "مشاعرہ" تضحیک کے تحت آتے ہیں اور "قواعد محفل" طنز و مزاح یا خالص مزاح کے تحت۔ ایک مضمون "سوچا گیا تھا کیا ہوا" تو باقاعدہ مزاحیہ افسانے کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

مضامین کسی عنوان کے تحت آئیں، رام لعل صاحب کی خاص طرز نگارش ہر جگہ جلوہ نما ہے۔ اس میں سلاست، بلاغت اور روانی تینوں کا زور دکھائی دیتا ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی زبان سمجھنا جتنا آسان ہے لکھنا اتنا ہی مشکل ہے۔ لیکن رام لعل صاحب اس مشکل کو علد حل کر چکے ہیں ان کے طنزیہ مضامین کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ارباب سیاست پہ کیچڑ اچھالنے کی عامیانہ روش سے ہٹ کر زیادہ تر اپنے ہم پیشہ لوگوں یعنی ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ہی ہولی کھیلی ہے کتاب، گیٹ اپ چھپائی کتابت وغیرہ اعلیٰ پیمانے کی ہیں۔ صفحات ۱۴۴ قیمت بارہ روپے ملنے کا پتہ رام لعل نابھوی محلہ دیوان ناقہ ۱۴۷۲

سرسوتی سرن کیف

تبصرے کے لئے موصول ہوئیں

واحد متکلم: شاعری
مخمور سعیدی ۱۵/=

آتے جاتے لمحوں کی صدا: شاعری
مخمور سعیدی ۱۲/=

اک موسم میرے دل کے اندر شاعری
اک موسم میرے باہر
کمار پاشی ۱۳/=

زیر بار: شاعری
شاہد کلیم ۱۰/=

کرچیاں: افسانے
شمیم صادقہ ۵/=

ثبات: شاعری
محبوب راہی ۱۰/=

وہ فقیر اور: شاعری
سیل کرشن اشک ۱۰/=

بزم احباب

تحریک نظر سے گزرتا ہے۔ ہر شمارہ اپنی مثال ہوتا ہے۔ ترتیب و تہذیب میں جو سلیقہ ہوتا ہے وہ صرف آپ کے ذہن اور ہاتھوں کو حاصل ہے۔ اور انہیں ہاتھوں میں ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں۔ تاکہ آپ کے فن شناس ہاتھ اسے بھی تحریک کی ترتیب میں شامل کر کے درخشاں کر دیں۔

————— نیاز اعظمی علی گڑھ

ماہ دسمبر کا تحریک دیکھا پسند آیا ماہنامہ تحریک کا بہت دنوں سے مطالعہ کر رہا ہوں لیکن خط لکھنے کا آج پہلا اتفاق ہے اس شمارے میں افسانوی حصہ بہت ہی اچھا ہے خاص کر افسانہ "خون" نے بہت ہی متاثر کیا اور بھی افسانے پسند آئے نظم و غزل کا حصہ خوب سے خوب ہے شعری حصہ میں خاص کر مخمور سعیدی مصور سبزواری منظفر حنفی سلیمان خمار آج کھیتی اور نوذ نقی نور نے متاثر کیا اس ماہ کا سر ورق بھی اچھا ہے آئینہ اور پرچھائیں اور بوڑھا درخت پر تبصرہ کوئی خاص نہیں ہے اور کیا لکھوں تحریک کی زیادہ تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کی مانند ہے۔

————— فردوس گیاوی

تحریک کا باقاعدہ خریدار بننے کے بعد اب پابندی سے "تحریک" شہر بوسہ میں مجھے اور دیگر احباب کو میرے ذریعے پڑھنے کو مل رہا ہے ورنہ اس علاقے میں اچھے ادبی [illegible] بہت کم آتے ہیں۔

ستمبر کے شمارے میں مدحت الاختر صاحب اور دوسرے دوستوں کو بھی پڑھنے کا موقع ملا جن سے مدتوں بعد ملاقات ہوتی ہے۔

غزلیں نظمیں، افسانے اور مضامین وغیرہ تمام تخلیقات جاندار اور پر مغز نظر آئیں۔

————— فدا المصطفٰے فدوی پونتال

پرچے کا مطالعہ برابر جاری ہے "تحریک" کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی پالیسی حقیقی معنوں میں ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ جو الزام دوسرے رسالوں میں عائد کئے جاتے رہے ہیں یا لگائے جا رہے ہیں کم از کم ان سے یہ رسالہ پاک ہے اور اس کی تمام تر کامیابی آپکی کامیاب قیادت پہ جاتی ہے لہٰذا ان معنوں میں آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ہر شمارہ شخصیت پرستی سے پاک، معیاری تخلیقات کے ساتھ قاری کو متوجہ کرتا رہا ہے اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔ امید ہے آئندہ بھی قائم رہیگا۔

————— ایم۔ کے اثر کلکتہ

تحریک فروری کے شمارے میں شعری حصہ بہت کم ہے۔
آپ کا تحریر کردہ مضامین پُر مغز اور بصیرت افروز ہیں مضمون میں خاص طور سے پڑھتا ہوں۔ جناب کرشن موہن کی غزل نے بہت متاثر کیا ہے

راز دل کھولے سخن سے پہلے
خامشی بولے دہن سے پہلے

دیویندر ستیارتھی کے افسانے کا تاثر دیر پا [illegible] ہے۔

بمل کرشن اشک کی نظم اور احتشام اختر کی نثری نظمیں بڑی پیاری ہیں تازہ شمارہ ہر حال میں وقیع اور معیاری ہے۔

مومن دھنباد

غزل کی اشاعت کا شکریہ۔

لکھنے والوں کو متعلقہ شمارہ بھیجنا غالباً آپ نے ترک کر دیا ہے۔

میں بھی اردو کے ادبی رسائل خرید کر پڑھنا زیادہ مستحسن خیال کرتا ہوں ہندوستانی کمیونسٹوں کی غلامانہ ذہنیت پر آپ کا مضمون مختصر مگر جامع ہے کمیونزم در و دیوار نہ ہونے کے باوجود بھی ہندوستانی کمیونسٹوں کے کمزور پہلوؤں پر بیباک اور حق پسندانہ آراء کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

ایک نظم "منظر، پس منظر" بغرض اشاعت روانہ ہے امید ہے تحریک کی کسی اشاعت میں شریک کر کے شرف قبولیت بخشیں گے!

خدا کرے آپ بعافیت ہوں!

محمد صدیق

تحریک (فروری ۱۹۸۰ء) میں مخلص جارچوی پر محمد مشتاق شارق کا مضمون پڑھا۔ صفحہ ۴۴ پر شارق صاحب تحریر فرماتے ہیں " مذہباً مخلص شیعہ تھے مگر تھے بہت غیر متعصب"

کیا شارق صاحب کے خیال میں شیعہ عام طور پر متعصب ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ آپ جیسے ذہین اور سمجھدار ایڈیٹر کو بھی زیر حوالہ فقرے میں پوشیدہ شرارت کا احساس نہیں ہوا اور شارق صاحب کا مضمون جوں کا توں شائع فرما دیا۔

مجھے شارق صاحب سے کوئی شکایت نہیں ہے شکایت ہے تو آپ سے کہ تحریک میں اس طرح قابل اعتراض فقرہ کیسے چھپ گیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی "گوپال متل مذہباً ہندو ہیں لیکن بہت غیر متعصب"۔

سبط اصغر رضوی

دختران حرم۔ نام کی ایک کتاب تقریباً پچیس تیس سال قبل شائع ہوئی تھی۔ یہ چند مشاہیر خواتین کے بارے میں مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور اس کا پہلا مضمون بیگم مولانا محمد علی لاہوری سے متعلق ہے۔ مصنف کا نام معلوم نہیں مجھے اس کتاب کی ایک تحقیقی مقالے کے سلسلے میں ضرورت ہے اگر کوئی صاحب عنایت فرما سکتے ہوں تو درج ذیل پتے پر اطلاع دیں۔ بے حد شکر گزار ہوں گا۔

پتہ: اکبر علی خاں عرشی زادہ

رامپور رضا لائبریری رامپور یوپی

فروری کے شمارے میں آپ کا مدلل مضمون "حکیمانہ نظام حکومت اور جیوتی باسو" بہت اہم ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے آپ نے اسے بڑے وقت پر تحریر کیا ہے۔ ہم جیسے دور دراز علاقوں میں بسنے والوں کو آپ جیسے مجاہد صحافیوں کی تحریریں ہی گمراہی سے بچائے ہوئے ہیں۔ خدا آپ کو دراز عمر عطا فرمائے اور آپ لمبے عرصے تک ہماری راہ نمائی کرتے رہیں۔

محمد صالحین۔ کڈپا اے پی

تاجور سامری صاحب اس دنیا سے اٹھ گئے۔ ستیارتھی صاحب کا کہنا ہے کہ ان کی میت میں بہت کم لوگ شریک ہوئے۔ موجودہ دور میں جب اردو کے بیشتر ادیب اپنا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے کے بجائے مراسم بڑھانے میں صرف کرتے ہیں تاجور سامری گوشہ گیر ہی رہے۔ انہوں نے اپنی کج کلاہی میں فرق نہیں آنے دیا۔ کچھ احباب نے مجھ سے کہا کہ ان کے لئے کسی وظیفے کا انتظام کیا جائے۔ سلسلہ جنبانی سے پہلے میں نے تاجور سے مشورہ کیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اپنی کج کلاہی کی تاجور نے سزا بھی خوب بھگتی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مفلسی ہی میں گزرا لیکن انہوں نے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے لیکن ان کا مزاج مومنانہ تھا۔ خدا نے بہتر جو ظاہر کا ہی نہیں باطن پر نظر رکھتا ہے۔ انہیں بخشش کا مستحق ضرور سمجھے گا۔

گوپال متل